



کراچی

کراچی

دور ۱۹۸۹

سنگ

نمیب

شعاع کا جنوری ۱۹۹۸ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ادارہ شعاع کی جانب سے قارئین کو نیا سال مبارک۔

۱۹۹۷ء کا سفر تمام ہوا۔

۱۹۹۸ء تمام تر خوش امیدوں کے ساتھ دستک دے رہا ہے۔

دن، مہینوں میں، بیسے سالوں میں اور سال ماضی میں بدلتے جاتے ہیں، وقت ٹھہرتا نہیں ہے لیکن وقت کا کوئی پل، کوئی ساعت ہماری زندگیوں سے جدا نہیں ہوتی، ہمارا آج ہمارے آنے والے کل سے وابستہ ہے جو عمل ہم آج کر رہے ہیں، اچھا یا بُرا، اس کا حساب ہمیں کل دینا ہوگا، اس دنیا میں بھی اور اگلی دنیا میں بھی۔

نئے سال کا آغاز رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے فرض کیے ہیں، اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ہے اور غیر فرض عبادت یعنی سنت یا نفل ادا کرنے کا ثواب فرض عبادت کے برابر ہے۔

اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت، درمیانی حصہ مغفرت اور تیسرا حصہ آتش دوزخ سے آزادی کا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ماہ مبارک کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

اس شمارے میں

- آسیہ زبانی اور افشاں آفریدی کے مکمل ناول،
- نسیم آمنہ، نور بانو محبوب اور زرین آرزو کے ناولٹ،
- عابدہ رؤف، سعیدہ عزیز آفریدی، نرہت شہانہ حیدر، شمیم فضل خالق اور حجاب امتیاز علی تاج کے افسانے،
- زہرہ ممتاز اور ماہا ملک کے ناول،
- اندازِ بیاں اپنا میں رفیع الدین راز کے کلام کا انتخاب،
- مشہور کرکٹر اظہار الدین اور سنگیت، بجلانی سے ملاقات،
- ٹی وی فنکار فرخان علی آغا کا پہلا ڈکھ،
- ٹی وی فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ دستک،
- پیارے بچے کی پیاری باتیں،
- اور دیگر متنقل سلسلے شامل ہیں۔



آپ کے نام سے ابتداء اے کریم
آپ کی ذات ہے غفور الرحیم

میری زباں پر ہر دم حمد و ثنا جاری
میری زباں ہو، ذکر سے ترانے غلامی

ہم حقیر انسان ہیں آپ کے تابع و مطیع
نہیں آپ کے حکم سے سرتابی اے سمیع

دنیا کی حسین شے کائنات کا حسن و جمال
آپ ہی کے ہیں مہول منت لے کمال

آپ کا کرم میرے لیے دولتِ بہتِ اقلیم
مجھ سیاح کار پر کیجیے رحم اے فرخ دستِ علیم

ازل سے ہے ابد تک باقی آپ کا وجود
کائنات کی ہر شے ہے فانی اے مقصود

افشاں جہیں خان



میرے لیے تو ہیں میرا جہاں حضور مرے
خدا کا شکر ہیں آرام جاں حضور مرے
ہے کائنات کا بلجام و بارگاہِ یہیں
پناہ لیتے ہیں کون مکان حضور مرے
کسے ہوئے تھے شگجے میں اپنی وہم و جہل
تمہارے دم سے ہیں آزادیاں حضور مرے
میں خوش نصیب تھوں قدرے مل گئیں مجھ کو
تمہارے عشق کی تابانیاں حضور مرے
یہ نعت گوئی بھی میری ہے آپ کا فیضان
وگرنہ آپ کہاں ہیں کہاں حضور مرے
جمالِ نذر کی بارش سی ہو گئی ہر سو
وجود آپ کا ہے کہکشاں حضور مرے
بنا ہے دل مرا آئینہ جمالِ رسول
اسی لیے تو ہوا ضوِ افشاں حضور مرے
صفات آپ کی جو ہیں عیاں ہوئیں مجھ پر
ہے بے قرار دلِ ناتواں حضور مرے
درو پڑھتی ہے تسنیم دلِ جاں کے ساتھ
ہے ذکرِ پاک ہی حسین بیاں حضور مرے

چاند چاندی کی پائی گاتی ہے

رمضان تمام کا مطلب

ماہ رمضان کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ رمضان اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک ہے، اسی لیے اس ماہ کو رمضان کہا گیا، ایسے وجہ کو شہر الائمہ کہتے ہیں۔ عبد اللہ اور جعفر صادق اپنے بزرگوں سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”رمضان کا مہینہ اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے، انس بن مالک کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”رمضان کو صرف رمضان نہ کہو بلکہ جیسے خدا نے اس کی نسبت کی ہے اس طرح کہو یعنی شہر رمضان“ اسی میں جیسے نام کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں گرمی کے باعث اونٹ کے پتے کے پاؤں گرم ہو جاتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ سورج کی گرمی سے پتھر گرم ہو جاتے ہیں اس لیے اس ماہ کو رمضان کہا گیا۔ کیونکہ رمضان گرم پتھر کو کہتے ہیں۔ فرمایا اس ماہ کو رمضان اس لیے کہا گیا کہ اس میں گناہ جل جلتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی یہی ہے۔ آپ نے فرمایا اس ماہ میں آخرت کی فکر اور نصیحت کی گرمی سے دل متاثر ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے سورج کی گرمی سے ریگستان اور پتھر جل جلتے ہیں۔

خلیل کا کہنا ہے کہ رمضان کا لفظ رخص سے مشتق ہے۔ رخص اس بارش کا نام ہے جو خریف کے موسم میں برتی ہے۔ چونکہ ماہ رمضان لوگوں کے دل اور جسم گناہ سے پاک کر دیتا ہے۔ اس لیے اسے بھی رمضان کا نام دیا گیا۔

نزول قرآن

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ
رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا۔
علیہ بن اسود فرماتے ہیں۔ ابن عباس سے اس کے معنی پوچھے گئے تو انہوں نے فرمایا:
”اس کے معنی میں شک ہے، اس لیے کہ قرآن سب مہینوں میں نازل ہوا۔ ارشاد ہوتا ہے۔
”ہم نے قرآن کو الگ الگ کر کے بھیجا تاکہ لوگوں پر غم نہ پڑے۔“
پھر فرمایا: ”یافرون نے کہا کہ قرآن ایک ہی بار کیوں نہ اتارا گیا؟“
اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن دراصل لوح محفوظ سے رمضان کی شب قدر میں ایک ہی مرتبہ اتارا گیا۔ پھر اسے دنیا کے آسمان (بيت العزت) میں رکھا گیا۔ بعد میں جبریل عتورا مقودا لے کر بیس سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اترے۔

تمام صحیفے اسی ماہ اتارے گئے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”میں قرآن کے نزول کے اوقات کی قسم کھاتا ہوں!“
داؤد بن ابی ہند کہتے ہیں۔ میں نے شعبی سے پوچھا کہ قرآن ماہ رمضان ہی میں اترتا۔ مختلف برسوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہیں ہوا۔ وہ کہنے لگے کئی سالوں میں نازل ہوا۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ رسول اللہ پر جس قدر قرآن مجید اتر چکا ہوتا۔ جبریل م

رمضان کے مہینے میں اسے دہرایا کرتے تھے۔ اور جس قدر اللہ کو منظور ہوتا۔ اسی قدر آپ کو یاد رہتا۔ باقی بھول جاتا۔

شہاب بن طارق نے ابی ذر غفاری سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”حضرت ابراہیم پر رمضان کی تین راتوں میں صحیفے نازل ہوئے۔ حضرت موسیٰ پر رمضان کی چھ راتوں میں توہرات اتاری گئی۔ حضرت داؤد پر رمضان کی اٹھارہ راتوں میں زبور اتاری گئی۔ اور رمضان کی تیرہ راتوں میں حضرت عیسیٰ پر انجیل اتری۔ رسول خدا پر رمضان کی چوبیس راتوں میں پورا قرآن نازل ہوا۔

رمضان کی برکتیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری دن خطبے میں فرمایا۔
”اے لوگو! بزرگ اور مبارک مہینہ قریب آ گیا ہے۔ اس ماہ کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس ماہ کے روزے اللہ نے فرض کیے ہیں اور نفل کے لیے رات کا قیام مستحب قرار دیا ہے۔ جس نے اس ماہ میں ایک نیکی کی یا کوئی نفع ادا کیا وہ اس شخص کی مانند ہوگا جس نے ماہ رمضان کے سوا ستر فرض ادا کیے۔ فرمایا یہ مہینہ کا مہینہ ہے۔ اور صبر کا ثواب جنت ہے۔ یہ ایک دوسرے سے اچھا سلوک کرنے کا مہینہ ہے۔ جس سے رزق میں ترقی ہوتی ہے۔ اس ماہ میں کسی کا روزہ کھلوانا گناہوں کو معاف کرانے کا ذریعہ ہے۔ جانا ہے۔ اور دوزخ کی آگ سے نجات کا باعث اور اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

بعض صحابہ عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم تو دوزخ کے روزے کھلانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ آپ نے جواب دیا کہ: ”وواب روزہ کھلانے سے ملتا ہے خواہ ایک کھجور، ایک گھونٹ پانی یا دو دھکے ایک چلو سے کھلوا یا جائے۔ یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کی ابتداء جنت ہے۔ درمیان مغفرت ہے اور آخر میں دوزخ ہے۔ نجات۔ سو ہر شخص اس ماہ میں اپنے غلام کا کوچہ ہلکا کر دے گا۔ وہ بخش دیا جائے گا اور دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔“

کر دے گا۔ وہ بخش دیا جائے گا اور دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔
فرمایا اس ماہ میں چار خصلتیں زیادہ اختیار کرنی چاہئیں۔ وہ خصلتیں تمہارے اللہ کو خوش اور راضی کرنے والی ہیں۔ اور دوا ایسی ہیں کہ ان کے بغیر نہیں چارہ ہی نہیں۔ اول الذکر دو میں سے ایک لا الہ الا اللہ ہے اور دوسری استغفار مؤخر الذکر دو میں سے ایک تو اللہ تعالیٰ سے بہشت کا مالک بنانے اور دوسری دوزخ سے بچنے کے لیے اس کی پناہ میں آنا۔
فرمایا جو شخص اس ماہ میں روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھلائے گا اسے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میرے حوض سے ایسا خربت پلائے گا جس کے پینے کے بعد اسے کبھی پیاس محسوس نہ ہوگی۔“

کھانے ابی الفداء سے اور انہوں نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”رمضان کی پہلی رات میں آسمان اور بہشت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ جو مہینے کی آخری رات تک کھلے رہتے ہیں۔ جو مرد یا عورت ان راتوں میں نماز پڑھے اسے ہر سجدے کے عوض ایک ہزار سات سو نیکیاں عطا ہوتی ہیں۔ بہشت میں اس کے لیے سرخ یا قوت کا محل بنایا جاتا ہے۔ جس کے ستر ہزار دروازے ہوں گے۔ یہ سب دروازے سونے کے ہوں گے، جن میں سرخ یا قوت جڑے ہوں گے۔ جب مومن بندہ پہلے دن روزہ رکھتا ہے تو رمضان کے آخری دن تک اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ دوسرے ماہ رمضان کا کفارہ ہوتا ہے۔ جتنے روزے وہ رکھتا ہے ہر روزے کے عوض بہشت میں اس کے لیے سونے کا ایک محل تیار کروا جاتا ہے جس کے ہزار دروازے ہوں گے۔ ستر ہزار فرشتے صبح سے شام تک اس کے لیے بخشش کی دعا مانگتے ہیں۔“

فرمایا دن رات میں جتنے سجدے وہ کرتا ہے، ہر سجدے کے عوض بہشت میں ایک درخت عطا ہو گا۔ اس درخت کا سایہ اتنا وسیع ہوگا کہ ایک سو سو برس تک اس میں چلا جائے تب بھی وہ ختم نہ ہو۔

ابو نضر اپنے والد سے، وہ اس کے لئے اور وہی میرے سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

» ماہ رمضان کی پہلی رات اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر لطف کی نظر کرتا ہے۔ اور جس بندے پر ایک دفعہ رحمت کی نظر ڈالے اسے کبھی عذاب نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ روزانہ ایک کروڑ آدمیوں کو آگ سے آزاد کر دیتا ہے۔ ابو نضر اپنے والد سے، وہ سہل سے، وہ اپنے والد سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: » رمضان آنے پر بہشت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور سب شیطانوں کو قید کر دیا جاتا ہے۔«

ہر رات اللہ تعالیٰ تین مرتبہ پکارتا ہے کہ کوئی سوال کرنے والا ہے کہ میں اس کا سوال پورا کروں، کوئی توبہ کرنے والا ہے، کہ اس کی توبہ قبول کروں، کوئی بخش چاہنے والا ہے کہ میں اسے بخش دوں، کون ایسے غنی کو قرض دے گا جو نادر نہیں۔ اور جو پورا دلا کر تاپے اور ظلم نہیں کرتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: » جو لوگ دوزخ میں آگ کی سزا پانے کے مستحق ہو جاتے ہیں، ماہ رمضان میں روزانہ افطار کے وقت ان لوگوں میں سے ایک کروڑ کو اللہ تعالیٰ معافی دیتا ہے۔ اس ماہ میں جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات کو ہر ساعت میں ہزار ہا دوزخوں کو بخش دیا جاتا ہے۔ ماہ رمضان کے آخری روز سے میں اللہ تعالیٰ اتنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے جتنے رمضان کے دوسرے تمام دنوں میں آزاد اور معاف کیے گئے تھے۔«

پھر جبریلؑ آواز دیتے ہیں کہ اسے گروہا دلیا اب یہاں سے کوچ کرو۔ اس وقت وہ پوچھتے ہیں اسے جبریل اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی کون کون سی حاجتیں پوری کی ہیں؟ وہ جواب دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کی نظر کی ہے۔ ان کے گناہ معاف کر کے انہیں بخش دیا ہے۔ مگر جا رہے آدمیوں کو نہیں بخشتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا وہ چار آدمی یہ ہیں۔ ہمیشہ شراب پینے والا۔ ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا۔ مسکرا کر قلعہ کرنے والا اور مسلمانوں سے تعلق توڑنے والا۔

جب فطری رات آتی ہے جسے جائزہ بھی کہتے ہیں تو اس صبح کو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ ہر شہر میں پھیل جاؤ، چنانچہ فرشتے زمین پر آ کر ہر راتے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور آواز دیتے ہیں جسے جن اور انسان کے سوا سب سنتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

» اے محمدؐ کی امت! اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ ہمیں بہت سی عنایات سے نوازتا ہے۔ اور تمہارے گناہ بخشتا ہے۔«

جب لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے: » اس مزدور کو کیا مزدوری دینا چاہیے۔ جس نے اپنا کام پورا کر لیا۔« فرشتے عرض کرتے ہیں: » اے اللہ! اسے اس کے کام کی پوری مزدوری دی جائے۔« اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ » اے فرشتو! تم گواہ رہنا! اس نے ماہ رمضان کے جو روزے رکھے ہیں۔ تو ان کو کھڑے ہو کر عبادت کی ہے۔ اس پر میں بہت خوش ہوں۔ اور اس کے گناہ معاف کرتا ہوں۔«

پھر فرمایا: » اے میرے بندو! تم کو کچھ اور بھی مانگنا ہے۔ تو مانگ لو۔ مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم دینا یا آخرت کے لیے جو کچھ تم مانگو گے دوں گا۔ جب تک تم مجھے ڈرتے نہ ہو گے، میں تمہاری۔ لغزشوں پر پردہ ڈالتا رہوں گا اور تمہیں خوار اور دوسوا نہیں کروں گا۔ تم مجھے ہونے پہنے گھروں کو واپس جاؤ تم مجھ سے اور میں تم سے راضی ہوا۔«

یہ فرشتے پکار کر تپتے کہ کوئی ایسا شخص ہے، جو گناہوں سے باز آ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ اس کی توبہ قبول ہوگی جو دعا کرے گا، اس کی دعا قبول کی جائے گی۔ کوئی ظلم مدد چاہتا ہے تو اس کی مدد کی جائے گی۔ بخشش چاہتے والے کی بخشش کی جائے گی۔ سوال کرنے والے کی حاجت پوری کی جائے گی۔ رمضان کے سارے بیٹھے میں اللہ تعالیٰ فرماتا رہتا ہے۔

» اے میرے غلامو! اور میری لونڈیو! تمہیں خوشخبری ہو تم صبر کرو۔ اور اس پر مجھے رہو جلدی نہیں رہو۔ مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ اور میں تمہیں اپنی رحمت کے قریب بلاؤں گا۔«

شب قدر میں حضرت جبریلؑ فرشتوں کے ایک گروہ کے ہمراہ زمین پر تشریف لاتے ہیں اور سب ان بندوں کے لیے جو خدا کی یاد میں معروف ہوں دعا کرتے ہیں۔ انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

» اگر اللہ تعالیٰ زمین اور آسمان کو طاقت رکھتا تو اسے تو یہ اس بندے کو جو رمضان میں روزے رکھتا ہے۔ بہشت کی خوشخبری سنائے لیکن۔«

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

» اگر اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کو بات کرنے کی قدرت عطا فرمادے تو یہ رمضان میں روزے رکھنے والے کو بہشت کی خوشخبری سنادیں۔«

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

» روزہ دار آدمی کا سوجانا بھی عبادت ہی ہے۔ اس کی مامولی بھی ہے۔ اس کی دعا قبول کی جاتی ہے اور اس کے اعمال کا اسے دو گنا ثواب ملتا ہے۔«

امام شافعیؒ نے اپنی تفسیر سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے فرمایا۔

» ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک، ایک حج سے دوسرے حج تک، ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک، ایک نماز سے دوسری نماز تک آدمی کے ان افعال کے لیے کفارہ ہے جو اس سے سرزد ہوتے ہیں بشرطیکہ کبیرہ گناہ نہ کرے۔«

عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

» جو شخص ماہ رمضان میں ایمان کی حالت میں ثواب کی غرض سے روزہ رکھے، رات کے وقت قیام کرے، اللہ تعالیٰ ان کے لکے پچھلے گناہ معاف کر دیتا ہے۔«

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے میری امت کا کوئی شخص ایک نیکی کرے تو اس کے بدلے میں دس سے لے کر سات سو تک مزید نیکیاں اس کے لیے بڑھادی جاتی ہیں۔ روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ یہ خاص میرے لیے ہے۔ اس میں آدمی اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ وہ میری خاطر کھانا پینا ترک کر دیتا ہے۔ اس لیے میں اسے اپنی شان اور اپنی عظمت کے مطابق اجر دیتا ہوں۔ روزہ اس شخص کے لیے ڈھال ہے۔ روزہ دار کو دو راتیں نصیب ہوتی ہیں۔ ایک راحت روزہ افطار کرتے وقت اور دوسری اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل کرتے وقت۔ ان دو فرشتوں کے برابر کوئی فرشتہ نہیں۔ ابوابہرکات مستطیٰ یزید بن ہارون سے، اور وہ سعید سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

» جو آدمی ماہ رمضان کی ایک رات میں اپنے نفلوں میں سورۃ انفاتحنا پڑھے وہ اس سال میں تمام آفات سے محفوظ رہتا ہے۔«

کس کے روزے قبول نہ ہوں گے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

» جب تک میری امت کے لوگ رمضان میں روزے رکھتے ہیں، ہرگز ذلیل و خوار نہ ہوں گے۔ کسی نے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ! کس بات میں ہے؟ فرمایا۔

» اس بات میں کہ کوئی شخص ماہ رمضان میں بڑے کام کے، شراب پیے، زنا کرے۔ ایسے کام کرنے والا اگر روزے رکھتا ہے تو وہ بھی بے توفہ قبول نہ ہوں گے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے اور آسمانوں کی ساری مخلوق آئندہ رمضان تک اس پر لعنت بھیجتی رہے گی۔ اگر وہ آئندہ رمضان کے آسنے پہنچے مگر گیا تو اس کے پاس کوئی نیکی نہ ہوگی۔ (جیسے لے کر خدا کے حضور میں جائے۔)

شب قدر کیا ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ » اے محمدؐ! جانتے ہو شب قدر

کیلئے، اگر اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نہ بتاتا تو کتنے کس طرح معلوم ہوتا کہ اس رات کی تعظیم اور قدر کی کینت کیلئے۔ جس چیز کو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے "وما اذکارہ" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی اطلاع خود آنحضرت کو دے دی اور لفظ "ما اذکارہ" میں جو ایک بار ہے اس کی اطلاع آپ کو نہیں دی گئی۔ فرمایا۔ اور تم کون سی چیز معلوم کرتے ہو سکتا ہے قیامت قریب ہو سکتا اس رات کو نہ بتایا اور اس رات کو شب قدر سے تعبیر فرمایا۔ یعنی بزرگی اور قدر کی رات۔ اس رات کو مبارک کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ہم نے قرآن کو مبارک رات میں اتارا۔" اس لیے کہ سال میں جس قدر قرآن نازل ہوتا تھا تھا وہ اس رات میں ایک ہی مرتبہ الگ کر لیا جاتا تھا۔ پھر فرمایا "شب قدر ہزار ہینوں سے بہتر ہے۔" یعنی اس رات میں جو شے عمل کیا جاتا ہے وہ ان ہزار ہینوں کے عمل سے بہتر ہے جن میں شب قدر نہیں آتی۔ کہا جاتا ہے کہ خیر میں الف شخصہ کے الفاظ سے صحابہ کرام جس قدر خوش ہوتے تھے کسی اور قول سے اتنا خوش نہ ہوتے تھے۔

ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے یہی اسرائیل کے چار دیوؤں کا ذکر کیا کہ انہوں نے اتنی سال تک اللہ کی عبادت کی۔ اس دوران میں ایک لحظہ کے لیے بھی اللہ کی نافرمانی نہ کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چار دیوؤں کا ذکر کیا حضرت یونسؑ، حضرت ذکریاؑ، حضرت حزقیلؑ اور حضرت یونسؑ بن نونؑ صحابہ کرام۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ سن کر بہت تعجب ہوئے۔ اس وقت جبریلؑ نازل ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا۔

"یا رسول اللہ! آپ کے صحابہ کو آپ کی بات سے تعجب ہے کہ ان کو جو نعمت عطا کی ہے وہ اس سے بھی بہتر ہے۔ چنانچہ جبریلؑ نے سورہ انا انزلناہ "پڑھی اور کہا۔

"جس بات پر آپ کے صحابہ نے تعجب کا اظہار کیا ہے یہ سورہ اس سے بھی بہتر ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خوش ہو گئے۔

"یہی بنی نوح سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس نے اللہ کی راہ میں ایک ہزار ماہ تک بھٹا رہا ہندو رکھے اور علیحدہ نہ کیے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ تعجب ہوئے تب اللہ تعالیٰ نے سورہ انا انزلناہ "نازل فرمائی اور فرمایا۔

"قہارے لیے یہ ان ہزار ہینوں سے بہتر ہے۔ جن میں اس شخص نے میری راہ میں بھٹا رہا ہندو رکھے اور انہیں ایک لحظہ کے لیے بھی نہ اتارا۔" کہا جاتا ہے اس شخص کا نام ثعلون عابد تھا جو بنی اسرائیل تھا۔ بعض اس کا نام ثمنون بتاتے ہیں۔

شب قدر کی تلاش

شب قدر کو ماہ رمضان کے آخری عشرے میں ڈھونڈنا چاہیے۔ خصوصاً تیسویں رات میں۔ امام باکھٹ فرماتے ہیں کہ رمضان کی آخری دس راتیں برابر ہیں کسی رات کو دوسری پر فضیلت نہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ "رمضان کی تیسویں رات شب قدر ہے۔ بعض اسیسویں رات بتاتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ عیسیٰ نے تیسویں رات بتائی ہے۔ حضرت ابو ذرؓ اور حضرت امام حسنؓ نے پچیسویں رات بیان کی ہے۔

حضرت بلالؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

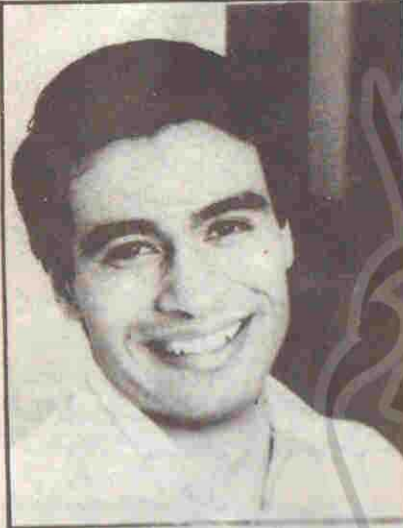
"شب قدر رمضان کی چوبیسویں رات ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابی بن کعبؓ نے تیسویں رات بتائی ہے اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ امام احمد بن حنبلہؒ نے اپنی اسناد میں ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ لوگوں کا دستور تھا کہ رمضان کے آخری دس دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے اپنے خواب بیان فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا۔ تمہیں پے درپے جو یہ خواب آتے ہیں یہ تیسویں رات واقع ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا شب قدر تیسویں رات ہے۔



پہلا ذکر

فرحان علی آغا

شاہین کشمیر



فرحان علی آغا ایک بھاری بھر کم نام مگر گفتگو میں نرمی اور بات کرنے کا انداز بہت اچھا ہے۔ اپنے نام سے کم اور مراد کے نام سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ حالانکہ سیریل "جال" ختم ہوئے تقریباً ایک سال ہو گیا ہے۔ فرحان علی آغا کے دل سے اور سیریل کے تعداد بہت کم ہے مگر یہ بڑی بات ہے کہ کام کرنے کے باوجود یہ ناظرین میں مقبول ہیں اور اس کی ایک وجہ تو ان کا اخلاقی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ایک اچھے فنکار ہونے کے علاوہ ایک اچھے ماڈل بھی ہیں۔

"فرحان صاحب آپ ہمیشہ ہنستے مسکراتے ہوئے بات کرتے ہیں اور اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ کم سے کم ان لوگوں کو دوران ہنستے مسکراتے رہا ہے۔ اس بات کی وجہ سے آپ کے ہنسنے کے بارے میں بات کریں گے۔ آپ انہیں اپنا پہلا ذکر بتائیں گے۔"

سوچتے ہوئے دیکھتے ہیں آپ کو ایک بات بتاؤ کہ انسان کی زندگی میں چند ہی آثار پڑھاؤ آتے ہیں وہ انسان کی زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں اور ان آثار پڑھاؤ سے ہی انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔

"بے شک آپ درست کہہ رہے ہیں مگر کچھ تو کہ ہمیشہ کسک بن کر زندہ رہتے ہیں۔" "ہاں کیوں نہیں، مجھے میرے والد کی موت نے بہت ہرٹ کیا۔

تو اگر وہ کہ ذکر آنے کا تو پھر میں یہ کہوں گا کہ میرے والد کی موت میری زندگی کا پہلا ذکر

ہے اور جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میں اسلام آباد میں تھا اور ایسا نہیں تھا کہ میرے والد بیمار تھے یا انہیں کوئی تکلیف تھی۔ میں انہیں اچھا بھلا چھوڑ کر اسلام آباد گیا تھا کہ ایک دن اچانک ہی اطلاع ملی کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کا وارث فیمل ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی اور بڑی خیر سن کر انسان کی اور خصوصاً بیٹے کی کیا حالت ہوگی یہ کوئی کہنے سننے کی بات نہیں ہے اور پھر جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میری عمر صرف بیس یا اکیس سال کی تھی اور لوگ کہتے ہیں کہ میری عمر بہت کم تھی۔ لوگ یہاں تو اس عمر میں بڑی کہلاتی ہیں مگر روکے نہیں۔

”ہمارے معاشرے میں مردی کمال ہے تو اس
اچانک کی موت سے گھر کا نظام تو درہم برہم ہوا
جی ہو گا“

”کیوں نہیں، ایسا ہوتا ہے اور ایسے موقع پر
رشتے دار بھی آن لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے
جن کے ساتھ یہ حادثہ پیش آتا ہے مگر اللہ کا
شکر ہے کہ ہمیں مالی طور پر کوئی پریشانی نہیں ہوئی
مگر افرادی طور پر سب متاثر ہوئے اور میں بہت
زیادہ متاثر ہوا اس حادثے سے کہ نیکو میں اپنے
والد کا بہت چہیتا اور لاڈ لایا تھا تو میں ہر وقت
بہت ادا اس اور پریشان رہتا تھا اور میرا کسی
کام میں دل نہیں تھا تھا میری یہ کیفیت تقریباً
دو سال رہی پھر میں نے سوچا کہ یہ تو ایسا غم ہے
جو کوئی شہر نہیں کر سکتا اگر میں نے اپنے آپ کو
مصروف رکھا تو زندگی کیسے گزرے گی چنانچہ جب
میں مصروف رہنے لگا تب زندگی کچھ آسان ہو گئی
مجھ سے ایک بڑا بھائی بھی ہے اس نے بھی مجھے
بہت سہارا دیا اور سمجھایا اور کہا کہ ایک شخص جب
ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹ جائے تو دوسرے کو اس کی
جگہ سنبھالنی پڑتی ہے اور میرے بڑے بھائی نے

ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔
اب اگر جب کا فی سال گزر گئے ہیں مگر والد صاحب
ہر خوشی اور پریشانی میں دیا کرتے ہیں اور مجھے ایک
بات کا اور بھی افسوس ہے کہ ابھی تک وہی عرصہ ہوا
ہے میں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن پاک
کا اردو میں مطالعہ کیا ہے اور بڑی گہرائی کے ساتھ
اور بہت سوچ سمجھ کر مطالعہ کیا، اور جو اچھی باتیں
میں نے پڑھیں اور جن کو میں نے سمجھا تو میں سوچتا
ہوں کہ کاش میرے والد صاحب زندہ ہوتے تو
یہ باتیں ان کو بتاتا، انسان جس سے محبت کرتا

ہے اس سے محبت کا یہی ثبوت دیا جاسکتا ہے
کہ اسے سیدھا راستہ دکھا دے۔ اُسے اسلامی اچھی
باتیں سکھادے۔ دُنیا کی حقیقت بتا دے۔ اس کی
اوقاف صحیح سمجھا دے، کیونکہ بہر حال اسلام ایک حقیقت

ہے اور اس کی باتوں کو سمجھنا، سمجھانا اور ان پر عمل
کرنا اور کرانا بجا رافضی ہے۔ ہم ان سچائیوں سے
منہ تو نہیں موڑ سکتے۔ گھر میں بند رہنے سے سورج
نکلنا تو بند نہیں ہو جاتا۔ ہمیں رہنمائی حاصل کرنی
چاہیے۔ اپنے مذہب سے۔ لوگ غفلت میں پڑے
ہوئے ہیں۔ میں اپنے والد کو یہ سب کچھ بتاتا تو
انہیں ان باتوں سے کتنی رہنمائی ملتی۔ کبھی کبھی تعلیم
سارے پردے گرا دیتی ہے ورنہ جب تک آپ کو
اس بات کا علم نہیں ہو گا۔ کہ آپ نے کہاں جانا
ہے، کیا کرنا ہے تو آپ اپنا راستہ کیسے تلاش
کریں گے۔“

”جو باتیں آپ بتا رہے ہیں یقیناً آپ کے
والد کو معلوم ہوں گی کیونکہ وہ آپ کے باپ تھے
آپ سے بڑے تھے۔ مذہب کو سمجھتے ہوں گے۔
آپ ان سے رہنمائی لے سکتے تھے۔ وہ آپ سے کیا
رہنمائی لیتے؟“

”آپ مجھے یہ بتائیں کہ کتنے لوگ ہیں جنہوں
نے اللہ کی کتاب کو ٹھیک طرح سے سمجھ کر پڑھا
ہے۔ آپ عربی میں قرآن پاک تو پڑھ لیتے ہیں
مگر آپ کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ پڑھ کیا رہے
ہیں۔“

بغیر سمجھ بوجھ کے کوئی کتاب پڑھنا تو وقت ضائع
کرنے کے مترادف ہے۔ تو میرے والد نے بھی عام
لوگوں کی طرح اللہ کی کتاب کو عربی میں پڑھا، آج
وہ زندہ ہوتے تو میں انہیں بتاتا کہ اس کتاب میں
کیا لکھا ہے اور کس طرح ہیں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب
کے ذریعے رہنمائی دی ہے۔“

باب کے پچھڑنے کا ذکر تھا، اب افسوس
اس بات کا ہے کہ ان کے لیے میں کچھ کر سکا۔
خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔



رفیع الدین رازی

ساتھ غلام نبی

سادہ اور عام سا نظر آنے والے شخص کے
بارے میں کوئی یہ بتائے کہ یہ شعر کتنا ہے تو حیرت
بالکل نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس شہر کراچی میں بے تحاشا
لوگ ملیں گے۔ اور ملتے بھی ہیں کہ وہ شاعر ہوتے
ہیں۔ مشاعرہ پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ بزم خود انشور
کہا رہے ہوتے ہیں۔ اور لوگ ان کو جانتے بھی ہیں۔
اور وہ مشہور بھی ہوتے ہیں اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ
وہ کھربور شعر کہنے کی صلاحیت سے کبھی محروم ہوتے
ہیں۔ اس انجم میں وہ سادہ اور عام سا شخص جو ”دیدہ
فرد خنوعاب“ اور ”مینائی“ کا خالق ہے۔ جس کا نام
رفیع الدین رازی ہے۔ دونوں کتابوں کی درجہ گہرائی سے
معلوم ہوتا ہے کہ یہ کم سخن شخص کو کم گو کہے یکن کم فہم
ہرگز نہیں۔ پھر پورے شعر کہنے کی کتنی ہی صلاحیت اس کے
اندر ہے۔ اور اس صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے
ایسے شعر کہ رہا ہے۔

اس درجہ شناسائی کہ میرا ہے نصرت
کیا عرصہ موجود بھی گزرا ہو کل ہے

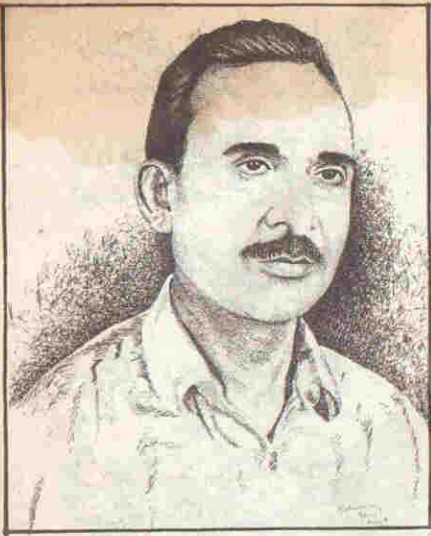
دیار شوق و فاضل کا کہ صلوات دے
میں ملک گیا ہوں مجھے گراں آستہ دے

گدا را اس درجہ کیوں ہے دل
میں بھی عشق کا آزار ہے کیا؟

دوسری بزم میں رفیع الدین رازی صاحب
ہمارے ہمارا ہوئے چلنے کی پیالی کے ساتھ گنگو کا
آغاز ہوا۔ میرے پہلے سوال کے جواب میں انہوں
نے کہا۔

”سچ پر مجھے تو شعر کہنے کا آغاز بس آغا تھا، ہی ہو
گیا۔ اسکول کے زمانے میں گانے کا شوق تھا۔ اور
میں بتاؤں کہ بلا مطالعہ میری آواز اچھی تھی۔ اسکول کے
فنکشن میں گانے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ اور
گانے والے لوگ آہنگ اور عرض سے واقف تو ہو
ای جاتے ہیں۔ ہم ان دونوں ڈھلے میں رہا کرتے تھے۔
یہ اکثر سے پہلے کی بات ہے۔ وہاں ہمارے ایک
مہربان فیاض عالم صاحب ہو کر تھے۔ وہیں شرقی
پاکستان میں ایک شاعر بشر اے کے نام سے
مزارعہ شاعری کیا کرتے تھے۔ ان کی ایک
غزل بھی۔ فیاض صاحب نے اس غزل کو پڑھ کر کہا
کہ کیا انچھا فلسفہ بیان کیا ہے۔ میں نے ترنگ میں آکر
کہا کہ ایسا فلسفہ تو میں بھی شریں کہہ سکتا ہوں۔ اسی
رذیل تالیف میں، یہ تو جوانی کی بات تھی، جو میں
نے دہرا کر دیا تھا۔ اب ایسی بات سوچ بھی نہیں
سکتا، خیر اسی رذیل تالیف میں برجستہ شعر تقریباً
دو منٹ میں کہہ دیا۔ وہ شعر یہ تھا۔

”کیوں نہ ڈر جاؤں تیری قوت سے
میں ہوں تنہا تیری خلائی ہے
وہ شعر سن کر چپکے آ گئے۔ اور انہوں نے کہا
کہ وہ کہاں کہ دیا مزیں انہوں نے کہا کہ اگر پوری
غزل کہہ کر دکھاؤ تو میں تم سب کو ڈر دوں گا۔ خیر
میں میرے ہوں گا کہ اب یہ دہرا نہیں کر سکتا۔ ہونٹ
میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اور بیس پچیس منٹ
میں پوری غزل کہہ دی۔ سولہ گے سولہ مصرعے وزن میں
تھے۔ سولہ ایک دو جگہ تذکر و تائید کی غلطی کے
عوض میں کوئی کمی نہ تھی۔ پھر انہوں نے بے حصار
کیا کہ میں صرف اور صرف شاعری کروں۔ اور اس حد



تا دم آخر مکافات عمل کی شکل میں
بازگشت ذات تھی جو ہم کو سنوئی گئی

شہر جاں روشن ہوا تکمیل آب و گل ہوئی
زندگی کو رد کی جب آج دکھائی گئی

”اپنی شاعری میں آپ نے رومان ”کوکس حد“
تک بڑھا جو اب انہوں نے کہا۔
میں نے بھی سوچ کر کہنے کی کوشش نہیں کی۔
میں نے اس تجربے کو بھی نہیں لکھا۔ جو مجھ پر بیٹا نہیں۔
جسم مفلس پہ جوائی کیسی
پچھتا دیکھو، بڑھاپا دیکھو

میرے ساتھ ہوا کچھ یہی، ابانے دوسری شادی
اس وقت کی جب میں چھ سال کا تھا۔ نوجوانوں کو جو
رومانی زندگی ملتی ہے وہ مجھے میسر نہیں آئی۔ براہِ راست
پرکشش لائف میں آ گیا۔ میں خود کو بد قسمت
ہی کہوں گا۔ کیونکہ ایک صاحب علم باپ کی اولاد
ہو کر بھی میں ان کی صلاحیتوں سے فیض یاب نہ ہو سکا۔
ابا کہتے ہیں سابق مشرقی پاکستان کے ہنگاموں کی زندگی
ہو گئی۔ اسے میری بد بختی کہتے یا حالات کی قسم نہ لینی
کہ لقمہ ساہارہ سال کی عمر میں ہی زندگی اپنی تمام تر
جلوہ سامانوں کے ساتھ بہتے سامنے آگئی ہوئی۔
پھر میں تھا اور سر پر کھلا آسمان۔ پچھلے ہوئے کہنے
جسم بدستریں دریں سرکتے ہیں۔ مجھے ابھی طبع معلوم
ہے سورج کی پیش کس وقت کتنی ہوتی ہے اس سے
یہ اہل دن واقف ہے۔“

انہی حوالوں سے مرتب ”غزل“
نوں کی ورد کی چھالوں کی بات کرتا ہوں
میں زندگی کے حوالوں کی بات کرتا ہوں

تلاش رہتی ہے شب میں بھی زندہ چہروں کی
اندھیرے میں بھی اجالوں کی بات کرتا ہوں

یہ پاس خاطر جاں موسمِ اہم میں بھی
طرب کی لے میں ملاؤں کی بات کرتا ہوں

مری چشمِ تنہا کو سرابِ آسمانِ منظر تک
کبھی امید لے جلے کبھی امکان لے جلے

کبھی تو بے خودی مجھ کو شعورِ خود شناسی دے
کبھی تو میری جانب بھی تجھے وجدان لے جلے

سفر میں رازِ آشفتمند بریاسِ شاد و حنت
جو بارِ خاطر جاں ہو وہی سامان لے جلے

اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے ان سے
پوچھا۔
”مکری اعتبار سے آپ اپنا تعلق کس سے بڑھا
محسوس کرتے ہیں؟“
جواب انہوں نے کہا۔

مکری طور پر اپنا تعلق غالب سے جوڑتا ہوں
کیونکہ غالب ایسا شاعر ہے کہ اس کے یہاں تنوع
بہت ہے۔ اور غالب جیسی بڑی شخصیت سے متاثر
ہونے کے بعد کوئی اور شخصیت بچاتی نہیں۔ ویسے بھی
غالب کے بعد ایک بہت بڑا خلا محسوس ہوتا ہے۔
اور یہ اسے ٹوٹی ایک عمدہ غزل دیکھیے۔
دروغی خوشبو گئی، رختوں کی رعنائی گئی
موجم، جہراں تری اسب کے پذیرائی گئی

کون سی محفل، کہاں کے روز و شب کیساقیام
زندگی تو اصل میں اک سانس تھی آئی گئی

جس گلی جس راہ جس بستی سے بھی گزرا وہ شخص
زخمِ خوردہ جسم کے ہمراہ پروا ہی گئی

اہتمام و فقر رمزِ مشیت دیکھیے
جس نے جو چاہا وہی تحریر پرھوائی گئی

دیکھتے ہی دیکھتے سارے منظر کھڑے
نیند توئی، خواب بکھرے یا گریباں گئی

تنگ مجبور کیا کہ میں نے شاعری شروع کر دی
یہ غزل دیکھیے ”دیدہ خوش خواب“ سے

جب تری بادل و دیدہ میں درآتی ہے
رنگ تو رنگ ہے خوشبو بھی نظر آتی ہے

دردِ خود راہ بنا لیتا ہے جسم و جاں میں
روشنی بند و ریتوں سے بھی درآتی ہے

شاید اس راہ سے ملگو کوئی گزرا ہے ابھی
تیرگی رات کی غائت سی نظر آتی ہے

ضبط کی حد سے بزرگ رو کر بکھر جاؤ گے
پیاس کو ہونٹوں تک آنے دوا کرتی ہے

عروتی عجز یہ اک سجدہ دستار انا
دھوپ دیوار سے بھی اتر آتی ہے

قلب کے وزن و درازا ابھی وار کھنا
بے اثر ہو جو دھاوا ٹکے گمراہی ہے

رازِ صاحب نے سلسلہ مکمل جوڑتے ہوئے مزید کہا۔
”میں نے ان کے کہنے پر شاعری شروع کر دی
لیکن شاعری کو انتہائی سنجیدگی سے بھی نہیں لیا۔ اس
لیے کہ معاشرہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ عملی زندگی
میں شاعری کی حیثیت میں نے ثانوی رکھی۔ اور نگرہ حیات
میں سرگرداں رہا۔ لیکن یہ دیکھا جائے کہ میں نے شاعری
کے ساتھ فکری اعتبار سے غیر سنجیدہ رویہ رکھا۔ فکری اعتبار
سے شاعری پر میری توجہ رہی؟“

مجھ پر اور اتنا زور کی یہ غزل دیکھیے۔
کوئی اعصاب مل کر نہ کوئی اوسان لے جلے
مری ہر سانس مجھ سے ذات کا تاوان لے جلے

کھلا ہے در تو مجھ سارے در پہ بھی کئے رکھو
کہیں ایسا نہ ہو سارا مکان طوفان لے جلے

یہ میرا وصف کہ شعلہ بیانون میں رہ کر
ہنوز تیر میں حقاوں کی بات کرتا ہوں

ملاں، کرسٹ اہم، زخم، داح، اشک آپس
میں دشتِ ہماں کے غزاؤں کی بات کرتا ہوں

زباں شعرِ غزل میں، میں رازِ دنیا سے
بساطِ زیست کی پناہوں کی بات کرتا ہوں

”دیے ذہنی طور پر میں اپنے آپ کو رومانی پاتا
ہوں۔ زندگی کی تمام تر خوبصورتی، فطرت کی خوبصورتی
آج بھی اچھی لگتی ہے۔ میری ذات میں شروع سے
ایک جھجک سی رہی۔ حالانکہ میری زندگی آزاد گری۔
اس کے باوجود میں تے سگریٹ تنگ کو ہاتھ نہیں
لگایا۔ یہ بھی بات نہیں کہ میں گناہ و ثواب کا چکر
مجھے اچھا تا۔ لیکن اس کے باوجود میں جھجک میں ہی
گرفتار رہا۔ حالانکہ بہت سے چہرے اچھے بھی لگے۔
رومانوی مزاج کی حامل یہ غزل دیکھیے۔
خود و خال نگہ شوقِ نکھر جاتے ہیں
تم سنو رتے ہو تو آئینے سنو جاتے ہیں

خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے معموم لنگ
زندہ رہنے کی تمناؤں میں مرجاتے ہیں

اپنی آئینہ صفت آنکھ بچا کر رکھنا
چہرے آنکھوں کو بے عکس بھی کر جلتے ہیں

جمعیت زیست کے لمحوں کو کہاں تک کیجیے
غم سمٹتا ہے تو اعصاب بکھر جاتے ہیں

پیر ہیں زخم کا کچھ اور معطر ہو گا
پچھتے پھول سبر دامن تر جاتے ہیں

جب بکھرتی ہے ہواؤں میں سوچی خوشبو
کھر درے ہاتھ تو انانی سے بھر جاتے ہیں

راز وہ وقت بھی آتا ہے کبھی دل یکدھ
ایک پل میں کئی ادوار گزر جاتے ہیں

شعر کے موضوعات کے بارے میں رفیع الدین
راؤ صاحب نے کہا۔

”غیر محسوساتی بھی اور غیر شعوری طور پر بہت سی باتیں
انسان کے اندر اترتی جاتی ہیں۔ شاعر جو ہے اس
کو بیان کر دیتا ہے۔ دنیا کا ہر غصہ اگر چاہے تو
وہ خود کو دنیا سے چھپا سکتا ہے لیکن شاعر چاہتے
ہوئے بھی خود کو تو دنیا سے چھپا سکتا ہے اور نہ ہی
اپنے آپ سے۔ کیونکہ شاعری اندر کی سچائی کا نام
ہے۔ وہ جب بھی شعر کہے گا اس کے اندر کی صداقت
ظہور میں آ کر جلتی گی۔“

میرے یہاں زندگی کی جمالیات سے تعلق تو ملے
گا لیکن عشقہ جمالیات سے نہیں۔“

”آپ عشقہ جمالیات کو نہیں مانتے ہاں درمیان میں
میں نے سوال کیا۔“

”اصل میں جمالیات کو محدود کر دیا گیا ہے۔
علقہ عوام زلف و رخسار لگی و ملیں کو جمالیات سمجھتے

ہیں۔ جبکہ مجھے المانک شعروں میں بھی جمالیات کا
پرتو محسوس ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں زندگی کے تمام
حقائق جو دل پر دستکیں دیں وہ جمالیات ہے۔

انسانی زندگی سے مربوط، یعنی بھی سچائیاں ہیں۔ چاہے
اس کا تعلق خوشی سے ہو، غم سے ہو، تنہائی سے ہو یا
شیرینی سے ہو۔ وہ مجھ سے متاثر کرتی ہیں۔“

”رنگ حیات یہ رنگ ملاں اب بھی ہے
کسی کو بھولنا کا ریحال اب بھی ہے

رجلنے کب سے ہے محاذوں کا سحر و پیش
مگر یہ دل ہے کہ دریا مثال اب بھی ہے

نہا ہوا ہے تعلق رفیق دیرینہ
غم نفس کو ہمارا خیال اب بھی ہے

روشنے زخم سے کل بھی دیکھ رہا تھا بدن
نگار غار ہستی نہاں اب بھی ہے

دراز دوستی شام فراق سے کہہ دو
کو میری روح میں کیف وصال اب بھی ہے

ملا تو ہے وہ بظاہر تپاک سے لیکن
نگاہ کبھی ہے شیشے میں بال اب بھی ہے

زبان بریدوں کے جوہر تپا ہے میں راز
نگاہ و لب پر وہ حرف سوال اب بھی ہے

”آپ نے سینتالیس میں ہجرت کی اور پھر اکثریت میں
مزید ہجرت کی آپ نے ان تجربات کو کس حد تک
برتا؟“

جواب میں انہوں نے کہا۔

”میں نے ان تجربات کو برتاؤ دیا ہے لیکن اوڑھا
نہیں۔ زندگی کی اتنی شاخیں ہیں کہ سوچا جس کو بھی
برت سکیں تو بڑی بات ہے۔ اور ہجرت انسان کو
بہت توانا بناتی ہے۔ یہ انسان کو غیر معمولی چٹان بنا

دیتی ہے۔ ہجرت کرنے والا اپنی زمین سے رابطہ توڑ
رہا ہوتا ہے۔ وہ حوصلہ اسے ہجرت ہی عطا کرتی ہے۔
اسی حوصلے کی بدولت وہ دہکتی ہوئی آگ ہوتا ہے۔
اس سے اس کو جلا ملتی ہے۔“

”رہ گزار شوق میں کیا دشت و دریا دیکھنا
عشق کا احرام باندھا ہے تو پھر کیا دیکھنا

اس تماشا گاہ میں کیا کارہائے دھند و شب
یا تماشا بن کے رہنا یا تماشا دیکھنا

جلگئے تو دو شعور عاشقی کو روح میں
قطرہ خونِ تمنا کا تقاضا دیکھنا

کٹنا روشن کس قدر شفاف ہے اس کا وجود
مطل ہے یاد دہشی کا استعارہ دیکھنا

ماقا ہوں نلی، فزین، اسپ، سب نظروں میں ہیں
مات کا باعث دین جلتے پیادہ دیکھنا

راز شکل ہے بہت اس جگہ کا قیہ زم میں
سلاسل کے ساتھ رہنا خواب سادہ دیکھنا

”تو آپ رشتہ کیا ہیں؟“ سوال کیا تو وہ دھمک کر
مربوط سے سوال کیا انہوں نے وہ دھمک کر کہا۔

”قلنا نہیں۔ یوں تو ہر انسان تمام تر جست
کرنا چاہتا ہے۔ ذہنی طور پر بھی اور فکری طور پر بھی۔
اس کے ہر کونے میں دیکھنا۔ اور جن طیالات کو ذہن

کا حقد بنایا، جسے ہوس کے بعد اسے رد بھی کر دیا۔
یہ فکری ہجرت ہے۔ اور ایسا ہر شخص کرتا ہے۔“

ہر نفس حالت سفر میں ہوں
اور بظاہر میں اپنے گھر میں ہوں

عکس میرا بھی آئینے میں ہے
میں بھی اک چشمِ معتبر میں ہوں

گیلی مٹی کی طرح میں شاید
آج بھی دستِ گرزہ گریں ہوں

ایسا لگتا ہے جیسے مدت سے
زندگی میں تری نظر میں ہوں

دشت میں بورا ہوں شاخ گل
آج تک خواب کے اثر میں ہوں

پتھ لگتی ہے راز یہ وسعت
جانے کس زعمِ بال و پر میں ہوں

راز صاحب کی شاعری کی فضا تصوفانہ ہے لیکن
تصوف کے مضامین کے باوجود ان کے یہاں دنیا

سے ذاریت نہیں ہے۔ پڑمردگی اور افعالِ عالیہ
کی کیفیات کے بجائے خوش و ولولہ اور نشہ وصال

کی سرسستی ہے۔ یہ غزل دیکھیے۔
عجب سرور ہے طاری عجیب حال میں ہوں
خدا، ہجر ہے یا نشہ وصال میں ہوں!

مے نفس کی حرارت ہے وقت میں قیصال
میں حرف کن ہوں اور رفتارِ وصال میں ہوں

تو مجھ سے لاکھ چھپائے، مگر پتا ہے مجھے
میں کس کا نقش ہوں اور کس کے غم وصال میں ہوں

کہاں کی وسعت گردوں کہاں کے بال و پر
اسیر فکر ہوں اور آگہی کے جال میں ہوں

عزوب مہر کا منظر تو ایک دھوکا ہے
یہ کس نے کہا دیا میں حالت زوال میں ہوں

اسیر موسمِ صدر رنگ سے مرا پیکر
کہیں غرور کہیں اشکِ انفعال میں ہوں

شادی مبارک ہو

ڈاکٹر عبدالحمید خان

ڈاکٹر کبکشاں قاندر



شادی سنت رسول اور دینی فریضہ

ہے لیکن بیٹی والے خاص طور سے اکلوتی بیٹی کے والدین جس دل سے بیٹی کو رخصت کرتے ہیں یہ کوئی ان کے دل سے پوچھے اور شاید بیٹی کی ماںیں پوچھی جب پالنے میں ہو، اسی وقت سے اس کی خوش بختی اور دہن بننے کے خواب دیکھنے شروع کر دیتی ہیں۔

تو جناب ۱۴ فروری، ۱۹۹۲ کو ہم نے بھی اپنی دو بھائیوں کی اکلوتی، لاڈلی اور ناز و نعم میں پٹی بیٹی کو رخصت کیا۔ اتفاق سے ہم دو بہنیں اور دو بھائی ہیں لیکن میری باجی کی بھی ایک بیٹی ہے اور میری بھی۔ دونوں میں اس قدر محبت ہے

کہ سچی بہن کی کمی محسوس نہیں ہوتی پھر دونوں ہی ڈاکٹر۔ چنانچہ تقریبات جو پہلے ہی جاری تھیں۔ میری بھانجی ڈاکٹر افتخار پرویز اس کے چار بچوں اور شوہر بدر و اختر اعوان کے اسلام آباد سے کراچی آتے ہی عروج پر پہنچ گئیں۔

رسم مایوں، افروزی کو گھر ہی پر تھی۔ اور اسی دن کو مل کی عزیز دوست ٹواکٹر ناویہ لاہور سے شریعت لے آئیں۔ دونوں ہی نے ڈاکٹر کو مل سے گزشتہ سال ایم بی بی ایس کیا تھا کو مل، کبکشاں کا پیار کا نام ہے، ڈاکٹر افتخار، عجنہ بن، ناجیہ، ناویہ، ماجرہ، کو مل کے دونوں بھائی گزرتا اور بھائیاں، کو مل کو تاروں بھرے

دوپٹے کے سائے میں ہال میں لائیں اور سچی ہوئی مسند پر بٹھایا جو میں نے خاص طور پر اپنی بیٹی کے لیے بنجائی تھی۔ ہر طرف سیلے کپڑوں کی بہار تھی۔ قرآن خوانی اور میلاد کی فضیلت پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اس لیے لڑکیوں نے خوب ہی ملق بھلائے اور زبردست ڈانس کیا اور اسی مایوں کی رسم کے دوران میں بھری آنکھوں اور ہنسنے ہوئے دل سے اپنی معصوم اور خوبصورت بیٹی کے سنہرے اور تابناک مستقبل کی دعا میں مانگتی رہی رسم مایوں کے بعد لان میں کھانا کھایا گیا۔

۱۴ فروری کو ایر وکلب کے ٹینس کورٹ میں ہندی مٹی اور ٹینس کورٹ کا سبز قالین اور اسٹیل جنبل کے بیک گراؤنڈ میں موسیقی بھی نہ رہی تھی عجب بہارے راجھا۔ رنگ برنگے کپڑے اور شادیوں بہار ماحول کو رومان پرور بنا رہی تھی۔ دہن کے آبا جو گورنمنٹ آف سندھ کے ایک اعلیٰ افسر ہیں ہندی کے انتظار میں بے چینی سے بٹھ رہے تھے۔



بالکل ٹھیک وقت پر ڈاکٹر کبکشاں کی ہندی بھر پور گانوں اور دولہا کے بھائیوں کے بہنکڑے کے ساتھ جو میدان میں آری تو لطف آ گیا گلاب کے پھولوں کا بھر پور استعمال کیا گیا۔ دولہا ڈاکٹر عبدالحمید خان عرف گلشنی جو گلہ میں چھوٹے اور لاٹے ہیں کسی، میر سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ دونوں طرف سے بھر پور گانوں کا مقابلہ ہوا پھر خوش میں دولہا کے بہنوئی جو بی وی آر اسٹریٹ بھی ہیں اور کونزے کے بیچ پر چڑھ کر ڈانس کیا اور مقابلے پر میرا بھانجا ڈاکٹر شمس الزماں اور افتخار کی آواز ساہ بیٹی ریمانے ڈانس کر کے دولہا والوں کے چھکے چھڑا دیے۔ ریماکا ڈانس ہر شخص نے سانس روک کر دیکھا کہ وہ ہے ہی اتنی پیاری ہے اس کو میرے اصرار پر بڑی خشکوں سے اجازت ملی مٹی پھر پہلے میری بیٹی کی ہندی کی رسم سسرال والوں نے کی اور پھر دولہا کی شامت آئی۔ اور افتخار نے ہندی نگار زبردست ننگ و سونل کیا۔ ناویہ نے بنگنا ہاندا شاید پنجابی میں ہے

گناہتے ہیں، پھر کھانا ہوا۔
۱۴ فروری بروز جمعہ دولہا کی خواہش پر مسجد میں نکاح ہوا اور ماں ہونے کی حیثیت سے جو قیامت میرے دل پر گزری وہ صفحہ قرطاس پر بکھرنے سے قاصر ہوں۔
۱۵ فروری کی رات کے ڈیڑے لان کو کینڈلنگ والوں نے اتنی خوبصورتی سے سجایا تھا کہ لگتا تھا کہکشاں زمین پر اتر آئی۔ تازہ پھولوں سے سجایا بیچ اور درمیان میں پھولوں سے سجی بڑی سی توپ سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ آداری سے جب میری بیٹی شاہن کے ہاتھوں آف وائٹ اور میرون راجستانی۔ سوٹ میں دلہن بن کر آئی تو

اردو اور انگریزی ادب کا بہترین انتخاب

عمران ڈائجسٹ

جنوری کا خاص نمبر شائع ہو گیا ہے

بہترین ادب۔ ۲۰ کہانیاں
ان کہانیوں کے مصنفین کا نام بت کر
روپے کے نقد انعامات جیتیں،
جواریے عالمی شہرت یافتہ ادیب نعتگر
اور ناول نگار دوستوفسکی کے معروف ناول کی نقل تھیں

۱۴ طویل و طویل تر مختصر ڈراما کہانیاں
ایک ڈیجیٹل سنسنی خیز سلسلہ وار کہانی
اور ایک مکمل ناول

نئے سال کا خصوصی شمارہ آج ہی خرید لیں

آسمان سے اتری تھوڑی گلی دہری مٹی چونک دو لہا
والوں کو پابندی وقت کی تاکید کی گئی تھی کہ اندرون
سندھ سے بھی وہاں متوقع تھے اس لیے چھینک
ساڑھے نو بجے جب رات کے ڈیڑے لان پہنچی
تو ہمان حیران اور میرے میاں خوش ہو گئے۔
آف وائٹ شہروانی اور میرون صلفے میں دولہا
نظر نیچے کی حد تک خوبصورت لگ رہا تھا۔ چاند
سورج کی جوڑی محاورتا نہیں بلکہ حقیقتاً اسٹیج
پر براجمان تھی چونکہ نکاح ہو چکا تھا اس لیے
فوراً ہی کھانا لگ گیا۔ (اس وقت کھانے پر پابندی
نہیں تھی، کھانے کے بعد پھول پہنائی، اسلامی

اور فوٹو اور ویڈیو سیشن ہوا اور تقریباً رات
کے ساڑھے گیارہ بجے ماں باپ، خالہ خالو، ماموں
عمانی، بھائیوں، کزنز، بھائیوں، دوستوں اور
بے شمار ہسٹیلوں کی دعاؤں اور قرآن پاک کے
ساتھ تینے جب کومل رخصت ہوئی تو سب کی
آنکھیں نمناک تھیں۔ باپ، ماموں اور خالو نے
جب گاڑی میں بٹھایا تو رکاشی نے کلیجہ فوج
کر پھینک دیا۔

۱۶ فروری کو علیگ لان میں ولیمہ تھا۔ اس
مرتبہ دولہا والوں کی طرف سے زبردست پذیرائی
ملی۔ آج دولہا دلہن کے چہرے پر اس قدر نکھار
اور طراوت تھی کہ نگاہیں سمیٹنے کو تیار نہیں تھیں
اکثر ہمان حیران ہو کر پوچھ رہے تھے کہ کیا
یہ دونوں میڈیکل سکول کر چکے ہیں کہ دونوں ہی
بہت چھوٹے لگ رہے تھے۔ دولہا کی والدہ
جو بے حد غصیل اور دوست پرور خاتون ہیں اور
دولہا کے بھائی، بہنوئی اور ہمیش اس طرح ہر لوگوں
کی خاطر کر رہے تھے کہ شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا
تقریباً رات بارہ بجے یہ آخری تقریب بھی اختتام
پزیر ہوئی۔ میری بیٹی کی شادی کی تقریب اس قدر
باقادر منظم اور خوبصورت تھی کہ مدتوں یاد رہے گی
خدا کرے کہ اس کی خوشیوں کو کسی کی نظر نہ
سکے اور دونوں میاں بیوی ہمیشہ خوش و غرم رہیں

مشہور کرکٹ

اظہر الدین اور سنگیتا بھادانی سے ملاقات

شہنشاہ نوگس



نہیں ہو سکا۔ ایک اور ملاقات کے دوران کیے گئے
سوالات کے جوابات کو بھی کیا گیا۔ اظہر الدین نے
سنگیتا بھادانی کو صحافیوں سے کافی ڈور دکھا۔ وہ سنگیتا
کو صحافیوں کے سوالات سے بچانے کے لیے تمام
وقت ڈھال بنے رہے۔ جب بھی کوئی صحافی اگے بڑھ
کر کوئی سوال کرتا جواب میں اظہر الدین ٹال دیتے کہ
یہ سوال کرنے کا کوئی وقت نہیں ہے اور اس کے بعد وہ
اپنی بیوی کو صحافیوں سے لے کر دوڑ پھلے جلتے۔ اس
دوران انہوں نے ایک صحافی کا ہاتھ بھی جھٹکا اور
غصے سے سنگیتا کو لے کر دوسری طرف چلے گئے۔ بعد ازاں
اس عشاءے میں چند صحافیوں کو سنگیتا سے بات چیت
کرنے کا موقع مل گیا۔ گفتگو کے دوران اچانک اظہر الدین
کی آمد پر گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اظہر الدین اپنی

اظہر الدین اور سنگیتا بھادانی کی لاہور
آمد پر حسب میں نے ایک مقامی ہوٹل میں ان سے
دو روزہ ملاقات کی۔ اظہر الدین نے انٹرویو دینے سے صاف
انکار کر دیا بلکہ سنگیتا نے بھی نہیں کہا کہ وہ بھی
دو روزہ ملاقات کے لیے لاہور آئے ہیں۔ پھر انہوں
نے اپنی فلموں کے حوالے سے مختصر بات کی۔ یہاں
کے فلم حزیاری اور پسند ناپسند کے بارے میں بتایا۔
ابتداء میں دونوں اس بات پر ڈٹے رہے کہ وہ کسی
صحافی سے بات نہیں کریں گے لیکن بعد ازاں فون پر
ہوٹل میں اور پاکستان بھارت کی کرکٹ میچوں کو
دیکھنے گئے ایک عشاءے میں انہوں نے نہایت مختار
گفتگو کی۔ اس لحاظ سے باقاعدہ انٹرویو کسی کے ساتھ

بیوی کا ہاتھ پکڑ کر کم ان کم ان سگیتا کہتے ہوئے اسے ہوش کی لٹ میں لے گئے۔ یوں صحافیوں نے جب بھی سگیتا کو تنہا دیکھا بات چیت کی اور یہ سگیتا کی اعلاظی سے کہ اس نے اپنے شوہر کے حمل کے باوجود روایتی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور صحافیوں کے سوالات کے جوابات دیے۔

اظہر الدین اور سگیتا، بجلانی کی پاکستان آمد میں ایک روزہ کرکٹ میچوں کے سلسلے میں تھی۔ کرکٹ میچوں کی سیریز کا پہلا میچ انٹیمس ٹیمبر کو جیڈر اکاؤنٹس کھیل گیا جس میں پاکستان نے پانچ وکٹوں سے فتح حاصل کی۔

دونوں ٹیموں کے درمیان سیریز کا دوسرا میچ تیس ستمبر کو کراچی میں ہوا جس میں بھارت نے چار وکٹوں سے کامیابی حاصل کر کے سیریز ایک ایک سے برابر کر دی۔ تیسرا میچ لاہور کے تذا فی اسٹیڈیم میں ہوا۔ یہاں ایک مقامی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے ٹنڈوکر نے پاکستان کو ہوم گراؤنڈ پر برتری کی خواہش کا اظہار کیا۔ پاکستان اور بھارت کی ٹیموں کی لاہور ایر پور پر پریسنگ اکتوبر کو دوسرے ٹیڈ ٹیڈ آمد ہوئی۔ بھارتی ٹیم کو لاؤنڈ سے دو دنے سامان کے ساتھ پولیس کمانڈوز کے تحت پہرے میں ہوش رواں کیا گیا۔ سگیتا کے علاوہ دوسری شاستری اور سینیل گواسکر کی بیگمات بھی ہمراہ تھیں۔ سینیل گواسکر کی بیوی نے چوٹی پر باجرام جیکر دوسری شاستری کی بیوی نے پتلون خرٹ پہن رکھی تھی۔

اظہر الدین نے بھارت کے سابق کپتان بھی ہیں بہت محتاط رویہ رکھا۔ انہوں نے کسی سے بات نہیں کی۔ صرف اتنا کہا کہ انہوں نے ویسٹ انڈیز کے سوا ساری دنیا میں رنز بنائے ہیں۔ ایک بھارتی اخبار میں شائع ہونے والے ایک انٹرویو کے مطابق بھارت کی کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان اور کامیاب بیٹس مین اظہر الدین نے کہلے کہ یہ تجزیہ حقائق کے مطابق نہیں کہ کپتانی چھوڑ دینے کے بعد ان کے فن میں نکھار آگیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ ریکارڈ چمک کریں

تو انڈازہ لگا سکتے ہیں کہ جب میں کپتان تھا تو میں نے زیادہ رنز بنائے۔ انہوں نے کہا کہ اسٹارٹ چھ تیز گیندوں کو نہ کھیل سکے کے الزام میں بھی کوئی صداقت نہیں۔ میں نے ویسٹ انڈیز کو چھوڑ کر ہرگز رنز بنائے ہیں۔ میں نے ویسٹ انڈیز اور آسٹریلیا کے خلاف بھی اسکر کیا ہے۔ کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ وہ ویسٹ انڈیز کے فاسٹ بالرز سے کم تر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں فاسٹ بالرز کو نہ کھیل سکتا تو پچودہ سال پہلے وکٹ پر جا رہا ہوتا۔ ایک سوال کے جواب میں اظہر الدین نے کہا کہ اپنے کیریئر کے شروع میں میں نہیں اور کم کر لیا کرتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ محفوظ شارٹ نہیں اس لیے فیصلہ کر لیا کہ ایسی گیندوں کو سامنے دیا کر کھیلنا چاہیے۔ تو ہر طرح سے ٹھیک رہا۔ ایک سوال کے جواب میں اظہر الدین نے کہا کہ میں نے اپنی ٹیکنیک کو دوبارہ ایڈجسٹ کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ اگر میں اپنا اسٹائل تبدیل کرتا ہوں تو اظہر الدین نہیں رہوں گا۔

اکثر بتایا کہ میں نے خود کو فٹ رکھنے کے لیے مسلسل محنت کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ انٹرنیشنل کیریئر بڑھا سکوں جو چار پانچ سال میرے کیریئر کے نچے ہیں ان میں اپنی کرکٹ کھیلنا چاہتا ہوں۔ بس یہی میری خواہش ہے۔ انٹیمس ٹیمرباں بنا چکا ہوں لیکن اس حوالے سے کوئی خواہش نہیں کیونکہ میں ریکارڈوں کے لیے نہیں کھیتا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے امید نہیں کہ کرکٹ چھوڑنے کے بعد لوگ مجھے کوچ بنانا چاہیں گے۔

اظہر خوش لباس ہیں۔ انہیں اچھے لباس پہننے کا شوق ہے اور وہ ہمیشہ ہینڈ ڈریس میں رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لاہور قیام کے دوران بھی انہوں نے خوش لباس کا بہترین مظاہرہ کیا۔ اظہر نے چند ماہ پیشتر اپنی پہلی بیوی نورین کو طلاق دے دی جس کے بطن سے دو بچے ہیں۔ نورین کو ضرورت لڑکی ہے اور جب اظہر سے اس کی شادی ہوئی تھی وہ کم سن بھی تھی مگر اظہر سگیتا کے عشق میں مبتلا ہو گیا جو بھارتی

ظہر اسٹار سلمان خان کے ساتھ منسوب تھی۔ انڈین اخبارات رسائل و جرائد میں اس جوڑی کی رومانوی داستانوں کے بہت قفے شائع ہوئے۔ بعد ازاں سلمان خان کی بے وفائی اور بھارتی فلم انڈیا میں صوفی علی کے ساتھ دوستی نے اس سنگنی کو توڑ دیا۔ سگیتا پر سلمان کی بے وفائی کا بہت گہرا اثر ہوا اور اس نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ سلمان ادھر ادھر کی دوستیوں کے باوجود سگیتا سے دور رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے وہ باہر اور اس کے گھر کے اندر کئی ہنگامے کرتا رہا۔ سگیتا پر اس کے ہنگاموں اور دوبارہ محبت کی یقین دہانی کافی برابر اثر نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ خود بھی سلمان کی محبت میں بڑی طرح گرفتار تھی۔ سلمان خان کی فلم انڈیا میں آمد سے پہلے یہ بیرواس لڑکی کے مطلق میں گرفتار تھا۔ سلمان خود اپنے ایک انٹرویو میں اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ سگیتا (سلمان) کے اسکول لیٹ پر گھنٹوں کھڑا اس کی ایک بیلک دیکھنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ پھر دونوں کی سنگنی ہو گئی۔ سلمان کے والد قلم رائٹر سلیم ہیں جو بھارتی رقاصہ میلن کے خاوند بھی ہیں۔ سلمان اپنے والد کی پہلی بیوی سے ہیں۔ اس لحاظ سے میلن ان کی حوتی والدہ ہیں۔ سلیم خان نے اسے فلموں میں متعارف کروایا۔

اظہر الدین سگیتا کا خاموش بھاری عقلا اس نے کئی بار سگیتا سے اپنی خاموش محبت کا اظہار کیا مگر اس وقت تک سگیتا کے دل میں اظہر کے لیے کوئی جگہ پیدا نہ ہو سکی۔

لیکن اگر ان کے درمیان کرکٹ کے میدان میں اظہر اپنے وقت کے کمالات دھماکے کے بعد بھارتی کرکٹ ٹیم کے کپتان بن چکے تھے۔ سلمان خان کی بے وفائی نے ایک نیا موڈ لیا جس میں ہرگز کے روار میں سلمان کی جگہ اظہر الدین نے لے لی۔ سگیتا کو احساس تھا کہ اظہر اس کا پیرا نا بیٹل ہے۔ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے اس نے اظہر کو اپنے قریب لانے کی شہ پش کی کہ وہ اپنی پہلی بیوی نورین کو طلاق دے۔ اظہر مان گیا اس شہ کے بعد انہوں نے شادی کر لی۔ سگیتا



بجلانی اگرچہ ناکام اداکار ہے لیکن اس کی وجہ شہرت بھارت اور پاکستان میں اس کے اسکیڈ لڑائی رہے ہیں۔ سگیتا نے اپنے کیریئر میں جو کامیاں حاصل کیں اس میں پہلی کامیابی ان کا مس انڈیا کا تاج پہن کر شو پر ہیں آنا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں سگیتا نے بتایا کہ میں بس انڈیا رہی ہوں۔ مس انڈیا کے بعد مختلف وجوہ کی بنا پر مس ایشیا اور مس ورلڈ کے مقابلوں میں حصہ نہ لے سکی۔ فلموں میں کام کرنے کے بعد میں ان مقابلوں کے لیے مناسب تیاری بھی نہ کر پائی۔ اگر میں فلموں میں کام شروع نہ کرتی تو شاید میں مس ورلڈ کے مقابلے میں حصہ لیتی اور اس اعزاز کو حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتی۔

سگیتا نے ان گنت فلمیں کیں لیکن دونوں خرم اور تری دیوی ان کی وجہ شہرت بن سکی تری دیو میں ان کے ساتھ سونم اور مادھوری دلشٹ بھی

سنگیت کی تیسری کامیابی یہ تھی کہ سلمان کو چھوڑ کر اس نے اظہر الدین سے شادی کر لی۔ سلمان شاید اس کے ساتھ اپنی وفادار کیا تا جس قدر اظہر نے کی۔ اس نے تو سنگیت کی خاطر اپنی بیوی اور مصنوم بچوں تک کو چھوڑ دیا۔ محبت ہو تو ایسی بھی اور کھری ہو۔ بس یہی وجہ تھی اظہر کی سنگیت کو صحابیوں سے دور رکھنے کی۔ وہ لاہور دوسرے کے دوران اس حوالے سے زیادہ پریشان رہے کہ صحابی ان دونوں سے کوئی نئی سوال نہ پوچھ لیں جو ان کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول دے۔ لاہور کے ایک فاضل خواستار ہوٹل میں جہاں دونوں تھے قیام کیے ہوئے تھے وہاں ایک جنگ کی طرف سے دیے گئے عثمانیہ میں سنگیتا سرخ ساڑھی میں ملبوس جب ہال میں آئیں تو ایک صحافی نے کہا: آپ پریس سے پہلے کیوں رہی ہیں؟ اس پر اظہر نے صحافی کا ہاتھ جھٹک دیا اور غصے میں کہا: یہ وقت سوالوں کے لیے نہیں ہے۔ اس عثمانیہ میں ایک مقامی اخبار کے فوٹو گرافر نے اظہر الدین پر براہ راست حملہ کیا۔

”جناب آپ نے پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کیوں کر کی؟“

یہ سنتے ہی وہاں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سنگیتا نے فوراً اپنا رخ موڑ لیا جیسے کچر سنا نہ ہو۔ جبکہ

اظہر الدین نے جواب میں یہ کہا: کیا پہلی شادی کے بعد دوسری شادی نہیں ہو سکتی؟ مشہور لوگوں کی زندگیوں میں اس قسم کے سوالات سے جہنم بنتی ہیں۔ حالانکہ عام لوگوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے۔ اس موقع پر ایک صحافی نے سنگیتا سے براہ

راست سوال کیا۔

س: آپ کی وجہ سے اظہر الدین سے کپتانی چھین گئی کیا آپ جانتی ہیں؟

ج: ہرگز نہیں! سنگیتا نے تھلا کر جواب دیا: کوئی کسی کے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا فیصلہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اظہر سے پہلے بھی

بھاری بھرے تمہیں کپتان بدلے گئے ہیں کیا وہ مادھوری اور سری دیوی کی وجہ سے بدلے گئے تھے۔ بھلا اظہر میری وجہ سے بدلے جاتے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم دونوں نے کبھی ان فضول باتوں پر توجہ نہیں دی۔

س: کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اظہر نے آپ کے فلموں میں کام کرنے پر پابندی لگا دی تھی؟

ج: جی نہیں۔ اظہر روشن خیال اور محبت کرنے والا شخص ہے۔ اس نے کبھی مجھ پر کوئی پابندی عاید نہیں کی۔ اگر اظہر فلموں میں کام کرنے پر پابندی لگاتے تو میں فی وی سیریل چاندنی میں کام کرنے کی کبھی ہامی نہ بھرتی، لہذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اظہر نے میرے فلموں میں کام کرنے پر پابندی لگا دی ہے۔ اظہر فن اور فنکار شخصیت کے مالک ہیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے مزاج کی پسند ناپسند اور

دعوتوں کو دیکھتے اور دیکھتے کے بعد نو فیرج کی ہے۔ انہوں نے شادی سے پہلے اور بعد میں بھی مجھ پر کوئی حکم فطرت کے گوشش نہیں کی۔ میں جب جا ہوں فلموں میں کام کر سکتی ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہماری شادی کو ابھی عقوناز احمد ہوا ہے۔ ہم نے اپنے لیے ایک الگ گھر بنایا ہے۔ اسے بنانے اور

سوارنے کی ذمہ داری مجھے اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال شوہر کی مصروفیات کو ترک کر دوں۔ آرٹسٹ کبھی اپنے فن سے علیحدہ نہیں رہ سکتا ہے۔ اداکاری یا حقوق ہے اور میں اپنے شوق کو کبھی ترک نہیں کر سکتی ہوں۔ گھر سینٹ ہو جانے اور کوئی مناسب آخر طے کی تو ضرور کام کروں گی۔

س: اظہر کے ساتھ شادی کیسا تجربہ رہا؟

ج: اظہر کے ساتھ شادی کامیاب تجربہ ہے میں سمجھتی ہوں اس شخص نے میرے لیے بہت

قربانیاں دیں۔ وہ میرے ساتھ ہمیشہ غفلت رہے۔ میری بھی خواہش ہے کہ ان کے ساتھ ویسا ہی رویہ اختیار کروں۔ میری کوشش ہوگی کہ کبھی انہیں میری طرف سے کوئی شکایت نہ ہو اور میں انہیں خوش رکھ سکوں۔

س: جب آپ فلموں میں آئیں تو آپ کو شوہر میں کس طرح پرہیزگار کرنے کی بہت پیشکش ہوئی اور آپ کو ایسے سین کرنے کے لیے کہا گیا جن میں لمبائی اور عریانی زیادہ تھی؟

ج: اس میں شک نہیں کہ میں نے جب فلمی دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت نئے رجحانات جنمے رہے تھے۔ ان رجحانات میں عریانی اور عریانی کارخان بھی تھا لیکن میں عریانیٹ اور عریانیٹ کی کمال نہیں۔ میں ذاتی طور پر آزاد خیال مفرد ہوں۔ میں آرٹ کے آزادانہ اظہار کی حامل ہوں۔ پرہیز اور فن کے آزادانہ اظہار میں فرق ہوتا ہے۔ میں نے اگر بعض فلموں میں اداکاری کا پہل انداز اختیار کیا تھا تو وہ اپنے کردار کو برقرار کرنے کے لیے کیا تھا۔ وہ کردار کی ڈیمانڈ یا ضرورت ہو سکتا ہے۔ ذاتی زندگی میں میرے انداز اور رویے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مجھ میں معرقت نہیں ہے۔ میں ہمیشہ سادہ اور ایسے لباس استعمال کرتی ہوں جو مجھ پر انداز سے جسم کو نمائش سے روکتے ہیں یہ شخص ڈپلومیسی نہیں۔ بھارت میں بھی میری

عام زندگی کا اسٹائل اسی نوعیت کا ہے۔

س: آپ نے اب تک جتنی فلموں میں کام کیا ان میں زیادہ فلمیں ناکامی سے دوچار ہوئیں حالانکہ آپ کا تعلق زینت امان اسکول آف تھٹا سے رہا ہے اس کے باوجود آپ شہزادہ اعظمی اور سیتا پائل جیسی شہرت حاصل نہ کر سکیں اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج: میں نے اب تک جتنی فلموں میں کام کیا ہے اگرچہ ان میں سے بیشتر فلموں کو توجہ کے مطابق

پریس نہیں مل سکا لیکن ان فلموں میں میرے کام کو ناپسند نہیں کیا گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے ایک کے بعد دوسری فلم میں کام کرنے کی پیشکش بھی نہ ملتی۔ اداکار کے غلاب ہونے کی بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ اسے فلموں میں کام ملتا بند ہو جاتا ہے لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا میں نے ان گنت فلموں میں کام کیا اور ان فلموں میں مقوری سی کامیاب فلمیں بھی میرے کریڈٹ میں جاتی ہیں مثلاً سری ڈیو اور جرم اور بڑے آرٹسٹوں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے۔ ایک فلم کی ناکامی میرا سنا کر کوئی ناکام فنکاروں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کسی فلم کے غلاب ہونے میں آرٹسٹ کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا دوسرے بہت سے عوامل فلم کی ناکامی کا باعث بنتے ہیں۔

س: یہاں قیام کے دوران آپ کی ملاقات کن فنکاروں سے ہوئی؟

ج: میں یہاں اپنے شوہر اظہر الدین کی وجہ سے کرکٹ ٹیم کے ساتھ ہی آئی ہوں۔ یہ میرا بالکل نجی دورہ تھا اس لیے کہیں آجا نہیں سکی۔ صرف لاہور میں مقوری سی شائنگ کی کسی فنکار سے ملی۔ اسٹوڈیو جا کر پاکستانی فنکار کا اتفاق ہوا ایک ڈیز میں نیلی جی سے ملاقات ہوئی تھی وہ بہت سویت ہیں۔ میری خواہش تھی کہ سب سے ملتی لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے مجبور تھی۔ میں چاہتی ہوں دونوں فلموں کے فنکاروں کا ایک دوسرے



سے ملنا چاہیے۔ آرٹسٹوں کے میل ملاقات سے دوستی بڑھتی ہے۔ جس طرح پاکستان اور بھارتی کرکٹ ٹیم کے درمیان دوستی ہے۔ بظاہر کھیل کے میدان میں وہ ایک دوسرے کے متبادل ہوتے ہیں لیکن بنی محفلوں میں ان کے درمیان دوستی اور بے تکلفی وید کے قابل ہوتی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے فنکاروں کو بھی کرکٹ کی طرح ایسے مواقع ملتے چاہئیں کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آئیں۔

س۔ آپ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ بھارتی فلمی صنعت عروج پر ہے اور وہاں فنکاروں کو برابر کام کرنے کے مواقع میسر آتے رہتے ہیں؟
ج۔ جی ہاں بھارت میں فلمی صنعت کافی عروج پر ہے۔ وہاں بڑی بڑی فلمیں بن رہی ہیں، عوام میں فلم یعنی کارٹون بہت زیادہ پسند کیے جاتے آرٹسٹوں کو فلموں میں کام کرنے کے مواقع بھی میسر آتے رہتے ہیں۔

س۔ آپ کو فلموں میں کام کرنے کے لیے کافی پاپر ملتے پڑے ہوں گے؟
ج۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میں انڈیا مقرب ہونے کے فوری بعد مجھے بڑی بڑی پیشوں کے مشعل کے لیے سائن کیا۔ اسی دوران مجھے فلموں میں کام کرنے کی۔ پیشکش ہوئی۔ اس لیے فلموں میں آنے کے لیے مجھے کسی بڑی سفارش یا ٹانگہ نہ نہیں کرنی پڑی۔

س۔ بہت لوگوں نے کہا آپ اسکینڈلز پر یقین رکھتی ہیں؟

ج۔ میں نے کبھی لوگوں کے کہنے کی پروا نہیں کی۔ میں تو میڈیا کی بھی پروا نہیں کرتی ہوں۔ جو فنکاروں پر بعض اوقات غلط الزام تراشی کرتا رہتا ہے۔ ویسے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ اس قسم کا کوئی بھی سوال مجھ سے نہیں کریں گی۔ (شاید اس نے مزید بات نہ کرنے کی وارننگ دی۔)

س۔ آپ وفاداری کو کیا اہمیت دیتی ہیں؟ آپ کی اظہر کے ساتھ سخت اور شادی اور ملاقاتوں

کا سلسلہ کب سے تھا؟

ج۔ میں سمجھتی ہوں مخلص انسان کے ساتھ میں بھی وفادار رہنا چاہیے۔ یہ صحیح طریقے سے زندگی گزارنے کا تقاضا بھی ہے کہ ہم وفادارنے والوں کے ساتھ مخلص رہیں۔ اظہر نے میرے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ ان کے اعتماد پر پوری اتروں اور کبھی ان کی دل آزاری نہ کروں۔ ہر قسم کی پریشانیوں کو خیر آباد کہہ دینا خوشی کی کیفیت کا دوسرا نام ہے۔ میرے لیے تو یہ بھی خوشی ہے کہ میں اب شادی شدہ ہوں اور اپنے شوہر کے ساتھ خوشی خوشی زندگی گزار رہی ہوں۔ ہماری شادی کو اگرچہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر ملاقاتوں کا سلسلہ کافی پرانا ہے۔ وہ نسیانی طور پر میرے بہت قریب رہا ہے۔

س۔ اظہر کے بارے میں آپ کیا کہیں گی کیسا شوہر ہے؟

ج۔ بہت مضبوط اعصاب والا ہے اس کی باتوں میں زندگی اور سچائی ہے اس کی آنکھوں میں اقلو کی چمک ہے۔ اس کی موجودگی کو واضح طور پر محسوس کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا ہے۔ اسے مجھ پر غریبہ محبت کرتے والا شوہر ہے۔ کھر پر توجہ دیتا ہے، مجھے بھی اس پر غریبہ۔

س۔ آپ کو یقین ہے کہ آپ کی شادی طویل عرصے تک برقرار رہے گی؟

ج۔ جی ہاں مجھے یقین ہے کہ ہماری شادی ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اس شادی کو برقرار رکھنے کے لیے دونوں فریق اپنا کردار بخوبی سمجھا رہے ہیں۔ مجھے چاہیے اس کے لیے ہمیں بہت طویل فاصلے عبور کرنا پڑیں گے مگر ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ ہمیں بہت سے معاملات ایڈجسٹ کرنا پڑیں گے۔ ہمیں اپنے بہت سے معاملات پر یاد و محبت سے طے کرنا ہوں گے۔ کون سے میاں بیوی ہیں جن کے درمیان اختلاف نہیں ہوتے مگر مشہور شخصیات کی ذرا سی بات بھی چھاپ دی جاتی ہے جس سے ان کے درمیان

مزید اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ میری تربیت اس وقت تک سے ہوئی ہے کہ میں کبھی اپنے سے باہر نہیں ہوتی۔ مجھے بہت کم غصہ آتا ہے۔ عام طور پر میں خود کو کنٹرول میں رکھتی ہوں۔ اگر چھوٹی موٹی کوئی بات ہو تو میں اسے گھونٹ کر گزر کرتی ہوں۔ یہی ماد میں اظہر میں بھی موجود ہیں اس لیے زندگی کی گاڑی ہمیشہ خوشی رواں دواں ہے۔ میاں بیوی اگر دگر دگر کرنے کی عادت ڈالیں تو ازدواجی زندگی میں پریشانیوں پیدا نہیں ہوتی ہیں۔

س۔ آپ نے سچی اور پہلی محبت کس سے کی؟
ج۔ ذاتی سوال ہے اور اس کی میں اجازت نہیں دے سکتی ہوں۔

س۔ آپ نے دی دہلی پر ایک سیریل کر رہی ہیں "چاندنی" اس کا سانس کیا میل رہا ہے؟

ج۔ بہت اچھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میٹا لائٹ کی وجہ سے دی کی میڈیا باب فلم سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کا ایک شوٹ یہ ہے کہ پاکستان میں خیر قیام کے دوران کراچی سے لاہور تک جن خواتین سے میری ملاقات ہوئی انہوں نے میری فلموں کے حوالے سے تو بہت کم بات کی ہے لیکن ڈراما سیریل "چاندنی" کے سلسلے میں بہت سی باتیں کیں۔ اب میں فلموں میں کام کرنے کے بعد بھی فی وی پر بدستور کام کرتی رہوں گی۔

س۔ چاندنی کی کامیابی کی وجہ آپ کی نظر میں کیا ہو سکتی ہے؟

ج۔ اگر کسی سیریل کی کہانی جاندار ہو اور اسکرین پر مصنف کی گرفت مضبوط ہو تو کوئی دھچ نہیں ہے کہ سیریل کامیابی سے ہمکنار نہ ہو۔ ناظرین اس سیریل کو دیکھ رہے ہیں۔ اور پسند کر رہے ہیں۔ یہی اس کی کامیابی کی بڑی وجہ ہے۔ میرے خیال میں یہ سیریل ہر لحاظ سے مکمل ہے۔

س۔ فلمیں کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟
ج۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اداکارا میں فیشن

پر مست ہوتی ہیں حالانکہ اس کے برعکس ان کا فیشن تو صرف اسکرین تک محدود ہوتا ہے۔ اسکرین پر نہیں کردار کی خصوصیات کے مطابق رہنا پڑتا ہے۔ جہاں تک ہماری عام زندگی کا تعلق ہے اس میں ہم سادگی سے رہتے ہیں البتہ کسی تقریب وغیرہ میں جاتے کے لیے حاجی سافیشن اور بناؤ سٹائلز ضرور کرنا پڑتا ہے۔

س۔ آپ کی نظر میں ایک اچھا فنکار کون ہوتا ہے؟
ج۔ جو اپنے کردار کے ساتھ انصاف کرے اور اپنی ذات کی نفی کرے۔

س۔ اظہر الدین کسی سے آپ کو ملنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟

ج۔ اگرچہ سچ ہے تو پھر میں آپ لوگوں سے بات کیوں کرتی۔

س۔ دیکھیں جب بھی آپ سے کوئی بات کرنا ہے تو وہ رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ کیا وہ آپ کی شہرت سے خائف ہیں؟

ج۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ بات بہت نہیں کہتے کہ بڑے عرصے کے گھارٹے لگتے ہیں۔ ذاتی زندگی پر منفی رویے ایسی ایسی باتیں سامنے لاتے ہیں جو قابل اعتراض ہیں۔ اظہر میری شہرت سے خائف کیوں ہوں گے۔ وہ خود شہرت رکھتے ہیں اور شادی سے پہلے وہ میرے بارے میں جانتے تھے کہ میں کیا ہوں۔

س۔ سچی زندگی میں وہ آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟
ج۔ میں اظہر الدین کے لیے لگی ہوں وہ مجھے لکھتی سمجھتا ہے۔

س۔ آپ کو فلموں سے سری دیوی اور مادھوری نے آؤٹ کیا؟

ج۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ مجھے فلموں میں مادھوری اور سری دیوی نے کامیاب نہیں ہوئے۔ وہاں میں نے بھی سراسر مارنے سے بچ کر خراب نہیں دیکھے۔ نہ ہی اس کے لیے کوئی بلا ٹنک کی۔ میری زندگی کی ترجیحات بالکل مختلف رہی ہیں۔ شوہر میں نمایاں پوزیشن کے لیے فنکار کو

عمران ڈائجسٹ

جنوبی کا خاص نمبر شائع ہو گیا ہے

- گارگی بیٹی صاحب طرز ادیب ڈرامہ نگار، بھونٹ گارگی کی آپ بیٹی جس نے انسانی فطرت کے عمیق اور پوشیدہ حقائق کو بڑی بے باکی سے رقم کیا ہے اس ماہ کی خاص کہانی
- احمد صغیر صدیقی کی ۲۲ جلدی پیکلی کہانیاں
- ۱۔ معنوب ۲۔ رات بھر
- یامہد سلاسل، ایک معصوم شخص کی تعریف داستان جسے ایک سازش کا شکار بنا گیا، حسن، رقابت اور انتقام کے گرد گھومتی ہوئی ایک پرتگرس داستان
- سات سمندر پار سے ۳۰ شوخ و شنگ دھنک رنگ کہانیوں کا انتخاب، تین مختلف رنگ، تین مختلف ذائقے
- بہترین ادب - ۴ کہانیاں
- ان کہانیوں کے مصنفین کا نام بت کر ۱۰۰۰ روپے کے نقد انعامات جیتیں
- جوارحی، عالی شہرت یافتہ ادیب منتظر اور ناول نگار دوستوئسکی کے معروف ناول کی نئی تصویر
- ۱۴ طویل و طویل تر مختصر و غیر اثر کہانیاں
- ایک ڈیسپ سٹینی خیر سلسلے وار کہانی
- اور ایک مکملے ناول

نئے سال کا خصوصی شمارہ آج ہی خرید لیں

میں اپنے لاہور میں مختصر قیام کی بہت حسین یادیں گرجا رہی ہوں۔ مجھے جب بھی موقع ملا میں دوبارہ یہاں آؤں گی۔
 ۱۰۔ آپ نے یہاں سے کیا شاپنگ کی؟
 ۱۱۔ بہت سی چیزیں خریدی ہیں۔ میں نے یہاں کی بوتلیک سے کمرے خریدے ہیں۔ جن میں زیادہ تر کڑھائی والے ملبوسات ہیں۔ میں نے کائن اور شیمنون کے لباس خریدے ہیں۔ خصوصاً پیلے اور گلابی رنگ میں۔ مجھے آرام دہ ملبوسات پسند ہیں۔ خریداری کے وقت میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ایسے لباس منتخب کروں جو آرام دہ ہوں۔ ویسے بھی گلابی اور ہلکا رنگ میرے فوٹ رنگ ہیں۔ میں نے اپنی اور فنیس کے بھی خریدے ہیں۔

● دراصل بھارت میں اس قسم کے عموماً نہیں ملتے، اس لیے میں نے زیادہ کچھ خریدے تاکہ ہر لمحہ تک میں بوتلوں کو سینے کا شوق پورا کر سکوں۔ میں نے کچھ ویڈیو کیسٹ بھی خریدی ہیں بھارت واپسی تک اگر دوبارہ بازار جانے کا موقع ملا تو مزید شاپنگ کروں گی۔

۱۰۔ کیا آپ اسٹیج کو برقرار رکھنے کے معاملے میں ممتلا ہیں؟

۱۱۔ میں نے بھی اسٹیج بنانے یا برقرار رکھنے کے لیے کام نہیں کیا۔ میں صرف یہ کوشش کرتی ہوں کہ مختلف نوعیت کے کرداروں کو خوش اسلوبی سے کرتی رہوں۔ میں نے بھی ٹاپ اسٹار بننے کی کوشش نہیں کی ہے۔

۱۲۔ کیا آپ نے بھی پرسنل اور پروفیشنل لائف میں فرق محسوس کیا؟

جی نہیں لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ دونوں میں فرق ہے مثلاً پہلے میں ذاتی زندگی میں بہت سست واقع ہوتی تھی اور آج کا کام کل پر ہونے کی عادی تھی جبکہ شادی کے بعد میری فٹے دایر یاں تبدیل ہو گئی ہیں اور میں ہر کام



بدلتا چلا ہے۔ اظہر بھی میرے طوق کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔

۱۰۔ آپ کے خیال میں بھارت اور پاکستان کے مابین مشترکہ فلم سازی ہونی چاہیے؟
 ج۔ بالکل ہونی چاہیے۔ اس میں زیادہ فائدہ پاکستان کو ہوگا۔

۱۱۔ لاہور کیسا لگا؟

ج۔ مجھے لاہور اگر بہت خوشی ہوئی ہے۔ مجھے لاہور دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کروں۔ میں نے اس شہر کی ثقافتی، تمدنی اور تاریخی حوالوں سے بہت تعریف سن رکھی تھی۔ اب یہاں آکر میری خواہش پوری ہوئی ہے۔

بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میرے نزدیک زندگی تنہا بیٹھے کا نام نہیں۔ آپ کے رشتے ملتے آپ

کی زندگی کو خصوصاً بٹلتے ہیں۔ میں اگر بڑی اسٹار نہیں بن سکی تو کیا ہوا۔ میں بہتوں انڈولی زندگی گزار رہی ہوں۔ میرے خیال میں یہ اس سے بڑی کامیابی ہے۔

۱۰۔ اظہر نے کبھی آپ پر کوئی پابندی عائد کی؟
 ج۔ جی نہیں، اظہر ایک روشن خیال اور محنت کرنے والا شخص ہے۔ اس نے مجھ پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ کچھ پابندیاں میں نے خود اپنے آپ پر لگائی تھیں۔ ایک طویل عرصہ گھر میں رہنے کے بعد خود ہی فیصلہ کیا کہ لائف کو

وقت پر نظم و ضبط کے ساتھ کرنے کی عادت ڈال رہی ہوں۔ میرا خیال ہے یہی وہی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ذرا لطف کو زیادہ اہمیت دے اور ایسی کوئی بات نہ کرے۔

— جس سے اس کی گھبرائو زندگی کو خطرہ ہو۔

اس کے بعد ہم نے اظہر سے سوالات کیے۔ سہ۔ میڈیا کے ساتھ آپ کے تعلقات اچھے نہیں رہے ہیں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ پراسنل ہو جاتے ہیں؟

ج۔ جی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میرا اس بات پر یقین ہے کہ میڈیا آپ کو مشہور کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں لیکن جب وہ آپ کو مشہور کر دیتے ہیں تو بعد نقصان بھی پہنچاتے ہیں۔ میں میڈیا پر پراسنل ہونے کا الزام نہیں لگاؤں گا۔ بس پہلی بات دہرائوں گا کہ وہ آپ کو مشہور کرنے کے بعد نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور کوئی بھی شخص خود کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اس لیے میں ذرا فاصلہ رکھتا ہوں۔

س۔ اپنے طویل کیرئیر میں ایسی کون سی کارکردگی ہے جس پر آپ کو فخر ہے؟

ج۔ پہلی ٹینم متواتر سچیاں ہمیشہ میرے دل میں زندہ رہیں گی۔ ان سچوں کو نے مجھے بہت مطمئن کیا اور میرے اندر سنسنی پیدا کر دی۔

س۔ آپ نے، حیثیت کیتان بھی کامیابیوں کا غیر معمولی تسلسل قائم کیا تھا۔

ج۔ کامیابی صرف ایک کھلاڑی کی وجہ سے کہی نہیں ملتی نہ کرکٹ انفرادی کھیل ہے۔ گیارہ کھلاڑی کھیل کے میدان میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور جب ہم کوئی ٹیسٹ میچ کھیلتے ہیں۔ جب صحیح معنوں میں کامیابی تمام کھلاڑیوں کی کامیابی ہوتی ہے۔ پہلے مجھے اپنے ٹیلنٹ پر اعتماد نہیں تھا اب صورت حال مختلف ہے۔

س۔ کیا آپ سپر ہٹ ہیں؟

ج۔ جی ہاں میں پہلے سے کہیں زیادہ سپر ہٹ ہوں نفس کے لیے میں نے بہت محنت کی ہے۔ چند برس قبل میں نے محسوس کیا تھا کہ مزید کھیلنے کے لیے نفس پر توجہ دینا ضروری ہے۔ آج مجھے اپنی اس سوچ اور اس پر عمل کرنے سے فائدہ پہنچا ہے۔

اظہر اور سنسنی بھلائی دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں اور دونوں اس شادی کو کامیاب بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ہماری بھی خواہش ہے کہ دونوں کی یہ شادی کامیاب رہے اور وہ خوشگوار زندگی کے مزے تو لیں (آمین)۔



گھر کی سیر

رائی کا پہاڑ بنتے بنتے دیر لگتی ہے۔ اس کے بارے میں صرف سنا تھا اور پڑھا تھا۔ مگر اب تجربہ بھی ہو گیا۔ وہ صفائیاں دیتے دیتے تھک گئیں کس قدر کوفت ہوتی تھی جب وہ لوگوں کے سامنے جھکا جاتا کر کہتیں۔

”ارے بھئی ایہ سب کچھ نہیں ہے۔ میں نے کسی بدبخت سے یہ بات نہیں کہی تھی۔ میں تو مثال دے رہی تھی کہ ماں باپ کے مرنے سے بچے اکیلے ہو جاتے ہیں انہیں کسی بزرگ کی، سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے جو صحیح

تربیت بھی کرے اور اسی لیے ثنا کو حامد صاحب لے گئے ہیں۔ داوی بے چاری کا کیا بھروسہ آج ہیں کل قضا لے جائے۔ تو یہ وہاں اکیلی کیسے رہے گی؟ اور یہ بات وہ کسی سے نہ کہہ سکیں کہ انہوں نے تو بھائی جان کو اپنا سمجھ کر یہ بات بتائی تھی کہ شملہ کے چچا کا لڑکا اپنی داوی کے پاس رہے آ رہا ہے۔ تو شملہ کا وہاں رہنا مناسب نہیں۔ اور بھائی جان نے پورے خاندان میں شملہ کے متعلق غلط اور فضول قسم کی باتیں ان سے منسوب کر کے پھیلا دیں۔ یہاں تک کہ ملنے والوں



اور ان کے غلے والوں تک بھی خر نشہ کر دی۔
 حالانکہ شتا کو پیٹنے بھی اگر دیتی تھی۔ اکثر بھی کلاں
 ماموں کے گھر گزارتی۔ کمال، نویر اور اجڑے اسے
 بہت محبت تھی۔ ایک ماموں ہی تو تھے خصال میں۔
 ان کے بچوں میں ان کی جان تھی۔ ماموں بھی اس اکلوتی
 بھانجی کے شہیدانی تھے۔ روز اس کا ذکر کرتے۔ ہر شے
 اس کی دادی کے ہاں جا کر مل آتے۔ اور بھی اپنے ساتھ
 لے آتے۔ اور اب۔ وہ اسے مستقل لے گئے تھے۔
 ان کا خیال تھا کہ اس کی شادی جلد کر دیں گے تاکہ وہ دی
 سے سکدوش ہو جائیں مگر ایک چھوٹی سی بات کا بھنگو
 بن گیا۔ اور شتا کے دروازہ کو مشکوک کر گیا۔ لوگ اس پر
 مکتہ چینی کرتے۔ اعتراض ہوتا۔
 کیوں لے گئے ہیں حامد میاں اسے۔ تم نے منع کیوں
 نہیں کیا۔ تمہاری بھی بیٹی ہے۔ اس کا خیال کرنا چاہیے۔
 صحبت اچھی ہوتی چاہیے۔ بڑا اثر پڑتا ہے صحبت کا
 وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ سمجھا اور نیک نفس
 وہ یقین دلا میں مگر کسی کو یقین نہ آتا۔ ان کا خیال
 تھا کہ اس کا شہرت تو فرما ہو جائے گا۔ بہت سے لوگ
 اس کے متعلق سوال کیا کرتے تھے۔
 اس کی دادی کا کیا خیال ہے۔ کیا گھر چاہیں گی۔
 کتنا بڑھا کھا لاکا چاہیے۔ وغیرہ مگر اب تو مجھے لوگ
 بھول ہی گئے تھے بک شتا کوئی لڑکی ہے۔ بڑی بھائی جان
 پہلے تو خود اس کو پسند کرتی تھیں۔ اب جب سے وہ آئی
 اور انہوں نے فضول سی بات کو بڑھا چڑھا کر اس کو بدنام
 کرنے کی کوشش کی۔ وہ ان سے ناراض ہو گئیں۔ اور بھائی
 جان نے بھی اسے قطعی نظر انداز کر کے منہ سے کہا۔
 "اپنے بیٹے کے لیے بھی کوئی اچھی سی لڑکی تلاش
 کرو۔ اب تو وہ برسرِ دروازہ ہو گیا ہے"
 اچھی لڑکی سامنے ہے۔ نظر نہیں آتی؟ وہ چڑھ گئیں۔
 "صنیہ سنو۔ وہ تو میری کیسی ہے تال۔ ارے۔ اس کی
 اماں مجھے پسند آئیں۔ ان سے پوچھو"
 بھائی جان! ابھی تو وہ چھوٹی ہے۔ بڑھ رہی ہے۔
 مجھے تو یہ کہنے کوئی نہیں کر سکا اچھا لگا۔ ابھی کیا
 عمر ہے ان کی۔ گھر واری کی خستہ داریاں۔ ان کی طاقت
 سے زیادہ ہیں؟

بھائی جان کو بہت برا لگا۔ وہ سمجھیں کہ تو یہ کہ
 نظر انداز کرنا انہیں ناگوار گزار ہے۔ اس لیے منہ بنا کر
 بولیں۔
 "بھئی۔ تو یہ تو مجھے پسند ہے۔ مگر وہ کہتا ہے
 رشتے داروں میں نہیں کرتا"
 "نہیں نہیں بھائی جان! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اصل
 حکم کا بھی جوڑ ہوگا"
 "لو۔ تو کیا برا بیٹا بڑھا ہے!"
 وہ سخت ناراض تھیں۔ یوں بھی جب سے انہوں
 نے سنا تھا وہ ہر کسی سے ان کی غلط فہمی کے رشتے روئی
 ہیں شتا کی صفائی میں وہ اپنی اس سادہ دل تندہ سے غما
 ہی تھیں۔ مگر پھر بھی جاتی تھیں۔ اور جب بھی وہ آتیں
 صفیہ کا دل گھبرا جاتا۔ کیونکہ خدا خدا کے کسی بھی فرد کے
 بارے میں کوئی نہ کوئی خبر نہ کرنا نازل ہوئیں۔ ایسی خبر
 جس کو سن کر آدمی پریشان ہو جاتا ہے۔ اب اگر وہ
 اپنے بیٹے کے لیے شتا کو مانگ لیتیں۔ تو وہ ان کی ہر
 بات تسلیم کر لیتیں مگر انہیں شتا سے چڑھو کی تھی حالانکہ
 اس کو بدنام کر کے انہوں نے اس کا مستقبل اندھیرا کر
 دیا تھا۔
 تعجب تو سوچ رہا تھا۔ جب بھی شتا دادی کے گھر سے
 آتی۔ وہ بھی آجاتا۔ کبھی بھی نہیں کو بھی لا کر شتا اور
 کمال اور نویر کے ساتھ خوب کھلتا۔ کبھی لطفوں کا
 تبادلہ ہوتا کبھی بہت بازی۔ اس کو شتا کی بے ساختگی بہت
 پسند تھی۔ وہ گفتگوں شتا سے باتیں کیا کرتا۔ شتا بھی سچو
 سے بے تکلف تھی۔ اور مسکراتی بھی شتا کو پسند کرتی تھیں
 وہ کچھ چاہ پسند خاتون تھیں۔ اور شتا کا دو جیال خاصا
 دولت مند تھا۔ کم از کم اس کلاوی کے ساتھ ایک کو بھی
 میں غماض سے رہتا۔ نوکروں پر حکم جلاتا۔ اور دادی
 سے اپنی ہر خواہش منوا لیتا۔ وہ اس کی شاندار زندگی
 سے بہت مہربان تھیں مگر اب۔ جب سے وہ
 ماموں کے گھر آئی تھی۔ انہوں نے رخِ تنک رکھا۔
 اور تو اور مسعود نے بھی یہ سننے کے بعد کہ اب شتا نہیں
 رہے گی۔ کسی شوق کا اظہار نہیں کیا۔
 شتا کی والدہ تو کوئی برس پہلے فوت ہو گئی تھیں۔
 والد بھی بارٹ فیل ہونے سے یکدم ہی ختم ہو گئے۔

مجھے ہے کماں باپ کے بعد تو شتا کی زندگی بھی ختم ہو
 جاتی ہے۔ اور اس کے باپ کی آنکھ بند ہوئی۔ اور پھر
 شتا کا مسند آنکھ کھڑا ہوا کہ وہ کہاں جلے۔ ایک گجا
 آری میں تھے۔ ان کا تو کوئی بھکانا ہی نہ تھا۔ تیار تھے
 وہ دنوں کے دست مگر جتنا کھایا اس سے زیادہ
 لٹایا۔ وہ شتا کو ساتھ رکھنے پر تیار بھی ہو جاتے مگر شتا
 ان لڑکی کو اپنے گھر لانے پر راضی نہ ہوئیں۔ یوں بھی
 وہ دادی کے ساتھ آرام سے رہتی تھی۔
 "دادی کی خدمت اس پر فرض بھی ہے کافی دن
 فائدہ اٹھانے ہیں اس نے۔ اب دادی کو اس کی
 ضرورت ہے۔ گھر سے بے گھر کرنے کی کیا ضرورت!"
 اور اس طرح وہ دادی کے پاس ہی رہ گئی۔
 دادی سوچ رہی تھیں کہ کوئی کو لے کر شتا بیٹے
 پاس آئی ہائیں گی۔ نوکروں کو سکدوش کر کے کو بھی
 لے کر شتا کو لے آئیں گی۔ دادی اپنی کسے خواہشات
 کو شتا کے ساتھ لے کر رہے ہو جائیں گے اور بیٹوں
 سے کوئی لڑائی نہ ہو۔ منع ہوتی رہے گی۔ باقی پرستے
 ہوں گے کام آئے گی۔ مگر ان کی بہو نے یہ کہہ کر۔
 "یوں گھر سے بے گھر ہوتی ہیں اماں۔ اپنی جگہ بھی
 ہیں۔ اب کا اپنا گھر ہے۔ پھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے
 رہا ہے۔ اب آپ کو آرام نہیں ملے گا۔ آپ کے پرانے
 دروازہ گراہ بھی ہیں بند ہو چکے ہیں"
 گاہے گاہے وہ اپنے بیٹوں کی تندہ کوئی اور بڑائی
 کے نقشہ بھی بیان کرتی ہیں۔ صاف ظاہر ہو گیا کہ اس
 کا اپنے ساتھ رہنا ناگوار نہیں۔ چھوٹے بیٹے کی اچانک
 موت کے بعد چکا چلتا بیٹا تھا اس سے زیادہ بہو کی
 ان کو ملے ہوا۔ بیٹے کی خاموشی بھری کی تائید میں تھی۔
 اور وہ بھی تھا۔ وہ تو بیٹے ہو کے فائدے کے لیے ان
 کے ساتھ رہنے کے لیے کہہ رہی تھیں کہ جو پیر جمع
 اور کان کوگوں کے ہی کام آئے گا۔ لیکن وہ یہ بات
 کہہ سکیں۔ تو دادی بھی چپ ہو گئیں۔ پرانے نوکر کا خیال
 اور دست گزار تھے۔ لیکن کسی اپنے کی ضرورت بھی تو ہوتی
 ہے۔ اور اس بڑھاپے میں تو اور بھی خواہش ہوتی ہے
 لڑائی لڑائی۔ وہ ہی کم کرنا قریبے کار۔ مگر مجبوری تھی۔
 انہیں شتا سے بہت محبت تھی۔ وہ ان کے سب

سے چھوٹے لاڈلے فرماں بردار بیٹے کی جہتی بیٹی تھی۔
 ماں کی آغوش سے محروم۔ انہوں نے اسے ماں کی
 ماتا دینے کی پوری کوشش کی تھی۔ شتا کو کسی بات
 کی فکر نہ تھی۔ اسے دادی کے سوا اور کسی کے پاس
 رہنے کی خواہش نہ تھی۔ ان میں ایک ماموں تھے جن
 کے پاس جلنے کو ہر وقت تیار رہتی۔ دادی کی خواہش
 تھی شتا ان کے پرستے سے باہر جلنے مگر شتا اسے
 پسند نہیں کرتی تھیں شتا کی گھنڈی طبیعت۔ لاپرواہی
 بے نیازی سے وہ بے تار تھیں۔ بڑے بیٹے کی شادی
 انہوں نے اپنی ہی بھانجی سے کی تھی۔ بیٹے صاحب
 نے شادی کے بعد خوب پر رزے نکالے تھے۔ دو
 بیٹوں کے باپ بن گئے۔ مگر لڑکیوں سے نظر بازی۔
 گھر سے باہر دلچسپاں اور گھر میں بیوی پر رعب
 جمانا۔ یہ طریقے اختیار کر لیے تھے۔ اور وہ جلی کر صحتی
 رہتی تھیں۔ پچھتاہی تھیں کہ کیا بھئی کو کیوں بیاہ لائیں۔
 کسی غیر سے شادی کی ہوتی تو۔ اتنی کوشت نہ ہوتی۔
 ایک دو دو فخر اور مارہ دادی کے پاس آئے
 تھے شتا کی تو مارو سے خوب دوستی ہو گئی۔ مارو بھی
 واپس جا کر شتا کی تعریف کرتی۔
 شتا کے لباس بہت لاجواب ہوتے ہیں۔
 شتا کے شوق بہت اعلیٰ ہیں۔
 شتا طبیعتا بہت اچھی ہے۔
 ہر وقت ہنسی ہنساتی ہے۔
 دلچسپ باتیں کرتی ہے۔
 اس میں محبت کا جذبہ ہے۔ مجھ سے قوتی محبت کرتے
 لگی ہے جیسے میں اس کی مٹی ہیں ہوں تو اپنی زندگیوں
 کو سناتی۔ تو وہ بھائی سے تو بڑھ رہیں۔ ماں باپ کو
 شتا کے خلاف بھڑکائے کی کوشش کریں۔ تائی تو وہ
 یوں بھی پسند نہ تھی۔ گھر واری سے سروکار نہ تھا۔ لونڈائی
 راتی۔ کانچے سے آکر سو جاتی۔ شام کو اٹھتی تو ان میں
 بیڈ منٹن شروع ہو جاتا۔ گھر واری کی عملداری میں نوکروں
 کے ہمارے چل رہا تھا تانی جب بھی وہاں سے آئیں
 میاں اور بیٹوں کو شتا کے بھی قہقہے سنایا کرتیں۔ باپ
 لاڈ کے ماسے کچھ بکتے تھیں۔ دادی نے سر پر چڑھا کھا
 ہے۔ پھر وہ باپ بھی نہ رہے تو دادی اور بھی ناز بھٹانے

گیں۔

چلکے انتقال پر غلظ اور مارہ بھی گئے تھے۔ تائی اور باقی سب واپس گئے۔ غلظ اور مارہ وہیں رہ گئے۔ کچھ دن بعد وہ واپس آئے تو غلظ بھی شکاری مہنتیں بیان کرتا یا یا گیا۔ بہر بات میں شکار کا مقابلہ اپنی ہنسون سے کرتا۔ مارہ پر بھی اعتراض۔ آخر ایک دن کہہ دیا۔ ”جہاں میرے لیے رہ نہی تھی۔ شکار کا عشر عشر بھی نہیں۔ بتا نہیں آپ میری قسمت چھوڑنے کے لیے اپنے بیکے کیوں تھی؟“

”جب رہو غلظ باب چار سال کے بعد میں احساس ہوا ہے کہ مارہ شکاری عشر عشر نہیں۔“

”ماں تو حیران تھیں ہی۔ باپ اور ہنسون کے بھی چورہ طبق روشن ہو گئے۔“

”آخر شکاریوں کی کیا ہے۔ یہی ناں کہ وہ میرے چمکا کر بیٹھی ہے۔ سسرال آپ کو پسند نہیں۔“

”چار سال پہلے جب تمہاری شادی ہوئی تو شکار کا تھی۔ میرے ک کا طالبہ۔ تمہارے چچا تو میرا سر بھارتیہ یہ سن کر۔“

تائی سخت رنجیدہ ہو گئیں۔ روتی ہوئی مارہ کو سبنا لیا۔ سمجھا نا مشکل ہو گیا۔ اسی زمانے میں داوی نے ان کے گھر آکر رہنے کی تجویز دی۔ جس کو سنتے ہی وہ پھر میاں کو لے کر ماس کے پاس دوڑیں۔ شکارا قرب کسی قیمت پر گوارا نہ تھا۔ ساس ناما بھی ہوتی ہیں تو ہوں۔ بھائی کا گھر نہ تباہ ہو جائے۔ بیٹے پر اعتبار نہ تھا۔ پھر داوی نے شکار کو رفتہ رفتہ زمانے کے سرگرم سے آشنا کیا۔ اپنی ہلکے موت کا حوالہ دیا۔

”دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ ہر شخص کو خود اپنی تقدیر پر بنانی پڑتی ہے۔ چچاؤں پھر پھوپھوں سے کوئی امید نہ رکھنا۔ سب اپنے اپنے حالوں میں گرفتار ہیں۔ کسی کے دل میں جگہ نہ ہوگی۔ اور جب دلوں میں جگہ نہ ہو تو گھر بھی تنگ پڑ جاتے ہیں۔ کسی سے کوئی توقع نہ رکھنا۔ پھر کوئی تکلیف بھی نہ ہوگی۔ میرے اختیار میں ہو تو اپنے سامنے شادی بھی کر دوں۔ مگر یہ میرے پس میں نہیں۔ تم اپنے ماموں کے پاس چلی جاؤ۔“

”داوی! میں یہاں بہت خوش ہوں۔ آپ کے ساتھ رہوں گی۔“

”میری بھئی! تو بہت نادان ہے۔ اور زمانہ بڑا خراب۔ ارے میرے مرنے کے بعد یہاں تیرا کون ہوگا؟“

”گھر تو ہے۔ یا گھر بھی کہیں چلا جائے گا؟“

”گھر تو میرے بیٹوں کا ہے۔“

”تو اب بھی آپ کے بیٹے تھے؟“

”ہاں۔ تھے۔ میں نہیں۔ اور جو ہیں۔ ان سے تم کو کچھ نہیں ملے گا۔ اگر نہ سہارا۔ اپنا ٹھکانا بنا لو۔ ورنہ۔“

”بیٹا۔ میں کب چاہتی ہوں کہ تم کو خود سے جدا کر دوں جیتے جی۔“

ان کا بھی بھرا آیا۔ آسو بہنے لگے۔ شکار کی سمجھ میں نہ آیا کہ داوی کیوں اسے خود سے جدا کرنا چاہتی ہیں۔ انہی اسے دنیا کا تجربہ ہی کہاں تھا۔ وہ لوگوں کے رویے کی پہچان بھی نہیں رکھتی تھی۔

اسی دوران غلظ اور مارہ پھر آگئے۔ وہ خوش ہو گئی۔ پچھلی بار اس کی مارہ سے خامی دوستی ہو گئی تھی لیکن اس بار وہ اس سے پہلے اپنی تھی۔ اور شکار نہ کسی۔ نہ مارہ کا اکثر اکرہ زور۔ اس کی سمجھ میں آ رہا اور نہ ہی غلظ کا لغات۔ پھر ایک رات وہ سوئی ہوئی تھی۔ صبح چٹا چلا مارہ واپس مل گئی۔ وہ تیراں ہو ہو کر سب سے پوچھتی رہی۔ کہ آخر وہ بغیر تیلے کیوں چلی گئی۔ رات تک تو پروگرام تھا نہیں۔ داوی نے غلظ سے بھی کہا۔

”بیٹا! تمہارے دوست احباب میں کوئی تنگ شریف بڑھا کھار کا ہو۔ تو خیال رکھنا۔ میں اپنے سامنے شکاری شادی کر دوں۔“

”کیوں آپ کہیں جا رہی ہیں؟“

”ہاں۔ جانا تو ہے۔ مثلاً۔ لی بی عمر گزار چکی۔ کب تک بیچوں گی۔ میں تم شک کے لیے کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کرو۔“

”آپ کے خیال میں۔ میں بہت برا ہوں؟“ غلظ بغیر ہچکچاہٹ کے بولا۔

”داوی نے حیرت سے دیکھا۔ غلظ نہیں رہا تھا۔“

”داوی کا کوئی حرج ہے کیا؟“ شرعیات میں تو چار کی اجازت ہے۔ اور وہ میری چچا زاد ہے۔ میرا بھتیجا افضل ہے۔ آپ کسی کی پروا نہ کریں۔ میں مقابلہ کر سکتا ہوں۔“

اول

کس سے مقابلہ۔ اس کی مراحت نہ کی مگر داوی کہہ گئیں۔ جب ہو کر لیٹ گئیں۔ ان کی کمزوری بڑھ گئی تھی۔ غلظ نے شکار سے بھی کہا۔

”داوی پریشان ہیں۔ ان کی پریشانی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تمہاری فکر سے وہ بے حال ہیں۔ بیمار ہیں۔“

”میں گھر ملے گا۔ تحفظ ملے گا۔ اور پھر میرا کم بہر حق ہے۔“

شکار تو نگ رہ گئی۔ غلظ بھائی۔ جن کی بڑی عزت کرتی تھی وہ۔ بڑا بھائی سمجھ کر ان سے بڑی توقعات وابستہ کر لی تھیں اس نے۔ جب بھی وہ آتے۔ ان کی خاطر مدارت کرتی۔ ان کے آگے پیچھے بھرتی۔ مارہ اور بیٹوں سے بھی اسی لیے دوستی بڑھانی کہ وہ غلظ کی۔ جو نہ کھتے۔ انہی نے کیا سوچ کر ایسی گھنیا بات کی۔ وہ ان کی جائیداد کا مدد تھی۔ زمین کا کوئی پلاٹ۔ جس پر وہ اپنا حق جتا رہے تھے۔

اگلے دن وہ داوی کو تباہ ماموں کے گھر چلی آئی۔ اور وہاں سب کے گلے گلے چہرے۔ محبت سے بھرے ہوئے۔ اور یہاں بھی مدارات۔ اس کے ذہن پر سے سارا بوجھ تار پھینکا۔ سوتا دوسرا آجائے۔ کمال اور

تو بہ۔ خوب ہنسی مذاق کہیں کو میں وقت گزرنے لگا۔ پھر ایک دن غلظ بھائی اسے لیے آگئے۔

”داوی نے بلایا ہے۔“

”شانے انکا کر دیا۔ مامی سے چپکے سے کہا۔“

”آپ مجھے روک لیں۔“

”وہ ٹھنک گئیں۔ بولیں! یہاں ابھی کیسے جا سکتی ہے۔ اس کے ماموں پتہ ہی نہ ہوئے ہیں۔ وہ انہی کے قریب تو اسے خود چھوڑ آئیں گے۔“

”داوی کا آپ کو پتا ہے۔ یہاں ہیں۔ انہیں منانے بہت بیمار ہے۔“

”ہاں۔ مگر ان کے پاس ڈر کہ ہیں۔ پھر آپ بھی ہیں۔“

”ہاں اکیلے ہوتی ہے۔ باپ کے بعد بہت اداس رہنے لگی ہے۔ یہاں اگر تو میرے ساتھ خوش ہو جاتی ہوں۔“

”ہاں۔“

غلظ نے بہت زور لگایا۔ مگر ساس سے بدظن ہو گئی تھی۔ پھر غلظ کے واپس چلے جانے کا سن کر ہی وہ داوی کے پاس گئی۔ پھر کچھ دن بعد شکار کا خط کا لٹا سفر لا اور ہو گیا ہے۔ وہ اور مارہ آئے دلے ہیں۔ چکو۔ یہ اور مصیبت۔ ظاہر ہے وہ نہیں رہیں گے۔

”ماموں اس سے ملنے کے تو اس نے پوچھ لیا۔“

”آپ میرا خرچ اٹھالیں گے ماموں؟“

”ماموں جراتی سے اسے دیکھنے لگے۔“

”کیوں نہیں بننا؟ میں نے تو پہلے بھی کئی بار چاہا کہ تمہیں ساتھ لے جاؤں مگر تمہاری داوی کو ہی منظور نہ ہوا۔“

”م سے جاؤ حامد؟“ داوی نے اجازت دے دی۔ کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر شادی بھی کر دینا۔ یہ چیک کر لو۔ شکار کے اکاؤنٹ میں جمع کر دینا۔ جب تک زندہ ہوں۔ اس کی طرف سے غافل نہ رہوں گی۔“

انہوں نے کچھ زور نہ برتن اور نہ کھڑے بھی اس کے کس میں بھر دیے۔ اور با دیدہ برہم اسے گلے لگا کر ماموں کے ساتھ رخصت کر دیا۔

جب شکار ماہان کے ساتھ ماموں کے ہاں پہنچی تو سب کو حیرانی ہوئی۔ ماموں نے رواروی میں کہہ دیا۔ کہ جو کچھ داوی کی دیکھ بھال کے لیے ان کا پوتا آ رہا ہے۔ تو شکار کو میں لے آیا۔ داوی اپنی زندگی نے مایوس ہیں۔

اگر انہیں کچھ ہو گیا تو شکار ہاں اکیلی تو نہیں رہ سکے گی۔ شکار کی مامی صفیہ۔ ایک سیدی سادی خاتون تھیں۔ زمانے کے اچھے چھوڑ گئیں تھیں۔ انہوں نے میاں کے اس اقدام کو سراہا۔

”وہاں باپ کے مرنے سے پہلے تمہارا ہو جاتے ہیں انہیں کسی بزرگ سر پرست کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو انہیں بڑے بچے کی تینہ سکھائے۔ داوی بھی نہ رہیں۔ تو سب جاری شکار واقعی بالکل اکیلی۔ اسے ہماری سرپرستی کی ضرورت ہے۔“

یہ بات لہی فطری سادگی میں بڑی بھائی سے کہہ بیٹھیں۔ انہوں نے ساسے جہاں میں نشر کر دی اور اپنی فطرت کے مطابق۔ اپنے الفاظ کے ساتھ صفیہ کے خاندان میں گھلبلی سی چھ گئی۔

”اسے ہے بھائی کو لے آئے حامد مہاں۔ پہلے کون سا
ہیں برس رہا تھا۔ ایک اور خرچ۔ تو بھلا صفیہ کی عقل
دیکھو۔ نند کی بیٹی کو جھٹکے کیجیے سے لگا لیا۔“

ان کی ہنسنی ممتی شہناز۔ سب سے پہلے وہ دوڑی
آئی۔ اور گھبرا کر شہناز سے پوچھنے لگی۔

”تم مستقل آئی ہو۔ یا کچھ دن کے لیے۔“ شہناز بہت
سامان آیا ہے تمہارے ساتھ۔“

”میرے ماموں کا گھر ہے۔ میں مستقل بھی رہوں تو
کیا؟“

”میرا مطلب ہے۔ یوں تو پہلے بھی رہنے کے لیے آتی
تھیں۔ مگر اب جو سامان۔“

”محض ساسا سامان لائی ہوں۔ تمہیں کیا اعتراض ہے؟
شہناز بگڑی۔“

”ہم نے تو سنا ہے تمہارا کزن رہنے آ رہا ہے۔
اس لیے تم یہاں بھیجی گئی ہو۔“

”اچھا۔ پھر۔ کوئی آئے۔ کوئی جلتے۔ میں یہاں
رہوں یا وہاں۔ آپ سے مطلب؟“

”شہناز سہنا سہنی۔ اس کا کوئی مطلب نہ تھا۔ وہ تو اپنی
ماں کے خدشے کی تصدیق کرنے آئی تھی۔ مگر شہناز نے

کوئی مثبت جواب نہ دیا۔ بلکہ شہناز نے اور بھی گل
پھرنے لگا کر گفتگو کا ماحصل بیان کیا۔ جس سے لوگ

اپنے مطلب کے معنی نہ لے سکے۔
”مامی ماموں تک بھی اڑتی اڑتی افواہیں پہنچنے

لیں۔ ماما بے چاری سخت پریشان۔ اور اب انہیں
یقین ہو گیا کہ لوگوں کی آنکھیں نہیں ہوتیں صرف کان

ہوتے ہیں اور وہ بھی اپنے طرف کے مطابق ہی سن
سکتے ہیں۔“

بڑوس کی خشک پہلے بہت آتی تھی۔ شہناز اس
کی خامی دوستی تھی۔ مگر اب اس نے ملنا چھوڑ دیا اور

تواور سجاوہ سعودی بہن تھی۔ اور خود سعود۔ اس پر تو
مامی کو بڑا غصہ آتا تھا۔ یا تو یہ حالت کہ ادھر شہناز داوی

کے گھر سے ماموں کے ہاں پہنچی۔ سعود حاضر۔ اور اب۔
مہینہ ہو گیا۔ شکل دو دکھائی۔“

پھر ایک دن آیا تو بتایا کہ اسے بوئے نوری کی جانب
سے تحقیقاتی نوڈر بھیجا جا رہا ہے۔ اس نے شہناز کے

یہاں آئے پر کسی خوشی کا اظہار بھی نہ کیا۔ بہت لیا ویا
انداز تھا۔ پھر وہ دو مہینے کے لیے غائب ہو گیا۔ پھر
سنا کہ اپنے نوڈر سے واپس آیا کہ ہے مگر ادھر کا راستہ
تو بھول ہی گیا تھا۔

ایک دن شہناز کے ساتھ داوی سے ملنے گئی۔
بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ آٹھ کر بیٹھ گئیں۔ شہناز مل

کر آبدیدہ ہو گئیں۔ مائزہ اچھی طرح ملی۔ داوی نے اسے
کوئی اختیار کیا۔ وہ اسٹور میں چلی گئی۔ اور وہاں سے

ایک بڑا سا ڈبہ آٹھ لائی۔ شہناز کو دے دیا۔
”یہ کیا ہے؟“

”یہ چاندی کے برتن ہیں۔ یکسوں میں پڑے تھے۔
تمہارے دادا کا شوق تھا۔“

”میں ان کا کیا کروں گی داوی؟“
”بیٹا۔ استعمال کرنا۔ تین حصے کر دیے ہیں۔ ایک

ظفر کا۔ دوسرا تمہارا۔ تیسرا عائشہ کا۔ تم تینوں پہلو بھی کی
اولاد ہو۔“

”اور باقی سب؟“
”باقی سب کا ہی تو سب کچھ ہے۔ یہ گھر۔ گھر کا سارا

سامان۔ داوی بہت دل گرفتہ تھیں۔
مائزہ نے بتایا کہ ان پر تمہارے چلے جانے کا بہت

اثر ہے۔
”مگر میں۔ روکوں گی نہیں تمہیں۔“ مائزہ نادم نادم

سی بول رہی تھی۔ ”خدا ظفر کتنا بھی بگڑیں۔ بلاؤں گی بھی
انہیں۔ میں داوی کی خدمت کروں گی شہناز فکر نہ کرنا۔

میں خود غم نہیں ہوں۔ تم سے کوئی شہناز نہیں ہے
نیچے۔ بلکہ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر کے تم نے مجھ پر

جوا احسان کیا ہے۔ میرے بچوں پر احسان کیا ہے۔
میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ تم سمجھ رہی ہو ناں؟“

”ہاں۔ بھائی اب میں تک ہو جانے گا۔ آپ میری
طرف سے تو مطمئن رہیں؟“

”اور کبھی اگر میں تمہیں واپس لے کے لیے آؤں گی۔
تو میری منت خوشامد کے باوجود۔ تم واپس نہیں آؤ گی۔“

وعدہ کرو شہناز۔
مائزہ کی آواز گھٹ گئی۔ ضبط کر کے کی کوشش میں

اس کا دل شروع ہو گیا۔ شہناز زرد رہ گئی۔ کتنی اچھی
داوی۔ سادہ معمول۔ خوبصورت۔ یہ مرد بھی نہ جلتے
کیا تھا۔ اس اور عورتیں۔ کس قدر بخیر ہوتی ہیں۔
شہناز مائزہ پر کتنا دباؤ ہو گا۔

ایک دن مائزہ ظفر کے ساتھ ماموں کے گھر آئی۔
شہناز واپس ملنے کی التجا کرنے لگی۔ بہت سمجھایا۔

”خاطر کرنا چاہا۔“
”کب طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں شہناز؟ کب

داوی کی خدمت کا موقع آیا تو قیاسیہ صاحبہ گھر سے چلی
گئیں۔“

”کہنے دیں۔ ان کے پاس آپ لوگ ہیں۔ میں نے
اپنے نہا نہیں چھوڑا۔“

”لوگ تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ۔ ہم لوگوں نے
تمہیں گھر سے نکالا ہے۔ انہیں جھٹلانے کے لیے ہی

پہنچا رہا جانا۔“
”اس ایک بار کئی۔ سوا کئی۔ بار بار کی نقل مکانی۔

بہت نہیں تھکتے؟“
”نقل مکانی کا کون کہہ رہا ہے۔ بھئی کچھ دن کے لیے

اپنے ساتھ رہو۔“
”بھائی، کوئی کچھ بھی کہے۔ صاف بات تو یہ ہے

”اس گھر میں میرا کوئی حق نہیں۔ چاہتی تھی کہ داوی کی
خدمت کی تک اس کے پاس رہوں۔ ان کی خدمت کروں۔

ان کی کمزوری کا قرض ادا نہ بھی ہو۔ کم از کم اپنی تسلی کے لیے۔
ان کے ساتھ ہی رہوں۔ مگر معاف کیجیے۔ آپ لوگ ہی

کچھ واں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ ذرا تپا تپائی سے پوچھیں
”ہاں۔ ابھی سے معلوم کر رہی۔ کس کو میرا وجود گوارا ہے۔“

داوی کے بعد سب کچھ دھکے دھکے کرنا کال باہر کر رہی۔
اس نے بہتر ہے کہ میں ایک محفوظ پناہ گاہ تلاش

کروں۔“
مائزہ کا امید نہ تھی۔ وہ اس قدر تلخ بات بھی کر سکتی

تھی۔ ظفر بھی کم صبر ہو گیا۔ وہ ڈرا کر کہیں اس کی پول بھی
نہاں نہ کر دے۔ شہناز کی زبان پھسلنے لگا وہ دیر لگتی ہے ایسی

اس حد تک تھی وہ۔ دراصل اپنی اس تلخ بیانی سے مائزہ
کراہنے سے نجات دلانے کی کوشش کی تھی۔ اب ظفر مائزہ

کو تو استعمال ذکر کے گا۔

اور داوی کو اس آخر میں کسی پریشانی سے بچانا بھی
اس کا فرض تھا۔ شہناز تو ان کی جان لگتی تھی۔ اس کے

ماموں کے گھر رہنے سے وہ مطمئن تھیں۔
داوی کی عمر بس اتنی ہی تھی ممتی قدر کرنے۔ پھر بھی

بہت جی لیں۔ اپنے بچوں کے فرائض ادا کر لیں۔ ان
کی اولادیں بھی دیکھ لیں۔ ایک بیٹے، ایک بہو کی بدلتی

کے دکھ کے سوا کوئی غم نہ ملا۔ بڑی معروف اور بھرپور
زندگی گزار رہی۔

اس دن شہناز ماموں کے ساتھ ان کو دیکھنے گئی تھی
وہ ماموں کو بڑی آس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں

ماموں نے انہیں تسلی دی۔
”شہناز خوش ہے۔ اس کی کوئی فکر نہ کر۔ وہ میری

ڈنٹے داری ہے خال جان۔“
وہ دیر تک بیٹھے رہے۔ ان کا جھڑپوں بھرا نرم

ہاتھ بھلاتے رہے۔ داوی کا سانس تیز چل رہا تھا۔
ظفر، مائزہ اور شہناز ان کے پاس بیٹھے تھے۔ ادھر ماموں

نے خازن کی نیت باندھی۔ ادھر داوی نے آخری بچگی کی۔
ان لوگوں کی سمجھ میں ہی نہ آیا۔ مائزہ کی چیخ نکل گئی۔

شہناز کو خوف نے گھیر لیا۔ عجیب وقت ہوتا ہے یہ۔
طاہر بھائی کا۔ کچھ منے کے عمل کا وقت۔ وقت بھی موت

کے خدشے کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔
مائزہ اور شہناز ایک دوسرے سے اپنی روتی رہیں۔

ظفر فون کرتا رہا۔ ماموں پورا وقت وہیں رہے۔ قبر
کی تیاری کفن کی تیاری، اور آخری منزل پر لے جانے

کے لیے غسل کی تیاری۔ تابا کی فیل، چچا کی فیل۔ دونوں
پھوپھیاں صبح تک سمی بہنچ گئے۔ اپنے پیاروں کی

موجودگی میں بڑی شان کے ساتھ رخصتی ہوئی داوی
کی۔

دو ہر کو قبرستان سے آگرایا۔ چچا بڑے کمرے
میں بیٹھ گئے۔ اند لوگوں کا ہر سر قبول کرتے گئے۔ تانی۔

چچی اور پھوپھیاں سر جوڑے بیٹھی رہیں۔ پھر بڑوس
سے کھانا آیا۔ کھانا کی سب کچھ کر لیت گئیں۔ تنک

گئی تھیں جہاں کے سفر سے۔ کیا ہوا اگر خدمت ایلی مائزہ
نے کی۔ بہو ہوتی کس لیے ہے۔ اس کا فرض تھا۔ اب

بھی ماثرہ ہی اویسر سے اویسر دور رہی تھی۔ ایک دن وہ وار گھر والی کی طرح لکھنا لکھوانے۔ برتن اٹھانے سے جلنے صفائی کرانے کی وہی دھڑلہ تھی۔ ثنا تو چوتھے باب ایک کمرے میں بیٹھی تھی۔ اسنو شک تھے۔ انھیں بلی رہی تھیں۔ ہر چیز دھندلائی ہوئی تھی۔ اسے تو اپنی چچا زاد اور چھوٹی زاد بہنیں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ رات کا لکھنا ماموں کے کمرے آ یا ماما اور نوید کل سے نہیں تھیں۔ صبح جا کر کھانے کا انتظام کر کے پیرا گئی تھیں اور ماثرہ کے ساتھ مل گئی رہیں۔ ماموں کوئی سے مسلسل جاگ رہے تھے۔ سارا کام ان ہی سے کیا تھا۔ قریب ہی اپنے سامنے کھدوائی تھی۔ وہ تنگ کر چڑھتے۔ ظفر تو گراہ تھا۔ مگر وہ خود جا کر سو گیا۔ ماموں سے جھوٹ موٹ بھی آرام کرنے کا نہ کہا۔ ماثرہ کو ہی خیال کیا تو اس نے زبردستی انہیں گھر بھجوا دیا۔

شنا کی نیند جھوک پیاس اڑ گئی تھی۔ وہ کونے میں چپ بیٹھی تھی۔ ماثرہ کو ہی خیال آتا کہ وہ بیوی ہوگی۔ تو کچھ لا کر دیتی۔ مگر اس سے کچھ بھی کہا مارے جاتا۔ حلق آٹنا خشک ہو گیا تھا کہ بات بھی نہ کی جاتی۔ آواز بھی لگتا تھا سڑک گئی ہے۔ سامنے ہی داوی کا پلنگ تھا۔ اس کا بستر بدل دیا گیا تھا۔ مگر لگتا تھا وہ کام سے کہیں گئی ہیں۔ ابھی اگر ٹیٹ جا میں گی۔ چھو پھو اس پر لیشیں تو اس کا جی جاگا کہ انہیں منع کرے کہ آخر داوی کہاں جا میں گی۔ پھر وہ سرفال کر پڑ گئی۔ چوتھے دن کھسکھسرتے زبان کھولی۔

شنا کا کیا ہوگا۔ ساتھ ساتھ گھر کی چیزوں کی تقسیم بھی ہو رہی تھی۔ داوی کے بھرے گھر کی قیمتی اشیاء سبجانا جگ ملک کرتا ڈرائنگ روم ان واحد میں خالی ہو گیا۔ بڑی بڑی قیمتی چیزیں بیٹنگز۔ بلوری گلدان۔ چینی کے گلدان تھارڈ فائوس جو فرانس سے داوانے نہکا یا تھا۔ سونے کی سونہوں اور چاندی کے ہندسوں والا والا کلاک چینی تھا۔ کارنر والے نقش پتیل کے گلے۔ نہ ہلے تھنی ڈیکوریشن کی چھوٹی موٹی چیزیں۔ نہ جانے کیا کیا تھا جو بکروں سے اپنی جگہ درست اور محفوظ تھا۔ وہ اگلے دن ملک سب ہٹ گیا۔ ڈرائنگ روم کی تنگی دو لاریں خالی الماریاں اور میزیں۔ بیوہ کی طرح اجڑا ہوا کچن تھیں اور یہ سب سامان ان کے بیٹے نینوں کے ذاتی سامان

میں لکھا جا چکا۔ ٹوٹ کے مال کی طرح ہر کرا مختلف سامان سے آٹ گیا۔

»شنا کا کیا ہوگا؟« یہ سوال گردش میں تھا کسی کو ثنا کا خیال نہ آیا کہ اتنے ڈھیر میں سے کوئی چینی کی گویا ہی اس کو دے دی جاتی بلکہ سب اس سے جان بچا رہے تھے۔ نذر بخرا رہے تھے۔ آخر ماثرہ نے ہی اپنی ساس کو مطلع کیا۔

»ابھی ثنا قرآنے ماموں کے پاس رہتی ہے؟« وہی زیادہ متفکر تھیں۔ جن کڑکھ کا سانس لیا۔ ماموں کے آتے ہی وہ ان کے ساتھ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اپنے خونی رشتے داروں سے گلے مل کر غالی ہاتھ اس گھر سے نکل آئی جہاں پیدا ہوئی۔ اور اٹھارہ سال گزرا۔ اور ماں باپ بیسی بیماری ہستیوں داوی جیسی شفیق خالوں سے جہاں ملی۔ اب اس گھر میں اس کا کچھ باقی نہ بچا تھا۔

اس دن کے بعد سے یوں لگا جیسے سب سے رشتے تھے۔ کون کب اپنے گھر گیا کسی نے سنبھالنا مطلع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہاں بھی ماثرہ کا خط آجاتا تو وہ اپنے ان عزیزوں کے حالات سے واقف ہو جاتی۔

ظفر کے بھائی، بہن کی شادی ہوئی تو کسی نے بلایا نہیں۔ ماما ہی اب اس کی سب کچھ تھیں۔ ماموں تو خیر ماموں تھے۔ ماما سے اس کا اور کوئی رشتہ نہ تھا۔ مگر کوئی شنائے پوچھتا۔ ماما کی قربت میں کسی روحانی لذت محسوس ہوتی تھی۔ ماں کی متا داوی کی شفقت باپ کا تحفظ۔ ماموں کی محدود آمدنی میں ماما کی کسی سلیقے سے سینڈووشی قائم کیے تھیں۔ یہ ان کا کمال تھا ثنا کو شاید احساس بھی نہ تھا۔ مگر ماما کے رشتے داروں کے واو بلا کرنے پر اسے علم ہوا۔ کہ ایک ہستی کا بھی خرچ ہونا ہے۔ اور وہ ان پر بوجھن سکتی ہے۔ اگر ماما سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ سامنے ماما کے آخری کپے برتنر ماجد کا انگش میڈم اسکول تھا۔ انہیں شاید کچھ کی ضرورت بھی تھی۔ اگر اپنا پورا خرچہ نہ بھی نکال سکتی تب بھی کچھ دیکھ ماما کی مدد ہو ہی جاتی مگر ماما نے اجازت نہ دی۔ سروس کرنے والی لکھی

»اگر آپ پسند نہیں کرتے۔«

»معدو کی اتنی کی تو شرط یہی ہے کہ لڑکی سروس نہ کرے۔ ان کا خیال ہے گھر سے باہر نکل کر لوگ ان کا زانو نہ چا رہا ہو جاتی ہیں۔ پھر گھر میں ان کا دل نہیں لگتا؟«

»معدو کی اتنی کو بھلا اس کی سروس سے کیا ہوتا ہوگی۔ وہ کہاں آتی بھی نہیں۔ انہوں نے تو ماموں کی لہائی اس کی داوی کی وفات کا سن کر انہوں نے تو کھڑے ہو کر ہنس نہ سکے۔ البتہ اتنا پورا تھا۔

»کیا ثنا کو جاننا دوستہ حصہ ملا یا کیش؟«

»ماموں کے بتلے پر کچھ نہیں ملا۔ انہیں افسوس تھا کہ اگر کوئی کام ہوتا تو دفتر فون کرتے ماموں کو رات دینی تھیں۔ کسی بل کا مواملہ ہو یا کوئی بھی کام۔ بلا لکھتے انہیں بلایتی تھیں۔

»وہ اپنے تحقیقاتی دور سے واپس آ گیا تھا۔ انہیں میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد ثنا کا اسے ایک اچھی جا ب بھی مل گئی۔ مگر اس نے اگر شکل نہ لکھی۔ تو یہ بہت حیران تھی۔ معدو ثنا سے ملنے بھی نہیں آیا۔ حالانکہ اس نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ وہ شائے شادی کرے گا۔ کیونکہ وہ ہی اس کی پسند کے مطابق ہے۔

»شنائے کیسے لوگ آتے۔ اور ملے جاتے کسی جائیداد کا تعلق نہ اخلا جیمر کی امید۔ ماموں کی تاکہ تھی کہ کسی کو صوبے میں نہ رکھا جائے۔ ماما نے کہا بھی۔

»اس کی داوی نے زلیخا کپڑا، برتن، چاندی کے ظروف دیے ہیں۔ وہ خالی ہاتھ تو نہیں؟«

»کچھ سیدی سادی؟ ماموں ہنس دیے۔ یہ چیزیں دولت نہیں۔ لوگوں کو وہ چیز چاہیے جس سے ان کا دل نہ جالے۔ خرچ خیر۔ رنگین ٹی وی۔ فریج۔ اور ہولائی میں کار یا موٹی رقم۔ ماما ہی ان کی عزت ہے؟«

»تو میرے قاعد صاحب۔ ہماری نو بیوی کی شادی ہی نہیں ہو سکتی گی۔ ہم کہاں سے لائیں گے یہ سامان؟«

»ہماری نو بیوی کے لیے ہمارے جیسے لوگ آئیں گے۔ وہ اس کے قریب امید لے کر آتے ہیں کہ دو مہینے کے جائیداد ملے گی۔ تم انہیں صاف بتا دو۔ اس کی شادی ہماری

فرسے داری ہے۔ ہم اپنی حیثیت کے مطابق کریں گے؟«

»رقم بھی تو دی ہے انہوں نے شادی کے لیے؟«

»ہاں۔ مگر اس سے شادی کے اخراجات ہی پورے ہو جائیں تو غنیمت جانو۔ لوگوں کی ذہنیت بہت غراب ہو چکی ہے۔ اخلا دیجے گا جیسے تو اس میں نہیں بن سکے گا۔ خیر اللہ مالک ہے!«

»شنائے نہ ہیں میں بس ایک ہی خیال چکراتا۔ ایک ہی سوال ابھرتا معدو نے آنا بند کر دیا کیوں؟«

»یہ سوال ماما کو بھی پریشان کر رکھا۔ وہ اتنا تو کچھ چکی تھیں کہ معدو ثنا کو پسند کر تا ہے۔ اور ثنا بھی اس کی پسندیدگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ شاید وقت کے ساتھ ان میں محبت بھی ہو جائے۔

»کچھ عرصے سے یہ ہوتا تھا کہ اویسر ثنا داوی کے ہاں سے آتی۔ معدو پیچھے تھے۔ نہ جانے کسی تار برقی تھی ان کے درمیان۔ اور پھر کمال کے ساتھ مل کر قبیلہ ہوں کے طوفان اٹھتے تو پورا گھر گرج جاتا۔ بیٹے تو ثنا بھی ان کے ساتھ خزاوتوں میں خریک رہتی تھی مگر اب کچھ دنوں سے معدو کے آتے ہی وہ خود برتھنگ کی کاخول چڑھ جاتی۔ مگر بلیوں کے گوشوں پر شونر تھیم کی خر۔ بر۔ بخوئی پر بھی جاسکتی تھی۔ اور معدو بھی براہ راست ثنا کو مخاطب نہ کرتا مگر ہاں جب وہ دونوں ہوتے تو دینی دنی آوازوں میں گفتگو کرتے تھے۔ پھر اب۔ آخرا ب کیا ہو گیا تھا کہ معدو نے آنا چھوڑ دیا۔ بھابی جان کے پر وپیگندے کا اس پر اثر تو نہ ہونا چاہیے۔ وہ تو خواص کے کردار سے واقف تھا۔

»ماما کی طلب نے آخر کام دکھایا۔ وہ انارگی میں شاپنگ کر رہی تھیں۔ معدو نظر آیا۔ خودی پلکتا ہوا آیا۔ اس کی نظریں کسی کی تلاش میں جھٹک رہی تھیں۔ السلام علیکم خالہ جان۔ آپ۔ آگئی؟«

»ہاں۔ بس۔ وعلیکم السلام۔ انہوں نے نگہانی کا تاثر دیا۔ خنا جو تھیں۔

»شاپنگ ہو رہی ہے؟« وہ شاید سمجھ گیا تھا۔

»نہیں۔ کوئی خاص نہیں۔ بس یہ شنائے کی کچھ کپڑے ہیں۔ کام ہونا ہے۔ وقت سے پہلے تیار ہو جائیں

تو اچھا ہے۔ وقت پر سہولت ہوگی۔
 "وقت سے پہلے سے کیا مراد ہے؟ وہ کچھ اچھا گیا۔
 یہی۔ شادی سے پہلے۔ اب جلد سے جلد شادی
 کرنی ہے۔ حامد صاحب تو چاہتے تھے اس کی دادی
 کی زندگی میں ہی اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔
 اس کا شکنا بن جائے۔ مگر انسان جو چاہتا ہے۔ وہ
 فوراً تو پورا نہیں ہوتا۔
 "تو کیا؟" شادی پوری ہے؟ وہ خواہاں پریشان
 ہو گیا تھا۔

"حامد صاحب کو جلدی ہے۔ آخر کیسے تو کرنا ہی
 ہے؟"
 وہ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور اٹھیں کے
 تاثرات دیکھ کر خاصی مطمئن ہو گئیں۔ اب یہ جلدی کتنے
 گا۔ اگر اس کے دل میں کچھ خیال ہوگا۔ اور خیال ہی ارادے
 کا تابع ہوتا ہے۔ اور وہ اگلے دن ہی آ گیا۔ شنا اور
 ٹوہرہ کبیں گئی ہوئی تھیں۔ اعداد و کمال بھی پہلے سے
 تھے۔ حامد صاحب سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی نظریں
 کونے کونے میں بھٹک رہی تھیں۔ دراصل کسی نے
 بتایا ہی نہیں کہ وہ کہاں گئی ہے یا کھڑی ہے۔
 اس پر اضطراب طاری ہونے لگا تو وہ ہنسی مسکاتی
 گھر میں داخل ہوئی۔ ٹوہرہ بہت جوش میں تھی۔
 اپنی کامیابی کی داستان سن رہی تھی۔ کس طرح شنا
 نے پرنسپل سے گفتگو کی۔ کیسے انہیں قائل کیا۔
 بالآخر انہیں کمپیوٹر سینٹر میں داخلہ ملی گیا۔ ٹوہرہ کے
 برعکس شنا پر خاموشی طاری تھی۔ جیکہ سعودی نظر میں
 اس پر جم کر رہ گئی تھیں۔

مائی کے سوا کوئی مشاہدہ نہ کر سکا کہ کیسے شنا
 کے چہرے پر شفق کی سرخی چھائی اور وہ گردن موڑ کر
 یوں بیٹھی جیسے سعود کو دیکھا ہی نہ ہو۔ پھر مائی نے اس
 سے جلنے لسنے کا کہا۔ وہ چلنے لانی تو جیسے عجز ارادی
 ناعوس انداز میں سعود کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
 کچھ دیر بعد ماموں سجدہ کے لیے چلے گئے۔ مائی
 بھی اٹھ کر آگئیں۔ تب سعود نے دھیمی آواز لیکن سخت
 بچے میں کہا۔
 "سنابہ تم کو شادی کی بڑی جلدی ہے؟"

شنا کچھ نرمیوں ہو گئی تو اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ
 پر رکھ دیا اور نرمی سے بولا۔
 "خیر وارہ۔ جو میری مرضی کے بغیر ہاں کی۔ اور ہاں۔
 وہ کیا قصہ ہے کہ تمہارے رشتے داروں نے تم کو چھوڑ
 دیا ہے؟"
 شنائے دیکھا۔ مائی سامنے نہ تھیں۔ ٹوہرہ برآمدے
 میں رکے گئے کیل کوستان پر باندھ رہی تھی۔
 "انہوں نے نہیں۔ میں نے سب کو چھوڑ دیا۔"
 "کیوں؟"
 "کیونکہ بس میری مرضی۔ میرے لیے ماموں بہت
 ہیں؟"

سعود بڑے غور سے چنتی نگاہوں سے اسے دیکھتا
 رہا۔ نہ جانے کیا جانا چاہتا تھا۔ شنائے جی میں آئی۔
 ایک سوال کرنے لگا کہ کیا تم کو بھی میری جائیداد۔ یا اعلا
 ترین چیز سے دلچسپی ہے۔ مگر اس نے پھر کچھ پوچھا
 نہیں۔ بولا ہی نہیں۔ تو خود سے کیا تھی۔
 سعود کے جانے کے بعد انہوں نے کتنی مری۔ کم از کم
 اتنا غصہ غیر حاضری کی وجہ ہی پوچھ لیتی۔ مگر اس کی آمد
 ہی اتنی حیران کن اور دل خوش کن تھی کہ کچھ یاد ہی نہ
 رہا۔

ماموں ایک رشتہ لے آئے تھے۔ ان کو پسند تھا۔
 مگر مائی نے چپکے سے کہہ دیا۔
 "ابھی اقرار نہ کر لینا۔ شنائے پوچھنا ضروری ہے۔
 "جلدی کرو۔ انہیں جلدی ہے۔" سمجھے بھی جلدی
 ہے۔ دیر کی گنجائش بالکل نہیں؟ نہ جانے ماموں کو

کس بات کی جلدی تھی۔
 "میرا خیال ہے سعود۔ مگر وہ تو اتنی جلدی شاید نہ
 کریں؟"
 "سعود کو کرنا ہے تو اپنی ماں بہن کو لائے۔ اس کے
 والد بھی موجود ہیں۔ صرف اس کی خواہش سے تو کچھ نہیں
 ہوگا۔ ملگنی تو کر رہی دوں گا؟
 "سعود نے کہا تو کہوں گی؟"

ماموں نے دفتر سے سعود کو فون کر دیا کہ کمال کی ماں
 کو تمہارے کام ہے۔ وہ شام کو آ گیا۔ مائی نے صاف

دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔

علاؤ اللہ ہی کیا جلدی ہے؟

وہ کہہ گیا تو کئی دن تک نہ آیا۔ آیا تو اسی طرح سے
 آیا۔
 "سنابہ اپنے آبا یا امی سے بات کی؟" مائی صاف
 شنائے کی قائل تھیں۔

علاؤ۔ بات یہ ہے کہ۔ میرا تو لندن جانے کا
 ارادہ ہے۔ آبا جان نے سب ملے کر لیٹھے۔ ایم بی اے
 کیا ہے۔ وہاں یونیورسٹی۔ داخلہ بھی ہو گیا؟
 وہ جرموں کی طرح سر جھکے کہ شام تھا۔ مائی کو غصہ
 آیا۔ انہوں نے محل سے کام لے کر کہا۔

اچھا بیٹا! اللہ تمہیں کامیابی دے۔ پہلے بتایا
 تھا۔ تم تمہاری دعوت تو کر کے گئے۔ تب
 ہی۔ وہ۔ شاید کب۔ یا پارسوں۔ جھٹ کر لے لیا
 "سنابہ کا مسئلہ ہے کچھ۔ ورنہ میں آج چلا جاتا۔
 مائی حیران اسے دیکھتی رہیں۔ انہیں تو اس کی
 دل پر ہنسنے کی نظر آ رہی تھی۔

اچھا۔ پھر خدا حافظ! انہوں نے اسے انگلی سے
 اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ سراسیمہ سا باہر نکل

شنا جانے لے کر انی تو مائی اکیلی بیٹھی تھیں۔
 وہ چلا گیا۔ آج۔ یا کل یا پارسوں لندن چلا جائے
 اس نے بہت جلد راستہ تبدیل کر لیا۔ اب اسے
 ہول جانا بہتر ہے؟
 شنا کو مائی پر تو ڈر ڈانٹ نہ تھا۔ لیکن اگر اسے

ہاں ہی تھا۔ تو بتا دینے میں کوئی نقصان نہ تھا۔ وہ
 اس کو روک کر کہتی تھی مگر علاؤ اسے راز کو پلٹے
 کہ وہ کہیں نہ آئی۔ ان کے درمیان کوئی ٹھہر۔ یا
 سادہ تو ہوا نہ تھا۔ جو کچھ تھا وہ سعودی زبان تک
 تھا۔ اور زبان ہی تو بھادہ ہے۔ جب وہ اس کا
 اس نے کر سکا تو زندگی میں اور کس پر اعتبار کرے
 "سنابہ! یہی دیکھا ہے اور یہی کاروبار دیکھا۔ سب
 کچھ کی طرح ہی چلتا رہا۔ اسی طرح کھانا پیتا ہنستا
 ایک سعودی کے چلے جانے سے کسی کا کچھ بدلایا نہ بدلا۔

شنا کو لگا اس کی بساط زندگی الٹ گئی۔ وہ بالکل جیب
 ہو گئی۔ سعود لندن پہنچ گیا۔ شنا خاموشی کے شہر کی
 رفیق بن گئی۔ مائی بھی ان ہی تھیں۔ مگر اس کی سمجھ میں
 ہی نہ آتا تھا کہ پسند۔ محبت۔ یگانگت۔ اقرار۔ اگر اس
 سب کی حقیقت ہی کچھ نہیں تو پھر۔ حقیقت کیا ہے۔
 کہاں ہے۔

ماموں نے اس کا رشتہ طے کر دیا۔ اور لڑکے والوں
 کے جکر بڑھ گئے۔ وہ اضطراری کیفیت میں تھی ماموں
 سے کیا کہتی۔ مائی سے بھی نہ کہہ سکی مگر قصہ خمر کر دیں
 ابھی کیا جلدی ہے۔ اسے اس وعدے کے سحر سے آزاد
 تو ہوئے دیں۔ سعود کی بے وفائی کا یقین تو کر لیتے ہیں
 دل پر ہے اس داغ کو مٹ تو جانے دیں۔ جسے اپنی
 کم فہمی کے باعث اس نے محبت سمجھ کر چھپا کر رکھا تھا۔
 کم فہمی کی وہ محبت۔ سعود کی نظر میں کسی کیفیت سے زیادہ
 دلچسپی۔ یا پھر۔ وہ مجبور ہو گیا ہوگا۔

وہ دل کو بھلاتی۔ ماں باپ کا حتی بھی تو بھولے
 انہوں نے اس کے لیے کیا کیا خواب دیکھے ہوں گے۔
 شاید انہیں اعتراض ہوا ہو۔ یا پھر۔ وہ تعلیم حاصل
 کرنے گیا ہی اس لیے ہے کہ۔ کوئی بہانا ہو کہ شنائے
 دور جانے۔ راستہ بدلنے کے لیے۔

ایک دن ٹوہرہ نے کان بے آکر بتایا۔ سعود بھائی
 کی اپنی ان کے لیے لڑکی کی تلاش میں ہیں۔ کوئی پسند آئی
 تو ملنی کر دیں گی تاکہ ان کے آتے ہی فوراً شادی ہو
 جائے۔ سعود کی چچا زاد بہن ٹوہرہ کے ساتھ پڑھتی تھی۔
 اس نے بتایا۔

"چچی کو کسی اعلا دارفہ لڑکی کی تلاش ہے۔ اس کی
 تعریف یہ ہے کہ۔ اچھے کھاتے پیتے گھر لگے کی ہو۔
 (تاکہ جیسے بھی اعلا درجے کا ملے) اعلا تعلیم یافتہ ہو۔
 خوبصورت۔ خوب سیرت۔ خوش مزاج آئی کی ساس کے
 ساتھ کھلی بے تکلفی سے رہے مگر ان کی عزت بھی کرے۔
 اگلے دن ہی ساس کا ہاتھ پیر کر باہر نہ نکال دے۔ یا
 شوہر کا بازو وقفاں کر لگا گھر میں نہ جائے پھرے بل جل
 کر رہے۔ اور بے زبان ہو۔
 سعود کی چچا زاد نے بتایا کہ خاندان میں ایک

میں جان نہ رہی۔ حامد صاحب کے فاضل کے لوگ جمع تھے۔ محلے والے تھے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں، کمال کرتا رہا۔ پھر بڑے ماموں بھی آ گئے۔ بارش نہ ہوئی تھی اور آسمان یوں صاف ہو گیا تھا جیسے کبھی بادل آتے ہی نہ تھے۔ وہ آندھی طوفان بلاغیر جیسی اور وہ بارش کی بغیر، سب کچھ آنکھوں کے مستقبل پر برس گئی۔ آندھی اور بادل ان کے جذبات و احساسات پر چھا گئے۔ پھر بول سناٹا اور تاریکی پھیل گئی۔

عشاء کی نماز کے بعد نماز جنازہ ہوئی اور قربان سے واپس آکر کمال کا ضبط بھی رخصت ہو گیا۔ گھر جیسے ہر ذی روح سے خالی تھا حالانکہ ابھی بھی لوگ مجھے بے ہوش تھے۔ ماں کے کندھے پر سر رکھ کر وہ ہلک ہلک کر دیا تو مجھے آنسو بہانے لگے۔ پھر شنا کو بھی ہوش آیا اور وہ کمرے میں کھڑی ہو گئی۔ ہر طرف آنسوؤں سے بل تھل ہو گیا۔ بڑی پردہ دروازے تھیں۔ کسی کی پلک نہ چمکی۔ تو یہ نہ ڈھال سی پڑی تھی۔ اس کے دونوں ماموں، ممانیاں، ان کے بچے، خالہ بھی تو تھے۔ پھر بھی اسے کیوں لگتا تھا جیسے اب انہیں تو گھر بالکل خالی ہو۔ صبح ہو گئی سب ایک دوسرے سے یوں آٹھیں چڑا رہے تھے۔ جیسے ان سے کوئی خطا ہو گئی ہو۔

ننانا کو اپنی ذات بے کار فضول نظر آ رہی تھی اماں، دادی، اب ماموں کوئی سہارا نہ رہا۔ بعض لوگ کیسا نصیب لے کر آتے ہیں۔ ہر سہارا عارضی، ہر سہارا ناپائیدار، اور اب کیا ہو گا۔ دادی رخصت ہوئیں تو چچا، چچو پھیونے نے نانا تو ڈھیا۔ اب ماموں بھی نہ رہے تو ممانی۔

وہ دہشت زدہ سی بیٹھی تھی۔ رورو کر تھک گئی تھی۔ اسے تو کوئی کا نہ تھا بھی نہ ملا، جس پر سر رکھ کر آنسو بہاتی۔ جب کمال نے اندر آکر اسے بکرا۔ تو وہ خوفزدگی کے عالم میں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی جیسے وہ اس کے جرم کا فیصلہ سنانے آیا ہو۔

”چلو، باہر آؤ، اچھی مل رہی ہیں“ کمال بھی صبر و ضبط کے بہادر سر کر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ جاگاتی رات بھر رو دیا بھی نہیں کمال ابھی بے ہوش رہنے دو۔ میں ممانی سامنا نہیں کر سکتی گی، ضبط کے باوجود ہچکیاں آ رہی ہیں۔

”کیوں؟ تم نے کیا جرم کیا ہے؟“ میں ہوں بد قسمت، سبز قدم، سب کو کھاتی جا رہی ہوں میں۔ کمال حیرت سے بولا۔

”کیا تمہیں شیشہ الہی کا یقین نہیں؟ چلو اٹھو باہر چلو“ وہ زبردستی سمجھا کر باہر لایا تو ممانی نے یوں اسے گود میں بھر لیا جیسے اسے ہر بلا سے بچانا ان کا فرض ہو۔ رات بھر کا خوف ممانی کی آغوش نے چٹ کر لیا۔ دونوں مل کر رونے اور بین کرنے لگیں۔

”ہائے حامد صاحب! مجھے منجھد حار میں چھوڑ گئے۔ ممانی کہہ رہی تھیں۔“

”اسے اب میں کیا کروں گی۔ میرا تو کچھ سوچا ہوتا آپ نے“

شنا رو رہی تھی۔ دونوں کی سسکیاں اور نالے ایک دوسرے میں مدغم تھے۔ پھر ٹوہرہ اور احمد بھی ان سے آئے۔ آنسوؤں میں تیزی آ گئی۔ پھر کمال نے ہی انہیں سنبھالا۔

”اب ہمارا کیا ہو گا بھائی؟“ ٹوہرہ کے معصوم سوال پر کمال تھرا گیا۔ مگر اس کا حوصلہ بلند تھا۔ ذمہ داریوں کا پہاڑ سر پر آن پڑا تھا۔ اسے تو سب کچھ کرنا تھا، دکھے و لوں کا مدد و اعوان کے زخموں کو مرہم بھی چسکا کرنا ہے۔ رات بھر میں کمال جانے کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ غم کا سمندر عبور کر کے مضبوط چٹان بن گیا۔ طاقت و درادرجیہ بالا ہو ا سہا بن۔

نہ جانے دن کیسے گزے۔ تھے ماموں کے لہجے میں غم کی آواز۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔

”اب ہمارا کیا ہو گا بھائی؟“ ٹوہرہ کے معصوم سوال پر کمال تھرا گیا۔ مگر اس کا حوصلہ بلند تھا۔ ذمہ داریوں کا پہاڑ سر پر آن پڑا تھا۔ اسے تو سب کچھ کرنا تھا، دکھے و لوں کا مدد و اعوان کے زخموں کو مرہم بھی چسکا کرنا ہے۔ رات بھر میں کمال جانے کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ غم کا سمندر عبور کر کے مضبوط چٹان بن گیا۔ طاقت و درادرجیہ بالا ہو ا سہا بن۔

نہ جانے دن کیسے گزے۔ تھے ماموں کے لہجے میں غم کی آواز۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔

”اب ہمارا کیا ہو گا بھائی؟“ ٹوہرہ کے معصوم سوال پر کمال تھرا گیا۔ مگر اس کا حوصلہ بلند تھا۔ ذمہ داریوں کا پہاڑ سر پر آن پڑا تھا۔ اسے تو سب کچھ کرنا تھا، دکھے و لوں کا مدد و اعوان کے زخموں کو مرہم بھی چسکا کرنا ہے۔ رات بھر میں کمال جانے کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ غم کا سمندر عبور کر کے مضبوط چٹان بن گیا۔ طاقت و درادرجیہ بالا ہو ا سہا بن۔

نہ جانے دن کیسے گزے۔ تھے ماموں کے لہجے میں غم کی آواز۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔

”اب ہمارا کیا ہو گا بھائی؟“ ٹوہرہ کے معصوم سوال پر کمال تھرا گیا۔ مگر اس کا حوصلہ بلند تھا۔ ذمہ داریوں کا پہاڑ سر پر آن پڑا تھا۔ اسے تو سب کچھ کرنا تھا، دکھے و لوں کا مدد و اعوان کے زخموں کو مرہم بھی چسکا کرنا ہے۔ رات بھر میں کمال جانے کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ غم کا سمندر عبور کر کے مضبوط چٹان بن گیا۔ طاقت و درادرجیہ بالا ہو ا سہا بن۔

نہ جانے دن کیسے گزے۔ تھے ماموں کے لہجے میں غم کی آواز۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔ کمال نے دیکھا کہ ممانی نے دوپٹے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔

والا اور ممانی جو شنا کی شادی کی تیاری میں مگنی ہوئی تھیں۔ اس کی سسرال سے رشتہ توڑنے کے اعلان پر ٹوٹ کر گر گئیں۔ کمال نے ہی سب کو تسلی دی تھی اور ماں سے کہہ دیا۔

”ابھی تو اس معاملے کی شہرت ہوئی نہیں تھی۔ آبا کے اور ان لوگوں کے درمیان ہی تھا معاملہ، اب آپ اسے بھول جائیں۔ کسی کے سامنے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بڑی ممانی سے تو ایک لفظ نہ کہیں آپ۔ سمجھ لیں کہ کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ اب جو بھی شنا کے لیے رشتہ آیا وہ اس کی ذاتی خوبیوں پر آئے گا۔“

کمال بہت سمجھ دار تھا۔ اسے اپنی ذہانت پر ہی دنیا کا مقابلہ کرنا تھا اس نے کتابوں میں ترقی کی راہ تلاش کر لی تھی۔ اس کے چھوٹے ماموں عرصے سے انگلینڈ میں تھے۔ ان کا خط آیا۔ جس میں کمال کے لیے آفر تھی کہ وہ انگلینڈ آجائے۔ وہاں اس کا داخلہ ہو جائے گا۔ وہ اس کی تعلیم کا بار اٹھالیں گے۔ انہوں نے بہن سے ہمدردی کا اظہار کیا اور یقین دلایا کہ کمال دوران تعلیم بھی کوئی کورس کر کے ایسی جاب حاصل کر سکتا ہے جس سے تعلیم میں ختم نہ پڑ سکے۔ اس طرح وہ تمنا ہے بھی کام آ سکتا ہے انہوں نے کچھ اور تجاویز بھی دی تھیں۔ چھوٹے ماموں عرصے سے انگلینڈ میں تھے شاید اسی لیے وہ خاندان کی سیاست سے دور رہے اور وہاں کی آزد فضا نے ان کا ذہن روشن رکھا۔

ممانی تو کچھ بچہ بچہ کرنے لگیں مگر شنا نے کمال کو جانے پر آمادہ کر لیا۔ ٹوہرہ نے فوراً دامخ لڑایا۔ ”بھائی! وہاں سعود بھائی بھی تو ہیں۔ ذرا ان سے بھی میل ملاقات رکھیے گا۔“ سعود وہیں بھی غلوں اور رفاقت کے آثار تھے جب وہ دادی کے گھر سے آئی تھی سعود اور سیمیا بھی آ جاتے اور مکمل مل کر آدھی سے ہنسنے بولنے تب سعود، شنا کی تعریف میں ذرا نہ جھجکتا۔

لے آئے اچھے دن تھے۔
وہ رات تک صبح میں بیٹھے گیم کھیلا کرتے بیت بازی کرتے۔ یہ چاندنی ان پر نور برساتی اور خوشیوں کی کلیاں کھلنے کو لے تپا ہو جاتیں۔ یہ سب احساسات سعودی رفاقت کے ساتھ تھے۔ سعود کی احمی آئیں تو ثنا کو رنگ بنگھانے کے نسخہ بتایا کر میں۔ کتنے اچھے دن، جلدی سے گزر گئے اور کوئی نشان تک نہ چھوٹی۔ انہوں نے دوستی اور خلوص کا رشتہ جوڑ لیا تھا جو بناوٹی ثابت ہوا۔ اپنی موت آپ مر گیا۔

چلو وہ تو تھا ہی مصنوعی رشتہ لیکن جن سے اصلی رشتہ تھا انہوں نے بھی کیا سلوک کیا ماموں کی وفات پر سب کے تار آنے اور بس کسی نے یہ نہ پوچھا ثنا! ماموں تو اب بے نہیں پھر تم کیا اپنی ممانی کے ساتھ رہو گی؟“
ممانی سے ماموں کی وجہ سے رشتہ تھا ناں مگر انہوں نے ثابت کر دیا کہ اصل رشتہ تو محبت کا ہی ہوتا ہے، احساس کا ہوتا ہے، مروت کا ہوتا ہے۔

چھوٹے ماموں انگلیٹ سے آگئے۔ وہ کمال کو ساتھ لے جانے کے لیے خاص طر پر آئے تھے۔ ممانیوں کے سینے پر سائب لوٹ گئے۔ انہوں نے اپنے شوہروں کو آگے کی پوری کوشش کی۔ جیلا جیٹھ کو چھوڑ کر بھانجے کو لے جانا اخراجات اٹھانا مناسب ہے، بھانجا تو عیر مہوا، جیٹھ تو اپنا ہوتا ہے۔ باپ و دادا کی نسل انہی سے چلے گی نہ کہ جھانجے سے۔“
ممانی نہایت ادا اس متفکر بھتیجی۔ ان کے بھائی

گھنٹوں انہیں بچھاتے، تیلیاں دیتے۔ کمال کے روشن مستقبل کے حوالے سے مصر و محل کی لمبیت کرتے پھر وہ کمال کو لے کر چلے گئے۔ جانے سے پہلے کمال نے ماں سے بہت وعدے وعید کیے بہت بندھائی۔ تعلیم ختم ہوتے ہی واپسی کا وعدہ کیا۔
”بیٹا! ہم ایلے رہ جائیں گے۔ اعد بہت چھوٹا ہے اور یہ لوکیاں، زمانہ خراب ہے۔ کوئی آسرا

ہی نہیں، تم بھی چلے گئے تو۔۔۔“
”اچی! اللہ کا آسرا ہے۔ وہ ہمارا مالک ہے محافظ ہے اور یہ ثنا ہے میرا قائم مقام۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ کے انتظام۔ ثنا کو پہلے سے یہاں لایا تھا مجھے بڑا اطمینان ہے۔“
”لیکن اس کی شادی میں کب تک بٹھائے رکھوں گی؟“
”بالکل نہ بٹھائیں فوراً شادی کر کے رخصت کر دیں پھر اللہ تعالیٰ کوئی اور صورت نکال دیں گے۔“

اور ہوا یہ کہ چھوٹے ماموں کے ایک دوست ان سے ملنے آئے تو توہم کا رشتہ دے گئے جسے ماموں نے فوراً منظور کر لیا۔ شادی اس کے بی لے کرنے کے بعد ماموں خود آکر کر گئے۔ یہ طے ہوا ممانی خوش بھتیجی انہیں شادی کی خبر سنی۔ بڑی ذمہ داری ڈال گئے تھے حامد صاحب۔ ان لوگوں کی خواہش پر ٹوہم کو انکو کھلی پہنائی نئی رنگی میں شامیانے رنگا دریاں، قالین بچھائے گئے خوب صورت سے اینچ پر ٹوہم کو لاکر بٹھایا گیا تو سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں سیدھی سادی ٹوہم، سسرال کے بھاری چمکا چوند کرتے جوڑے میں آسمان کی حور لگ رہی تھی۔ پورے دس تو لے کا سیٹ منگنی میں چڑھایا۔ سب کی آنکھیں بھٹ کر رہ گئیں۔ وہ تو بہت دولت مند تھے جیلا اس حقے خاندان میں انہوں نے کیا دیکھا۔ ممانیاں کڑھ کر کھل جھلس چکیں تو ان پر طنز کے تیر برسائے۔

”یا گل میں شاید منگنی میں کوئی دس تو لے سونا دیتا ہے، ارے وہ لوگ پتا نہیں کون سا حرام

کھاتے ہیں اور ان کو دیکھو میاں کے مرتے ہی ان کی تو لاٹری نکل آئی۔ بیٹا انگلیٹ پڑھنے جارہا ہے بیٹی سیریاہ داروں میں۔ بھئی واہ۔ باپ تو مر کا خاندان کو خوش قسمتی کے تحفے دے گئے۔“
ممانی تو شکر ادا کرتے نہ بھتیجی بھتیجی۔ اللہ نے اپنی رحمتوں سے کتنا نواز ا تھا انہیں۔ اعدا اسکول میں ولیفہ مقرر ہو گیا۔ اس کی ذہانت اور قابلیت

العام میں افس اور دیگر اخراجات معاف ہو گئے۔ سنا تھا مبارکباد دینے آیا۔ بڑی ممانی اس طرح خوشی کا اظہار کیا۔
”سیدہ! احادیث کے مرتے ہی تمہارا تو سب ہو گیا۔ بھئی واہ!“
”سیدہ! دل خوشی سے بولیں۔ ان کے سامنے بھی کہہ دیا جیسا جان قسام ازل نے، ہی کچھ لکھ لکھا جو نصیب میں تھا وہی قدرت کے اشارے سے ہوا ہے۔ ہاں یہ دکھ ہے کہ وہ زندہ ہوتے تو اس قدر خوش ہوتے۔“

وہ زندہ ہوتے تو مکمل میاں کمال کو کیوں لے جاتے، پڑھانے کے بہانے، وہ طنز بھیتیجی۔
”حامد میں نہیں تم پر احسان بھی ہو گیا، لو کا بھی ماموں آگیا۔ آخر تین بیٹیاں ہیں۔ ایسے ہی کسی کمزور کو بڑے بولیں گے اب دیکھو نیا شکار کون ہوتا ہے۔“
ممانی تو پریشان ہو گئیں۔ وارکار دی پڑتا دیکھ کر مال اور بھی شہر ہو گئیں۔ اگل کی بیٹیوں کی عادات پر تھکے۔ ان کی بیوی کی بد مزاجی، بیٹی خوری کی مادت، لوکیاں بے جا تنگ مزاج۔ ممانی ان کے ہانے تک ضبط کرتی رہیں۔ پھر جوڑویں تو انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وجوہات سن کر ثنا اور توہم سے سر پھٹ لیا۔

”ای! کمال کر رہی ہیں آپ۔ ابھی تین سال پہلے ان کی ممانی لڑکیوں کو لے کر آئی تھیں۔ دیکھا تھا آپ نے۔ بھئی بھاری ہیں۔ چھوٹی ممانی بھی تنہا خوش مزاج اور سادہ طبیعت کی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اگر رہی تھیں۔ کتنا خوش و خرم تھے سب۔“
”اور ممانی! اگر کمال کو یہ رشتہ پسند آیا تو جو بولے

”ای! کمال کر رہی ہیں آپ۔ ابھی تین سال پہلے ان کی ممانی لڑکیوں کو لے کر آئی تھیں۔ دیکھا تھا آپ نے۔ بھئی بھاری ہیں۔ چھوٹی ممانی بھی تنہا خوش مزاج اور سادہ طبیعت کی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اگر رہی تھیں۔ کتنا خوش و خرم تھے سب۔“
”اور ممانی! اگر کمال کو یہ رشتہ پسند آیا تو جو بولے

سے ہی خیرے بازوں کا۔ یہ تو ہم ہی ہیں سیدھے سادے خاکسار طبیعت کے۔ آپا پر گئے ہیں ہم۔“
”چل۔ شعی خوری، ممانی ہنس دیں۔“

”آج ای! اگر بھائی کی شادی کے لیے ووٹ ڈالا گیا۔ تو میرا ووٹ تمہیں کے حق میں ہوگا۔ آج حسین لڑتی ہے۔ پیارے پیارے بچے ہوں گے۔ ہماری نسل سنور جائے گی۔“

”میرا کمال کچھ کم ہے۔ ممانی خیرے بولیں۔ اب ان کا دل کچھ بھڑا تھا۔“

بڑی ممانی کے پھیرے اب کافی بڑھ گئے تھے۔ ساتھ ہی پر و پگنڈا ابھی ترقی پر تھا کہ کمال کو اگل کے ضبط کر لیا ہے۔ کور و مادی کے لیے۔ بڑی ممانی کے آگے ہی ممانی کو گھبراہٹ ہو جاتی۔ ان کے چکر کے ساتھ ممانی کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو جاتا۔

یوں لو کمال پابندی سے خط لکھ رہا تھا مگر کبھی دیر بھی ہو جاتی۔ کبھی پڑھائی کا زور کبھی ٹیٹ کی تیاری

جہیز استعمال کیا وہ جانتے ہیں
سوہنی میسرائل کی خوبیاں
○ کرتے ہاں کو روکتا ہے
○ بال بچے اور گھنے کرتا ہے
○ ہاں کو مضبوط اور پگنڈا بناتا ہے



سوہنی میسرائل
کیا آپ نے اسے استعمال کیا؟ نہیں قیمت 60 روپے
تو ایک دفعہ استعمال کر کے دیکھیں۔
ملنے کا پتہ
۳۷ اردو بازار کراچی

اس بار بھی دو مہینے سے خط نہیں آیا تھا۔ بڑی مومالی کے سامنے ذکر ہوا انہوں نے کہہ دیا۔
"بس اسی طرح رفتہ رفتہ تم سے دور کیوں گئے گئے ہوں گے اسے کہیں میرے دفتر کے لیے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر تو ہوتے ہیں لوگوں کو پھانٹنے کے۔ بڑی جلیتر ہیں اکل کی دلہن۔ جی نہیں یہ سب نہیں آتا"

کمال کا خط آیا تو خط نہ لکھنے کی معذرت لکھی تھی۔ اور وجہ یہ کہ وہ ماموں کی فیملی کے ساتھ میر و قزاق کے لیے کہیں گیا ہوا تھا۔ ماموں نہیں جا سکے۔ تو اسے لے جانا پڑا۔ پھر اس نے ان مقامات کی خوبصورتی و قدرتی مناظر کی دلکشی اور سب کے ساتھ دلچسپ گفتگو اس نے بڑے مزاج پر اسے میں لکھی تھی۔ مامی کے دل کو کھٹ سے جا کر پھینچ گیا۔ مگر مندر یہ کہیں۔ لیکن تو یہ اور ثنا مرنے لے لے کر بار بار پڑھتی رہیں۔

"دورا دلش بھائی جان ہمارے نے فوراً احتیاط دے ڈالا کیسی پیش گوئی یہاں بیٹھے ہوئے کر دی۔ اب کمال جس ہی نہ جاتے" انہیں خبر نہ تھی کہ

کمال کو وہاں چھوٹا موٹا کام مل جاتا تھا۔ اور وہ کچھ پیسے بھی دیتا تھا۔ مگر اس میں ظاہر ہے کہ تمام اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ کچھ دیر سویر بھی ہو جاتی تھی ثنا چلنے سے اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکال لاتی۔ پھر ثنا نے آخر برسوں کے لیے ارادہ کر ہی لیا۔ کچھ تو کرنا تھا تاکہ ماموں کو کبھی کی ضرورت نہ پڑے۔

وہی مسز ماجد کا انگلش میڈیم اسکول اس کاروری رسالہ بن گیا۔

مسز ماجد کافی سویر شالیز اور معقول خاتون تھیں۔ کچھ تو ثنا کا تعلیمی کیریئر پھر اس کی ظاہر ہی تھیں۔ خوش لبا ہی تھیں۔ جانتی تھیں۔ مسز ماجد اس سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ تو یہ نے بھی کچھ پڑھتیں تو میٹروں پر چھانا شروع کر دی۔ مگر اسے اخراجات جیسے پورے ہر جاتے۔

دو سال نہ گئے تو کمال نے پابندی سے رقم بھیجنا شروع کی۔ کچھ اطمینان ہوا تھا کہ مامی پر فالج کا حملہ ہوا۔

بڑے ماموں مومالی حج کرنے گئے ہوئے تھے۔ ماموں بیمار تھے۔ انہیں کہتے تھے۔ ثنا پر سارا بوجھ تھا۔ اسکول کی ذمہ داری، ڈاکٹر کے ہاں بھانج دوڑنا مافی کی دیکھ بھال۔ فالج وائیں جانب ہلکا سا تھا۔ مگر انہیں لٹا دیا تھا۔ جسے شام ساٹھ بجے ثنا بھی ششاپی کرتی تھی۔ اور پر ہنری کھانا بھی خود تیار کرتی۔ تو یہ کو پڑھانی کرتی تھی۔ امتحان نزدیک تھے۔

ثنا بہت پریشان تھی۔ لیکن اس نے کمال پر اپنی پریشانی کا اظہار نہ کیا۔ نہ ہی تو یہ پر بار ڈالا۔ اس کا سال خلع ہونے کا خطہ تھا۔

اس دن دو شام کو مسز ماجد کے ہاں گئی۔ ان سے مامی کا حال کبیر کبیر بندہ دن کی چٹھی مانگی۔ اور ایک مہینے کی پیش گوئی خواہ مسز ماجد اس کے جذبہ انسانی اور احساس خدمت سے متاثر ہو گئیں۔ وہ اس سے یوں بھی خاصی متاثر تھیں۔ مٹا وائیں آتی تو دروازے پر چلنے پہلے قیوں کی آئیں جھٹیں۔ جو شہنشاہی نظر تھا۔ کڑو لکھا۔ اپنی جگہ کر رہی تھی۔ پوروں نے جنبش ہی نہ کی۔ نظریں انہیں تو ایک جگہ آٹک کر رہ گئیں۔

سعود کہتے دن بعد ساقوں پر لپٹا ہوا تھا۔

"میلو" سعود کے لیے میں پچھلی ہٹ تھی۔ اس کی نظریں بھی ثنا پر گڑھ گئی تھیں۔

کئی دہلی اور کدوڑ ہوئی ہے۔ ثنا اور اداس۔ ثنا تھا اس کی منگی بڑی دھوم دھام سے دولت مند گھر میں ہوئی ہے۔ خوشی یا اطمینان کی کوئی دھن تو نظر نہیں آتی۔ سوکھے ہونٹ۔ اور کھانا چہرہ۔ اس کی وہ دلکش مسکراہٹ اور چہرے کی شادابی کہاں گئی۔ دولت مند گھرانے کی کوئی نشانی تو اس کے شہر میں نہ تھی۔ انگوٹھ نہ بنے۔ اتنی نے بنایا تھا کہ منگی میں اسے بہت بھاری سیٹ چڑھا ہوا لگتا ہے۔ وہ تو چند دن پہلے شادی کے لیے آیا تھا۔ ماموں کے پرستے کے لیے آنے لگا تو اتنی نے سما کی شادی کے کارڈ پر ڈیڑھ ایسے اچھا نہیں لگا۔ تو اتنی بھی ساتھ آگئیں۔

مامی کو اس قدر بیمار دیکھ کر بہت پریشان ہوا تھا۔ وہ ان سے تو بس ماموں کی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ یا مامی اپنی بیماری کا حال بتاتی رہیں۔ مٹا کی منگی کا ذکر

اس نے ہوا۔ پھر اتنی نے جلدی جلدی کر کے اسے اٹھادیا۔ اور وہ رفتی کا سلام کرنے میں دس منٹ لگا چکی تھیں۔ پھر دو آگئیں۔ اور ثنا پر اجنبی نگاہ ڈال کر سعود کو بچنے کے لیے لیں۔

مگر اگر بھی سعود کافی دیر اداس اور تنگ رہا۔ ثنا کہیں اس آخر سے چلے میں بھی نظر آئے گی۔ یہ تو تصور بھی نہ کیا تھا۔ آخر کیا تکلیف ہے اسے کون سی پریشانی ہے کہ وہ اس قدر مر جاتا ہے۔ اس کی وہ باتیں بھری نگاہ جو سعود کی آنکھوں سے اٹھ گئی تھی۔ بس دیر معطل کر رہی تھی اسے۔

مامی نے اس کی جانب کا بنایا تھا۔ تو کیا اس کے دولت مند سرسرا والوں نے اجازت دے دی ہے؟ اعزاز نہیں کیا؟ یا پھر ان سے جبکہ آخر وہ اپنی اداس اور بے بسی کی تصویر کیوں نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت مہر کی گئی تھی۔ کیا اسے منگی کے لیے مجبور کیا گیا تھا؟ اس پر جبر ہوا ہے؟ کیا وہ اب بھی سعود کی نظر سے ہے؟ کیا وہ آج بھی۔

سما کی شادی ہو رہی ہے۔ یہ خبر اسے تو میرے دی تھی۔ اگر اسے پہلے خبر ہو تو دروازے کے باہر جواب منٹ کی ملاقات ہوئی۔ اس میں وہ سعود کو مبارکباد دے دیتی۔ یا پھر کچھ بھری وہ ملاقات جو سادو کی امی سے ہوئی اس میں مبارک ہو کا لفظ ادا ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کی نظریں سعود پر اور سعود کی اس کے چہرے پر کھینچ لاش کرتی ہوئی لگا رہیں۔ دیکھ کر ہی تنیدہ رہی۔ پر لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے اور وہ سعود کو بازو سے لپیٹتی ہوئی باہر کھینچ گئیں۔

سعود بھی کسی معمول کی طرح کھینچا جا گیا۔ رشوق بھرا لہجہ نہ بولیں پر مسکان پھر یاد آئی۔ اٹھ اٹھیں۔ اعلا ارف کی تلاش میں ہیں۔ جھلٹا ثنا پر سعود کی نظریں جھٹتی کب دیکھ سکتی ہیں۔ خفگی ہے۔ اب وہ ابھر تے اور پوزیشن کے مطابق ہوا لاسکی ہیں۔ ان کا بیٹا انگلیوں سے پڑھ کر آیا ہے۔ اسے اچھے سے اچھا رشید مل سکتا ہے۔ حسین ترین لڑکی بھی۔ مگر سعود تو حسین ترین پر یقین نہیں رکھتا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ لندن کے گوری جی پر ہی لے آتا۔ اس نے تو ہمیشہ ثنا کے ساتھ بے تک

نیکین حسن کو سراہا تھا۔ گو کہ محبت کا تو اظہار کبھی نہ کیا مگر زندگی گزارنے کے لیے اسے سنا جی لڑکی کی ضرورت ہے۔ یہ وہ کئی بار کہہ چکا تھا۔

اور تنہا ہی اتنی؟ ثنا نے تو جھانکا تھا۔ مان جانی گی۔ انہیں کچھ پر بھروسہ ہے اور ہمارے ماموں کی بہت مدد ہے۔ پھر تیار خاندان بھی خاصا معزز ہے۔ وہ اس سے مغرب بھی ہیں۔ دراصل پوزیشن والے لوگوں سے وہ دب کر ملتی ہیں۔ بہت قدر دل ہیں ہمارے خاندان کی۔ دادی کی

مگر یہ پرانے زمانے کی بات تھی۔ اب نہ خاندان کا ساتھ اس پر ہے نہ دادی۔ پھر کون قدر کرے۔ کس چیز کی قدر کرے۔ اس کے سادہ ہے نفوس۔ اور ساڈا دل۔ دولت کے بغیر کتنا لاوار لگتا ہوگا۔ اور جی اچھی۔ ان کو کیا ہے۔

آج تک خیال نہ آیا کہ ایک عرصہ یتیم بستی ہے جو ماموں کے مرنے کے بعد تنہا رہ گئی ہے۔ اسے ان کی دستگیری کی ضرورت ہے۔ کبھی دو حرف لکھ کر نہیں ڈالتے۔

اب تو ماموں کے خطوط بھی بند ہو گئے تھے۔ چلو۔ وہ اس طرح خوش ہیں تو خوش رہیں۔ میں کب ان سے کچھ لکھ سکے گی ہوں۔ اس نے کتا سانس لیا۔ وہ صابر اور ہر حال میں مطمئن رہنے والی لڑکی تھی۔ خاصا حوصلہ تھا اس میں۔

ہاں مگر سعود کی بات الگ تھی۔ اسے سعود سے شکایت تھی۔ نہ جانے کب اس کے دل میں ابلسا تھا وہ سعود بھی جانتا تھا۔ شام کے دل پر اس کا راج ہے۔ بھی تو اس پر حکم چلاتا تھا۔ اور اگر وہ اس کے دل سے اترتی تو جس طرح ایک عہد ایک دوسرے کی زنجیر سے اسے باندھتا تھا۔ وہ فطرت سے اسے تو بھی سکتا تھا۔ اگر زبان سے نہیں۔ تو خط کے ذریعے ہی۔ اسے ایک معصوم لڑکی کے جذبات میں آگ لگا کر کیا ملا۔

انگلیوں میں تو قدم قدم پر حسینوں کے جلوے ہوں گے۔ شاید کسی سے دل لگایا ہو۔ پھر جھلکا ہاں ماد آئی ثنا۔ غربت کی ماری۔ یتیم لے گئی۔ اور آج آیا بھی تو کس قدر بگڑا۔ اس نے حال پوچھنے کی

زحمت تک نہ کی۔

شناعر سے بعد بے کل ہوئی تھی۔ وہ توسعود کو جھلا دینا چاہتی تھی۔ مگر اسے دیکھ کر پتا نہیں کون سے جذبے نے نقاب ہونے لگے۔ دل تھا کہ اسے قزاقی نہ تھا۔ چکر لکیر پیر کر گئی۔ لیسر اس کے آئینوں کا امین۔ بے چینوں کا گواہ تھا۔ اور۔ شب بیداریوں کا دانا دل دیتی تو ممدردہ گنا تھا۔ اب جتن سے لیٹ کر سارے دکھ کھڑا لیتی تھی۔ لیسر پر گری تو اٹھائی نہ گیا۔

الگادان۔ چچی کا بیٹا دل تھا۔ مہربانی ہو رہا تھا۔ دیر تک لیٹی رہی۔ پھر کھڑک مامی کے کمرے میں چلی گئی۔ تو بیہوش ہوا نیک لیا۔ مامی کے لیے سوپ اور سالن بھی بنالیا۔ شنا کو آرام کرنے کا کہہ کر وہ نہانے چلی گئی۔

مامی کو کھانا کھلا کر شنا پھر اپنے کمرے میں آگئی۔ سہ پہر کو ابھی تو صبح کھانے صبح والے ہاتھ روم میں آگئی۔ چپن سے آوازیں آرہی تھیں۔

تو بیہوش ہوئی۔ ارشدہ آئی ہوئی تھی۔ ارشدہ کا گھڑا گلی کے کونے پر تھا۔ کسی زمانے میں ان کے ساتھ والے گھر میں سعود رہتا تھا۔ اسی لیے اس کی دوستی سب سے تھی۔ حالانکہ باغ میں اس سے بڑی تھی بلکہ وہ شناعر سے بھی بڑی تھی۔ سعود کی امی ارشدہ کی امی سے اب بھی تعلقات قائم کیے ہوئے تھے۔ اور محلے والوں کا خیال تھا کہ شاید وہ سعود کے لیے ارشدہ کو پسند کر رہی ہیں۔ ارشدہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ ان لوگوں کا آپس میں آنچا نا تھا۔ بلکہ جب سعود کی امی ارشدہ کی امی سے ملنے آتیں تو محلے کے دوسرے لوگوں سے بھی گھڑی بھر کر ملنے آ جاتیں۔

شنا و صو کر کے ہاتھ روم سے نکلنے والی تھی تو اسے ارشدہ کی آواز آئی۔ وہ کچھ جوش میں بلند آواز کر بیٹھی تھی۔

”اچھا اچھا نہیں لگا۔ سب کی امی یوں حقارت سے بات کر رہی تھیں۔ جیسے خود بڑے لکھنواروں میں کتنے لکھن سعود تو باطل ہے۔ لکھن سے بھی لکھتا تھا یہاں اگر بھی بڑا شور مچا یا اس نے جھلا اس کلو میں کیا دیکھا۔ مجھے تو حسین سے حسین بہو مل جائے گی مگر

سعود۔ شنا نہیں تو کوئی نہیں کی رٹ لگائے رہا۔ اس قدر کوشش کر کے تو اس گلی کو چھوڑ کر آئے ہیں۔

اب پھر اسی لکھن میں بنانا چاہیں۔ پھر شنا میں ہے کیا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا تھا توئی۔ لیکن کیا کہتی۔ آئی تھی ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں سوچا انہوں نے کہ اسی گندی گلی کی رہنے والی ان سے ملنے آئی ہے جس سے وہ مغالطہ ہیں۔ اور وہ جوان کے خوشبو دار محلے میں آکر کھینچتا رہی ہے۔ اس قصے میں، میں انہیں یہ بتانا بھول گئی کہ منگی تو بیہوش ہوتی ہے شنا کی نہیں۔

”مہربان سعود بھائی کو بتا دیتی ہیں۔ تو بیہوشی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”ہاں۔ تاسکلی تھی۔ والیس میں دیکھا تھا اپنے لان میں بیٹھے ہیں۔ سلام کرنی ہوئی آئی تھی۔ مگر جان کر یہ غلط فہمی رفع نہ کی۔ ہم خود سوچو۔ جہاں اس قدر ذلت کی جائے۔ حقارت اسے اس گلی کا فخر ہو۔ لوگوں کو خراب الفاط سے یاد کیا جائے۔ اس گھر کے عیش آرام الگ۔ کیا یہ ذلت ختم کوئی رکھ کر بدانت کر سکتی ہے۔ شادی کر کے تو تاجر سنا پڑے گا۔ فردودہ کی نسبت میں کیلے گا۔“

”شادی تو فردو واحد سے ہوتی ہے ارشدہ سارے خاندان سے نہیں۔“ تو بیہوش نے کہا۔

”نہ۔ میرا یقین ہے۔ محبت فردو واحد سے۔“

شادی خاندان سے۔ یہی اصول بہتر ہے۔“

پھر بھی نہیں سعود بھائی سے کہنا چاہیے تھا۔ اس دن آئے تو آیا کا افسوس ہی کرتے رہے۔

اور کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ جلدی میں تھے۔

”خیر۔ اب آئیں تو تادنا۔ مجھے تو اس قدر غصہ آ رہا تھا کہ سما لیکار نہ گئی۔ میں گیت سے باہر نکل آئی۔ اب تو میں نے تو یہ کی۔“

”تو یہ نہ کرو۔ کیا بتا ممتا سے نصیب اسی خوشبو دار محلے میں جاگئیں۔“ تو بیہوش شرارت سے بولی۔

”خوشبو دار محلے کے مکھن اگر بدبو دار سوچ رکھتے ہوں۔ تو میرا ان کو دور سے سلام۔ دیکھنا۔ جس گلی میں آپ پندرہ سول سال رہ کر گئے۔ جہاں کے لوگوں نے عجیب بانی ہوں۔ خلوص لٹا یا ہوا۔ اور جہاں آپ

طوبہ صبر و استقامت گزارے ہوں، وہاں سے دور جا کر اس میں آپ کو بدلہ آئے۔ یہ تو اس محبت اور خلوص کی بات ہے۔ جو ہم لوگوں کی طرف سے ملتی رہی۔ بلکہ میں سب اسی طرح جا کر ملے ہیں۔ وہ خود بھی آئی۔ مگر رشہ نہیں کر کے گندہ لگی میں۔ مجھے رشہ آپ دل کا لیں گے کہ گلی کا چہ بڑے جوش میں تھی ارشدہ۔ چور و بھتیجی۔ بہت حساس ہوتے ہیں۔“

تو بیہوش بات ٹال دی۔ وہ دوسری باتوں میں لگ گئیں۔ شنا اپنی جگہ پھر بیٹھ کر رہ گئی۔ پھر جانے اس لڑکے اپنے کمرے میں آئی۔ نماز ادا کی۔ دعا کی۔ لیہ باجھ جھیلانے تو آئینوں سے ٹپک گئے۔

تو بیہوش ادھر امتحان سے فارغ ہوئی۔ ادھر اس کے پاس سسر آگئے۔ ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جا رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے تو بیہوش ساتھ جاتے۔ انہوں نے کمال اور اکمل سے بات کر کے منظوری لے لی۔ ایک مہینے کے اندر نکاح۔ اور رخصتی۔ اور دو دن بٹنے بعد باپیورٹ ویزا کے مسائل حل ہونے کے بعد اسے امریکہ جانا تھا۔ مامی کے ہاتھ پر پھول لگا کر۔

”یہ کسے ہو سکتا ہے۔ میں۔ بیمار۔“

”آپ کو کچھ کرنا نہیں ہے۔ ہوش نہم خود کر کے لیں گے۔ پس آپ کی اجازت دے کر رہے۔“

اور انہوں نے اکل اور کمال سے مامی کی بات کرادی۔ کمال نے کہا کہ وہ خود تو بیہوش کو لندن میں لے کرے گا۔ لندن میں چند دن گزار کر پھر لوگ امریکہ جائیں گے۔ اب مامی کے پاس کوئی عذر نہ

تھا۔

پہلے ماموں نے معقول رقم کا انتظام کر دیا۔

بڑے ماموں لوگوں نے اگر خود داری سنبھال لی۔ مہم تو نہ مانا تھا۔ ایک سوٹ کپڑوں کا۔

دوسرا چادر و وغیرہ کا۔ حیران و ششدر تو بیہوش دین کی پھر رخصت ہوئی۔ اور ایک ماہ کے اندر امریکہ روانہ ہو گئی۔

جب وعدہ پہلے چند دن کمال اور اکمل کے ساتھ گزار کر امریکہ گئے۔ تو بیہوش نے انگلی بند کچھ

فون کیا۔ اور پھر امریکہ جا کر بھی۔ فون ٹھیکہ کے گھر آیا۔ شنا اور احداثات کر کے آئے۔

تو بیہوش شادی ایسے ہوئی جسے چادوسے دہلیا ہوا لکھڑے پر سوار آیا۔ اور وہاں تو اٹھا کر لے گیا۔ کشتہ دن تک پورے محلے میں ذکر ہوتا رہا۔ تو بیہوش کے جانے سے گھر ایک دم خالی ہو گیا۔ شنا اور احداث کے اسکول جانے کے بعد مامی اکیلے رہ جائیں۔ چونکہ محلے میں ان کے خاصے تعلقات تھے۔ اس لیے کوئی نہ کوئی خالون گھنٹہ دو گھنٹہ ان کے پاس آ جیتی۔ پھر ارشدہ کی امی نے ایک سوہ عورت ان کے گھر بھیج دی۔ جو کھانا وغیرہ بھی پکا لیتی۔ گھر کی معنائی اور مامی کی دیکھ بھال، کھانا کھلانا۔ لباس تبدیل کرنا وغیرہ شامل تھا۔

شنا کی ایک فکر دور ہوئی۔ مامی کو اب خاصا آرام تھا۔ وہ مطمئن بھی تھیں۔ نصیبین ہوا ان کی خدمت کرنی تھی۔ ہاتھ پیر کی مالش بھی۔ جس سے ان کے ہاتھ میں جیتھل ہونے لگی تھی۔ مامی اس سے خوش تھیں۔ انہوں نے نصیبین سے کہا۔ کہ کوئی معقول رشہ نہ کرانے والی عورت ہو تو اسے یہاں لانا نصیبین لگے دن ہی ایک عورت کو لے آئیں۔ آئی نے شنا کو بغور دیکھا۔ بڑی طرف سے جانچا۔ کھا۔ چال کیسی ہے۔ آوارگی سے کچھ مامی سے سرگوشیاں کیں۔ اس طرح کہ ہر لفظ شنائی سماعت تک رسائی کر گیا۔

”لوگ تو بہت دہلی ہے۔ کیا بیمار ہے۔ رنگ کم ہے۔ لگتا ہے۔ عمر زیادہ ہے۔“

”نہیں۔ عمر تو زیادہ نہیں۔ مامی کو صرف عمر کے انداز سے براہ عمل تھی۔“

”بی بی! آپ نے چھوٹی کو پہلے یاہ کر چھا نہیں کیا۔ اب تو سب ہی یہ کہیں گے چھوٹی۔ بیہوش گئی۔ بڑی بیٹھی ہے۔ اس سے عمر کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔“

سب تو یہی کہیں گے کہ بچی عمر کی ہے۔ کیا یہ کبھی بنتی نہیں۔ لوگ ہنسی مسکراتی تو لکھن شنائی پسند کر لیتے ہیں۔“

”ہنسنے والے حالات ہی نہیں رہتے۔“

مامی سر دھاک بھر کر رہ گئیں۔ ہنسی بھی مسکراتی بھی تھی۔ شرارتیں کرتی تھی۔ او دم چال تھی۔ اور یہ وہ

زمانہ تھا۔ جب ماحول زندہ تھے۔ وادی زندہ تھیں۔ اور سمندر زندہ تھا۔ اس کا بھی شمار زندوں میں ہوتا تھا۔ مگر اب وہ تو خود کو زندہ لوگوں میں نہیں گنتی تھی۔ جب کوئی اٹھک ہو نہ خوشی امید نہ اس۔ پھر سانس کی آمدورفت ہی زندگی کی گواہ نہیں تھی۔ کمال نے لکھا کہ گھر پر فون لگوا دیں اور فون سے بھی بات کر لیں گے۔ تو یہ اکثر اس ہوجانی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کو فون کر لیتا ہوں۔ وہ بھی کرتی ہے۔ دراصل کلین اور زمین سے اس کی دوستی ہو گئی ہے۔ وہ لوگ بھی اکثر اسے فون کرتے ہیں۔ فون سننے کے لیے تم کو تشکیک کے گھر جانا پڑتا ہے۔ جو مجھے پسند نہیں۔ اس کا بھائی لکھ لکھ کا دوست نہیں کسی اور قریبی پروردگار کا بننے کے رکھے لکھو۔ مگر وقت پر بلا دینے والے لوگ ہوں۔ ناک بھوں نہ پڑھا ہیں بلانے کے نام سے۔ تم فوراً فون کی درخواست دے دو۔

اس دن ارسہ تو یہی کی قیمت دریافت کرنے آئی۔ تو اس نے خوشی سنائی کہ ان کے گھر فون لگ گیا ہے۔ مٹا خوش ہو گئی۔

اچھا ارسہ! اگر کمال کا فون آئے۔ تو تم ہمارے ہاں اطلاع کروادو گی؟ وہ پھر دوبارہ کرے گا۔ پانچ منٹ بعد۔

ہاں۔ ہاں۔ میرا چھوٹا بھائی نہیں تو کر رہا ہے۔ بھائی وہ بڑی ہر کسی کو اپنا منہ دے دیا ہے۔ اب ہر پانچ منٹ بعد فون آتا ہے کہ فلاں کے گھر سے فلاں کو بلا دو۔

کمال نے لکھا ہے کہ گھر پر فون لگوا لو تاکہ آسانی سے بات ہو جائے۔ تو یہ ادا اس ہوجانی ہے نا۔

تو ہمارے ہاں کر لیا کرے۔ میں بھی بات کر لوں گی۔ بڑا یاد آتی ہے۔

لیکن گھر پر لگوانا بھی ضروری ہے۔ تمہیں کرنا پڑتا ہے ہاں سے کر لیا کرو الگ سے فون لگوانے کی کیا ضرورت۔ مہمانی سعودی عرب چلے گئے ہیں۔ خوب گارہے ہیں۔ کوئی فکر ہی نہیں۔ ہاں۔ شادی میں کوئی نہیں گیا۔ تمہارے ہاں سے؟

کون جاتا۔ مای پوار۔ احمد لا پروا یا

تم آجائیں یا۔ اٹھے تو کیا باقی نہیں انہوں نے؟ اس نے کہا۔ ارسہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

سینا کی اٹی بہت خوش تھی۔ کہہ رہی تھیں۔ بہن اس غلے سے لکھو کی لوگوں کے اچھے رشتے آئیں گے۔ میں دیکھو وقت سے پہلے نکل آئے ہیں بھی سہا کی ابھی جبکہ شادی ہوئی۔

ارسہ، شناسے یہ سن کر کہ اسے نہیں بلایا گیا۔ بات ان ہی کر گئی۔ اچھا۔ تو پھر اس گندی گلی کو چھوڑ کر کسی خوشبودار محلے میں کب جا رہی ہو تم؟

ہائے۔ اس کو تو یہی کہی تھی کہ تادیا تھیں، میں نے منع بھی کیا تھا۔ امی تو یہ حملہ نہیں چھوڑ رہیں۔ کبھی ہیں اپنی محبت اور غلوں کہاں سنے گا۔ اتنے اچھے پروردگار کے رشتے داروں سے زیادہ ہمدرد۔

تو پھر اچھا رشتہ لے آئے گا؟

آج بھی گیا۔ وہ بے ساختہ ہنس کر بولی۔ شناسا اپنی دراصل اچھے رشتے گلی غلوں کو نہیں۔ پوزیشن دیکھ کر آتے ہیں۔ دولت بہ جنتی۔

کیسے پتے کی بات گئی تھی ارسہ نے بہت ذہین اور حواس تھی وہ۔

تو تم بھی اب پرانی ہو جاؤ گی؟

جی۔ لڑکیوں کے ساتھ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ماں باپ پال پوس کر بڑا کرتے ہیں۔ پھر اپنے ہاتھوں سجا بنا کر فروخت کر دیتے ہیں۔

ہیں ہیں۔ کیا کہہ رہی ہو ارسہ۔ اس طرح نہیں کہتے۔ یہ تو خدائی قانون نکل کرنے اور بقائے نسل انسانی کی خاطر ضروری ہوتا ہے۔ فرض ہے ماں باپ پر۔

ارسہ آبدیدہ ہو گئی۔ ہاں۔ پھر غروں میں کیوں جینک دیتے ہیں۔ اینوں کو تو خاندان کی لوکیاں نظر ہی نہیں آئیں، غبورا؟ وہ چپ ہو گئی۔ شناسا کو نہ جانتے کیوں اس سے ہمدردی ہو گئی۔ یہ چھوٹی عمر کی خناس لڑکی دل میں کیا کچھ پال رہی تھی۔

دیکھو ارسہ۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ خاندان کے لوگ آگے بڑھیں۔ جب انہیں سامنے بھی لڑکیاں نظر ہی نہیں آئیں۔ تو ماں باپ خود سے نو نشان دی کر تے شرماس گئے نا۔ اور پھر ایک خاندان میں مسلسل شادیوں کے نقصانات بھی سامنے آتے ہیں۔ اس لیے بھی اب لوگ بچتے ہیں۔ ماں باپ واقعی مجبور ہوتے ہیں۔

غروں کا کوڑا کرکٹ بھی انہیں چمکتا نظر آتا ہے۔ اور اپنی کی بلیاں ناکارہ۔ شناسا آتی، ہمارے اپنے خاندان میں ہی تکتے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ دوسرے خاندان سے ہو باہر لائے۔ وہ نہ جانتے کن بیاریوں کی وارث تھی لاکھ ہاں بھی تقسیم کر دیں۔ یا نہ نہایت ناکارہ، بد نفس نکلے۔ اب بچھٹانے ہیں کہ اپنے خاندان کی ہی اچھی رہتی ہے۔

دیکھو۔ کوئی جان بوجھ کر تو ناکارہ چیزیں نہیں ہٹا کر تا۔ قسمت بھی اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ اور پھر شناسا بے جوڑے تو آسمان پر بن جائے ہیں۔ میں تو اس تاول کو نہیں مانتی۔ ویسے ہی وثوق سے تو دعویٰ نہیں کر سکتی۔ آخر تجربے کا نہیں ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ قسمت کو مورد الزام ٹھہرا کر لوگ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ آج ہماری

ہی اماں کو دیکھیں بڑے فرو ناز سے ایک حسین بیری چہرہ با حقیقت باب کی بیٹی بیاب لائیں۔ جو ٹک بھر چہرہ لائی اور وہ خود اس اعلیٰ ترین چیز کی عظمت میں پیش پیش رہیں۔ اب ان کی زبان پر آئی ہو کہ بے رحمی اس قدر نامناسب الفاظ بڑھتے ہیں کہ میں تو سن کر ہی تڑپ جاتی ہوں۔ پہلے تو آپ نے مختلف ماحول

میں بڑھ کر ذلیل ذہنیت کا مطالعہ نہ کیا۔ اب بچتا رہی ہیں۔ میں نے ان کے ان کے آگے شہزادیوں کے سامنے بیٹھ کر اب بھی اماں کو میری آپا بہت یاد آ رہی ہیں۔ جنہوں نے سسرال میں اپنے قدم جمالیے ہیں۔ ساس

شہزادی خدمت۔ نندوں سے پناہیت اور دیوروں کو بھائی بنا کر اپنے شوہر کے دل پر راج کر رہی ہیں۔ اور پھر سسرال میں ان کی عادات کا ڈنکناٹ

ہاں ہے۔ جی اماں کو اپنے بیٹے کی شادی کے وقت آپ نظر نہیں آئیں۔ حالانکہ ان کے بیٹے تو خاندان میں

ہی۔ خیر اب دوسرا بیٹا ہے۔ جس نے واضح طور پر میرا نام لیا ہے۔ تو انہیں چھوڑیں ہزاروں خامیاں نظر آ رہی ہیں۔

ارسہ بہت افسردہ نظر آ رہی تھی۔ آج پہلی بار وہ شناسا سے اس قدر کھل کر گفتگو کر رہی تھی شاید دل کا غبار نکالنا چاہتی تھی اس کی افسردگی میں ملال۔ قلق اور بے بسی کی کیفیت تھی۔ آواز بھی بار بار غر آلود ہو جاتی۔ کسی چنی مسکرائی بے فکر لڑکی تھی ارسہ۔ جیسے جتنا سال پہلے کی شناسا لڑکیاں لوگوں کو چھوٹے چھوٹے غم سے کر وقت سے پہلے بڑا کر دینے میں کیا مصلحت ہے تیری۔

خیر چھوڑو۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ جو کہ اس وقت چہن نظر نہیں آتا۔ اس نے ارسہ کو تسلی دی۔

میری سوچ کر دل مضبوط کر لیتی ہوں میں بھی۔ میں قسمت پر میری سب کچھ نہیں چھوڑتی۔ اپنی بھرپور کوشش کروں گی صلاحیتیں آزمائے گی۔ اور اپنے گھر اور زندگی کو انشاء اللہ جنت نشان ضرور بناؤں گی۔ اور لوگوں کی ماؤں کو بچھانے کے موقع بھی ضرور دوں گی۔ جلیں ہر گز نہیں۔

شناسا کو ہنسی آ گئی۔ بھی بہت دلچسپ ارادہ ہے۔

اور اس سلسلے میں، میں نے پہل کر دی ہے۔ وہ مسکرائی۔ چند لمحوں پہلے کی غم آلود آنکھیں بھی ہنس پر ہیں۔ اور بلیوں پر اٹھتی ہیں جیسے موتی کی طرح دمک اٹھی۔

اچھا۔ جھلاں طرح؟۔ شناسا پوری دلچسپی سے سن رہی تھی۔

اس طرح کہ ان صاحب کو یعنی اپنے ہونٹ لے صاحب کو فون کیا۔ شکر ہے کہ مجھے مثبت جواب ملا۔ اور وہ بھی حوصلہ افزا تھا۔

شناسا بڑے اشتیاق سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ چھوٹے سے ذہنی گھڑ یا جی لڑکی، جس کی گفتگو میں ذہانت۔ شائستگی۔ اولوالعوی۔ اور جس کا لہجہ بڑا

فکر آموز تھا جیسے بلند پایہ دانشور۔ میں نے ان صاحب کو ملا کر اپنے خیالات اور

نظریات سے آگاہ کیا۔ یہ کہ اس شادی کی تیری کچھ شرائط

ہیں۔ چونکہ میں آپ کے گھر میں اپنے تمام ایمان اور تمام اس لیے کہ داخل ہونا چاہتی ہوں۔ جن کی تکمیل آپ اور میں مل کر کر سکتے ہیں۔ اور چونکہ اس زندگی میں داخلے کے سارے فرائض سے میں آگاہ ہوں۔ جن کی ادائیگی میرا ایمان اور یقین ہے۔ تو اس کے عوض میں صرف یہ چاہوں گی کہ آپ کے والدین مجھے اپنی بیٹی سمجھیں۔ مائیں۔ میں ان کو بھی بن کر دکھاؤں گی۔ آپ کے بہن بھائیوں کو دل و جان سے بہن بھائی بنا کر دل کو وسیع کر لوں گی۔ جو قربانی دے سکی۔ دونوں کی۔ لیکن آپ کو بھی اپنا دل فراخ بنانا ہوگا۔ زبان کو قابو میں رکھ کر اس میں ہرے کے لیے شہر ہی کھلاتے رہنا ہوگا۔ میں آپ کے ہر دکھ کی شریک بنوں گی۔ آپ مجھے اپنے ہر سکھ میں شامل کر لیں۔ مجھے اپنی شریک حیات سمجھیں۔ زہر و دھیر کینز نہیں۔

اور ہو۔ اتنی لمبی تقریر کر ڈالی یا جی نہیں۔ مگر بے لوث کر چلے آدیا کیے تھے۔ آسان تو نہیں کسی عرصے سے وہ بے لوث تقریر و اب کر رہی ہوں۔ وہاں تو کسی کم بھی۔ حلق بند تھا۔ انھیں تھیں ہی نہیں۔ پتا نہیں کس دیوار سے خطاب بھی اھر سے تو کھٹکھٹانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جس پر مجھے حلال آگیا کہ یہ شخص تو ابھی سے میرا عقلمند اثر رہا ہے۔ اس پر انہوں نے یہ

ہاں۔ پھر۔ کیا کہا انہوں نے یہ اب کیا بتاؤں۔ مثنائی۔ یہ میرا تو بڑے بڑے میرے بے دھڑک، بے ایمان۔ اور بے شرم ہوتے ہیں۔ میں نے ان پر یہ بھی واضح کر دیا کہ ہم ابھی اتنے اندویش نہیں ہوتے کہ گفتگو کے بعد لوگوں کو ملاقاتیں کرتا ہوں۔ میں نہیں اپنے گھر بلاتی۔ مگر اس کا یہ جوا ہو جاتا۔ اس لیے باتیں بلاتی اور آئندہ زندگی میں۔ اگر تم نے مجھے آج اس ملاقات کا طعنہ دیا، ابھی تو یاد رکھنا۔ میں اسی وقت مر جاؤں گی۔ چلے نہ رہا ہوں۔ پڑے کہیں اپنے شفاف کردار پر طنز کی چیخیں بھی گوارا نہ ہوگی مجھے

مٹانے اس کے اچانک بے حد نفیہ اور گھبر ہوجانے والے جہرے کو تعجب سے دیکھا۔ اور دل میں یقین سا ہو گیا۔ یہ بلند غزائم جذباتی لڑکی اتنی ہی مضبوط

ہے۔ جو سچے کھرے دل کو لے کر کس بڑھے۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کیا یاب رہتی ہے۔ اداس کی زندگی یقیناً جنت نشاں ہوگی۔ اس نے ابر کے لیے دل میں بے پناہ حمایت سموس کی۔ اور اس کی زندگی کی کیا یابی کے لیے دعا کی۔

مگر میں۔ جو اتنی ہی مضبوط ہوں۔ سچے کھرے دل کو لے کر کہاں جاؤں۔ میری بے شمار ذمہ داریاں۔ مصلحتوں کے بوجھ تلے دلی میری بچان۔ سونے جیسا میرا دل۔ میرے بلند غزائم۔ ان کو کہاں صرف کروں۔ سوائے سوچنے رہنے کے۔ میری حساسیت میرے جذبات۔ فکر اور نا اُمیدی میں دیے ہوئے ہیں۔ جب تک کمال نہیں آجاتا۔ اپنے گھر کو سنبھال نہیں لیتا۔ احمد اور مای میری ذمہ داری ہیں۔ مثنائی میرا عقلمند زندگی اپنے ان غصوں کے کام آتا ہے۔ خدا جسے اس میں کیا یاب کرے۔ اور کمال کو بھی اپنے عقلمند میں کیا یابی ہو۔ وہ اپنے فرائض کا احساس کرے۔ اپنے ماموں کی ان خواہشات کا شکار نہ رہے۔ جن کا یہ بڑھ چکا ہے۔ اسے اپنی ماں اور بھائی کی خاطر دلچسپی آنا ہے۔ اور ایک لائق فرائض شایس فراز مذہب کو کمال کی خدمت اور ان کی علامتوں کی تکمیل کرنی ہے۔ یہ اس کی آرزو تھی۔ اور دعا بھی۔

کمال کا خط آئے کافی دن ہو گئے تھے۔ اس کے فون پر اسے مل گیا ہوگا۔ مگر اس نے فون بھی نہیں کیا۔ یا شاید اسے خطا میں نہ ملا ہو۔ ورنہ فون تو کرتی لیتا۔ رشتے لگانے والی لوائن بھی تھیں۔ مای کی بلند آواز پر شنا ہوئی۔ فالج کے اثر سے مای کی زبان بھی مٹی ہوئی تھی۔ مگر کھڑے ہوئے جملہ آواز کرتی تھیں۔ وہ کچھ زور لگا کر بولنے لگی تھیں۔ اچانک ان کی آواز بلند ہوئی۔

اے عورت! جوش میں ہے، ہاں اس موٹے منہ سے ادھر سے کراشت لاتے تھے شرم نہ آئی کوئی جوڑ بھی ہے جھلا۔ کہاں میری نازک اندام مٹنا۔ کہاں وہ گندم کا بورا۔ چار پانچوں کا باپ۔ دو بیویاں کھا چکا۔ ذرا سوچو مجھ کو بات کرتے ہیں بوا۔ اب ہم اتنے بھی مجبور نہیں ہوئے

ہاں! مگر بے شک زیادہ ہے۔ مگر دکان بہت بڑی ہے۔ لکھتی ہے۔ چار پانچ ہیں تو کیا ہوا۔ اپنی حالت کا کھاتے ہیں۔ بہت پیسہ ہے باپ کے پاس۔ ساری مٹی کو کوئی ہی نہیں ہوگی سوچ لو لکھتی ہے۔ بلاٹ لکھ دے گا یا

لو اور سونہ مای کی خشکی پر قرار تھی۔ بلاٹ کو لے کر لکھتا ہے۔ تم کیا بھی ہو۔ ہم بلاجی ہیں۔ بلاٹ نہیں چاہیے۔ لکھتی ہے کہ روٹی بخانا نہ کا جوڑ ہو۔ مگر کا جوڑ ہو۔ تو یہ تو یہ کمال سے کمال قیامت دکھا دے گا یا

ہاں! پھر آپ کمال سے ہی کر دیں۔ خواہ مخواہ بوا۔ ہر ماہ نہ باقی انھیں۔

ہاں ہاں کر دوں گی۔ مگر اسے جہنم میں اپنے ہاتھ سے نہیں جھونکوں گی یا

لو اسے جنت نہ باری جاتے جاتے مگر کہا اب میں ہر آؤں گی۔ سوچ لینا یا

مای شدید غصے میں تھیں۔ ہانپنے لگی تھیں۔ بوا کے جانے کے بعد مثنائی ان کے پاس آئی۔ تو اس کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگیں۔ مثنائی انہیں کھانے لگی۔ غصے کے نقصانات سے آگاہ کرنے لگی۔ انہوں نے روتے ہوئے کہا۔

کیسی لاڈلی تھی اپنے ماموں کی۔ زبان سے کہتے نہ تھے۔ مگر مجھے علم تھا۔ کیسا پیار دل میں پھیلاتے ہوئے تھے۔ کیا منہ لے کر جاؤں گی ان کے سونے۔ ایسے ایسے ذلیل رشتے۔ ہاتھ بے بسی۔ بستر کی ہو کر رہ گئی۔ اٹھنا بھی نفیس ہو گا کہ نہیں

ان کو تسلی دینا۔ سمجھنا۔ امید کے چراغ روشن کرنا۔ یہ سب بھی مثنائی کی ذمہ داری تھی۔ جو وہ خوش اسلوبی سے پورا کر رہی تھی۔

گھر میں فون لگ گیا مگر مزاحیہ نہ ہی مدد کی تھی۔ بہت تر خواہ خاتون تھیں۔ کہ بیکر بیکر پھر سے ان کے مسائل دریافت کرنا۔ پھر مثنائی انہیں حل کرنا۔ ان فرائض بھی تھیں۔ واقعی یہ دینا اپنی جیسے ننگ بائیں لوگوں کے قیام ہے۔

کمال کا فون آگیا۔ مای نے، احمد نے دیر تک بات کی۔ وہ ماموں کی مٹی کے ساتھ تقریبی دور سے پر ہوا تھا۔ تو یہ کہ گھر بھی چاہیے سب لوگ خوب گفت رہا۔

چند دن بعد تو یہ کا فون آیا۔ بہت خوش تھی۔ مای سے بات کرتے ہوئے بار بار اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ پھر مثنائی لیا خود کو۔ ماموں کی فنی کی تقریبات کر رہی تھی۔ حضور مٹا فون کی۔

احمد نے کمال کو اور پھر تو یہ کو بھی گھر کے حالات بتائے۔ اپنی بیویاں۔ مثنائی مصروفیت۔ جاب بھارتی کی خدمت۔ اب مجھے پڑھانے کی ذمہ داری بھی ملنے لگی ہے۔ بہت آرام سے ہر بات مکمل اور جامع۔ احمد کو مناسب اور محدود الفاظ میں فقط نظر کھانے کا طریقہ آتا تھا۔ وہ ہر بار کمال کو پوری تفصیل سے آگاہ کرتا تھا۔

مزاحیہ نے شنا کو اپنے گھر بلایا تھا۔ وہاں انہوں نے اپنے کزن سے اس کا تعارف کر دیا۔ وہ ڈاکٹر تھے۔ اور اپنی ہی طرح ہمدرد انسان۔ مزاحیہ کے کہنے پر وہ ڈاکٹر سجاد کو گھر لائی۔ دیر تک معاشقہ کرتے رہے۔ علاج تجویز کیا۔ ایک سائز کے فائبر پر روشنی ڈالی۔ اور ایک آؤی کو ایک سائز کے لیے بھیجا۔ جو روز آکر مای کو ورزش کرانا پڑا تو ڈاکٹر کی توجہ۔ علاج کی بامندی اور ورزش کا سلسلہ۔ مای کی طبیعت خامی بحال ہو رہی تھی۔ وہ سہارے کے ساتھ اب صحن میں آکر بیٹھنے لگی تھیں۔ گھر کے کاموں میں مستور رہے وہیں۔

مثنائی کو ان کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔ اور اب سادی توجہ وہ احمد کی طرف کیے ہوئی تھی۔ اس عمر میں بڑے شک جاتے ہیں۔ اس کے دوستوں کو دیکھتا تھا۔ نظر رکھتا۔ احمد کو پڑھانے کے لیے زیادہ وقت دینا۔ تفریح کے مواقع دینا۔ ابھی اس اطمینان کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔

مگر مای پر شائش لاش تھیں۔ زبان کی کلفت میں بھی واضح فرق ہو گیا۔ اب کمال کا فون آتا تو مای اور احمد ہی بات کر لیتے۔ ایک دن مای نے کمال سے کہہ دیا۔

شنا کی اگر اور کہیں نہ ہوئی۔ تو تمہیں اس سے شادی کرنی ہے

اس نے کیا جواب دیا۔ یہ تو علم نہ ہو سکا۔ لیکن مای نے ایک دن شنا سے پوچھا کہ۔

کیا اسے سب کو فون نہ معلوم ہے؟ وہ کچھ نہ سکی۔

مائی نظر پڑانے لگیں۔ اب وہ کمال کو کیا بتائے مائی کو کیسے سمجھائے۔ ذلت، حقارت، اس کی برداشت سے باہر ہے۔ وہ اپنی جست و خیزان کو کسکتی ہے اپنی عزت نفس پر اپنے وقار کے لیے سب کچھ جھکاسکتی ہے۔

بڑی مومانی حشیر بڑے تیر تھنگ کے ساتھ آتی تھیں۔ اب بھی ان کی مومائی کی خیریت کے لیے مگر اپنے پوشیدہ چہنچہاروں سے سب کو زخمی کر گئیں۔ ان کی اس نثر انگیزی نے گھر کے سکھ اور سکون کو تباہ کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد مائی کا مہر منظر رخصت ہو گیا۔ شیار پریشان تھی۔ خود کو سنبھالنے یا مائی کو جن کو کمال کی بچپن کی باتیں بھی یوں یاد آ رہی تھیں جیسے وہ سامنے ہو۔ جس کے لیے انہوں نے لاکھوں بار ازیت سہی۔ قربانیاں دیں دکھا کھائے۔ لیکن اس کے سکھ اس کی ترقی میں ذرہ بھر رکاوٹ نہ آنے دی۔ ثنا انہیں گھبراہٹ ہوئی۔

مائی: یہ غلط ہو سکتا ہے۔ بڑی مومانی بڑھا پڑھا کر بیان کرتی ہیں۔

لیکن مائی دل پر کمر بٹے بٹے کر رہی تھیں۔ کمال نے کیسے تیر کیا۔ تمکین سے شادی کوئی جرم تھی۔ اسے پوشیدہ رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اکل کو کیا مجبوری تھی کہ اسے گھر کی پہلی خوشی یوں چپ چپا سے منلی۔ یہاں جان درست کرتی ہیں۔ المکن دین میں جالا کی ہے چلتی باز ہیں۔ تو یہ کسے گھر سب کا جانا اسے نشانہ کوٹنا۔ یہ سب ایک سلسلے کی کڑی ہے۔ لیکن بے شادی کر کے ہی توبہ کے پاس امریکہ پہنچے ہوں۔ اب وہ توبہ کے فریضے ہی اپنے اگلے ارادوں کی تکمیل بھی کر سکتے۔ بڑی مومانی کے ارشاد کے مطابق۔ کمال نے انگلی بند نہیں کی۔ رہائش کار پروگرام طے کر لیا ہے۔ لیکن بے شادی۔ کوئی بڑی بات نہیں۔ مگر مال کو بھلا کر اسے فراموش سے منور دلتا۔ بڑی مومانی کو یہ اندوہی لڑکشی معبود والی سے معلوم ہوا تھا۔ مگر کیا رہی تھیں۔

احمد نے سنتے ہی کہہ دیا۔

یہ غلط ہے۔ جو ٹ ہے جہاں جان الیا کر ہی نہیں سکتے۔

حالا کہ یہ نامکن تو نہیں۔ انگلی بند کاتے عرصے قیام

ماہوں رومان کی ہر باتیاں، حسین مہ جین لوگوں کا ساتھ۔ وہاں کی چمکی دھکتی زندگی رشتوں سے بھرے مستقبل کی امید بھر گھر کے اندھیرے کے یاد رہتے ہیں۔ ترقی کے خاتون کو جوان کو، وہاں کے قیام سے دولت کمانے کے بڑے مواقع مل سکتے تھے۔ اور قیقا اس کا متعلق سمجھ جاتے۔ مگر مائی کا کیا مقصد ہے کہ سزا انہیں ملے ان کا تو سب کچھ داؤ پر لگ گیا۔ انہوں نے کہہ دیا۔

کمال کی کمانی ان پر حرام ہے۔ اب وراثت آئے تو وہیں کر دینا۔

انہوں نے احتجاجاً دو چھٹک دی۔ مائش سے انکار۔ ایک سزا سننے انکار۔ کھانا پیتا رہے نام نہور گیا۔ جھوک ہی جھٹ ہی تھی۔ کوئی تنگ ہی باقی نہ رہی۔ توبہ کا وزن آنے بھی عرصہ ہو گیا تھا۔ کمال نے جو چاہے سادہ رکھی تھی۔ کیا وہ فون نہیں کر سکتا۔ اپنی دعا بازی کے تیروں سے صلیق ہونے والوں کا حال تو پوچھ لے۔ چند دن میں مائی کے چہرے کی رونق ختم ہو گئی۔ انہیں سمجھانے کی ہر چیز بے کام رہی۔ ڈاکٹر سجاد کو پائی گئے ہر شے تھتے۔ اور ان کا قہر آنا پتا نہ تھا۔

مائی: اگر کمال وہاں رہ جائے تو کیا سجاد کو آپ سب سے التعلق تو نہیں ہوگا۔ خط لکھ کر گا فون آئیں گے۔ آخر آپ اتنی مایوس کیوں ہیں؟

وہ انہیں سمجھانے اور اس سزا کو امید کے تراخ جملانے کی سعی کر رہی تھی۔ مائی کے چہرے پر زردی چھا رہی تھی۔ اور اسے بڑی پریشانی تھی۔ اگر مائی کو کچھ ہو گیا تو؟

مگر۔ پھر تم آخر تک جہاں سارا رہی رہو گی۔ کب تک ایسی زندگی کیا کر لے گی جس سے انہیں اس پر بالا ہو سکا۔ کھلا ہوتا۔ ایک حرف تعلیم۔ وہ بھی جسد کی آخری تعلیم تو کرا لیں اس کی قسمت کے مالک ہو گئے۔ جہاں جان تو سب سے ہی کہیں تھیں۔ میری ہی تجویز نہ آیا۔ ہائے میں کیسے لٹ گئی۔

مائی کے ڈاکٹر سے بہتے آسنو۔ ثنا کا جگر کاٹے دیے رہے تھے۔ اس حرم ان نصیب مال کو کس طرح تسلی دے۔

مائی: آپ یقین کریں۔ ایسی کوئی بات ہوں تو جہاں جان مجھ سے ضرور ملے۔ آپ ذرا انتظار لو کر میں۔

احمد نے بھی سمجھا مگر مائی کے دل پر چوٹ سی لگی تھی۔

اے۔ میں کہتی ہوں۔ کیا میرا کوئی حق نہیں۔ میں نے اس سے کہا تھا کمال۔ اب ثنا بتا رہی ہے۔ داری ہے۔ بے اس کی کہیں شادی نہیں کرنی۔ اسی لیے اس نے جلدی کی ہے کہ یہ دیتا کہ نہیں کرنا چاہیے تو میں وہاں تو اس پر جبر کرنے نہ جاتی۔ اسے چھوٹے جہاں بھی خیال نہیں۔

میری فکر دس اسی میں اب بچہ نہیں رہا ہاں اگر آپ کو صرف ثنا کی آنکھ کے لیے تو پھر اطمینان رکھیں۔ میں کروں گا ان سے شادی۔ بس اب خوش یا

کہہ کر وہ نہ بنے لگا۔ اور ثنا اس کو مارنے پہلی پھر اسے بھی ہنسی آگئی۔

اس روز مائی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ بغیر دوا علاج۔ کم غذا۔ کھانوں کا بوجھ۔ کمزوری کا بڑی طرح حملہ ہوا تھا۔ وہ رہ کر کتبھی کیفیت طاری ہو جاتی۔ نصیب نے کیا۔

بی بی: ڈاکٹر کے آگے بغیر ٹھیک نہیں ہوں گی بیگم آپ ڈاکٹر بلوائیں۔

مائی پریشانی طاری تھی۔ ثنا کے ہاتھ پر مہر بھول گئے۔ بڑے ماموں کا فون خراب۔ منجھل ماموں نے گھر سے باہر گئے تھے۔ جیسے کراہ رہا تھا۔ فیس اور دوا کے لیے کس کا درگھٹا تھے۔ ان کا نام لے کر گھر سے نکلی۔ بس سے کلینک پہنچی۔ ڈاکٹر سجاد مل گئے۔ اس کی حالت سے کچھ گئے کہ معائنہ ناکہ ہے۔ اس کے چہرے پر اڑتی ہوا مائیں۔ آواز میں کلفت۔ انہیں میں پھیلی ہے بی بی کی مٹی۔ اس کی حواس اور ذمہ دار طبیعت کی گواہی دے رہے تھے۔

اے عزمیر: آپ کے دل میں جیسا جذبہ انسانی اور احساس درد مندی۔ یہ تو عالم کو شہر سزا ہے مجھ غریب پر تو اپنی اثر ملنے قوتوں کو نہ آزمائیں میں تو بہت سب سے آپ کا پرید ہیں۔

ڈاکٹر کے لبوں کے منہ سے ثنا کلمہ مندر ہوئی۔ وہ ان کے دل کی آواز کہیں سن لیں۔ کیا ڈاکٹر کو میری بات کا یقین نہیں؟ گھر پہنچے تنگ دو دنوں اپنے خیالات میں گم رہے۔ مائی کو ڈیکھ کر ڈاکٹر پریشان ہو گئے۔

میرے صاحب سے آپ بہت تیزی سے موت یاب ہو رہی تھیں۔ آخر اب کیا ہو گیا آپ کو؟ وہ مائی کے معائنے کے بعد بہت ہنسٹ سے کہنے لگے۔ اتنی زیادہ عمر بھی نہیں کہ بڑھا ہوا کہا جائے۔ پھر کمزوری کی وجہ؟ اور اس درجے؟

دوا کھاتی ہیں نہیں ہیں۔ غذا بھی کم ہو گئی ہے۔ نصیب نے اطلاع دی۔

میں۔ دو اسے انکار کیوں؟ اگر کوئی دکھ پہنچا ہے۔ تو یقین کیجیے۔ اس صورت میں مرنے کے بجائے جھینے کی کوشش ہونی چاہیے۔ کیونکہ اس طرح تو آپ خود کو ہی نہیں۔ دوسروں کو بھی تکلیف پہنچا رہی ہیں۔ دیکھیے۔ ان کی حالت۔ آپ سے زیادہ خراب نظر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر نے ثنا کی جانب اشارہ کیا۔ پھر وہ دیکھے لہجے میں انہیں بھگاتے رہے۔ دوا پلائی۔ انجکشن لگایا۔ کچھ دیر بیٹھے رہے پھر کہا۔

ہاں۔ اب بتائیے۔ اپنی صحت کی دشمن کس لیے ہو رہی ہیں آپ؟ کوئی فکر اور کیسے دکھ ہیں آپ کو۔ آپ کے بیٹے بیٹی باہر ہیں۔ یہاں بھی جو ہیں وہ غصے اور خدمت گزار ہیں۔ پھر آخر کوئی بات آپ کو اس قدر دکھ دے رہی ہے؟

میں بتاؤں؟ احمد نے سٹوئی سے کہا۔ ائی کو ثنا کی آنکھ سے بس۔ حالا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ اپنے اس بیٹے کو اور کھیں۔ میں کروں گا ناشادی ان سے۔

ڈاکٹر سجاد مسکرا دے۔ ان کے لیے چائے لاتی ہوئی ثنا کڑ بول گئی۔ اس کے چہرے پر رنگ سا آ گیا۔ چائے میز پر رکھتے ہوئے اس نے زور دار مکا احد کی پیٹھ پر سرسید کیا۔ احمد نے جڑی میں مارا گیا۔ پیٹھ سے ہلکے سے منہ بنا کر ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

دیکھا آپ نے۔ یہ ہے میرا مستقبل۔ یہ تو طریقہ تھا۔

ڈاکٹر کو ہنسی آگئی۔ واقعی۔ خاصا اندوہناک مستقبل ہے۔ پھر وہ مائی کی جانب متوجہ ہو گئے۔

اتنے خوش مزاج مجھے ہیں آپ کے۔ پھر بھی آپ فکر میں باقی ہیں۔ جو دور ہیں۔ ان کے لیے دکھ کریں۔ اور جو سامنے ہیں ان کو دیکھ کر دل شاد کریں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ احمد صاحب آپ اپنی اپنی کو بھی

ہستے رہا کریں اس طرح وہ اپنے دکھ بھول جائیں گے۔

واہ۔ میں کوئی جو کر ہوں۔ وہ بڑا مان کر کھڑا ہو گیا۔ پھر نہیں دیا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر یہ طریقہ علاج ہے تو حاضر ہوں۔“ مای پر ڈاکٹر کی نصیحتوں کا اثر ہوا یا نہیں لیکن مایوں خوشگوار ہو گیا۔ اور اس کا اثر مای پر بھی ہوا۔ ڈاکٹر نے فیس لیے بغیر اپنا ایک گھنٹہ یہاں صرف کروڑ لانا نہانے بعد میں فون کر کے معذرت کی۔

”دراصل میرے پاس فیس کسے سے تھے نہیں۔ اس لیے دے نہیں سکتی۔ آپ کو پہلے سے بتانا نہیں چاہی۔ بد بانی کی مر تکب ہوئی ہیں آپ۔ یہ بڑا عجیبہ لہجہ تھا۔“ مای نے کہا۔

”سوری۔ شاید آپ نہ آتے۔ خود غرضی تھی میری۔ لیکن میں۔“

”سود کے ساتھ وصول کر لوں گا۔“ وہی سخت لہجہ۔ فون بند ہو گیا تھا۔ مای نے خیال تھا کہ وہ کہے گا۔ میں نے پہلے کب مانگا تھا آپ سے آپ دینی تھیں۔ لے لیتا تھا۔ چلیں۔ کون بات نہیں۔ مگر وہ تو عجیب سے انداز میں بات ختم کر کے فون بند کر چکا تھا۔ اس دن مسز نا جگہ کہنے لگیں۔

”سجاد تم سے بہت متاثر ہے۔ تعریف کر رہا تھا۔“

وہ حیران ہوئی تو بولیں۔
”دراصل۔ اس کے ساتھ یہ بڑے بڑی ہوئی ہوئی اس کی والدہ اپنے بیمار شوہر سے تنگ آ کر انہیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ حالانکہ چھ دن صبر کر لیتیں۔ بے چارے بچا تو ان کے جانے کے چند ماہ بعد چل بسے۔ اس دوران انہوں نے دوسری شادی کر لی۔ سجاد اور اس کی بڑی بہن جو میری بھائی ہیں اکبر کہتے تھے۔ سجاد کی بہن کی تو چارے ہاں شادی ہوئی۔ مگر سجاد پر عورتوں کی فطرت کا منفی اثر پڑا۔ وہ بھی جتنا ہے کہ عورتیں جلد باز اور خود غرض ہوتی ہیں۔ مگر بھائی اپنی مای سے محبت ان کے ساتھ بھٹا راستوں دکھ رکھا اور خدمت دیکھ کر اب اس کا ارادہ تبدیل ہوا ہے۔ یعنی خیال بدلا ہے۔ ابھی تک اسی لیے شادی نہیں کی کہ۔ اسے کسی پر اختیار نہ ہوتا

ٹھنچا چپ رہی۔ خود غرضی کی ایسی مثال کہیں نہ دیکھی۔ ہاں ایک لحاظ سے سجاد کے اور اس کے حالات میں مماثلت تھی۔

اس دن مای کی طبیعت بہت خراب تھی۔ انہوں نے پانی پیتے ہوئے اس سے کہا۔

”ذرا سعود کو فون کرنا۔ اس کی حیران دیکھ کر بولیں۔“ آخر اس پر ہلکا سا جھجکا ہوا تھا۔ میں اسے یاد دلاؤں گی۔ جب اس کے باپ بے روزگار تھے کھلے بھر میں۔ کس نے ان کی مدد کی۔ جتنا بے ماموں نے۔ بغیر ہر کچے۔ مجھے بھی نہیں بتاتے تھے۔ جب میں نے حساب طلب کیا تب پھر میرے آشکار ہوا۔ کہ اس کے ماں باپ پر احسان کیا تھا تو اسے بھی لازم تھا۔ اس کی ماں اور باپ کو۔ کہ ہمارے اس مشکل وقت میں۔ کم از کم۔ وہ تو کریں۔ جس کا کئی دفعہ اشارا کر چکے تھے کہ شادی نہ کر

نہ کریں۔ وہ ہلکی ہے۔ اور ان کے کرتے ہی۔ سب یہ وہ بڑی طرح باپ دینی تھیں۔ ان کے لپٹے لہجے سے ان کی اذیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”مگر مای۔ احسان کر کے۔ اس کا اظہار کرنا تو اور پھر اس کا بدلہ چاہنا۔ کیا اگر ماموں ہوتے تو ایسا کرتے؟ وہ چیخ رہے۔ تو آپ بھی خاموش رہیں۔“

”نہیں۔ ان پر ایسا وقت نہیں آیا تھا۔ مگر میں جتانے بغیر نہیں رہوں گی۔“ ان کے چہرے کی رنگت مسند ہو رہی تھی۔ اور سانس بھول رہا تھا۔ ٹھنکا کو ان کی آنکھوں سے خوف آ رہا تھا۔ کہیں اپنی اہلی تھیں۔ شاید سانس کی وجہ سے۔ اس کے دل کو جیسے کسی نے ٹوچ لیا۔ اگر مای کو کچھ ہو گیا۔ اگر وہ نہ رہیں۔ تو میں کہاں جاؤں گی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اچھل گیا۔ مای کے بعد۔ کون ہوگا میرا پرسان حال؟

اس نے احمد کی طرف دیکھا۔ کیا اس بجے پھر وہاں کیا جا سکتا ہے؟ کمال نہ آتا تو اس کی انگلیاں ڈاکل گھمانے لگیں۔ فون اس کی اتنی نے اٹھایا۔

”جیلو۔ کون بول رہا ہے؟“ ان کی ترخت آواز نے اس کا دل بند کر دیا جیسے ہمت جمع کر کے بولی۔

”آئی! میں ٹھنکوں رہی ہوں۔ مای کو سعود سے بات کرنی ہے۔“ اتنے میں ہی وہ تھک گئی۔

”اوہ۔ مای کے پہلے کی کیا ضرورت ہے۔“ اس کے لیے اب تو سعود کا بیچا چھوڑ دو۔ نہیں ہے سعود آئندہ فون کیا تو۔“

اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ دماغ میں شرارے لپکتے۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ مانتے سے پسینہ لگا۔ اس نے منظر نظروں سے دیکھی مای کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے کہا۔

”آپ۔ بولنا۔“ وہ۔ دکھان۔ ان سے کہیں۔ ان تو کون کو بلا لائیں۔“

پھر ان سے نظر پڑا کہ جلدی سے باہر نکل گئی۔ سعود کی مای کی آواز میں اس کے لیے کیا تھا؟ حقاقت یہ فقرہ کس قدر کھٹ لہجہ اور دل شکن الفاظ تھے۔ آف۔ وہ کہا کر بیٹھی صرف اپنے حفظ کے لیے مای کی بات مان لی۔ اس کے انوال فراوانوش کر دیے۔ کمرے میں ٹھس کر رہی۔ روئی پھر اسے خبر آگیا۔ کیا جوا اگر عید کا انداز ہے۔ وہ کچھ بھی ہے۔ گھر کی چاہ تو ملے گی۔ کون حفظ تو دے گا وہ۔ جب قربان دینی ہے تو پھر انتخاب کا معیار ذکر کرنا ہے معنی ہے۔ محبت نہ ہی۔ دولت اور

مقاربت سے سابقہ نہ ہوگا۔ عزت تو ملے گی۔ بولو جیسے منظر تھیں۔ لیکن آئیں۔

”عید میاں کی نہیں ذرا فیشن آریل ہیں۔ ایک ایک شیک آپ تنگ ٹھاکر کر لیں۔ آج کل تو بچی سنوون

روٹیوں کو پسند کیا جاتا ہے۔“ غصہ تو آیا۔ پھر خدا سانس لے کر رہ گئی۔ کہیں تو معنوی اشیا کا سہارا نہ لیا۔ اب اس کے لیے؟

”ابھی دیکھنا کہ ناز کے لیے؟“ رنڈو سے۔ جاز پچ کے باپ۔ دو بیویوں کو کھانچے۔ اور سعود کو تو اس کا یہی انداز ہی سادگی پسند تھی۔ وہ کہتا تھا! اسی میں دکھ اور ناشیں ہے۔“

کچھ زیادہ کلفت کا پروگرام نہ تھا۔ بازار سے ایک منگالیا۔ منگو موجود تھا۔ چائے کے برتن رٹے میں رکھ کر نصیحتیں کر رہا تھا کہ چائے کی کھد کے سوٹ پر طعانی اس نے خود کی تھی۔ نہا کر کھینچ کر لاٹ چل گئی۔ کھپ اندھیرا اس وقت بڑوس کی

شکید اپنی امی کے ہمراہ آئیں۔ ان کے ساتھ سیمیا اور اس کا دوہا بھی تھا۔ احمد نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ایک موسم جی مہاؤں کے پاس دوسری ماں کے کمرے میں رہی۔ پھر صحن میں آکر شادی کو مہاؤں کی آمد کی خبر دی۔

ٹھنچا بھی۔ عید کی نہیں آگئیں۔ گھر اسٹ میں بال اور اٹھ گئے۔ ابھی سے فون آئیں۔ انہوں نے نو سات بجے آنے کا کہا تھا۔ مگر ممکن ہے سات بج گئے ہوں۔ یا۔ وہ جان کر جلدی چلی آئیں۔

اٹھاسیدھا ایک آپ کرنے لگی موسم جی کی روشنی ناکانی تھی۔ کھڑے ہی چیں آ رہا تھا۔ انداز الپ اسٹل رنگائی کریم، پاؤڈر، بلش آف، آف اس سامان پر اس کا خاصارو بہم خرچ ہوا تھا۔ خیر کام آئے گا۔ آخر لوگ بنی مسوری ریلوین کو ہی پسند کر کے ہیں۔ ہر چیز جلدی جلدی مقرب لی۔ دوپٹہ خانوں پر ڈالا۔ بالوں کا جھٹکا اٹھا اٹھا ہی رہا۔ گھٹنے گھٹنے لیے بال۔ کھلے چھوڑ دیے۔ مہمان مای کے کمرے میں ہی آگئے تھے، وہ عجلت میں اندر داخل ہوئی۔ موسم بیاں تو قبل رہی تھیں۔ پھر بھی اندھیرا غالب تھا۔

”نصیحتیں جانتے بنا لاؤ۔“ اس نے ہکا۔

”پھر سلام کر کے مای کے پاس بیٹھ گئی۔ کوئی نہ کرے تھے شکید کی۔“ اس کے بھی یہ تو ہم لوگ آئے ہیں۔ اور سیمیا آئی ہے۔ اپنے میاں کے ساتھ۔

دراصل ہم نے دعوت کی تھی نا۔ تو یہ کہنے لگی۔ جیلو، مای حامد کی طبیعت کا پوچھ لیں۔ ہمارے اندر آتے ہی۔ چلی چلی گئی۔

”اچھا۔ وہ گھر آئی؟“ کھنڈر ہی نہیں آ رہا تھے تو۔ نصیحتیں کہاں سے ہیں نے چائے کا کہا تھا۔

”جائے توئی کر آئے ہیں ہم؟“ یہ مانے کہا۔ وہ مای کے قریب کڑی پر بیٹھی تھی۔

”مای کی طبیعت تو بہت خراب ہے۔ ماسن دیکھ کیسے جل رہا ہے؟“ اس کی آواز میں دکھ اور عید کی تھی۔ یہ دونوں بہن بھائی اپنی ماں سے کس قدر مختلف ہیں۔ وہ تو برجی کی نوک کھینچے میں اتارنے والوں میں ہیں۔ آف ان کے وہ الفاظ۔

”نہیں جن مہاؤں کا انتظار تھا۔ وہ نہیں آئیں گے

ابھی بولنے کہلا رہا تھا کہ ہم تمہیں بتا دیں۔ دراصل ٹھیکہ
رشتہ نہیں اور چھوٹا ہے۔
شکیلہ بڑے مزے سے تیار ہی تھی۔ اور ثنا کے
اور جیسے برف چمک رہی تھی۔ ماما کی سانس اور بھی تیز ہو گئی۔
اسی وقت بجلی آگئی۔ سب کی ہلکیں جھپک گئیں۔ اجالک
شکیلہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر منبر پر اٹھ کر اس
طوفانی قہقہے کو روکنے کی کوشش کی۔ مگر اس طرح کہ
اس کی اٹھنے کی جانب ابھی ہوئی تھی۔

سیما بھی ہنس پڑی۔ پھر بول: "اندھیرے میں کچھ
بتا نہیں چلتا۔ اور ثنا نے تو شاید سیلی بار میک اپ
کیا ہوگا۔ پھر اس نے منبر پر اپنے مایاں سے کہا: "جی ہاں
وہ سب کھڑے ہو گئے۔ شکیلہ کی امی نے آہستہ
سے کہا۔

"ثنا بیٹی، منہ دھو لو۔ ثنا پھر کے بت کی طرح
جامد تھی۔ وہ سب دروازے کی سمت چل پڑیں۔
شکیلہ کی کھلکھلاہٹ جاری تھی۔

"تو یہ کتنا شوق ہے اسے شادی کا۔ وہ بھی بڑے
مجید کے ساتھ۔ وہ پھر قہقہہ لگا رہی تھی۔

نہیں بیٹا، مذاق نہیں آتا ہے۔ ہمارے تو بیوی
اس کو میک اپ میں نہیں دیکھا۔ نہ جانے کیا مجبوری ہے
کہتے کہتے وہ باہر نکل گئیں۔ ثنا نے ماما کی طرف

دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیریں بہہ رہی
تھیں۔ سامنے لگے چھوٹے آنے میں اس نے دیکھا
اور احساسِ ذلت نے اس کا سر جھکا دیا۔ چہرے

پر سیاہی پوت دی۔ اندھیرے میں لیے میک اپ
نے اس کو کارڈوں بنا دیا تھا۔ سفید یاؤ ڈرے
بالوں تک رسانی حاصل کر لی تھی۔ چہرے پر کہیں

کرم نہیں پاؤڈر۔ اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ وہ خود اپنا
بھوٹ بن چکی تھی۔ ایک دم ہی خون رگوں میں مستحانے
لگا۔ دوپٹے سے اس نے چہرہ رگڑ لیا۔ اس طرح اور

بھی ہنسنے لگنے لگی۔ اُحد نے دروازے سے جھانکا۔
چلتے گئے مہان۔ نصیب چلنے بنا رہی ہے۔
ہم دونوں مل کر نہیں گئے۔ کیسا ہے؟

ہاں شام نہ نوٹے کڑی تھی۔ اُحد اور ماما سے نظر
کیے ملائے گی۔ دوپٹے کے دوسرے آگل سے اس
نے چہرہ رگڑا۔ پھر ماما کو دیکھا ان کے چہرے پر یہ پناہ

دکھ اور پچھتاوے کی پرچھائیاں تھیں۔ انہوں نے اپنا
لرزنا کا ہنستا ہاتھ بڑھایا۔ اسے تمام کر وہی گری گئی۔
اور پھوٹ پھوٹ کر رو بنے لگی۔
"ہائے رے مولا۔ کیسی بے بس زندگی ہے؟
ماما کا سانس بھی تیز تھا۔ مگر وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔
لیکن ثنا تو اس قدر دیکھی تھی کہ وہ اُسے روک بھی نہ
سکیں۔

"کمال۔ کمال۔ کہاں ہو تم۔ ارے میں اکیلے ہوں۔ بالکل
اکیلے۔ کون تو ہو میرے پاس؟
وہ بول رہی تھی۔ اور زیادہ زور شور سے روتی
جاتی تھی۔

"ہائیں۔ سیلو۔ کس قدر دل شکا رو یا جارہا ہے
خیریت تو ہے؟

یہ آواز بھی کہ نہ اُنہ غیب۔ بے انتہا ہجرت کے
ساتھ سراٹھا کر اس نے منبر پر دیکھا۔ ڈاکٹر سیما۔ ماما

کٹنا مہربان ہے تو۔ اس وقت میرے دل میں ایک
ہی آواز تھی۔ کون آئے۔ کون آئے۔ میری تنہائی گتے
دکھوں کا مددوار ہو۔ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"ڈاکٹر صاحب۔ دیکھیے۔ دیکھیے ماما کو۔ ماما کو
کچھ ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی۔ کیا کروں گی۔ ان کو
زندگی دے دیں کسی بھی طرح۔ ٹھیک کر دیں؟

آنسو دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے۔ ساتھ ساتھ
میک اپ کا رنگ بھی مزید پھیلتا جا رہا تھا۔
"بی بی: زندگی دینا تو خدا کے اختیار میں ہے۔

انہوں نے بڑی حلاوت سے کہا۔ لگتا ہے آپ
رور و کرانی ماما کی نکل دیں۔ انصاف کرتی ہیں۔ یہ تو
آج عقدہ کھلا کر ماما کیوں اس قدر مُڑب مُڑ ہیں یا نہیں

صحت کیوں نہیں ہوتی۔
اسے ہاتھ سے برے بنا کر وہ ماما کے پاس
بیٹھ گئے۔ دوائیں جاری ہونے لگیں۔
"دوا لائیے۔ پانی دیجیے۔ پکا کر پانی لائیں؟ پھر
وہ ماما پر رعب جھاڑنے لگے۔

"آپ اسی طرح کرتی رہیں۔ تو میں آپ کا علاج
نہیں کروں گا۔ بلا کیجیے کوئی دوسرا ڈاکٹر جو آپ کی بھانجی
کی آدمی منخواہ فیس لے کر چلتا ہے۔ میرا علاج کون ہے
یا نہیں۔ ہاں یا نا میں جواب دیں؟

شنا کے دیکھ دل پر چوٹ سی پڑی۔ صرف ایک بار نفیس نہیں ملے۔ تو طعنے دینے لگے۔ ہائے انسان کتنا مجبور ہے۔ غیروں کے طعنہ برداشت کرنا کتنا دشوار عمل ہے۔

”سنئے۔ درامہ ہاتھ دھو آئیں۔ میری آیا آنے والی ہیں۔ آپ کی اس کارٹون ماحولیت کو تو چھوٹی پسند نہیں کرے گی۔“

ہائے اللہ۔ شرمندگی اور خجالت سے زمین میں گر گئی۔ ٹنسو بھانے میں ایسی خوشی کو بھول ہی گئی۔ ”جائے جلیہ درست کر کے آئے۔ میرا مذاق اڑواؤں گی۔ یہ جتنی سے کہا۔ وہ بھاگی ہاتھ روم کی طرف ڈاکٹر کے فخر سے کھم نہیں آئے۔ صاف سے گر کر گھر پر چہرہ صاف کرنے میں لگی تھی۔ کہ باہر سے احمد نے بکرا۔

”شنا آئی! آپ کی میڈم آئی ہیں۔ میں نے نفیس سے چائے بنانے کا کہہ دیا ہے۔“

”تم نے اتنی دیر پہلے چائے کی بجائے کھا ہاتھ پھر کہاں چلے گئے تھے۔“ وہ اندر سے ہی غصا ہونے لگی۔

”اوپر تھا۔ ایک پتنگ کٹ کر آ رہی تھی۔ وہی ٹوٹنے چلا گیا۔“

اسے احد کی لاپرواہی پر بڑا غصہ آیا۔ ادھر ساتاں

”جیار۔ لب جلال۔ لب دم۔ اسے پتنگ ٹوٹنے کی بڑی سے سوجا ہی نہیں رات کے اٹھ بجے اس نے چھت پر گر کر پتنگ کیسے دھجلی۔

میڈم یعنی منیر صاحب ایک اور خاتون کے ہمراہ مامی کے پاس بیٹھی تھیں۔ مامی کو تسلی دلاسا دے دے

رہی تھیں شاید۔ مامی کے چہرے پر بحال تھی۔ لیکن پر ملاسا بیٹم۔ وہ سلام کر کے ان کے قریب بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر صاحب ڈراٹنگ روم میں احد کے ساتھ ایک قریب کر رہے تھے۔ ان کے قبیلوں کی آوازیں مکر سے سن آ رہی تھیں۔ نفیس چائے لے آئی اس نے احد کو آواز دے کر کہا۔

”ڈاکٹر صاحب کو ہمیں آؤ۔“

چہرے پر مل کر چائے پی۔ مامی کی حالت میں خاصا آغا تھا۔ نہ چائے یہ ڈاکٹر کی مسیحا تھی۔ یا میڈم کی تسلیوں کا اعجاز۔

”صبح امان اللہ صاحب آئیں گے۔ الیکس سائز کو والیں۔ دو ایک باندی ضروری ہے۔ اور بی شنا اگر آئیں تو آپ مامی کے پاس بیٹھ کر آٹسو بہائیں گی۔ تو میں ایک انجکشن آپ کے بھی ٹھنک دوں گا۔“

میڈم اور دوسری خاتون کے سامنے وہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔ ان خاتون نے اسے گلے لگا کر ماحولیت چلا گئی۔

”اچھی دھونس ہے۔ اب رونے کے لیے ڈاکٹر کی اجازت ہونی چاہیے۔ اسے غصہ آنے لگا۔ احد نظر آیا تو اس پر خفا ہونے لگی۔

”یہ بیٹہ اور مٹھائی لانے کا تم سے کس نے کہا تھا۔ ایسے کون سے خاص انکس مہمان آ رہے تھے، اتنے پیسے خرچ کر دیے۔“

”میں کیوں لاتا۔ میرے پاس اتنی رقم ہوتی تو میں پتنگ اور ڈور نہ لاتا۔ یہ تو ڈاکٹر صاحب لاکر گئیں ہیں۔ نفیس کو دے آئے تھے۔“ احد تنگ کر بولا۔

”ایں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کو کیا سوچھی۔ جیلو۔ اب ایک اور طعنے دے سارے گے۔ مامی کو سوپ پلا کر دوا دے کر وہ اٹھنے لگی تو مامی نے آستین سے کہا۔

”بیٹی شنا! کمال کو فون کرو۔ کہنا فوراً آئے۔ میں میں بلارہی ہوں۔“

مامی کا لہجہ عجیب تھا۔ وہ انہیں بغور دیکھنے لگی۔ کہا: کیا مامی کا آخری وقت آ گیا ہے؟ ان کی حالت کا بکڑنا۔

پھر سنبھلا۔ کہیں یہ آخری سنبھلا تو نہیں کہتے ہیں مرنے سے پہلے بعض ایک سنبھال لیتا ہے۔

وہ دوڑی باہر کی طرف۔

”احمد۔ احمد۔ مامی کہہ رہی ہیں کمال کو بلاؤ۔ احد! ہاں۔ تو بلا لیں۔ آپ کہیں گی تو اچھی جائیں گے۔ وہ بکس قدر لاپرواہ لڑکا ہے۔ بالکل بیکار ہے اس سے بات کرنا۔“

نامتورہ لینا۔ دل میں دھڑک پڑ تو رہی تھی۔ پیٹ میں گولے سے بن رہے تھے۔ جیسے دھواں پھر گیا۔ اگر یہ مامی کا آخری وقت ہوا۔ تو پھر۔ وہی ایک سوال۔ آخری کی مانند اپنے بل سے نہ لگا۔ میرا کیا ہو گا۔

فون کمال نے ہی اٹھایا۔ اس کی آواز سن کر شنا پر رقت طاری ہوئی۔ کتنے عرصے کے بعد سن رہی تھی

”شنا! کیا بات ہے۔ اسی کیسی ہیں۔ بولو۔ وہ کمال! مامی شگ نہیں ہیں۔ تم آ جاؤ کسی بھی طرح آ جاؤ۔ مامی نے خود کہا تھا کمال کو بلاؤ۔ کمال! آ جاؤ۔“

کمال شاید کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر اس نے ریسور رکھ دیا اور وہیں بیٹھ کر نکلے گئی۔ کتنا بوجھ اس کے اعصاب تھا۔ کچھ نہ کہہ تو اس نے کمال کی جانب منتقل کر دی

دیا تھا۔ شاید اسی لیے تنید بھی اچھی آئی۔

صبح بڑی دلنواز تھی۔ رات خواب میں ماموں بھی آئے تھے۔ بہت خوش تھے۔ کیا مامی ان سے ملنے

جاری ہیں۔ اس لیے، دل پھر دھک دھک کرنے لگا۔ مامی کی یادداشت بھی حل تھی؟ وہ تو کمال سے سخت ناراض تھیں۔ اب انہیں کمال کی ساری خطائیں اس کی شراوت

نظر آنے لگی۔

نفیس نے بتایا۔ اسکول سے چرائی آیا تھا۔ کتنا خاص شنا اسکول سے چھٹی کریں۔ امان اللہ آئے

تو اپنے سامنے ورزش کر رہیں۔ ٹائم نوٹ کریں۔ انجکشن لگوائیں۔ اس نے دل میں میڈم کا شکریہ ادا کیا اور نفیس کا بنایا ہوا ٹھنڈا پراٹھا بد مزہ اعلیٰ مزے لے لے کے کھانے لگی۔ چھٹی کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ بہر نظر حسین۔ اور ہر بات دلچسپ لگتی ہے۔

امان اللہ آیا۔ تو ڈاکٹر کی جانب سے مزید بات

جاری ہیں۔

”ایک جگہ دو ایک سختی سے پابندی کریں۔ اپنے ہاتھ سے سین وقت دوا کھلائیں۔ دلوں وقت مالش اور رونے سے پرہیز کریں۔“

اسے مزید ایک کھینچنے کی بھی مل گئی۔ اور یہ جو تھا دن تھا مامی کا بیٹن سکون تھیں۔ ان کے سکون میں ہی

اس کی حاضنت تھی۔ اب وہ چہرے سے سوچنے لگی تھی کہ اگلا کیا ہو گا۔ رات ہو۔ احد کی قید مکمل ہونے میں عرصہ لگے گا۔ کمال شاید وہیں رہائش اختیار کرے۔ مامی کی

صحت بآب ہو رہی تھی۔ تب بھی میرا مسئلہ ان کو لیتا ہوں رکھے گا۔ میں تو تنہا ہی رہ گئی۔ دو چوچیاں۔ دو بچا۔ اور دو درجن کن ستران سب کے ہوتے ہوئے

تنہا۔ وہ تکی سے سکران۔

”واہ رہی میں۔ اور واہ میرا خاندان۔ بلکہ آہ میرا خاندان۔ الماری میں ایک آپ کا سامان یونہی پڑا تھا۔ چلوں انہیں استعمال ہی کیوں۔ اپنا خون پسینے کی گمان کا پیسہ خرچ کیا ہے۔ آج خوب دل لگا کر میک اپ کیا واہ میرے توڑ ٹھاٹھ پر گئے۔ اب روز کیا کروں گی۔ اچھی لگ رہی ہوں۔“

بڑے مزے میں جھوٹی جھانسی مامی کو دوا دینے ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اپنی حکم کر رہی تھی۔

بالکل سامنے سعود بٹھا اس کی طرف شوق جھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر دہری گزیرے زمانے کی اپنائیت تھی۔ خوشیوں پر ویسا ہی بیتم۔ وہ مکر کر جانے لگی۔

سعود اضطراب کھڑا ہو گیا۔

”مجھے معاف کر دو شنا! شاید میں نے دیر کر دی۔ مگر دیر آید درست آید۔“

وہ کچھ کہنے کو جوں مگر اسی وقت باہر سے احد کی پرجوش آواز۔

”بھائی جان آگے۔ شنا آئی شنا آئی! میں نے کہا تھا نا۔ آپ بلا لیں گی تو وہ آ جائیں گے۔“

احد سوٹ لیس کھینے لارہا تھا۔ خوشی سے کھلا ہوا پھول بن گیا تھا۔ اس کے پیچھے کمال۔ اور تو بہرہ دوڑ کر شنا سے لیٹ گئی۔ کمال کی گود میں بیٹھ گیا۔ تو یہ

کا بیٹا۔ اسے شنا کے ہاتھ میں دے کر وہ ماں کی طرف بھاگا۔ ماں بیٹا ماں بیٹی۔ بڑا شاد مرنے ملاپ تھا۔

تینوں خاتون سے آٹسو بہا رہے تھے۔

سعود کھڑا ہو گیا۔ بولا: ”اچھا چلتا ہوں پھر آؤں گا۔“

”نہیں۔ پھر آئے کی ضرورت نہیں۔ آپ ہفتہ کے لیے جا سکتے ہیں۔ شنا کا لہجہ خاصا سخت تھا۔ دمر اس کی ماں کے کم) کھڑا۔ بے مروت۔ بے چلک۔

”شنا! میں نے تمہیں۔“

”کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میرا آپ کا راستہ اب الگ ہو چکا ہے۔“

”کیوں؟ میں نے سنا تھا کہ موٹی اسامیاں پھسلنے کے سارے گزرتے آ زمانے لگی ہوں۔ اسی لیے میں بھی آ گیا۔ کیا کسی سے عجیب ہے؟“

”سعود۔ سعود! آخر اپنی ماں کا بیٹا نکلا کس قدر تیز لہجہ بلع آواز میں۔ شنا ہنسنے کا پسینہ لگی۔ اس کے ہونٹ

مرز نے لگے۔ شدید غصہ۔ مگر پھر خود پر قابو پا کر اس نے کہا۔

"جو ایک بار دل سے اتر جائیں پھر نظر میں نہیں
 سماتے۔ دل سے تم کو رخصت کر دیا ہے۔ اب میں
 تم کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔"
 اب وہ سعودی کی کال پر اختیار کر چکی تھی، بغور
 کمال نے ان کی گفتگو کو، انجمن میں پڑھ لیا، کھڑا ہو کر انہیں
 پریشانی سے دیکھنے لگا۔
 "کیوں؟ اب نظر میں کوئی اور سما گیا ہے کیا؟ یہ
 ایک آپ۔ یہ سچ دج۔ شاید اس کے لیے ہے گفتگو
 کو آنکھوں میں بسا چکی ہو۔ دل سے اُتار چکی ہو، بناوٹ
 اور سب سے بچی تھی، مگر کاش، وہ اپنے کردار پر الزام
 کی جھپٹ پڑنے سے پہلے ہی مر چکی ہوتی، کتنا منظر ہوتا
 ہے مردوں کے معاشرے میں عورت کا عزت سے جینا۔
 "پہلے جاؤ، اس نے چلا کر کہا، اب وہ ایل نہ تھی
 کہ ڈر جاتی، اور جب بند رہتیں گے، تو بھی شرم
 سے زیادہ خطرناک ہو چکی ہے۔ اس کے جسم میں ایسا
 ہی غیظ و غضب کا طوفان مچا رہا تھا۔
 "سعود صاحب: بہت سے آپ جیسے جگہ جاتیں، کمال
 ثنا کے اس طوفان میں آگ کے شعلے بھڑکنے دیکھ رہا
 تھا، اس آگ کو پھینکے سے بچانے کے لیے اس نے
 سعود کو ٹالنے کی کوشش کی، سعود نے معنی خیز انداز
 میں آنکھیں میکرٹیں۔
 "اور تو یہ قصہ ہے، سعود آؤٹ، کمال ان
 اس کے اشارے سے تو کمال کو بھی شعلوں میں
 نہلا دیا تھا، مگر ثنا پر اس کا اثر اُٹا ہی ہوا۔ اس کے
 ذہن میں اُٹھتے بولے، اُٹھتے لاوے، جیسے تزارے،
 کسی جادو کے زور سے ٹھنڈے پڑ گئے، وہ گھٹتی ہوئی
 وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئی، جواس قابل میں
 کرنے کے لیے اسے خاصی حد جہد کرنا پڑی، پس سے
 زہر مل جاتا تھا، مگر حرام موت گوارا نہیں، بڑی سے
 بڑی ذلت کے مقابلے میں بھی، اللہ کی عزت دینا ہے،
 اللہ کی ذلت، مرنا اُتنا آسان نہیں ہوتا، اور ابھی تو
 دم و دار کے بوجھ اٹھانا پڑے۔
 خاموشی سے منہ ہاتھ دھو کر چن میں آن، نصیب کو
 کھانے کا بتایا، پھر مای کو جاکر دیکھا، وہ سب بیٹھے چلے
 لی رہے تھے، کمال، تو یہ ۱۴ حد اور مای، ان کا ایک
 خاندان، اور وہ خود آسٹریٹ ہوتی وہ بھی وہیں بیٹھ گئی۔
 احمد نے اس کو چاٹے بنا کر دی۔

"آپ کو پتا ہے جہاں جان، احمد نے سلسلہ کلام
 جوڑتے ہوئے بات وہیں سے شروع کی جہاں سے
 ٹوٹی تھی ثنا کی آمد کی وجہ سے۔
 "ننا آئی کا بیک خالی ہو گیا ہے، ان کے چاندی
 کے برتن بک چکے اور گھر سے شادی کے بعد یقین ہے
 کہ زیور بھی بیچ کھاؤں گا میں۔
 "تو یہ اور کمال ہنسنے لگے، شاید دیر سے وہ مومن
 گفتگو تھی۔
 "جہاں تو ثنا آئی کی ایک کال پر ہی سب کچھ چھوڑ
 جھاڑ چل پڑے، تو میرا بتانے لگی، مجھ سے کہا فوراً
 آؤ، میں بتا رہا تھا مجھے لگے رہا ہوں، میں نے کہا بھی
 جہاں میرے ہاتھ پر تو مت پھیلاؤ، دو دن پھر جاؤ
 تو بولے، ثنا نے پہلی بار مجھے بلایا ہے، ضرور کوئی
 بات ہے۔
 "میں بہت اکیلی ہوئی تھی، ڈر رہی تھی، بس وہ
 بشكل خود کو نکال رہی تھی۔
 "لو اکیلے کیوں، سجاد جہاں جو تھے، تو یہ ہنسی اس
 نے تعجب سے تو یہ دیکھا۔
 "یوں کیوں دیکھ رہی ہو، سجاد جہاں رشتے میں میرے
 جیسے لگتے ہیں، دور کے رشتے سے، مگر دوستی بہت قریب
 کی ہے، سجاد جہاں اور آفاق ایک ساتھ رہے ہیں
 برسوں باہل میں، بہت بار سب ان میں، سجاد جہاں
 نے نہیں بتایا؟ بڑے چالاک ہیں، چن فون کر کے امی
 کا حال پتہ آئی کی مصروفیت پریشانیاں بتاتے رہتے
 تھے۔
 "میری مصروفیت؟"
 "میتا ری مصروفیت، آسٹریٹ کی فراوانی، شادی کی
 پریشانی، گفیس کا ضبط کر لینا، جو لینے کا ہانا، وغیرہ تو یہ
 پہلے جاری تھی۔
 "شادی کی کوئی پریشانی نہ تھی، احمد نے بڑے
 ہونے بیچے میں کہا، "میں نے خود کو پیش کر دیا تھا اس
 نے سینے پر ہاتھ مارا، سجاد صاحب ہی جواب کی تعبیر
 تلاش کرتے ہوئے یہاں آجاتے تھے۔
 "تم تمکین کا تو سناؤ، ثنا سٹاپ کر لولی، عجیب انداز
 گفتگو تھا ان لوگوں کا۔
 "تمکین، بہت آسٹریٹ مشرقی لڑکی ہے، یہاں جو
 افواہیں پھیلاتی ہوئی ہیں، انہیں احمد نے بتایا، وہ سب

وقار عظیم

جھوٹا بیٹا ہے۔ مگر اگلے مہینے چھوٹے ماموں فیملی سمیت آ رہے ہیں۔ ہم انشاء اللہ بھائی کی شادی کر دیں گے۔ اب تو اللہ کے فضل سے بھائی کی یہاں نوکری بھی ملے ہوئی ہے۔

”کیا۔ میاں؟“ ماما کے چہرے پر رونق سی آگئی۔

”ہاں۔ اور کیا۔ بھائی کو انگریز کی رہائش منظور نہ تھی ورنہ وہاں ترقی بہت ہے۔ پیسہ بھی۔ عزت بھی ملے۔“

رات کو تو بیٹا ماما سے علی بھری خیریت پوچھتی رہی۔ اس کا بچہ ابھی ایک ماہ کا تھا۔ اور وہ اس کی شادی میں شرکت کے لیے بے قرار تھی۔ کمال نے تو بعد میں کہا تھا۔ تیار وہ پہلے سے تھی۔ کہ کسی طرح موقع ملے۔

”منا آئی۔ تم نے امی کی جیسی خدمت کی ہے۔ اور جس طرح میں ملتی رکھا ہے۔ اپنی قربانیوں سے۔ اللہ نے چاہا تو تمہیں اس کا بہت اجر ملے گا۔ ہم دور تھے۔ اور بے حد فکرمند۔ مگر اہل خانہ میں تمہاری جدوجہد اور محنت کا لگتا رہا تھا۔ بھائی کافی بے چین ہوتے تھے پھر احمد کے خط اور بعد میں فون پر بات کر کے کہتے تھے شہنا نے کمال کو دکھایا۔ مجھ سے بڑھ کر ذمہ داری اٹھائی۔“

”میں کسی اجر کے لیے تو نہیں۔ اپنے دل کے سکون اور فرض کی خاطر کرتی رہی۔ مجھے ماما کی بڑی فکر تھی۔ اسی لیے۔ اس روز گیارہ دیا کہ تم آ جاؤ کمال۔“

”اچھا کیا۔ امی نہیں دیکھ کر خوش ہو گئی ہیں۔ طبیعت بھی بھال ہے ان کی۔“

”کئی دن لوگوں کی آمد و رفت رہی۔ گھر میں میلہ سا لگا رہتا ابھی ڈاکٹر صاحب بھی آجاتے۔ تو میرے ہنسی مذاق کرتے۔ کمال سے دوستی کرنی۔“

اس دن تو کمال ہی ہو گیا۔ سعودی امی بھی آئیں بڑی نام سی تھیں۔ زبردستی انہیں میچ منچ کر آنسو بھی پیدا کر لیے۔

”سعودی صندیر آئی ہوں میں۔ اس کی ایک ہی صند ہے۔ شہنا نہیں تو کوئی نہیں۔ بہن کیا کریں۔ اولاد کی خوشی بھی دیکھتی پڑتی ہے۔ اس کی مرضی میاں ہے۔“

تو ہم بھی یہ لاچار سی تھیں۔ ماما کیلئے کے سہارے بیٹھی نوکری کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ غیر حذب باقی انداز میں بولیں۔

”بہن! آپ نے دیر کر دی۔ اب تو اس کا رشتہ طے ہو گیا۔ پرسوں نکاح ہے۔ تو یہ کے جیٹھے۔ آپ بھی آئیں۔ لوکا ڈاکٹر ہے امریکا کا پڑھا پروا اس کا میاں کلینک بھی ہے۔“

سعودی امی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ساتھ ہی شہنا کا بھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اسے صبر کا صلہ ملا۔ یا اس کی محنتوں کا اجر۔ یہ تو قدرت کو علم ہو چکا۔ مگر بڑی مومانی کو اب اور بھی کہنے کا موقع ملے گا کہ جامد میاں کے مرنے سے ان کے خاندان کی تقدیر بدل گئی۔ کمال نے باہر جا کر قلعہ حاصل کی، تو یہ کی لکھ پیتوں میں شادی ہوئی۔ اب یہ لکھ پری بھی بلندی کی طرف چلیں۔ ہمارا بیٹا بھی ہیں۔ کوئی بڑھ چھا ہی نہیں۔

”ان کی بڑیاں امی کا خیال ہو گا۔“

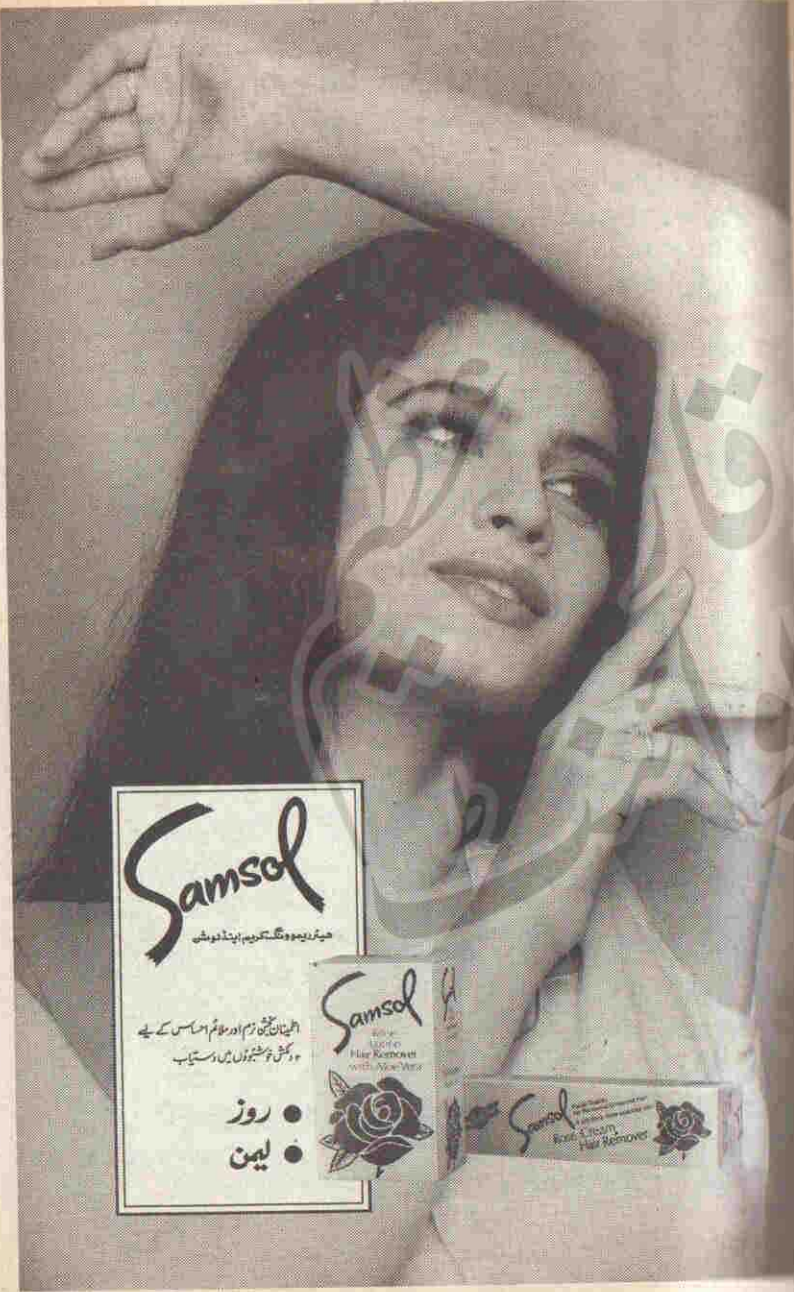
”میں نے سنا ہے۔“

”کوئی نہیں جانتا۔ اس روٹی کے پاس کتنی خوبیاں ہیں زمانے سے ٹکرانے کا حوصلہ۔ مقابلہ کرنے کی صلاحیت عمل کی قوت۔ جس سے وہ پورے عالم کو تسخیر کر سکتی ہے۔ اس کے پاس جن صورت نہیں۔ جس سیرت سے اختیار کا جذبہ۔ محبت کی روشنی۔ نہ جانے کتنے مصائب بھلنے کے بعد اسے یہ اجر ملا ہے۔ اعتماد اور محبت ملتی ہے۔“

اور وہ بھی کب جانتی تھی کہ ڈاکٹر سجاد اتنے بڑے ایکڑ ہیں۔

انہوں نے اس کو احساس ہی نہ ہونے دیا۔ محبت کی چوٹی سر کر لی۔ اس کا دل آج سجاد کے لیے دھڑکتا رہا تھا۔ وہ دل۔ جس میں جاتے کتنے وسوسے۔ اندیشے اور وہ سہما نے رہتے تھے۔ خوشی سے ناچ رہا تھا۔ اس سے مسکرا رہا تھا۔ آخر کار۔ آخر کار۔ اعلا میاں کا کھا کھا مل گیا اسے۔

ایک گھر وندے کی تکمیل ہو رہی تھی۔ سانبان پاؤں اڑ رہا تھا۔



Samsol
شوہر نیمہ ونگسٹیم اپنی دلہن

اپنی ان پختہ اور عظم احساس کے لیے
محبت و مشیتوں میں دستیاب

روز
لیمن



”بی بی! مجھ کے بوجھ تلے دب کر میں نے جرم کا اعتراف بھی کر لیا۔ سزا بھی کاٹ لی۔ پھر بھی جاتے کیا بات ہے۔ کیا چیز ہے جو اندر سے دل کو کاٹتی ہے۔ لگتا ہے ابھی کوئی بوجھ باقی ہے۔ میں کبھی بھی کرکریں نے جب اپنی بیٹی کو اپنی بہن کی طرح کوٹھلے بنے جسم کے ساتھ بغیر کوئی بیان دیے آنکھوں میں فقط دو آنسو لیے دنیا سے جاتے دیکھا تو میرا ضمیر جاگ گیا۔ میں نے گناہ کا اعتراف کر لیا مگر جیل میں ایک بی بی کی بات سن کر مجھے لگتا ہے میرے اندر کچھ ہے کوئی بات! جسے میں جاہل ہونے کی وجہ سے نہ جان سکتی ہوں نہ بیان کر سکتی ہوں۔ وہ بی بی سچ کہتی تھی۔“

یہ فردوس کہہ رہی تھی۔ فردوس ہماری ملازمہ ہے میرے غم کے ایک دوست جیل سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ وہی فردوس کو ہمارے گھر لائے تھے۔ ان کا کہنا تھا

ظاہر وظف



کہ تو اس عورت نے بہو کو تسلیم نہیں کرنا۔ لگاتی تھی مگر اتنے سنگین جرم کے باوجود اس عورت کے اندر ایک اچھی عورت چھپی ہوئی ہے۔ اسے عرق قند کی سزا ہوئی تھی مگر دوران سزا اس کا چال چلن بہت اچھا رہا۔ کسی صورت بھی یقین نہیں آتا کہ اس نے قتل جیسا سنگین جرم کیا ہے۔ اب اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے جس سے کہیں کو اس نے مارا تھا، وہ بھی حادثے میں مر چکا ہے۔ یہ لاوارث ہے۔ آپ اسے گھر میں رکھ لیں۔ میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ یہ آپ لوگوں کو کبھی دھمکا نہیں دے گی۔“

فردوس واقعی ایسی تھی جیسا ان صاحب نے بتایا تھا۔ شروع شروع میں، میں غماظ رہی، کبھی ڈر بھی محسوس ہوا مگر آہستہ آہستہ اس کے غل سے ثابت ہو

گیا کہ وہ بڑی عورت نہیں ہے۔ وہ نہایت ایماندار بہن تھی۔ سکھ گئی۔ اس نے فریض پہنچا تھی تھی۔ کھڑک کا تمام کام بہت اچھی طرح کرتی تھی۔ پانچ وقت کی نماز بھی پڑھتی تھی۔

میں اسے دیکھ کر سوچا کرتی تھی کہ اس نے کیسے اتنا سفاک قدم اٹھالیا تھا۔ کیا بہو حرا بھی؟ پھر دل میں سوچتی، یہ رشتہ ہی ایسا ہے خود میری امی جو ان پڑھی لکھی اور معبر خاتون ہیں۔ سماجی کارکن ہیں۔ عورتوں

کے حقوق کے بارے میں تقریریں بھاڑتی ہیں۔ محبت اخوت کے درس دیتی رہتی ہیں۔ گھر میں ہونے آتے ہی اور اپنی ساس بن گئیں۔ جانی کا جینا حرام کر دیا۔ ان کی ہر بات میں کڑے نکالتی ہیں۔ ہم بہنوں میں سے کوئی بھائی کی طرف ذرا دیکھ کر یہ تو ایک دم ایسی بات



کرتی ہیں جیسی عام جاہل عورتیں کرتی ہیں۔ بھائی کی کو محبت ہی نہیں ہے کہ بہن کے حق میں ایک لفظ بھی ادا کر سکے۔ اس رشتے کو سلجھانے سے بے خبر کام آتا ہے نہ عقل دانش ساتھ دیتی ہے۔ ازل سے ابد تک یہ رشتہ بونہی اُلھا رہا ہے گا۔

فردوس بھی اس روایتی چال میں پھنس گئی ہوگی میری امی پڑھی لکھی ہیں۔ وہ باتوں سے ایسی آگ لگا رہی ہیں کہ بھائی کا خود کشی کرنے کو ہی چاہتا ہو گا۔ فردوس جہالت کی بنا پر سچے بہو کو آگ لگا دی پھر بھی اس نے کئی بار سوچا کہ کبھی فرصت ہوئی تو فردوس سے ضرور پوچھوں گی کہ کس جذبے کے تحت اس نے یہ کو جلا کر مار دیا۔ فردوس جاہل تھی مگر کبھی بڑی سمجھداری کی کرتی تھی۔ اس کی باتوں سے لگتا ہی نہیں

تھا کہ وہ نری جاہل عورت ہے اس وقت بھی وہ اچھی لکھی ہوئی بیٹی تھی جس سے سوال کر رہی تھی اپنی کیفیت بیان کر رہی تھی۔
 "کون سی بی بی کیا کہا تھا اس نے؟ میں نے فردوس سے پوچھا۔
 "میں ایک بی بی۔ سب بتاتے تھے، بہت بڑی لکھی ہے، جتنے کس بات پر اپنے سارے گھر کو جوں آتی تھی۔
 "بی بی بڑی لکھی تھی اور۔" میں حیران ہو گئی۔ میں سمجھ رہی تھی، مشکل صرف جاہل ہوتے ہیں اور اشتغال کی آگ میں اندھے فیکلے کر لیتے ہیں۔
 "ہاں بی بی، لیستول سے سانس، سسر، دیور، میاں اور بچے سب کو مار آتی تھی۔ جب عورتیں اپنی اپنی کہانیاں سنانا نہیں تو چاہے کتنی بھی رونے والی بات ہو۔ تنہائی سب کی آنکھیں میں پانی آجائے اس کی بی بی کی آنکھیں آنسو نہیں آتا تھا۔ وہ مگر سب کو دیکھتی تھی۔ کوئی عورت اپنے گناہ پر شرمندہ ہو کر رونے لگتی تھی تو میں اس وقت جب باقی لوگ بھی اس رونے والی عورت کو سزاوار کہتے تھے تو ہی، وہ اس رونے والی عورت کو سزاوار دی سے دیکھتی تھی اور کہتی تھی۔
 "بیک انسان کے اندر شروع سے رہتی ہے جبکہ برائی ہمیشہ باہر سے آتی ہے۔ چپکے چپکے آتی ہے، جمع ہوتی ہے اور ایک دن باہر آکر حساب برابر کر دیتی ہے۔
 "تیارا تقویٰ نہیں ہے۔"
 پس اس سے آگے وہ تیرہ ہوجاتی تھی۔ لاکھ بوجھ سر چکر کر دے کیسے آتی؟ کیوں سب کو مار دیا وہ نہاؤں ہوجاتی تھی۔ ایک دن میں بھی ایسے ہی رو رہی تھی۔ مجھے اپنی بی بی یاد آ رہی تھی۔ بہو یاد آ رہی تھی تب اس نے مجھ سے بھی یہی جملہ کہا تھا۔ اب جبکہ میں سزا کاٹ آئی ہوں تب کہیں بھی اس کی بی بی بات یاد آتی ہے۔ اور میں اچھ جاتی ہوں کہ میرے اندر برائی کب اور کہاں سے آئی۔"
 "تیارا دی سانس خراب ہوگی، اس لیے تم نے اس کا بدلہ اپنی بہو سے لے لیا۔"
 "نری بی بی تو سانس بھی ہی نہیں، وہ جلدی سے

بولی۔
 "تو پھر اچھا ایسا کرو، تم اپنی کہانی سناؤ میں نے نفسیات پڑھی ہے۔ میں نہیں بتا دوں گی کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے بہانے سے اس کی داستان سنا چاہی۔
 یہ بات تو میں اچھی طرح جانتی تھی کہ ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ موجود ہے۔ جہاں عورتیں آگے دن چلیا جھٹکنے سے جھکتی اور مرد ہی ہیں۔ مرے وقت بیان نہیں دیتیں اور اگر بچ جاتیں تو خودی کا الزام لے کر سزا پھیل جاتی ہیں۔ گھر میں پھر سے نیا چو لہا آجاتا ہے شاید تیل کا چو لہا سب سے سستا اور موثر ہتھیار ہے استعمال کرنا آسان ہے۔ یہ قتل کے بہت ثبوت کو نشانہ بنا ہے اور حکمے والے کی زبان پر تالا بھی ڈال دیتا ہے اس لیے کہ اسے اچھی طرح بتا ہوتا ہے کہ اگر زندہ بچ گئے تو پھر بے بازار ہیں بہت ہیں۔ میاں سانس نہ دھکا دیورانی کوئی بھی خرید کر لا سکتی ہے۔ یہ تو گھر کی ضرورت ہے بازار میں اسے پیچھے پر یا بندی نہیں مل سکتی۔ جن گھر میں گیس لگتی ہے، وہاں بھی ہنگ ان خوردوں کا بیچا نہیں پھوٹتا۔ دھپے کا پلو آگ کی طرح لپٹا ہے۔ باقیوں کا دامن اور پھر ان کے پورے جسم جل جاتے ہیں۔
 "ہاں تاؤ کیا ہوا تھا؟ میں نے پھر کہا۔
 "پس فی کیا تاؤں؟" اس نے کہانی شروع کر دی۔
 "میرا ایک ہی بٹا تھا۔ جاوید نام تھا اس کا۔ اور ایک بی بی بھی رانی۔ رانی کی شادی میں نے سوہوہیں برس کر دی تھی۔ باپ تو اس کا اس کے چچن میں ہی مر گیا تھا جاوید گھر کی نکالت کرتا تھا۔ جاوید سے پہلے میں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ مگر رانی بڑی ہوتی تو میرے لیے مشکل ہو گئی۔ وہ شکل کی اچھی تھی۔ فدا کاٹھ بھی اچھا تھا۔ ساتھ لے جاتی تو لوگوں کی نگاہیں اس کا پیچھا کرتیں۔ اب ہر گھر میں اچھے برے بندے تو ہوتے ہیں ناں بی بی! اگر گھر چھوڑ کر جاتی تو حکمے کے اوتار مل لوگوں سے خوف آتا جو مجھ میں گھٹے گھر کے گرد نظر آتے۔ ان دنوں جاوید بھی ایک مل میں ملازم ہو گیا تھا۔ اور رانی اکیلے ہوتی تھی۔ میں اس لیے کام کرتے

پھر رانی کے ہاتھ لیے کرنا تھے۔ بہ حال حالات گھر پر جو کام میں سال دو سال بعد کرنا چاہتی تھی۔ وہ فرض ادھار کے روز فراہم کر دیا۔ فدا کاٹھ کا ملازم تھا۔ جاوید وال مل میں بی بی کام کرتا تھا۔ یوں میں نے رانی کا فرض ادا کیا۔
 پھر کچھ سال بعد جاوید کی بھی شادی کر دی۔ جاوید کی بیوی بھی بڑی خوبصورت تھی۔ رانی کی سسرال رشتے دار بھی۔ بڑی گھڑ، سلیقہ مند، دھیمی آواز میں بات کرنے والی، جاوید تو اس کا دیوانہ ہو گیا۔ صبح کام پر جاتا تو دروازے تک نظر نہ کر اسے دیکھتا تھا کو آتا تو اس کی نگاہیں ایک کونے سے دوسرے کونے تک اسے تلاش کر تیں۔ رات رات بھر دونوں جلنے کہاں کہاں کی باتیں کرتے بیٹے کھکھلاتے رہتے۔ وہ میری بھی بڑی خدمت کرتی تھی۔ جاوید بھی مارا نہ دار تھا۔ جاوید نے اب میرا گھر میں کام کرنا ہی بند کر دیا تھا۔ میں فالتو وقت میں غصے میں گھوما کرتی۔ سب میری بہو کی تعریف کرتے تھے جی فرض سے ملندہ رکھتی تھی۔
 مگر پھر چلتے کیا ہوا۔ مجھے بہو کی کمی اور بیٹے کے ناز غمزے برے لگنے لگے۔
 مجھے خواہ مخواہ بیٹے پر غصہ آنے لگا۔ بہو کی تصویر دیکھ کر ہی دل میں آجاتی تھی۔ اس کے ہر کام میں کڑے لگانے لگتی تھی۔ کئی بار رانی نے منع کیا۔ پیٹنے سے ہڑے ہوئے۔ بغیر کسی غلطی کے خود بھی معافی مانگی، بہو سے اس معافی منگوائی۔ چندھوں کے پیچھے ٹھنڈا ہوتا تھا اور پھر رات جیسے جلتے لگتا تھا۔
 یہ ان دنوں کی ہی بات ہے جب میں بات بات میں غصہ کرتی تھی۔ بہو کے گھر کوئی تعریف تھی۔ اس کی مائے اسے پہلے سے بلوایا تھا۔ مجھے بھی بلایا تھا پر میں نے سانا کر دیا۔ میرا بیٹا اسے شام کو چھوڑ آیا اور کہہ کر آیا مجھے اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر غصہ آ گیا۔ میں نے بڑ بڑا نا شروع کر دیا اور ہر دن شروع کر دیا۔ اس وقت میں باورچی خانے میں رانی کی بکارتی تھی۔
 "کیا ہوا اتنا؟" بیٹے نے مجھ سے روتے دیکھا

تو پوچھا۔
 "میرے عہد سے میری بی بی گھسنے کی، ساری عمر تو خدمت کی تھی، اب جب میری خدمت کا وقت آیا تو، تو بیوی کو میرے گروا پر لپکے۔
 "سیر کرنے کہاں گئی ہے امماں! اس کے گھر میں خوشی ہے۔ ماں نے بلایا تھا، وہاں گئی ہے۔ کل شام کو آجائے گی۔
 "وہ کل نہیں جاسکتی تھی۔" میں چپنی۔
 "اچھا شو نہ کر امماں! میں اسے آتا ہوں۔"
 جاوید اپنے قدموں لوٹ گیا۔
 گھٹن پھر بعد ہی وہ بیوی کو واپس لے آیا مگر جو باہر چلا گیا۔ خاندانہ ورہاتے پھر بیوی سے ٹوٹا آیا تھا۔ بہو کو موڈ بگڑا ہوا تھا مگر وہ مجھ سے زبان درازی نہیں کرتی تھی۔ وہ خاموشی سے برآمدے میں بیٹھ گئی۔ میں لکھا نا کھا چکی تھی۔ اور اب اسے لیے جانے سناری تھی۔ ابھی چو لہا جلا رہی تھا کہ بڑوس سے ایک ٹوٹی آگئی۔ اس روٹی کی بہو سے دو تھی۔ بہو کی غلے پھر سے سلام دعا بھی۔ ساری روٹیاں اسے بھجانی کہتی تھیں۔ وہ تھی ہی اتنی اچھی۔ وہ روٹی بھی اکثر میری بہو کے پاس آتی تھی۔ اس نے بہو کو برآمدے میں بیٹھے دیکھا تو بولی۔
 "کیا بات ہے بھائی! آپ تو اپنی امی کے گھر گئی تھیں۔ واپس کیوں آگئیں؟ خالہ بی کہاں ہیں، میں انہیں سالن دیتے آتی تھی۔ میں نے سوچا آپ گھر پر نہیں ہوں گی تو خالہ بی کیسے کھانا بنا سکیں گی؟"
 "نہیں، میں آج کا سالن تو بنا کر ہی دیتی، میں بغیر کام کے کب گھر سے جاتی ہوں؟ بہو کو کچھ غصے میں بولی۔
 "برآمدے اور باورچی خانے کا فاصلہ ہی کتنا تھا۔ چھوٹا سا تو تھا۔ میں ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ بوجھنی، بہو غصے میں بولی۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور میں وہیں سے بھلائی۔
 "ہاں! ہاں۔ تو تو فدا دمر بن رہی ہے۔ ہر کام کر کے جاتی ہے تب ہی تو روٹی مجھے پکانا پڑتی اور اب چائے بنا رہی ہوں۔"
 میری آواز سن کر وہ روٹی باورچی خانے میں چل آئی۔

ہلنے والے خالد بنی، آپ یہاں بھی ہیں، مجھے کہہ دیا
ہوتا، میں روٹی لادتی یا اگر لپکاؤ دیتی۔ لائیں میں چاہتے
ہوں۔
”سہنے دوست، میں آگئی ہوں، میں چاہے بنا دوں گی۔
میں نے روٹی اس لیے نہیں لپکائی تھی کہ تمہارے دوہا
مکھانے نے کہا تھا کہ وہ بازار سے لے آئیں گے۔ پھر
مناں، میں چاہے بناؤں۔“
”پھر نے آگے بڑھ کر چائے دانی اٹھائی۔ وہ لڑکی
والیں چلی گئی۔“
”اچھا تو بیٹے نے اسے روٹی بنانے سے منع کیا
تھا۔ جو روکا غلام۔“
میں نے دل میں سوچا اور ہوسے شدید نفرت
عموس کی، تباہیوں میں اس دن غصے میں ڈوبی ہوئی
چلی گئی غصہ تو جیشہ کی حرکت تھی مگر اس دن تھوڑا زیادہ
ہی غصہ لگتا تھا۔
دل سے دل میں نے فیصلہ کر لیا۔ میں نے ایک
لمحے میں فیصلہ کر لیا تھا اور پورا لٹ دیا۔ وہ
مگر اس دن، اس کے ہاتھ میں چائے دانی تھی جو وہ
دل کے لیے رکھنا چاہ رہی تھی مگر اس کا دو پیٹہ
مٹنے پر تیار تھا۔ میں خود اسے ماچس کی تیلی سے
آگ دکھانے والی تھی مگر دوپٹے سے خود ہی آگ کپڑ
لی۔ وہ ہمیں ماتر باہر نکلی تو چوہا بھی لٹ گیا اور
چاروں طرف آگ پھیلنے لگی۔ میں نے دیکھا عین اسی
تھے میرا بیٹا اندر داخل ہوا تھا۔ پتھروں میں گھر ہوئی
تھی اس کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، بیٹے کو دیکھتے ہی
میں نے بھی چیخنا شروع کر دیا۔
”ہائے چوہا چٹ گیا۔ جاوید! جلدی کر آگ
بچھا۔“
محلے والے جمع ہو گئے۔ جاوید نے دسی پر ہڑی دل
اٹھا کر اس پر چینی اور اس پاس کوئی چیز ایسی ڈھونڈنا
چاہی ہے۔ بیوی پر ڈال کر آگ بجاسکے مگر گرمیوں کے
دن تھے رضا نیاں اندر سے اسٹور میں پڑے تھے۔ وہ
اسٹور کی طرف بھاگا اور وہاں سے رحمان اٹھا لیا، آگ
تو کچھ کی مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ بہو
کا جسم بھول کر کیا ہوگا۔ جگہ جگہ سے پرنی لنگ آئی۔
اس کا منہ صبح جل گیا تھا وہ بھی ٹوٹو سی دی پر میں سوچ
کر اتنا بڑا ہو گیا۔ بہو کی آنکھیں اندر دھنسنے لگیں

میر گئی۔ وہ کچھ کہے نہاد نہ اسے رحمت ہوئی۔ وہ
ٹوٹی جا رہی تھی کہ دیر پہلے آنے والی ہو کر دھک کر چڑھیں ہلکی
چوٹی کے پوتوں پر چڑھ کر ہسپتال جانے کی قوت ہی
نہیں آتی ہو پولیس پر پھوٹ کر قی اور بیان بازی ہوتی
مخلط سے آئے دن اٹنے واقعات ہوتے تھے کسی نے
کچھ نہ کہا اور وہ سنو سنو تے دفن ہو گئی۔
جاوید کو جب تک گئی اس نے مجھ سے ایک
لفظ نہ کہا۔ کچھ نہ جاننے کی کرشمہ کی۔ میری بی بی رانی
البتہ کہ دیر دیر ہو جیتی۔
”اتان! چوہا تو خٹک ہے پھر بھائی کیسے حمل
گئی؟“
”چوہا پھٹا نہیں مگر اس وقت بڑے زور کا
دھماکا ہوا تھا۔ میری بھائی کے دوپٹے نے آگ پکڑ
لی تھی۔ چوہے میں بھی آگ پکڑ گئی تھی۔“
”چوہا اگر جل رہا ہو اور تیل ڈالو تو اکثر ہی دھماکا
ہوتا ہے آگ پکڑتی ہے مگر کوئی لوں تو نہیں حمل
جاتا۔“ وہ جرح کرنے لگی۔
”اگر دوپٹے نے آگ پکڑی تو بھائی کیسے دوپٹہ
اتار کر چھینک دیتی؟“
”پھر وہ مجھے کوئی نفلوں سے دیکھتی۔ البتہ میں
جاوید اگر موجود ہوتا تو وہ بھی مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتا
تھا۔“
”ہو کا چالیسواں ہوا تھا کہ رانی بھی چوہا پھٹنے سے
مر گئی مگر وہ پھر مرنے کے بجائے ہسپتال میں جا کر
مری تھی۔ جس وقت اس کے جلنے کی اطلاع ملی میں
روٹی تڑپتی اس کے گھر بھاگئی تھی۔ میں نے بیچ بیچ
کر کہا تھا۔“
”چوہا کیسے پھٹ گیا۔ کہاں ہے وہ پشہا ہو چوہا
دکھاؤ مجھے۔“
”میں دیوانوں کی طرح ان کے باورچی خانے میں جھڑکی
اٹھا اٹھا کر چھینک رہی تھی۔ وہاں بھی میرے باورچی خانے
کی طرح ایک تیل کا چوہا آوندھا پڑا تھا۔ تیل پانی کی
طرح فرش پر پھیلا ہوا تھا میں بیچ بیچتی تھی۔
”رانی کو ان لوگوں نے مارا ہے۔ اسے جلا لیا گیا
ہے۔ اسے قتل کیا ہے۔ میں پولیس میں رپورٹ کرواؤں
گی۔ ہمیں نے چوہا پھٹنے کی آواز سنی تھی۔“
”میں بیچ بیچ مگر لوگوں سے پوچھ رہی تھی رانی

جہاں ڈاکٹر تہ مہو

صحت کی دیکھ بھال،
اور بیماریوں کا علاج

یہ امریکہ میں چھپی ایک بہت مقبول عام فہم طبی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس انتہائی اہم کتاب کا 50 سے زائد زائیدانیوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور 100 سے زائد ملکوں میں استعمال ہو رہی ہے۔ اردو ترجمہ کتاب کے نئے نظر ثانی شدہ انگریزی ایڈیشن کا ہے جو 1992ء میں چھپا ہے۔

یہ کتاب تقریباً ان سب بیماریوں کا احاطہ کرتی ہے جو عام لوگوں کو اور خاص طور پر بیمار میں رہنے والوں کو متاثر کر سکتی ہیں۔ کتاب بتاتی ہے وہ کون سے صحت کے مسائل ہیں جو پڑھنے والا خود حل کر سکتا ہے اور کون سے ایسے ہیں جن کے لیے ڈاکٹر اور تجربہ کار سیلجھ دینے کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ آسان اور عام انہم انداز میں تصویروں کی مدد سے سمجھایا گیا کہ کس طرح بہت سی عام بیماریوں سے بچا جاسکتا ہے اور علاج کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب ان کے لیے انتہائی مفید ہے جو طبی سہولتوں سے محروم اور طبی مراکز سے دور ہیں، ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر قیمت لاگت سے بہت کم رکھی گئی ہے آپ کو اپنی، اپنے گھر والوں کی اور بستی والوں کی صحت کا خیال ہے تو یہ کتاب آپ کے لیے بہت ضروری ہے،

بڑا سائز 508 صفحات قیمت 200 روپے

ملنے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 رازدو بازار کراچی
فون — 216361

وہ کسی نوک کے نیچے آگیا۔ میری دنیا اندھ چوٹی پر تھی،
مجھ میں اس وقت بھی آیا کہ جب ہم کوئی گناہ کرتے
ہیں تو دنیا کو تیا چلے نہ چلے، خدا کو ہی خبر رکھتا ہے
اور اسی دنیا میں گناہ کی سزا دیتا ہے اور یہ سزا ختم
نہیں ہوتی، اس وقت تک ملتی رہتی ہے۔ جب تک
ہم خدا کے ساتھ ساتھ دنیا کے سامنے بھی اپنے گناہ
کا اعتراف نہ کر لیں۔

پہلے رانی مری بھر بٹا جلا گیا۔ اب میرا کوئی نہیں
تھا۔ مگر میرا ضمیر ہر وقت مجھے شرمندہ کرتا تھا۔ مجھے
اپنی سوچ بے بسی یاد آتی تھی۔ رانی کی موت یاد آتی
تھی۔ پھر جوان، بالکل بیٹا یاد آتا تھا۔ بس جی رہا وہیں
میرے لیے ایسی سزا بن گئی کہ نہ دن کو چین آتا تھا
نہ رات کو۔ میں اندر ہی اندر جلتی تھی۔

آخر ایک دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں خود قتل
جا کر ہو لوں زندہ جلانے کا اقرار کر لوں۔ شاید قدرت
مجھے دن رات اس لیے آگ میں جلا رہی ہے۔ مجھے جی
بالکل ایسے لگتا تھا جیسے میں بھی زندہ جلائی جا رہی ہوں۔
دن رات یہ تھا کہ جن کو جلا گیا وہ ایک خدا تک
تکلیف برداشت کر کے، سکمی ہرگز نہ گئے، اور میں
مسلل جل رہی تھی۔ آخر ایک دن میں نے خود کو قتل
میں پیش کر دیا۔ قرآن کو گواہ بنا کر اپنے جرم کا اقرار
کر لیا۔ اور یوں اپنے کیے کی دنیا کے سامنے بھی سزا
پائی۔

وہ کہانی سنا کر خاموش ہو گئی اور دوپٹے کے پلو
سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔ میں سوچنے لگی "سچ ہے
خون رنگ لاتا ہے کسی دیکھ کر اس طرح قائل ہو جاتا ہے
جاتا ہے۔"

فی بی: تم نے جو گناہ کیا، قدرت نے تمہیں سزا
دے دی۔ اور ثابت کر دیا کہ خدا کی ذات مہفت
ہے۔ پھر تمہارے ضمیر نے بھی تمہیں ملامت کی اور
دنیا کے سامنے تم نے خود اپنے گناہ کا اعتراف کر
کے دنیاوی سزا بھی پالی۔ بس اب تمہیں مطمئن ہو
جانا چاہیے۔ اور اگر دل پھر بھی مطمئن نہ ہو تو سرورِ قدرت
استغفار پڑھنا چاہیے اور آئندہ کے لیے پھرتی سے
چھوٹی برائی سے بھی توبہ کر کے نیکی کو اپنانا چاہیے۔
میں نے دو منٹ میں سزا و جزا کا تجربہ کر دیا۔
"سچ ہے جی! بالکل سچ۔ میں باقی ہوں پر میری

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے اندر برائی کہاں سے آئی
کب آئی۔ مجھے تو زندگی بھر یاد ہوتا ہے، وہ لہ لہی جیلا
میں کیوں کہتی تھی کہ نیکی انسان کے اندر ہوتی ہے
برائی باہر سے آتی ہے۔"

وہ پھر وہی فلسفے کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے میری
سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ دنیا میں ہر طرف
برائی ہی برائی ہے۔ ہر پرے انسان لا شعوری طور
برائی اپنے اندر جمع کرتا رہتا ہے مگر میں اس سادہ
عورت کو کیوں بتاؤں۔ میں خاموش ہوئی تو وہ بھی
خاموش ہی ہو گئی پھر اچانک رونے لگی۔

"فی بی! کتنا ظلم ہے دنیا میں، مجھے اپنی رانی کو
بے بسی نہیں بھولتی، جب زمان بند ہو، موت سر پہ
ہو، اور لوگ اقرار یا انکار میں گردن بھی نہ ہلانے
مجھے یاد ہے، اماں کا ضمیر بھی کوئلہ ہو گیا تھا۔ جہاں
کر بہت بڑا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی جگہ لکڑی بن گئی
جان باقی تھی۔ سب مجھے اس کی صورت دیکھ کر ڈر
تھے مگر میں پاس جاتی تھی۔ میں اماں کو غور سے

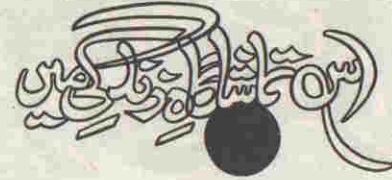
دیکھتی تھی، ابھی کچھ دیر پہلے اماں بھیج رہی تھی، رو رہی
مگر ناخاموش بیٹھا تھا۔ شبی کا کونسا اس کے پاس بیٹھا
میری دادی میں خاموش تھی مجھے اب پر غصہ آ رہا تھا۔
دادی اور ابابڑھ بڑھ کر بول رہے تھے۔ جھوٹا
رہے تھے۔ اور اماں خاموش تھی۔ میں کچھ سال کی تھی
پر مجھے سارا منظر یاد آ رہا ہے۔ میں نے دیکھا تھا
نہت قریب سے، اماں کے چہرے پر آنکھوں کی
جو دو لکڑیاں نظر آ رہی تھیں ان سے دو آنسو نکل
اس کی کندھوں سے ہو کر گتے فرش میں جذب ہو
تھے۔ ہاں جی، وہ دو آنسو مجھے یاد ہیں، شاید جین
سے یاد آتے ہیں۔

مجھے آج سے نفرت ہو گئی تھی۔ آج کی بے بسی
اماں کے دو آنسو جیب سے ہی میرے اندر شامل
رہے ہیں۔ ہاں جیب ہی سے۔"

وہ ایسے بولی جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔
"ہاں جی جیب ہی سے۔ کچھ گئی تھی۔ آگئی۔
ہے، برائی باہر سے آتی ہے۔ نیکی انسان کے
موجود رہتی ہے۔"
پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔

عظمت

ذوق و فوج و جوبہ



ناولٹ

احمد علی ایک متوسط تعلیم یافتہ طبقے
تعلق رکھتے تھے۔ ان کے خاندان میں زیادہ تر لوگ

گورنمنٹ سروس میں پندرہ سے لے کر اٹھارہ اور بیس
گریڈ تک کے آفیسر تھے۔ اور باقی اعلیٰ کارکردگی سے انہیں



اکاؤنٹنٹ منیجر خان تھے۔ جو احمد علی کے بڑے مددگار
اور دوست تھے اکثر وہ بیشتر اپنے گھر کے مسائل ان
کے سامنے رکھ کر ان کا حل مانگتے تھے۔

یار! دس بچے اور دو ہم میاں بیوی دو نوکر۔ چودہ
افراد کے اخراجات اس منگانی میں پورے کرنا سخت
مشکل ہو گیا ہے۔ آخر لوگوں کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے
آجائے۔ اب راشد کو ہی دیکھیں کیا شاہنشاہ کاڑی پر
آفس آتا ہے۔ کیا ایک کلرک اتنی قیمتی گاڑی خرید سکتا
ہے۔ جو ہمارا ماقہ ہوتے ہوئے بھی زندگی بسر کر رہا ہے۔
ایک ہم ہیں کہ ہمارے پاس ایک اسکورٹر ہی عمارا ہمارا
ہے اور وہ مسکرا رہے۔

ہیں بارہا اسی جہاز کی خبر ملو کہ اللہ سے کر لیں ہونے
سے محفوظ رکھے۔ نجیب خاں قمر شاہ اللہ بچہ بیٹوں اور
چار بیٹیوں کے باپ ہو۔ یہی بیٹے جب کمائیں گے تو

میں اعلیٰ مقام بنایا تھا۔ چنانچہ احمد علی سے بھی
اسی نظریہ ضرورت کے تحت اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم
دلائی کہ سرکاری محکموں سے منسلک ہو کر ان کا مستقبل
مستحکم رہے گا۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے بڑی محنت
اور دیانت داری سے ان کا مستقبل بنانے کی کوشش کی
تھی مگر دونوں بیٹوں کا رخان بڑس کی طرف تھا۔ احمد علی
کو پہلے تھوڑی سی مایوسی ہوئی مگر جب انہوں نے بڑس
ایڈمنسٹریشن میں ڈگری لی تو وہ بہت خوش ہوئے۔
کہ تجارت تو بادشاہت ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور
کون سا شعبہ ہوگا۔ تیسرا بیٹا آل راؤ نڈر تھا۔ اپنی خواہش
کے مطابق کام کرتا تھا۔ جس پھرت میں اسے نصیب نظر آتا
وہی کام شروع کر دیتا۔ جو تھا اور سب سے چھوٹا بیٹا
ابوہ علی تھا جو زیر تعلیم تھا۔ احمد علی بھی غلام جنگلات کی
ایک اعلیٰ پوسٹ پر لگے ہوئے تھے۔ اس غلام کے



گھر بھر دیں گے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے ہیں؟ احمد علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

نجیب خان نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے۔

”احمد علی! تم سے کچھ کہہ کر ایسا غلط کرنا چاہا ہو تو۔ نصیحتوں کے دفتر قبول کرینا چاہتے ہو۔ یہ نصیحتیں ہمارا پیٹ تو نہیں بھر سکتیں؟“

”بھروسہ کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”وہی خواہ لوگ کر رہے ہیں۔“

”یہ کوئی عافیت کا راستہ تو نہیں ہے۔ لوگ تو بہت کچھ کر رہے ہیں مگر یہ فردی نہیں کہ جو کر رہے ہیں وہ ٹھیک بھی کر رہے ہوں؟“

”ہاں۔ یہ بات تو میں بھی سمجھتا ہوں۔ لیکن خیر چھوڑو یہ جتاؤ اگر بھی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے تو کیا تم میرا ساتھ دو گے؟“

نجیب خان نے پرامید نظروں سے احمد علی کو دیکھا۔

”یہ جان دوں۔ تم کہہ کر تو دیکھو۔ بولو کیا بات ہے؟“

احمد علی نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ابھی نہیں۔ میرا جتاؤں گا۔“ نجیب خان کے ہونٹوں پر مہر خیز مسکراہٹ اٹھی۔

سید سے سادہ احمد علی فرار دوست کی اس مسکراہٹ کے پیچھے چھے غلام کو زد کر دیکھ سکے۔ یہ بات تو ان کے کانوں میں اڑی اڑی پہنچ چکی تھی کہ نجیب خان چھوٹے موٹے کام کرنے لگے ہیں۔ اپنا دامن بچاتے ہوئے انہوں نے کچھ کرم دناؤں سے ربط و مضبوط قائم کر لیا ہے جن کی شہرت کچھ ابھی زحمتی۔ لیکن بہر حال نجیب خان ایک پیغمبر خدا کا انسان تھے۔ دُنا دیکھی ہوئی تھی۔ وہ زیادہ انہیں کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے اس طرح دوستی کی روح تجدد ہونے کا بھی خواہ تھا۔ مگر یہ ضرور جانتے تھے کہ جو باپ اپنے بچوں کو اکل جلال کا لغتہ نہیں کھاتا اور فضل رقی کی طرف جھکا کتابے اس کی اولاد بھی اس سے خلع اور راست باز نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ نجیب خان کے دونوں بیٹے کسی تنظیم کے روح رواں بن چکے تھے۔ ان کے احمقوں میں کلاٹکوف کیا آئی کہ وہ خدا بن بیٹھے۔ حالانکہ یہ بات ابھی کمرے باہر نہیں نکلی تھی۔ مگر احمد علی کو چاہیے کیا تھا۔ اس کا تو عمل نجیب خان کی بیوی اور دوسرے بچوں پر شدید

ہوا تھا۔ انہوں نے طوفان برپا کر دیا مگر شوم ہنسے ہوئے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا۔ بولا۔

”کیوں گھر کو سر پر اٹھا رکھا ہے خاموش رہو۔ ہماری ذرا ذرا سی بات ان ادنیٰ ادنیٰ دواؤں سے باہر لپک کر جاتی ہے۔ اور دوسروں کے گھر میں بڑے بڑے کارناموں کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ ذرا یاد یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اگر تمہارے بیٹوں نے اپنی زندگی کا رخ بدل لیا تو کیا قیامت اٹھی۔ ہر شخص کو اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا حق ہے۔ پھر انہوں نے کیا بُرا کیا؟“

سب بچے سہم سہم کر کوفوں کھدروں میں گھس گئے۔

آج کل باپ بہت زیادہ غصہ کرنے لگے تھے۔ نجیب خان کمرے میں چلے گئے تو مجھے غل غل بھی آگئی اور انہوں نے شوہر کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا اور غصے میں بولیں۔

”تمہارے اندر کا وہ نیک نہاد ہر لمحہ خدا سے ڈرتے والا نجیب کہاں گیا جو کہتا تھا کہ میں اپنے بیٹوں کو کسٹم اور کولیس کی نوکری بھی نہیں کرتے دوں گا چاہے وہ کھڑے کھڑے مزدوری کر۔ میں کیونکہ وہاں پر کھلے احمقوں۔ کھلی آنکھوں سے لین دین کا کاروبار چلے ہے۔ بولو اب یہ کیا ہے۔ تم نے اپنے بیٹوں کو کن راستوں پر ڈال دیا۔ ان کی رہی کیوں رہی تھی۔ وہ کیوں تمہاری دسترس سے نکل گئے؟“

”وہ نجیب مر گیا کل۔ اب حالات نے ایک نجیب پیدا کر دیا ہے؟“

انہوں نے نہایت غصے سے یہی سوال کا ہاتھ جھنک دیا اور بولے۔

”جب ہر جگہ یہی ہو رہا ہے تو ہم کسی دوسرے ستارے سے آئی ہوئی مخلوق تو نہیں ہیں۔ کیوں اپنی ازبکی برادری ہو گئی۔ آخر ہمیں یہ چار جوان بیٹیاں نظر کیوں نہیں آتیں۔ انہیں بھی تو کل بھارتیہ جہیز کے ساتھ رخصت کر لے۔ کہاں سے آئے؟“

”زیادہ جذباتی بننے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تم میرے ساتھ تعاون نہیں کر سکتیں تو اپنی زبان اور آنکھیں بند کر دو غصے میں کھڑے کھڑے نکل گئے اور کل بنا دروازے کے پٹ سے ہر گز گئے سسکیاں لیتی

ان کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں ان کے دو جوان خوبصورت بننے و دھننوں نے ہتھیلیاں ان کی خوبصورت جوان بیٹیوں کی شادیاں خطرے میں لگی تھیں۔ کون شریف اور کون کس شخص ان سے شادیاں کرے اپنے خاندان کی نیک نامی کو مشکوک کرے گا۔“

”نجیب خان! تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ جوان بیٹیوں کی حفاظت بیٹیوں سے زیادہ کی جاتی ہے کیونکہ وہ اتنے بڑے بچے ہوتے ہیں۔ فال ڈال۔ بات بات کا ایسا ہوتا ہے۔ اچھے بڑے لوگوں سے ان کا سابقہ رشتہ ہے۔ انہیں بڑی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”خوف نے کچھ یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ان کی کوسا سالی کہا ہے۔ ان کا اخصا بھٹکان لوگوں میں ہوتا ہے۔ کالج کے بعد ان کی کیا مصروفیت ہے۔ ان میں یہ سب کچھ سوچنے کی فرصت کہاں۔“

احمد علی نے پھر کبھی نجیب خان سے اس موضوع پر بات نہ کی بلکہ وہ سچے سے زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ کچھ تھے کہ نجیب خان اب وہ نجیب خان نہیں تھا۔ دوستوں کا دوست اور یاروں کا یار ہوا کرتا تھا۔ اب ان کے گرد میں اندر تک غھنڈک آتے نہ لگتی تھی۔ اب انہیں دیکھ کر وہ کچھ خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ اور آخر ایک دن وہ خوف ان کے سامنے مجسم ہو کر آ گیا تھا۔

احمد علی کی ریشا رمنٹ کو چار سال رہ گئے تھے۔ وہ ان کی مشکلات میں آئیں کر ڈیٹے آئیں تھے۔ اتنا طویل دور انہوں نے بڑی دیانت داری اور محنت سے گزارا تھا۔ شعلے کا ہر شخص ان سے خوش تھا۔ وہ اپنے بہترین اخلاق اور ذمے دارانہ صلاحیتوں کی وجہ سے سب میں یکساں مقبول تھے۔ اور اسی مقبولیت اور اعتبار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نجیب خان نے ان کی بھاری رخصت کے تحت کچھ جتنا فنی خفیہ کاموں میں مدد دے گی۔ اور ان کے اندر ایک جھماکا سا ہوا۔

”اب نجیب خان کی وہ بات یاد آگئی جب انہوں نے مجھے اپنے ایک بک کہا تھا۔“

احمد علی اگر مجھے کبھی تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو کیا تم میرا ساتھ دو گے؟“

اور احمد علی نے ان سے وعدہ کر لیا تھا۔ اور آج مدد کی اس نوعیت نے ان پر ان کا نفس مدعا ظاہر کر دیا تھا۔ مگر جو جھڑپ تو وہ کچھ لول ہی نہ سکے۔

”کیا سوچنے لگے یا تم نے تو مجھے یقین دلایا تھا کہ یہ جان دل تم میری مدد کر گے؟“ نجیب خان نے انہیں گھیرا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں کب انکار کر رہا ہوں۔ جب کہو میں حاضر ہوں گا وہ مسکرانے۔“

”دوست! مجھے تم سے ہی امید تھی؟“ نجیب خان نے خوش ہو کر ان کی پشت پیچھے ہاتھیں آدھ چلے گئے۔

انہوں نے تو اپنے ترش کے سارے تیر چھوڑ کر دوپٹی کا بھرم تار تار کر دیا تھا۔ لیکن احمد علی بھر بھری سخی کی طرح بیٹھے چلے گئے۔ وہ انکار و قرار کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ شاید قدرت ان کے ظرف کا امتحان لے رہی تھی۔ کچھ دن تو وہ ملتے رہے۔ جب دیکھا کہ وہ چاروں طرف سے گھر گئے ہیں۔ ان کی عزت و ایمان خطرے میں پڑ گئے ہیں تو انہوں نے خاموشی سے استغاثہ دے دیا۔ ان کے پاس سخت حیران ہوئے۔ انہوں نے احمد علی کو بغیر دیکھا۔ وہ اس کی وجہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ بولے۔

”احمد علی! یہ تمہارے اچانک کیسا فیصلہ کر لیا تمہارے ابھی چار سال باقی ہیں۔ اس عمر میں مالکان تمہاری سابقہ کار کردگی سے خوش ہو کر تمہارے لیے مراعات کا اعلان بھی کر سکتے تھے۔ تمہیں آگے دو چار سال کے لیے ترقی بھی مل سکتی تھی۔ تمہاری صحت بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ تمہارے گھر بلبو براہم بھی نہیں بیٹھے بھی ماشاء اللہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ پھر ایسی کیا مجبوری تھی جو تم نے استغاثہ دے دیا؟“

”ضیہ صاحب! قبل اس کے کہ میری سابقہ دیانت داری محنت، وفاداریوں اور اخلاکار کردگی پر حریف آئے۔ میرا نام ریشیوں میں لکھا جائے۔ میں عزت کے ساتھ اپنے یہ چار سال بھی گھر والوں کی بقا پر قربان کر دینا چاہتا ہوں۔ اب آپ مجھ سے اس کی وضاحت نہ کر دیجئے گا۔ فی الوقت میں آپ کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ اور آپ کی محبت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

ضیہ حسن بڑی دیر تک احمد علی کے جھکے ہونے سے

طرف دیکھتے ہیں۔ وہ جگہ کیا سوچ رہے تھے پھر لگے
مٹھڑی سانس بھر کر انہوں نے استغنیٰ اٹھا کر دراز میں
ڈال دیا۔ اور کہا۔

”عجب ہے احمد علی۔ میں کوئی وضاحت نہیں چاہوں
گنا۔ البتہ تمہارا یہ استغنیٰ اسی طرح میرے پاس محفوظ ہے
گنا۔ میں خود ہی کاغذات بنوا کر جلدی دی واجبات کی
اور ان کی کوکوش کروں گا۔ میں تمہارے جیسا اکثر کہاں
سے ملے گا۔ میری اور دوسرے ملے کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں“
”شکر یہ سزا احمد علی نے اُن کے معاملے کے لیے اپنے
بڑھاپا تو میرے صاحب نے کھڑے ہو کر انہیں سینے سے لگا
لیا۔

گل بی بی کی شوہر سے ابھی طرح بھڑپ ہو چکی تھی۔
وہ دیکھ رہی تھیں کہ بیٹوں نے اب زیادہ تر اپنی دلچسپیاں
باہر ڈھونڈ لی ہیں۔ ماں کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔ تڑپ
کر رہ جاتیں۔

نجیب خان کی مصروفیت بھی بڑھ چکی تھی۔ وہ بھی
گھر پر سے آتے۔ اور جب آتے تو فالوں کا ڈھیر ان
کے ساتھ ہوتا۔ گل بی بی کاغذ سوانے پر آجاتا۔ وہ
کئی بار میاں سے اس سلسلے میں جھگڑا کر چکی تھیں کہ اُن
نے گھر کو بھی آؤں۔ غالباً ہے۔ اپنی دفتر کی مصروفیت
وہیں چھوڑ آیا کرو۔ آخر گھر اور بچوں کو بھی تمہاری
ضرورت ہے۔ جو بگڑ گئے۔ باحق سے نکل گئے ان پر
تو فاختہ پڑھ لی ”ایسا کہتے ہوئے ان کی آنکھیں جھم جھم
برستے لگیں۔ مگر جو زندہ ہیں۔ جنہیں ہماری ضرورت ہے
انہیں تو سنبھالیں۔ ان کے گروہ کیٹوں کا حصار لیں۔

دراز پر زندگی جہنم بن جائے گی۔ ہماری بیٹیاں اسی دلیسر
پر بیٹھی بیٹھی بوٹوں پر بولیں گی۔ کوئی نہیں جھلکے گا۔ وہ
بے تحاشا دوسری تھیں۔ نجیب نے فائل بند کی تلوار
سے رکھا اور دھکی دھکی نظروں سے گل بی بی کو دیکھنے لگے۔
”ایسی بد حال منہ سے نہ نکال گل۔ جو کچھ کر رہا ہوں
انہی کے لیے تو کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ سب عجب
ہو جائے گا“۔ نجیب خاں نے۔ یوں گے زخموں پر
مرہم رکھنا چاہا۔

اور گل بی بی، آنسو بھی شاکر لگا ہوں سے
نجیب خان کو دیکھتی ہوئی آنکھ کر چلی گئیں۔ انہیں یہ

طفل لیلیاں تسکین نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ بلکہ ان کا
سوا ہوتا تھا۔ نجیب خاں پھر برائیاں سے ہو گئے۔

چاروں بیٹیاں ان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئیں۔ ایک
بیٹی کی منگنی ہو چکی تھی۔ دوسری کی بات چل رہی تھی
گل بی بی کی خواہش تھی کہ وہ دونوں بیٹیوں کی شادی
ساتھ کر دیں گی۔ اس سے پہلے دونوں بیٹیوں کو ان کے
رائٹس برادر حافظوں سمیت گاؤں بھیج دینا چاہتی تھی۔
بیٹیوں کی غلط سوسائٹی کا ذکر نجیب خان کو بھی تھا۔

وقت باحقوں سے ریت کی مانند پھل چکا تھا۔ اب
کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جنہیں بگڑنا ہوتا ہے وہ کب
راہ پکڑتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے سوچا ہی چھوڑ
تھا۔ البتہ بیوی کاغذ اور اس کا ذکر غلط نہیں تھا۔ وہ
ماں تھی۔ اس کے لعل و گہر۔ مٹی میں رُل گئے تھے۔
وہ تو شہر کے روئے گی۔ چنانچہ انہوں نے ایک
کومری اور دوسرے کو پشاور ہوش میں داخل کرادیا
وہ دونوں ساتویں اور آٹھویں کے اسٹوڈنٹ تھے
باقی دونوں جھوٹے بیٹوں پر ماں نے اپنی گرفت سنبھال
کر دی۔ اسی طرح کسی حد تک ان کا مستقبل محفوظ ہو کر
تھا۔ انہی دنوں احمد علی کے استغنیٰ کی خبر مگر ہو گئی۔
نجیب خاں چلا کر رہ گئے۔

”کیا کیا تم نے احمد علی۔ لائٹ بھی نہیں لٹی اور
بھی مر گیا۔ خیر کوئی بات نہیں دوست بہت سے
جائیں گے اس سیٹ کے اہل بھی۔ تم نہیں اور سہی
اور نہیں اور سہی“۔ نجیب خاں نے ایک قہقہہ لگا

احمد علی کو پہلی بار کسی دوست کی طرف سے شاکر
پہنچا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اسی جگہ کہ نجیب خان کے
ارادوں کو ناکام بنا سکتے تھے۔ مگر نجیب نے اپنے
کچھ ایسے ناپسندیدہ کردار پر اصرار کیا کہ احمد علی
شریعت امن پسند لوگ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے
نہ وہ نجیب خان کے حریف بن سکتے تھے۔ انہوں
اسی میں عافیت سمجھ کر وہ خاموشی سے اپنی سیٹ چھوڑ
دی۔ دوستی کا بھرم شاید اسی طرح رہ جائے مگر
دوستی کا حق ادا کیا تو یوں
خجھر رکھ دیا۔ ہونے لگا پھر

بڑے دنوں تک احمد علی چپ چاپ رہے۔
انہیں نجیب خان کی طرف سے دھچکا پہنچا تھا۔ نوکری
کا انہیں غم نہیں تھا۔ انہوں نے کبھی چادر سے زیادہ
باؤل پھیلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اللہ کا دیا ان
کے پاس بہت کچھ تھا۔ اگر ملال تھا تو یہ کہ کیا دوستی اس
طرح خود غرضی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ زمانے کا خراج
اتنا بدل گیا تھا۔ پھر احمد علی نے اپنی پوری توجہ گھر پر
مبذول کر دی۔ ان کے چاروں بیٹے تعلیم اور اسٹینڈ
کے لحاظ سے قابل تحسین تھے۔ لیکن چھوٹا بیٹا شیوہ علی
سب سے زیادہ باصلاحیت، ذہین، ہونے کے باوجود
سب سے زیادہ لا پرواہ اور غرض سے دار بھی تھا۔ بی بی کی

کے بعد اس نے آگے نہیں بڑھا۔ اسے شروع سے ہی
آرٹ کا شوق تھا۔ مجسمہ سازی، پینٹنگ، تصویریں
بنانا اور خواب دیکھنا۔ اس کے متعلق تھے حالانکہ یہ
شوق بڑا نہیں تھا۔ نہ اس میں وقت کا زیاں ہوتا تھا۔
ملک آج کل کی جدید تہذیب اور سوسائٹی کو دیکھتے ہوئے
وہ مطمئن تھے کہ بیٹے نے کوئی غلط راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔
مگر اسے کچھ کرنا چاہیے تھا۔ کوئی نوکری، کام یا بزنس
وغیرہ۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ کسی کے کہنے کا اس راہ
نہیں ہو رہا تھا۔ ماں باپ کا لاڈ تھا مگر اس حد تک
کہ اس کی مصروفیت پوری ہو رہی تھی۔ جب باپ نہ
رہا تو کیا ہوگا۔ آخر اسے اپنے باؤل پر کھڑا ہونا چاہیے۔
یہ سوچتے ہوئے احمد علی کو پالتا یاد آ گیا۔ انہوں نے تو اس
وقت سے محنت کی تھی جب بچے صرف پڑھتے اور کھیلتے
ہیں۔ حال اور مستقبل کا ان کے سامنے کوئی تصور نہیں
ہوتا۔ ان کے والد صرف دو بھائی تھے۔ دادا کی چھوڑی
ہوئی کافی جائیداد تھی۔ جو برابر سے دونوں بھائیوں کو
ملی تھی۔ مگر باپ کی زندگی نے وفائے کی اور اس وقت
اللہ کے ہاں سے ان کا بلاوا آ گیا جب احمد علی صرف
پانچ سال اور بہن آٹھ سال کی تھی۔ قانونی طور پر تایاں

کے سر پرست اور خیار تھے۔ اس طرح پورا کاروبار
اور جائیداد تایا جان کی تحویل میں چلی گئی۔ اس کے بعد
انہوں نے اپنی من مانی شروع کر دی۔ اتنا ہی خرچ
دیتے جتنا بیٹ بھرنے اور تن دھانپنے میں ضرورت
پڑتی۔ احمد علی ہمیشہ سے حساس طبیعت کے مالک تھے۔
انہوں نے بھی اپنے تایاں سے مزید نہیں مانگا بلکہ روشن

بڑھاپا بڑھاپا اپنی جملہ ضروریات پوری کیں۔ تعلیم کا خرچ
تایاں نے صرف میٹرک تک اٹھایا تھا۔ پھر بند کر دیا تو
ماں نے گھر میں گرتے سی کر بچوں کو آگے بڑھایا
بہن کی شادی کے لیے ان کے والد نے کچھ حصص خرید
کر ڈال دیے تھے۔ وہ کام آئے، بخوبی بہت باجائے مدد
کر دی۔ اس طرح بہن کا فرض ادا ہوا۔ اور احمد علی نے
بی بی سی کر لیا۔ مگر تعلیم نہیں چھوڑی۔ پارٹ ٹائم
جاب کر کے آگے بڑھائی کا خرچ پورا کیا۔ پھر ماں کا
انتقال ہو گیا۔ اور تایا جان اچانک احمد علی پر مہربان
ہو گئے۔ اس کی وجہ خوشناعت تھی۔ وہ احمد علی کو اپنا داماد
بنانا چاہتے تھے۔ یہ سلسلہ والد کی حیات میں چلا تھا۔

انہیں صوفی بہت پسند تھی۔ وہ اپنی سب بہنوں سے
زیادہ سمجھدار، خوبصورت اور محنت کرنے والی لڑکی تھی۔
کوئی بھی نوجوان اس کی تمنا کر سکتا تھا۔ جبکہ اب وہ
تنبہ تھے اپنی نے کہا اب تم شادی کرو تا کہ مجھے سکون
ملے۔ اس وقت تک انہوں نے ایمر ایسی سر کر لیا تھا۔
پھر ان کی شادی ہوئی۔ صوفیاشا بڑی اچھی بیوی ثابت
ہوئی۔ اس نے گھر کو جنت بنا دیا۔ اور احمد علی کا دھما
لوچہ اٹھالیا۔ پھر انہیں عکس جنگلات میں ایک اعلا
عہدے پر ملازمت مل گئی۔ اس وقت سے اب
تک انہوں نے سخت محنت کی۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم
دلائی گھر بنایا۔ کاروبار سیٹ کیا۔ بچوں کی شادیاں
کیں۔ دو بیٹیوں کو رخصت کیا۔ اور خوشحال کے
ساتھ جا کر راج کی سعادت بھی حاصل کر لی۔ شادی کے
بعد تایا جان نے احمد علی کی جائیداد بھی واپس کر دی تھی۔
اس طرح انہیں اخراجات کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی
تھی۔ اب اگر انہیں کوئی وجہ تھی تو شیوہ علی کی طرف
سے کہ وہ اس کے مستقبل کا کوئی تعین نہ کر سکتے تھے۔ نہ
ہی وہ اس سلسلے میں مخلص تھا۔ سنجیدہ۔

گل بی بی کی دعائیں تھیں یا دونوں بیٹیوں کا نصیب
ان کی شادیاں خواہش کے مطابق دھوم دھام سے
ہو گئی تھیں۔ دونوں بیٹے آج کل سنگاپور کی سرکار سے
تھے۔ یہ بھی بہت اچھا ہوا تھا۔ شادی کا ڈاکہ احمد علی کو
بھی ملے تھے۔ وہ نجیب خان کی جسامت پر حیران تھے۔

آخر اس نے یہ جرات کی کیسے ؟ ان کی پیشانی پر بل پرٹ گئے۔ انہوں نے صوفی سے پوچھا۔
 ”یہ شادی کا ذکر کن لایا تھا؟“
 ”نجیب خان کا ذکر کر کے کیا تھا؟ صوفی نے شوہر کے پر سوچا چہرے کی طرف دیکھا۔
 ”کیوں کیا آپ جا رہے ہیں؟“ صوفی مسکرائی۔
 ”ساری باتیں نہیں بتا چکا ہوں صوفی۔ پھر ایسا سوال کر رہی ہو، کیونکہ جاننا چاہیے۔ میں تو اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔“
 ”چھوڑیں احمد علی۔ معاملہ بیویوں کی شادی کا ہے۔“
 ”سو سکیا ہے۔ نجیب اپنے لیے پھر شرمندہ ہوا اور اس طرح دوستی کی تجدید کرنا چاہتا ہوا وہ مسکرائی۔
 ”نہیں صوفی۔“
 ”سے عمر کی زد میں اگر بگڑ جائیں
 مگر کہاں ہمتیں سنو رقی میں
 دگر تہجد و دوسری نہ کرو
 اب یہ باتیں گراں گزرتی ہیں“

احمد علی جیسے ایک دم بچہ سے گئے تھے صوفی کو افسوس ہوا آخر آٹھواں اس نے اس ذکر کو چھوڑا۔ وہ بہت ہی دوست نواز اور غلط انسان تھے۔ نجیب خان کی اس حرکت پر ان کے اعتماد کو سخت جھٹکا پہنچا تھا اور ان کے دوستانہ جذبہ پر جرح ہو گئے تھے۔
 کئی سال آگے سرگ گئے۔ ایک دن خون کی گھنٹی بجی تو احمد علی اتفاق سے وہیں موجود تھے۔ لپک کر سیوڑ اٹھایا۔

”ہیلو احمد علی؟ آواز پر وہ پھڑک اٹھے۔
 ”جی سر السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ؟“
 ”اے احمد علی تم میری آواز پہچان گئے۔ میں تو سمجھا تھا اپنی شناخت کرنا پڑے گی مجھے۔“ وہ ہنسے۔
 ”نہیں خیر صاحب۔ میں اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں کو کبھی نہیں پہچانتا۔ اور ہمارا آپ کا تو برسوں کا ساتھ رہا ہے۔ فرمائیں سب خیریت ہے؟“
 ”ہاں احمد علی۔ اللہ پاک کا بڑا کرم ہے۔ یہ بتاؤ تم اخبار پڑھتے ہو؟“

”جی سر اب یہی تو ایک محبوب شغل رہ گیا ہے۔“ احمد علی نے ہنس کر کہا۔
 ”تو پھر نہیں اس فراڈ کا بھی پتا چل گیا ہوگا؟“ اور احمد علی کے اندر زور کا جھکا ہوا۔ اخبارات میں اس کی تفصیل آگئی تھی، چند سال پہلے جنگلات کی تحقیق کا کام شروع ہو گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ جیسرکاری طور پر کشتی ہی علاقہ درختوں سے خالی ہو چکا تھا۔ جس کا اندازہ محکمہ کی کسی فاکس میں نہیں تھا۔ اور یہی مقصد تھا جسے احمد علی کئی سال قبل چھوڑ چکے تھے خیر جن ابھی تک ڈائریکٹر آف جنگلات تھے کہہ رہے تھے۔ وہ بے حد ذہن دار اعلیٰ افسر تھے۔ انہوں نے سر سے کرایا کو وہ اپنا ہی عہدہ نکالا۔ پکڑ دھکڑ ہوئی۔ پتا چلا کہ یہ سارا پلان بڑی سوچ سمجھی اسکیم کے تحت بنایا گیا تھا۔ اور اسے فعال کرنے والے مسٹر نجیب تھے۔
 احمد علی کے سلسلے اخبارات کی تفصیل آتی گئی اور وہ فتنہ میں بڑی دور تک نکل گئے۔
 ”اے یار احمد علی، کہاں کہو گئے؟“ خیر جن خاموشی سے گھبرا کر بولے۔
 ”اوہ سو رہی سزا میرا ذہن چمکے کی طرف چلا گیا تھا۔ اسی پلان میں اُلجھ گیا تھا۔“
 ”واقعی احمد علی تم نے بڑی ذہانت اور خاموشی سے کام لیا۔ سچ بتانا کیا وہی پلان نہیں تھا جس کے لیے تم نے محکمہ کی مراعات اور کارڈر ونگ چھوڑ کر چار سال قبل ریٹائرمنٹ لے لی تھی؟“
 ”جی خیر صاحب۔ آپ کا خیال درست ہے۔ میں چاہتا تھا کہ آپ خراساں بدعنوانی کا سرا تلاش کریں۔ اور مجھ کو کو سلسلہ میں تو زیادہ بہتر ہے۔ ورنہ میرا کیس کمزور ہو جاتا۔“

”ٹھیک کہتے ہو احمد علی۔ میں بھی انسان ہوں۔ فتنہ نہیں ہو سکتا تھا کہ تمہاری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتا۔ بہر حال اب ہر چیز واضح ہو گئی ہے۔ تمہارے لیے ایک چانس ہے۔ اگر چاہو تو اپنی سابقہ کرسی پر واپس آ سکتے ہو۔“
 ”شکر ہے سر، بکریوں کا لین دین بڑا خطرناک ہوتا ہے۔“ نہیں کہا۔ اب تو میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ استعفیٰ دینے کے بعد دل اتنا گھبراہٹ میں اپنی وادعت

کے ساتھ حج بیت اللہ چلا گیا۔ وہاں سے آکر پھر بڑا سکون ملا۔ ویسے بھی میرے سینے مجھے کام نہیں کرنے دیتے۔ دل پہلانے کو کچھ کر لیتا ہوں۔ ورنہ لہنا کھرپنے پڑے۔ اس سے بڑھ کر کوئی جنت نہیں۔“
 ”ہاں احمد علی۔ تمہارے سینے بڑے فرمانبردار ہیں۔“
 ”ہلوا سی طرح تھی۔ اپنی دعاؤں میں مجھے بھی یاد رکھنا۔“
 ”فون بند ہو گیا۔ اور ایک بہت بڑا لچوہہ سر سے ہٹ گیا۔ انہیں یہ جہان کر خوشی ہوئی کہ وہ اپنے پاس کے دل میں اپنی نیک نای اور عزت کے ساتھ اب بھی زندہ تھے۔“

آج پھر وہی مسئلہ زیر بحث تھا کہ شیوہ علی کو کس کام میں ڈالا جائے۔ سب بچوں کے فرائض کے احمد علی سکدوش ہو چکے تھے۔ اب یہی رہ گیا تھا۔ اور وہ پریشان تھے کہ اسے کس طرح سمجھائیں۔ وہ تو آج بھی بچوں کی طرح ماں کی گود میں آکر لیٹ جاتا تھا اور صوفی مسکرا کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھیں۔ احمد علی ہنس دیتے۔

”صوفی۔ اسے بڑا ہونے دو۔ کیا اسے اسی طرح بچہ بنائے رکھو گی۔ اس کے بولنے مستقبل کے لیے پکڑ پکڑے؟“
 ”ہاں ہاں۔ سوچ لے گا احمد علی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ کھانے پھیلنے کے دن ہیں؟“
 ”نہیں صوفی۔ ابھی عمر احساس ذہن داری کی ہوتی ہے۔ آخر تمہارے اردن بچوں نے بھی تراسی عمر سے اپنے مستقبل کی پلاننگ کی تھی؟“
 ”وہ تو ٹھیک ہے۔ پراس کی تعلیم تو پوری ہو جانے دیں؟“ وہ مسکرائیں۔
 ”خیر وہ بھی پوری ہو جائے گی۔“ احمد علی ہنسنے ہوئے چلے گئے۔

شیوہ علی سے سب ہی محبت کرتے تھے۔ باب کو اس ایک ہی فکر تھی کہ وہ اپنے مستقبل اور زندگی کے لیے سنجیدہ نہیں تھا۔ اس کا رتھان آرٹ اور صورتی کی طرف تھا۔ اور ایسے نوجوان صرف خواب دیکھ سکتے ہیں اس کی تعبیر نہیں بن سکتے۔
 بڑی بھابی شیوہ علی کو پسند کرتی تھیں اور انہوں نے اپنی چھٹی بہن کو اس وقت سے اس کے ساتھ لگا

دیا تھا جب مہر و ترسری میں اور شیوہ علی کی کنڈری میں پڑھ رہا تھا۔ وہ بہت پیاری اور خصوصیت نہی تھی۔ وہ شیوہ سے کافی چھوٹی تھی مگر اپنی اچان اور خوش چہلی باتوں سے زیادہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس کا سارا انداز معصوم اور برجستہ تھا۔ جب آتی نہایت بے تکلفی سے شیوہ علی کے گھٹنے سے گھٹنا جوڑ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس کا نام اپنی تھی جو مہر و کے منہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔ اور بزرگوں کے درمیان یہ بات نہایت خاموشی سے طے ہو چکی تھی کہ شیوہ علی کی شادی مہر و ہی سے ہوگی۔ وہ دو دن بھی ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے کھلے پہلے دوسرے نظر آتے تو بڑی بھابی اور صوفی سب سے زیادہ محفوظ اور غرض ہوتی تھیں۔ اللہ نے کھڑے ہونے کا انتظار کر دیا تھا۔ انہیں کتوں میں بانس نہیں ڈالنا پڑے تھے۔ ابھی دفن اچانک ایک عظیم حد سے دوچار ہونا پڑا۔ احمد علی ہارٹ اٹیک میں انتقال کر گئے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہر لمحہ ہنسے ہوئے والا صحت مند بندہ یوں دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ ہو جائے گا صوفی کی تو دنیا ہی دیران ہو گئی تھی۔ بچوں کے سر سے سایہ اٹھ گیا تھا۔ ایک شخص کے نہ ہونے کے کتنا فرق پڑ گیا تھا۔ جیسے بغیر ملاں کے کشتی۔ منو خاں نے بچوں کو اردن بچوں نے ماں کو سنبھالا۔ احمد علی کوئی کام کل پر اٹھا کھنے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی بچوں کا ترکہ انہیں دے دیا تھا۔ ایسا شفیق باپ کہاں ملے گا۔ یہ غلا شاید کبھی پڑ نہ ہو سکے۔ ان کے منہ کے بعد بڑے بچوں نے ہر طرح کا خیال رکھا۔ مگر شیوہ علی کی لاپرواہی اور غیر ذہن داریوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کچھ دن باپ کو رووھو کر چھپ ہو گیا اور پھر اس کی وہی تصویر کشتی اور مجسمہ سازی کی عمر وقتیں۔ پہلے کو عرف باب چھوڑے بیٹے کے لاپرواہی پر ہر شغل رہتا تھا ادب و حرفت شان شیوہ علی کے لیے پریشان رہتی تھیں۔ ماشاء اللہ سب بچے اپنی اپنی جگہ میٹ تھے۔ کما ہے تھے۔ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے کوشاں تھے۔ ایک شیوہ علی تھا جسے کوئی فکر نہ تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا وہی غلط ہو جاتا۔ دراصل اس میں مستقل مزاجی نہیں تھی بجائے ان کے اس کے لیے کوئی ہی نہیں تھی کھی۔ دو ماگشتا کو طرارتے۔

ہماری تہاری دوستی ختم۔

شیوہ علی نے مصنوعی غصے سے کہا تو اس کے چہرے پر سایہ سالیک گیا۔ اور جلدی جلدی بلیک جھپکائی ہوئی اسے دیکھ کر بولی۔

» کیوں شیوہ؟ میں کیا آپ کو اچھی نہیں لگتی؟ «
» بہت اچھی لگتی ہوئی اس نے ہماری آواز میں رعب کے ساتھ کہا۔

» مجھے وقفہ لڑکی، کبھی میرے برابر لڑنے کی کوشش نہ کرنا، وہ ایک دم کلھکلہا کر ہنس پڑی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔
» نیک بے میں سمجھی؟ « وہ تیزی سے اٹھی اور ہنسی ہوئی بھاگ گئی۔

اس طرح مہروز نے اپنی شرمخ خوش باتوں اور معصوم صورت سے اس وقت اس کے دل میں محبت کی چھوٹی سی چنگاری سلگائی تھی جب وہ لاہالی، کلھنڈا کا جگمگاتہا ہی شرم اور دلچسپ سٹوڈنٹ تھا۔ جو ہر لمحہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ اٹھانے ہوتا۔ جب بھی وہ آتی دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے لان میں تینوں کے تعاقب میں بھاگنے لگتے۔ بڑی چھائی اور فضائل دونوں کو ہنسنے کیلئے دیکھ کر نہال ہو جاتیں۔ اور مہروز بھی شیوہ کی پشت پر سوار ہو جاتی کبھی گودیوں میں اگر بیٹھ جاتی ماس اور بڑی بہو کے چمکنے چہروں اور مسرت بھری مسکراہٹوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ مہروز کو کتنا پسند کرتی ہیں۔ اس کے بعد مہروز لاہور چلی گئی وہ چھینوں میں کراچی آئی تھی۔ بہن کے پاس۔ جب سے اس کے والد کا زنا نسف لاہور ہوا تھا۔ پہلے جیسی گدنگ نہیں ہو رہی تھی۔ اور شیوہ کو بھی مہروز بہت یاد آتی تھی۔ پھر دو سال اور آگے سرک سکرے شیوہ علی فاضل میں تھا کہ وہ آگئی۔

» نیلو شیوہ علی کہے ہیں آپ؟ « وہ بالکل اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور شیوہ جرات سے اس کو دیکھنے لگا۔ ایک نظر میں کوہ اسے پہچان نہ سکا۔

» اسے کوئی صدیاں تو نہیں بہت گئیں جو آپ کو پہچاننے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ماہ و سال کی گردش نے میری یاد بھی آپ

ماں الگ خیال رکھتی تھی۔ ساتھ ساتھ اسے سمجھاتی بھی رہتی تھی کہ بیٹا۔ مرد کی عزت اور وقار اسی میں ہے کہ وہ جلد جلد کے۔ محنت کرے اور اپنی شخصیت کی مخالفت کرے۔ انہی میں اس کی کہ ہے۔ جو وہ معصوم ہندی بچے کی طرح ماں کی آغوش میں لیٹ کر اٹھیں بند کر لیتا۔ وہ سب سے چھوٹا تھا اس لیے اسے سب سے زیادہ چاہا گیا۔ بڑے بھائی بھی کبھی ماں کو یاد دلاتے کہ انہی جان! شیوہ علی کو ہمارے برابر کیا ہے۔ اسے ہمارے کپڑے ٹھیک آنے لگے ہیں۔ اب تو اسے اپنے مستقبل کے لیے کچھ سوچنا چاہیے۔

» ہاں ہاں۔ سوچنے لگیں۔ ابھی وقت پر لہے۔ وہ مسکرا دیں۔
پہلے کوئی بات نہ تھی کہ شیوہ علی کچھ کر رہا ہے یا نہیں کیونکہ باپ زندہ تھے لیکن اب تو ساری فتنے وادی بھائیوں پر آن پڑی تھیں۔ وہ جانتے تھے شیوہ علی کہیں ملازمت کر کے یا پانا بزنس سیٹ کر لے۔ یا پھر جو بھی مستقبل کے لیے اچھی پلاننگ ہو سکتی ہے کرے پھر کم اس کی شادی کر دیں لڑکوں کی احساس ہی نہ تھا۔

ایک دن مہروز آگئی۔ وہ اب بڑی ہو گئی تھی۔ شیوہ علی کا ہی نہیں پرہور ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور ہنسنے ہوئے بولی۔
» علی! چلیں مجھے آؤں کہ تم کھلا لائیں! بعض اوقات اس کی بے تکلفی سے وہ چلا جاتا تھا۔
» میں نے سنی بار تم سے کہہ کر میرا نام زلیا کرو۔ میں تم سے بڑا ہوں میرا ادب کیا کرو! « اس نے ہنسنے سے ہاتھ چیر لیا۔ مگر اس نے برا نہیں مانا۔ ہنستی رہی۔

» اسے وہ شیوہ جی۔ ذرا کھڑے ہو کر تو دیکھیں! میں آپ کے کندھے تک آ گئی ہوں اور چھو بھی جان کہتی ہیں کہ لڑکیوں کا قد اکیس سال تک بڑھتا ہے۔
ابھی تو میں صرف دس سال کی ہوں۔ اکیسویں سال میں آپ کے برابر جاؤں گی! « اس نے ایک کلکتا ہوا جوتہ لگایا۔

» یا وحشت۔ پھر تو تم عالم چٹاک بیعتی لگو گی۔ نہ بابا

کے دل سے نکال دی۔ مگر دیکھیے میں آپ کو بالکل نہیں پہچانتی۔

اس کی ہنسی میں وہی قفل مینا کا ترن تھا جو طالب کو مجبور کر دیتا تھا۔ اس کے قہقہے رخساروں پر اسی طرح ڈھیل پڑتے تھے۔ آنکھوں کی جھلکا ہٹ سے اس کا چہرہ اور خوبصورت ہو گیا تھا۔ اس کے اندر قہقا کا سا ہوا اور دل مضطرب ہو گیا۔

» اودہ مہروز؟ « وہ اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے آج پہلی بار دیکھ رہا ہو۔
» تم سنی بڑی ہو گئی ہو! « اس نے واہنا ز انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
» جی ہاں بڑی ہو گئی ہوں مگر اتنی بھی نہیں کہ عالم چٹا کی بیعتی لگوں! « وہ مسکرائی۔

» اودہ مہروز! تمہیں وہ بات ابھی تک یاد ہے؟ «
اس کے اندر شرم سی ترن لگی۔
» دیکھیے۔ مجھے آپ کی فلاز اسی بات یاد ہے
» آپ مجھے بالکل بھول گئے! « مہروز کی آنکھوں میں پانی آنے لگا اور وہ اداس ہو گئی۔

» نہیں مہروز۔ تم رہنا میرے اندر موجود ہو۔ تمہیں اچانک سامنے دیکھ کر محسوس ہوا ہے تم آئینہ خانے سے نکلتی ہو۔ دراصل میں امتحانوں میں مصروف تھا۔
» مجھے اپنے اسٹوڈنٹ کو کبھی کچھ وقت دینا پڑا ہے۔
» تم ہی نہیں ملتی کسی کو سوچتے پایا د کرنے کی! «
اس نے کن انکھیں سے مہروز کی طرف دیکھا اور بولا۔

» شرم لڑکی۔ تم مجھے بتاؤ اس عرصے میں تمہارا نہ کوئی وزن آیا نہ کوئی فیئر خیر کچھ نہیں تھا تو کیونکر کے پاؤں میں چند ٹھنڈے سینٹے الفاظ ہی باندھ کر آؤ! «
» نہیں! «

اور مہروز نے شرم کو سر جھکا لیا۔
» اچھا خیر چھوڑو۔ حساب برابر ہو گیا! « وہ اس کا ہاتھ پکڑنے مسکراتا ہوا باغی رخ پر ہنسنے لگا۔
» اودہ مہروز! میں نے کہا تھا ان کے قدموں کو جو تم

اور تم اتنے عرصے کیا کرتی رہیں؟

» سفر! وہ مسکرائی۔

» کیا مطلب؟ «

» مطلب یہی کہ میں اتنے دنوں کتابوں کی سیاحت کرتی رہی۔ فلم کے کوئی چھٹی درسی۔ بڑا دلچسپ سفر تھا۔
» ماشاء اللہ بڑی ترقی کر لی ہے۔ دامن لعل و لہر سے بھر لیے ہیں۔ اب کیا ارادہ ہے؟ «

» فی الحال تو کوئی ارادہ نہیں۔ کراچی آنے کے لیے دل بڑا ہے چین تھا۔ سو میں آگئی۔ باقی جانے کو کہیں گی تو چلی جاؤں گی۔ اگر کسی نے روکا تو رک جاؤں گی! «

» یہ کہہ کر اس نے کن انکھوں سے شیوہ کی طرف دیکھا۔ شیوہ مسکرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو! اس نے بھی بات ٹال کر پوچھا۔
» اچھا آپ بتائیں کیا کر رہے ہیں یا کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ جاب یا بزنس؟ «

» بزنس کر رہا ہوں اور اسی میں شہرت پیدا کرنے کا ارادہ بھی ہے! « وہ مسکرایا۔
» سچ۔ آپ بزنس کر رہے ہیں کون سا بزنس؟ «
» مہروز! مجھے اس کے خوابوں کی تعمیر مل گئی۔
» خواب و خیال کا بزنس حسین اور جنرلوں سے معمور خواب! «

» مہروز! ایک دم کچھ سی گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے حیرانی سے شیوہ کی طرف دیکھا۔
» اسے تو اس میں اس قدر حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ خواب تراشتا ہوں۔ تخیل۔ کے چٹھے کھلا تا ہوں رنگ و خوشبو پختا ہوں! «

» یہ کیسا بزنس ہے بھلا؟ « مہروز اب بھی نہ سمجھی۔
» بس یہی کچھ کر رہا ہوں اور اسے بھی یہی سمجھ کرے گا! «
» بہت سے خبردار پیدا کر لیے ہیں۔ اس پر آشوب زمانے میں لوگ نیند کی گولیاں کھاتے اور نشہ کرنے کے بجائے میرے خواب خرید کر آنکھوں میں بجالاتے ہیں اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں! «
» آپ مذاق بہت اچھا کر لیتے ہیں! « مہروز بھی کبھی کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔
» میں اور بھی بہت سی باتیں اچھی کر لیتا ہوں! « وہ

ہنسنا۔

آپ کی طبیعت تو مضطرب ہے شیوہ ہے مہرزد کی آنکھوں میں ہلکا ہلکا خوف لہک رہے رہا تھا۔

اس نے ایک بھر پور قہقہہ لگا دیا۔

میری طبیعت بالکل مضطرب ہے۔ مجھے بات الگ سے

کہہ دینی چاہیے کہ تو دیوانہ کی طرح بھڑک رہی ہو۔

تو بھڑک کر کہہ دیتا ہوں۔ مجھے پریشان کیوں کر رہے ہیں؟ وہ روحی رو بھی سی ہوئی۔

اچھا آؤ۔ تم سچ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کر لو

خامخوارہ الفاظ ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر مڑا اور کچھ دیر چلنے کے بعد

سیڑھیوں پر گئے۔ لگا مہرزد کی خیرانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

(آپ بہت مشکل پسند ہیں شیوہ علی۔ نہ سمجھ میں

آنے والے۔ اور مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں

انہیں کوسنے میں مڑا سنبھلے ہوئے کو چھپاتے چھپاتے

کسی دیکھی جگہ اپنی باتوں۔ استعاروں سے ظاہر ہو جاتی

ہوتی ہیں)

وہ سوچتی سوچتی پورا زہر مہرزد کی گئی۔ سامنے دیوار

میں ایک دروازہ تھا۔ اس کی پشانی پر لکھا ہوا تھا۔

میں اور لیکن خوابوں کا حیرت کدو۔

مہرزد نے چونک کر شیوہ علی کی طرف دیکھا مگر اس

نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اندر کا دروازہ کھول دیا۔

اندر کا ماحول انتہائی خواب ناک تھا۔ ہلکی ہلکی میز

روشنی میں خوابوں کا سمندر بکھرا ہوا تھا۔ دیواروں میں

خوبصورت شیلیف نصب تھیں۔ ان پر موی اور سنگی

مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ کوئی پورا آئینہ تو ٹکئیل کے

مراحل سے گزر رہا تھا۔ کوئی ابتدائی مذوق خال اور ہیکر

کا محتاج۔ مینٹرمیں ایک گول میز چڑی ہوئی تھی اس

پر سرچری کے آلات کی طرح ٹرے میں جھٹس سازی کے

چھوٹے بڑے اوزار رکھے ہوئے تھے۔ کچھ کریاں بھی پڑی

تھیں۔ دوسری طرف ایزل پر کینوس چڑھا ہوا تھا۔ شاید

پتھر کی طرح خراش سے گھبرا کر وہ رنگ ویرش سے

کھینچ لگتا ہوگا۔ کوئی تصویر بنا رہا ہوگا مگر اس پر کڑا

پڑا ہوا تھا۔ مہرزد پر مویق انگلیاں، ہر چیز کا گہرائی

سے جائزہ لے رہی تھی۔ اس کا اسٹوڈیو بہت خوبصورت

تھوڑے لمبے لگی رہا۔

افوہ۔ آپ تو کہاں کی منانے لگے۔ آپ کو یہ سب

معلوم ہوا؟

یہ میرا خواب ہے مہرزد۔ جب میں نے پتھر کے اس

مچلے گئے کہ تراشنا شروع کیا تو ہر چیز واضح

ہو چلی گئی۔ اس کا چہرہ اس کی آنکھیں، لمبے گیس

بعض وقت تراب بالکل انہونی بائیں کرنے

لگتے ہیں۔ بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ پتھر لمبے

گیس ہو۔ میں صرف خواب نہیں دیکھتا۔ خواب

نہیں بنتا۔ خواب تراشنا بھی ہوں۔ اور پتھر شناس بھی

ہوں۔ قدرت کی کوئی چیز اس عجائب خانے میں

نہیں ہے۔ اور بے معرفت نہیں ہوتی۔ یہ جو اپنے اپنے

مذہب کے پیہر ڈھیلوں سے سراپا ملے کھڑے ہیں۔ یہ

ایسے اندر صدیوں اور قرون کی کہاں کہاں چھپائے

ہوئے ہیں۔ دکھائی دیتی ہیں، پتھری، منسکرائیں اور

زندگی کے سارے رنگ و خوشبوئیں۔ اور روشنی کے

ظلال ان شاہراہوں سے گزرتے ہیں جنہیں صدیوں کی

لہروں نے دھندلا دیا۔ جب ہم اس کے کسی چھوٹے سے

مذہب کے گھر کو دیکھتے ہیں۔ صاف کرتے اور چمکتے ہیں

اس کو تراشنے کا عمل کرتے ہیں تو اس کے اندر ہمیں

میں بے پایاں اور دلدادہ زمین کا احساس ہونے لگتا ہے۔

مگر شیوہ علی۔ اس میں زندگی کیسے آسکتی ہے؟

مہرزد۔ جو چیز اپنے اندر خوبصورتی اور شگفتگی

کے ساتھ ہے۔ وہی زندگی کو لپک کر قہقہے سے دوزخ مردہ

میں تو اپنی کشش اور حسن کو چھپی ہوئی ہیں۔

آپ کا فلسفہ میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ ہاں یہ

دوسرے کہ آپ کوئی جادوگر معلوم ہوتے ہیں جو پتھروں

کو جان اور احساسات دے کر خوابوں کو حقیقت

دروپ دیتے ہیں؟

شیوہ علی نے مسکرا کر دبی شہزادی کی مورتی اٹھالی

اس کے ہونٹوں کے قوس کو تراشنے لگا۔ پتھر رسا رہ

پشانی کے اعضاء اور آنکھوں کی نوک پیک درست

ہوئی۔ مہرزد بڑے غور سے دیکھتی رہی پھر اچانک

اچھا چھوڑ دی شیوہ: یہ بتاؤ کہ اس ایزل پر کس

شہزادی کی تصویر لگا رکھی ہے۔ کیا مجھے نہیں دکھائی

گئے؟ مہرزد نے مسکرا کر اس کی توجہ ایزل کی طرف

مبذول کر دی۔

یہ کوئی عام اور اس شہزادی کی تصویر نہیں ہے

زندگی کی خوشیوں سے مہمور اور مہمیزوں کے حلقے سے

بھر پور میرے خوابوں کی شہزادی کی تصویر ہے؟ شیوہ

علی نے مسکرا کر کہا۔

اچھا تو پھر ہم ضرور دیکھیں گے۔ مجھے تو آج ہی

معلوم ہوا کہ آپ اپنی اچھی تصویریں بھی بناتے ہیں۔ پتھر

ان کی نمائش کا اہتمام کیوں نہیں کرتے۔ یہ محض خواب

ہی تو نہیں ہیں۔ ان سے تو زندگی کی بہت سی حقیقتیں

واپس ہوتی ہیں؟

جنہیں مہرزد نمائش مجھے کسی چیز کی بھی پسند نہیں۔

جو چیز خود آنکھوں کو اچھی لگتی ہو اسے کیا دعوت نظر

دینا۔ میری چھوٹی سی دنیا میرے چند دوستوں پر مشتمل

ہے۔ جنہوں نے میرے فن کو سراہا ہے۔ اور انہوں نے

میرے کچھ چند فنکاروں سے متعارف کرایا ہے۔ یہ پتھر

تم ہو مہرزد: جس نے کبھی میری معرفت میرے

بندوں کی نفی نہیں کی۔ مجھے سمجھائے تلاش کیلئے

اور یہی میری تمام زندگی کا اساس ہے؟

مہرزد کی آنکھوں میں جیسے پوری کہکشاں اتر آئی

تھی۔ شیوہ علی کی شائش میری باتوں نے اسے فرش سے

اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہر شے

مسکراہٹ لرز رہی تھی۔

اچھا آپ نے باتوں میں مجھے بھلا دیا۔ ذرا اس

پر درہ نشین کے چہرے سے نقاب تو اٹھاؤ۔ میں بھی

آپ کے خوابوں کی اس شہزادی کو دیکھوں گا وہ اس

کے بالکل قریب آکر کھڑی ہوگی۔

دو نمائی میں کیا دوی؟ وہ مسکرایا۔

یہ تو اس پر میری ہیکر کے حسن پر منحصر ہے کہ کتنا تازہ

کرتی ہے؟ وہ مسکرائی۔

اچھا ذرا آنکھیں بند کر دو۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اب آنکھیں کھول دو۔

اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ہی وہ

خود مسکرا رہی تھی۔ اور مہرزد کو لول لگا جیسے وہ

قد آدم آئینے کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تو تصویر پر مہرزد کا پورٹریٹ تھا۔ اسے یاد آیا اس دن وہ اسی طرح کا پورٹریٹ لباس پہنے ہوئے تھی۔ ایک ہفتہ پر اس کے دوپٹے کا آئینہ پڑا تھا۔ دوسرا آئینہ سر سے ڈھلک کر کندھے پر آگیا تھا۔ بال کٹے ہوئے۔ پشت پر بڑے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر شرمیلیں جھمکتی تھیں۔ اور نگاہیں بھی بڑنی تھیں۔ کچھ دیر سنا سنا طاری رہا۔ پھر اس نے شیوہ کی طرف تجھیں آئینہ نظروں سے دوکھ کر کہا۔

”آپ نے تو واقعی کمال کر دیا کیا میں اس قابل تھی جیسے کیٹوس کی زینت بنایا جاتا؟“

”تم تو میرے شہر دل کی عمر ان ہومہرزدوں کے ایوانوں میں تھارے خن کے چرچے ہیں۔ یہ کیٹوس تو بہت چھوٹی سی چیز ہے۔“

وہ بڑی طرح سے شرمائی۔

”اچھا میں چلوں گی اس نے مڑتے ہوئے کہا۔“

اسے وہ برومانی دیے بغیر۔ ”شیوہ علی نے اس کے سامنے مسکرا کر ہاتھ پھیلا دیے۔ اور مہرزد نے اس کے پیچھے ہلے ہاتھ پر سر کر پنا ہاتھ رکھ دیا۔

اس تک تو شیوہ علی کھانا کوشادی کے سلسلے میں نالٹا رہا۔ مگر اب مہرزد کے بغیر وہ اپنی زندگی میں کچھ غلاما سمجھ کر رہنے لگا تھا۔ اور مہرزد وہ تو شیوہ علی کا سایہ بن گئی تھی۔ آخر ماں کے بے حد اصرار پر اس نے شادی کی باہمی بھری۔ اور وہ مبارک گھڑی آگئی جب دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ زندگی بہت خوبصورت ہو گئی تھی۔ اسے آج پہلی بار احساس ہوا کہ جیسے خواب زندہ اور محبت ہو گئے ہوں۔ محبت کے اصرار ان پر کھلے تو اندازہ ہوا کہ اصل زندگی کیا ہوتی ہے۔ اور خوشیوں کے سوتے کہاں کہاں سے پھرتے ہیں۔ کئی ماہ خوشیوں کی ترنگ میں گزر گئے۔ مہرزد کا کمر دوسری منزل پر تھا اور شیوہ علی کا اسٹوڈیو تیسری منزل پر۔ باقی پوری محبت پر مہرزدوں کے گلے جیسے ہوئے تھے۔ درمیان میں بیدکی مارک کر سیاں۔ اور ایک میز پر بڑی تھی جس پر وہ دونوں بیٹھ کر میاں بیٹے تھے۔ اور باتیں کرتے تھے۔ شادی کوچہ ماہ گزر گئے تھے۔ اور اب بھائی بھادو ج کو

شیوہ علی کی زادی کھنے لگی تھی۔ شادی سے پہلے کی بات اور تھی مگر اب وہ دونوں شادی شدہ زندگی گزار رہے تھے۔ اور دوسے تین ہونے والے تھے۔ اور اب اب اسی پنج پر سوچا جا رہے تھے۔ آبادی بڑھنے کی پھر اخراجات بھی بڑھیں تھے۔ بھائی کب تک کرتے رہیں گے۔ پہلے بہن نے مہرزد کو ساری اور کچھ بچھائی اور کہا۔

”اس سے کہو کہ اب تم شادی شدہ ہو کھل کر دوسے تین اور تین سے چار بھی ہو سکتے ہو۔ خوابوں کی دنیا سے نکلو۔ اور اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھو اور سوچو کہ نہیں اب کیا کرنا چاہیے؟“

مہرزد بہن کی باتیں سن کر چپ ہو گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ شادی کے بعد بھی شیوہ کی سوچوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اسے ذرا بھی مستقبل کی فکر نہیں تھی۔ احساس نہیں تھا کہ آٹھ بڑے بھائی اور ڈیڑھ چھوٹے بھائی کے باوجود نہ اسے اپنا بڑنس کرنے کی خواہش تھی۔ کوئی اعلا سرکاری ملازمت کی فکر بھیجھو اسے تو ہر جگہ ہاتھ لیا جاتا۔ کیونکہ اس نے بی ایس میں پورے پندرہ تھی۔ سب سے اس وقت بڑا زور لگایا تھا کہ وہ کسی بڑے یا کئی کمپنی میں اعلا پوسٹ پر لگ جاتے اور پھر آرمی جاتی ہوئی تھی مگر وہ اپنے خوابوں سے باہر نکلتا تو ناں۔ وہ دیکھیں خیاں اور خوابوں میں گم رہنے والا ایک سہل پسند نوجوان تھا۔ بڑی بڑی پرکشش آفرز آتے تھے شادی تھیں۔ لیکن شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ آتمی زندگی جن حسین اور دلکش خطوط پر گزری تھی ان کی انداز میں بننے کیلئے اور خواب دیکھنے کو بھی چاہیے گی۔ مگر زندگی کو اس نے ابھی برابری کہاں تھا۔ وہ کوئی پھولوں کی مالا نہیں تھی بلکہ پتھروں کا سینہ توڑ نکلنے والی دودھ کی وہ نہ تھی عشق کا وہ اعتبار تھا کہ اس نے فرہاد کے ہاتھوں میں تھمتھما کر شیریں کی دھاریں میں اسے خوراک ملا دیا تھا۔ کاش وہ ان گہرائیوں میں پہنچ سکتا۔ لیکن اس کے اندر کچھ ابھی سن بلوئے نہیں پہنچا تھا۔ مزاج میں وہی پچھتاؤ اور بے پرواہی بھائی اور بھادو ج کی کوئی بات بڑی لگتی تو ماں کی آغوش میں سر ڈال کر بسورہ لگتا۔ اور وضو پڑھا

اسے۔ پیار سے سمجھانے لگتے۔

”بیٹا! اب ماشاء اللہ تم جوان ہو گئے ہو۔ بڑے بڑے تمہارا تعلیمی کیریئر بھی شاندار ہے۔ پھر کیوں نہیں کچھ کرتے ہو۔ کسی بھائی کے ساتھ لگ جاؤ۔ تمہارے پاپا کی کتنی خواہش تھی کہ تم بڑنس کرو۔ نہیں تو کوئی اچھی سی مہرزد کرو۔ تمہارے خیر انکل نے بھی نہیں لو کر کی ہشکاش کی تھی کہ تمہارے پاپا کی سیٹ تمہاری منتظر ہے۔ آخر اس طرح کیسے کام چلے گا۔ بھائی بھادو ج بھی تمہارے پیچھے کیلے کہتے ہیں۔ میری بھی یہی خواہش ہے کہ میری زندگی میں تم کچھ کرو۔ انہوں نے پیار سے اسے بھجایا۔

”بیٹا! تمہارے پاس اتنا کچھ ہے کہ تمام عمر اچھے نہ کروں تو کم نہ بڑے گا۔“

شیوہ علی نے یہ بات کہہ کر ماں کو ہکا بھکا دیا۔ انہوں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ انہیں افسوس ہوا کہ ان کا بیٹا بڑھ لکھ کر بھی جاہل رہا۔ کوئی عقل و شعور کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اتنی تعلیم نے بھی اس کی صلاحیتوں کو حقیقت نہیں کیا یا پھر وہ دانستہ ایسا کر رہا ہے۔ بہر حال ضوئی نے بہت نہیں ہاری۔ ایسی بات نہیں کرتے بیٹا۔ بیٹھے بیٹھے تو فاراد کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر مہرزد کی عزت نفس اس کا دھار اس کی عزت کام اور مہرزد کام میں مضمر ہوتی ہے میرے بچے۔ باب دادا کا اثاثہ بھی اس وقت تک اولاد کا ساتھ دینا ہے جب تک وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ ورنہ یہ دولت پیسہ۔ بڑی بڑی اور بے وفا چیز ہے۔ بڑے بڑے دھڑا اور تخت نشینوں کے ہاتھوں میں اس نے کشول تھا دیے۔ تم ایسی عقلی بھی نہ کرنا۔

اور شیوہ علی اپنے ہونٹوں پر ہنسنے کی بجائے مسکراہٹ دینے والے سے آگے گیا۔ ماں نے اسے جلتے دیکھ کر منڈی سانس بھری اور لیٹ گئیں۔ اللہ نے انہیں چار کراہل جوان وجہ اور ذہن بیٹے دیے تھے۔ وہ تعلیمی میدان میں کہیں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ بڑے پھول بیٹے۔ اعلا پوسٹ اور بڑنس میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ سوسائٹی میں انہوں نے اپنی دھاک

بھادی تھی۔ مگر ان کا سب سے چھوٹا ڈالا ہنا ان کی کسی نصیحت پر کان نہ دھرتا تھا۔ بڑا مالوس تھا اس نے تعلیم میں بھی۔ وہ کسی سے کم نہیں تھا۔

وقت تیزی سے اپنا سفر کر رہا تھا اور مہرزد کے ہاں ایک بیٹا بھی آگیا اب سب کو اطمینان ہو گیا کہ شیوہ اب جڑ پکڑ چکے گئے گا۔ اب تو وہ ایک بیٹے کا باب بن گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ دو چار بیٹے اور گزرے تب پھر شیوہ علی پر زور ڈالا گیا کہ وہ کوئی نوکری یا کام کرے جو اس کو پسند ہو مگر اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹا مہرزد کو زیب نہیں دیتا۔ جبکہ وہ شادی شدہ اور بیٹے کا باب بھی ہو۔ بڑے بھائی نے کہا۔

”اب خواب و خیال کی دنیا سے نکلو۔ عملی دنیا تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ مرد کام کرتا تھا لکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا اہم مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ زمین کا سینہ چیر کر گل و گلزار کھلائے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ دنیا دیوان ہو جاتی۔ صرف خواب دیکھنے سے بیٹ بھر جاتا ہے۔ زمین کی ان گنت مزو تیں صرف کام سے ہی مشروط ہوتی ہیں۔ محنت کی عظمت کو تو خدائے بھی تسلیم کیلئے۔ اسی لیے حرکت میں برکت کہی گئی ہے۔ اسی قسم کی باتیں تقریباً روز ہی ہوتی ہیں بڑے سے چھوٹے بھائی کی بات وہ بہت مانتا تھا۔ ایک دن انہوں نے بھی اسے تنہائی میں سمجھانے کی کوشش کی۔ کہا۔

”بھائی! تم تعلیم یافتہ باصلاحیت نوجوان ہو پھر اپنی صلاحیتوں سے کام کیوں نہیں لیتے۔ بڑنس کرنا چاہتے ہو تو تمہارے ساتھ مل کر کرو۔ اس طرح تمہیں تجربہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ اگر تنہا کام کرنا چاہتے ہو تو اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ ہماری طرف سے تمہیں ہر طرح کا تعاون ملے گا۔ اگر نوکری میں تمہاری دلچسپی ہے تو وہ بھی مل جائے گی۔ لیکن اپنے آپ کو تیار نہ کرو۔“

شیوہ علی نے مسکرا کر انہیں یقین دلایا۔ ”بھائی میں اس پنج پر سوچ رہا ہوں کہ اور وہ ملین ہو سکتے دیکھتے ہی دیکھتے پھر ایک ماہ نکل گیا تب ایک دن مہرزد نے دبی زبان سے کہا۔

”شیوہ۔ برے بھتا آپ کو اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔ کسی بڑی بارنی سے ملانے کے لیے“ اور وہ ایک دم بھر دکھ اٹھا۔

”یہ تم سب لوگوں نے میرے خلاف محاذ کیوں قائم کر لیا ہے۔ تم کارہ زو مجھے نکلتے اور ناکارہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں بدحرام ہوں۔ بیٹھے بیٹھے کھاتا ہوں۔ سب پر بوجھ بن گیا ہوں۔ ٹھیک ہے اب میں گھر میں کھانا نہیں کھاؤں گا“

اس کی دھج اور دھار کی آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ مہرو نے اس کا یہ روپ۔ یہ غصہ پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ مقررہ کانپ رہی تھی۔ بات کچھ ایسی بڑا ماننے والی نہیں تھی جسے تیر کی طرح لگی تھی اور وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی تھی۔ بھائی بھادر نے بھی شیوہ کو اتنے غصے میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ کسی کی بہت نہیں پر رہی تھی کہ اس کی غلط فہمی دور کرے۔ اسے سمجھانے۔ بڑی ہمت کر کے مہرو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ بولی۔

”شیوہ! ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ بخانا خواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ آپ کو محض غلط فہمی ہو گئی ہے۔ کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ جیسے پانی پی پیے بغیر غصہ متھوک دیکھے پلینے مہرو نے فریج سے بوتل نکال کر گلاس میں پانی اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے غصے میں ہیری کی طرف دیکھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں، اس نے ایک ذرہ کا ہاتھ مارا اور گلاس ایک چھتا کے سے ٹوٹ کر دو تیک کبیر گیا۔ پھر وہ دم دم کرتا بڑھیاں اترنے لگا۔ مہرو بھی پیچھے ہٹا۔

”رنگ چاہیے شیوہ! میری بات تو سنیں! وہ درجانی ہو گئی۔ بھائی بھادر نے سامنے آگئے۔

”کہاں جا رہے ہو، شیوہ کیا بات ہے؟ ہا بڑے بھائی نے اسے ٹوکا۔

مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور ان کے درمیان سے نکلتا ہوا دروازہ کی طرف بڑھا۔ گرگ جاؤ شیوہ! یہ ماں کی آواز تھی۔ اس کے بڑھتے قدم ٹھٹھک

گئے، مگر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

”والیس! ڈیر میری بات سنو“ وہ مکر کے دروازے پر کھڑی تھیں، انہیں دیکھ کر سب بھائی بھادر ہٹ گئے اور روٹی پوٹی مہرو کو انہوں نے لٹالیا۔ اور اندر چل گئیں۔ شیوہ نے ہر ایک کو سوجا رہا پھر مڑ کر سر جھکائے آہستہ آہستہ ماں کے کمرے میں چلا گیا۔

”جی ماما! اس نے بھی کی طرف دیکھے بغیر نہیں۔ اس کے چہرے پر ابھی تک کڑخی تھی۔

”بیٹھ جا فریج! ماں نے حکم دے دیا۔

شیوہ نے ایک نظر روٹی پوٹی سوں سوں کرتی مہرو کی طرف دیکھا اور کڑی بڑھ گیا۔

”کیا بات ہے بیٹا! جنیں سب سے کیوں شکایت پیدا ہو گئی ہے؟

”ماں کا بھر ایک دم شیر و شکر ہو گیا تھا۔ ان کے لہجے سے متا جھلک رہی تھی۔

”نہیں ماما! مجھے نہیں بلکہ سب کو مجھ سے شکایت پیدا ہو گئی ہے کہ میں گھر کے معاشی حالات میں حصہ نہیں لیتا۔ مفت کی درگاہاں توڑتا ہوں۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ دیکھ دیکھ! شیوہ کی آواز بچ ہو گئی۔

”نہ نہ! ایسی بات نہ کرو! بھائی! کوئی بھی ایسا نہیں سوچتا۔ وہ گما معاشی زندگی میں حصے دار بننے کا سوال تو یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ گھر ایک ادارہ ہوتا ہے جسے گھر کے تمام ممبر مل کر چلاتے ہیں، اور سب لوگ حسب ذیل اور حسب حیثیت اس میں حصے دار ہوتے ہیں۔ اسی میں ادارے کا گھر والوں کی جوئی اور بہتری ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس میں دلچسپی نہیں لیتا تو اسے لٹاؤ اور آمادہ کرنا سب کا فرض ہے۔ اس میں غصہ کرنے یا برا ماننے کی تو کوئی بات نہیں تھی۔ تم سارے بھائی! بن! اس گھر کے ممبر ہو۔ تم سب کو اس کی خوشحالی کے لیے سوچنا چاہیے۔ میں اس سے پہلے بھی نہیں سمجھا تھا کہ آج میرے بھائی ایک ہے کل دو اور چار بھی ہو سکتے ہیں یہ بات نہیں پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ باپ دادا کی دولت برا بھلا کرنے والے سخت خسارے میں رہتے ہیں۔ انسان کو عیش و قوت بازو اور اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرنا چاہیے اور خدا بھی ایسے ہی لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد

آپ کرنے ہیں، ہمیں تمہاری میں اپنا عیسا نہ کرنا۔

”سب کیا منتارے دشمن ہیں، جو تمہیں کام کے لیے کہتے ہیں اس میں ان کا فائدہ ہے یا تمہارا؟“ موشال

”اب ہو کر شیوہ کی طرف دیکھتے ہیں۔

”ٹھیک ہے ماما! میں دو چار دن میں جواب دے دوں گا۔“

”اور بھی وقت لے سکتے ہو۔ سوچ مجھ کو جو قدم اٹھاؤ گے وہ زیادہ بہتر رہے گا۔“

شیوہ علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے مہرو بھی سر جھٹکتے خاموشی سے چلتے لگی۔

”سب عمار اور تمہارے بہن بھائیوں کا فائدہ ہے۔ تم نے لٹاؤ ان کے میری شکایت کی ہوئی! شیوہ مہرو کے سر پر کھڑا بڑی سخت نظروں سے اس کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

”میں شیوہ! میں نے ایک بار سنی ہے باقی کو منع کر دیا تھا تب سے وہ اس تو سوجا رہا بات نہیں کرتا، اور بڑے بھتا تو آپ کے بھائی ہیں! وہ آپ کے لیے برا سوچیں گے! مہرو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”وہ میرے بھائی! اس وقت تک تھے جب تک وہ تمہارے بہنوئی نہیں بنے تھے، اب وہ غصہ تمہاری باجی کے شوہر ہیں۔ اور پھر نہیں۔ وہ صرف اپنی اکلوتی سالن کے لیے سوچ سکتے ہیں بھائی کے لیے نہیں! نہیں شیوہ! کسی کی غبتوں کو اس طرح پامال نہ کریں! سب آپ سے بہت محبت کرتے ہیں!“

”اور تم؟“

”آپ تو میری دنیا ہیں، میرا سا بھائی ہیں۔ کچھ کریں تب بھی اور نہ کریں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا مہرو کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ جلدی سے نکل چکی تھی۔

رات شیوہ علی کا موڈ کچھ ٹھیک تھا۔ بچے کو سنانے کے بعد مہرو اس کے لیے جانے کے لیے گئی۔ پاس آئی تو شیوہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کے اندر اشارے کھل گئے اور اندر تک ٹھنڈک اترتی چلی گئی، تب اسے خوش دیکھ کر اس نے ہاتھوں ہاتھوں میں

کہہ دیا۔

”شیوہ! اگر آپ برا نہ مانتیں تو ایک بات کہوں؟“

”ہاں! ضرور کہو۔ سب نے کہنے سنتے ہیں اپنا حق استعمال کرنا۔ تم کیوں مجھے رہ جاؤ کہو؟ اس نے چہرے پر سنجیدگی کی چھاپ لگی مہرو دہلی گئی۔

”جی نہیں۔ مجھے جیسے نہیں کہنا۔ آپ مجھے سب میں شامل نہ کریں۔ میں تو اپنے دل کی بات بتانا چاہتی تھی آپ برا مان گئے اب کچھ نہیں کہوں گی۔“ وہ روٹھ گئی۔

شیوہ نے قہقہہ دیا۔ اور اسے اپنے حاتھ دکھاتے ہوئے کہا۔

”ارے بیٹی میں تو مذاق کر رہا تھا۔ بھلا دل کی بات میں نہیں سنوں گا تو پھر کون سے گا! اس دل کے ہاتھوں تو حمار ہوا ہوں۔ چلو مسکراؤ! اور وہ ہنس پڑی۔

”سچ پوچھیں شیوہ تو میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ آپ کی نوکری یا بزنس ہو، ہم الگ اپنی دنیا بسائیں جس طرح چاہیں رہیں۔ کامیابی پیش۔ ہماری آزادی میں کوئی غل نہ جو۔“

وہ اس کا ہاتھ کی گڑھی سے کھینچے ہوئے بولی، شیوہ کو وہ اس وقت ایک نئی سی پچی لگی۔

”خیال غلط نہیں ہے مہرو! اس نے مسکرا کر کہا۔

”میں نے بھی اسی بیچ پر سوچنا شروع کر دیا ہے!“

”اللہ پاک۔ آپ کی مدد فرمائیں!“ مہرو نے سینے سے جیسے بوجھ سنا اتر گیا۔

ایک ہفتہ سوچ بچار کے بعد شیوہ علی نے گھر میں ایک دھماکا کر دیا۔ اس نے بھائیوں اور ماں سے جائزہ لیا۔ پناہ سے مانگ لیا۔ مٹوڑی دیر کے لیے سب تنگ سے رہ گئے، دونوں بڑے بھائی ایک ساتھ بزنس کرتے تھے، اور تیسرا بھائی علیہ و کتا تھا۔ ماں نے شیوہ کی بات سنی اور سوالیہ نظروں سے دونوں کی طرف دیکھنے لگیں، تب انہوں نے کہا۔

”امتی حضور مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر آپ جانتی ہیں کہ سارا پیسہ بزنس میں لگا چاہیے۔ نہ دوست چاہیے، چاہے اس لاکھ روپیہ نہیں نکال سکتا بزنس بیٹھ جائے گا۔ یہ کوئی معمولی رقم نہیں، ہاں رقم رفتہ بہم یہ پیسہ نکال لیں گے۔“

”میں پرسب کچھ نہیں جانتا۔ جب پاپلے جانداد فقیر کی بیوی اور وہ آپ لوگوں نے کیش کرن پھر میرے جتنے کی رقم کیوں نہ عقودہ بینک میں فکس کر دی گئی، اسے کیوں بزنس میں لگا دیا گیا؟“ شیوہ کی بات پر دونوں بھائی ایک زبان ہوئے۔

”تو تم چارے ساتھ مل کر بزنس کرو۔ اصل کے ساتھ منافق بھی نہیں ملتا رہے گا۔ اور تجربہ بھی حاصل ہوگا۔“

”نہیں میں آؤر بھائی کی طرح علانیہ کام کرنا چاہتا ہوں اور تجربہ میں نے آپ ہی لوگوں کی باتوں اور لکھ رکھا دینے حاصل کیا ہے کہ بزنس کے ساتھ ہر قسم کی بے چارہ جتن ہوتی ہے۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم میر پور کا کاروبار کرتے ہیں؟“ بڑے بھائی کو غصہ آگیا۔ ”میں کسی بے چارہ کو نہیں جانتا۔ اپنے متعلق کہہ رہا ہوں کہ آپ لوگوں نے چھوٹے بھائی کی رقم ہر پھر کر دی ہے۔“

”نہیں شیوہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بھائی بنا ہٹے جھانے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اور دیکھ اس کے کہ بات سے بات نکلتی ہوئی شیوہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں اور بولیں۔

”بھائی! بڑے بھائیوں سے اس طرح حد تک بات نہیں لیا جاتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کاروبار سے اتنی بڑی رقم نکال لی جائے تو وہ صوبہ بھر جاتا ہے۔ تم نے اس سے پہلے کبھی بزنس کا خیال ظاہر نہیں کیا۔ اس کے تیار و متین کتنی رقم چاہیے اور تم کون سا بزنس کرو گے۔ بھائیوں کی طرح دشمنی اپنی طرف کرو گے یا سپر پائرس؟ وہ سہ کر بولیں۔

”مگر جان! میں کامیٹکس کا بزنس کروں گا یا مال نہیں پڑیں۔“

”ٹھیک ہے تجھ لگا کر بناؤ، کتنا پیسہ چاہیے۔“

پھر تھیں اس کے لیے دکان کی بھی ضرورت پڑے گی؟

”جی دکان تو میرے دوست نے مجھے دے دی ہے، لوکیشن بھی بہت اچھی ہے۔ اور میں نے لائسنس بھی لے لیا ہے۔ فی الوقت مجھے تیس لاکھ کی ضرورت ہے۔ مگر آپ کہاں سے دیں گی؟“

”میں گاؤں والی جوہی اور مالے کا باغ گروہی رکھ دوں گی، تم اپنا کام چلانا پھر جب مجھے عاقبت پیسے دے گا وہ میں ادا کرتی رہوں گی، لیکن تمھیں طمان ہونا چاہیے کہ تم اپنے خوابوں کی دنیا سے نکل کر ایک عملی زندگی گزارنے کی کوشش کرو گے۔“

”مگر! میں نے بتایا آپ کو کہ میں کامیٹکس کا سہارا امپورٹ کروں گا۔“

”ٹھیک ہے بھائی! میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے جواہر پر رنگ و نور اور خوشبو کا کام تمھیں تک طاری ہے۔ تم ابھی تک اس سے چھپا نہیں پھڑکے۔ خبر میں جا رہی ہوں کہ جو بھی کام کرو، مستقل مزاجی سے کرو اور کامیٹکس کا کام ہی تو تم جیسے پڑھے لکھے نوجوان ہی کرتے ہیں، پس محنت شرط ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں، انشاء اللہ پوری دیانت والی سے کروں گا۔ وہ مسکرایا۔

پھر پروگرام کے تحت موقوفات نے گاؤں جا کر جوہی اور مالے کا باغ نصیر صاحب کے پاس گروہی رکھ دیا۔ یہ باغ اور جوہی انہیں ماں کی طرف سے ملی تھی جیسے احمد علی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ نصیر احمد علی کے دوستوں میں سے تھے جنہوں نے باہر جا کر برطانوی دولت کمانی پھر اپنے آبائی گاؤں میں آکر خاموشی اور خردی، فارم خرد اور گاؤں میں اپنی دھاک بٹھا دی ان کے صرف دو بیٹے۔ دو بیٹیاں تھیں ایک بھائی ایک بیٹی تھیں جن کی ایک ایک بیٹی گاؤں میں یہ لوگ اخلاقی کمزور تھے۔ انہوں نے سونی سے بہت کمال آپ رقم نے جائیں مگر جا بجا رہن رکھنے کی بات نہ کریں میں اپنے دوست کی روح سے خشن نہ ہونا چاہتا۔

”نہیں نصیر بھائی! یہ آپ کی محنت ہے۔ لیکن کے معاملے میں ہمیشہ بات صاف کرنی چاہیے، دنیا

کاروبار کی طرح چلتا ہے۔ اس میں کوئی خرمندگی کی بات نہیں۔“

موقوفات کی بات پر وہ مسکرائے۔

”ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی۔ یہ آپ کی امانت ہے میرے پاس۔“

اس طرح شیوہ علی نے کامیٹکس کی دکان کھول لی، دکان میں بڑے بڑے خوبصورت شوکیوں میں بچے ہوئے رنگ برنگ کے جوتے، ایک ایک کھانا شیشہ، نوشن، کریکس، خوشبو، دکان کم شوروم زیادہ نظر آتا تھا۔ گاؤں پر ایک خور و نوجوان اور لائسنس پر ایک حسین و جمیل لڑکی، جو بیوی کو تن کاچتا پھرتا اشتباہ تھی، لوگ حیرت برداری کے ساتھ اس مارکیٹ میں سب سے خوبصورت دکان اور لوگوں کو دیکھتے آتے تھے۔ اسی کے ملحق انیلا احسان کا اپنا بیوی پارلر تھا۔

اس طرح شیوہ کی دکان اور چمک گئی تھی۔ اور۔

ایک ایک کے شوقین لڑکے، لڑکیوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ شیوہ علی کی زندگی جیسے بدل گئی تھی، انہیں میں حسین خواب بھلنے والا نوجوان ان کی بقید میں دیکھ رہا تھا۔ رنگ و نور کی فضا میں اس کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔

وہ بہت خوش تھا اور ہر روز کے حواہر کر کے اپنی دکان اور بیوی پارلر دیکھنے کے کیا تھا، ہر روز خوشی تھی کہ اس کا شوہر کچھ نہ کچھ کر رہا تھا۔ اب اسے کوئی بے کاری، کالعدم کو نہیں دے گا۔ انیلا ایک ایڈیٹر تھی، جس کی شادی اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ وہ خوبصورت نہیں تھی، اس کے چہرے پر چمک کے داغ تھے، باپ بڑی دولت چھوڑ کر مر گیا تھا، اور وہ اپنے ماں باپ کی اگلی لڑکی تھی، اس کے باوجود اس کی شادی نہ ہوئی۔ آجکل کے نوجوان گوری چٹری کے دیوانے تھے۔ انہیں دولت نہیں خوریری چاہیے تھی۔ تیب وہ دل برداشتہ ہو کر لندن چلی گئی۔ اس نے وہاں سر جری کر لی۔ اور حسین سے حسین نہ رہنے کے سارے کر سکے۔ اور چار پانچ سال میں وہ ایک بالکل بدلی ہوئی لڑکی کے روپ میں پاکستان

والیں آگئی۔ اب وہ پری وٹ اور خورشید ٹی، لکھنؤ کی چار سال کی منت ہی مہر وینت اور حسین نے کیڑیٹک نے اس سے دس سال چرایسے تھے۔ اب وہ گوری چٹری اور سلم و شیوہ کے روپ میں سامنے تھی، غیر تو خیر اسے اپنوں نے نہیں بیجا تھا۔ وہی نوجوان، وہی لوگ جو اس سے کوئی کاٹ کر نکل جاتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے حقارت ہوتی تھی۔ اب اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ اور انیلا انہیں منہ نہیں لگاتی تھی۔

اور اس نے اپنے کامیٹکس کی تسکین کے لیے بیوی پارلر کھول لیا۔ اس نے وہاں کئی شیشے رکھے، ساج ایک سائز، ٹھنڈے گرم پانی اور چھاپ سے غسل وغیرہ اپنے بیوی پارلر میں اس نے ایک چھوٹا سا سونگ پول بھی بنایا تھا۔ اور چن چن کر اس نے حسین چہرے رکھے تھے۔ وہ عورتیں تھیں بریائیں تھیں، منت تھے چلتے پھرتے فیشن تھے اختیار تھے۔ اس کے بیوی پارلر کی دور۔ دور و دور تک تھی۔ عموماً لوگ ان کی طرح بھانساؤں جانتی تھیں، اپنے ساتھ فلر ایڈیٹوں اور ماڈل گرل کی تصویریں لاتی تھیں۔ اور انہیں اسی طرح بنا دیا جاتا تھا۔ مگر وہاں کی فیس بھاری ہوتی تھیں۔ اصل میں کامیٹک شاپ کوہنے کا مشورہ انیلا نے ہی دیا تھا شیوہ علی کو، اور کہا تھا کہ۔

”تمہارا مزاج شاعرانہ ہے۔ تم ایک تخیل پرست نوجوان ہو، تخیلوں سے بہرے تراشے ہو اور موسم سے خواب، ریمیں، ریموریاں تمہارے ذوق سلیم کی تسکین تو کر سکتی ہیں مگر ان خوابوں کو بقیہ نہیں دے سکتیں۔ ایک دن آنے کا کہیں جبر کا محور نہ آس خود ساختہ دنیا کو چھوڑنا پڑے گا۔ یہ کہہ کر انیلا احسان لندن چلی گئی تھی، پھر اس کی کوئی خبر شیوہ علی کو نہیں ملی۔ وہ بڑی ذہین۔ تعلیم یافتہ اور زمانہ ساز لوگ تھی۔ اس کی دوست ہونے کے نالے اسے بہت اچھے مشورے دیے تھے، اکثر وہ اس کو محنت باتیں بھی کہہ جاتی تھیں۔ شیوہ تم نے اپنی صلاحیتوں سے کوئی تفریحی کام نہیں لیا۔ خواب سب دیکھتے ہیں، مگر کون اس طرح اپنے حواسوں پر انہیں طاری نہیں کر لیتا، خواہ مخواہ ایک

خوبصورت، ذہین نوجوان ان خوابوں کے ہاتھ تباہ ہو رہا ہے۔
 اور شیوہ علی اس کی ساری باتیں ہنسی سمجھتے ہیں اور دوتا برا نہیں مانتا تھا۔ اس نے جانے کے بعد کوئی مراحل آئے۔ اس کی شادی ہوئی۔ ایک شاہمی ہو گیا۔ اور گھر والے اس پر کام یا نوکری کا بدلیش ڈالنے لگے۔ اس کی بچیں کچھ نہیں پڑھا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس انشائیں انیلا آنا کو رت مل کر کے لندن سے آئی۔ سب سے پہلے وہ شیوہ علی سے ملی، وہ اسے بالکل نہ پہچان سکا۔ تب اس نے اسے پوری پوچھ لپچھ بتائی۔
 ”واقعی سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے مبارک ہو دوست، تم اپنے مشن میں کامیاب ہو گئیں برہمچے کو شیوہ دوم نے سچ کہا تھا کہ ان خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ اور یہ کہ ایک وقت آئے گا کہ تمہیں یہ دنیا چھوڑنی پڑے گی۔ چنانچہ میں اوٹ کی طرح دو سہاڑوں کے درمیان آکر بلبل رہا ہوں۔ اب کہہ دو گاؤں؟“ وہ مسکرایا۔
 اس نے اپنی پوری کھٹا انیلا کو سنا دی تھی، وہ عجیب لڑکی اور بیک اس کا مذاق اڑاتی رہی۔
 ”بس تم خواب ہی دلاشتے رہو۔ اور لوگوں کی میٹوٹ ہانک رہا ہے۔“
 ”پیارے بہت اچھا ہوا کہ تم خوابوں کے ان جڑیوں سے بے دامن ہو گئے نکل آئے۔ اب میرا شور مارتو تو کس انگلیس کا بزنس کر لو گے۔ بیوی پارلر کھول رہی ہوں تو آج کل امپورٹ کرو گے میں اس کی مستقل خریدار بن جاؤں گی، مجھے کہیں اور نہیں جانا پڑے گا۔ کیا خیال ہے؟“ وہ نہیں کر بولی۔
 ”بات تو تم نے چنے کی کہی ہے۔ مگر اس فیلڈ میں مجھے تو کوئی تجربہ ہے نہیں؟“
 ”نور بلیم۔ میں نے چار سال لندن میں گھاس تو نہیں کاٹی بیکر کے ہی تو حاصل کر دی تھی۔ وہ کس دن کام آئے گا؟“
 ”جو پھر ٹھیک ہے؟“ شیوہ علی نے پلاننگ کر لی اور کام شروع کر دیا۔
 ”جھاٹیوں نے بڑا دایلا مچایا جب انہیں پتا

سیلا کرماں نے شیوہ کو گاؤں کی حویلی اور مالے کا باغ گروی رکھ کر مودی ہے۔
 ”وہ حویلی اور مالکوں کا باغ تو خاص آپ کی ملکیت تھی۔ اس کے خرچے سے تو میں لوگوں کی ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں اسی جان۔ آخر آپ نے ہم سے کیوں نہ پوچھا اپنے لاڈلے بیٹے کو کھٹ اس جائداد کا پیسہ دے دیا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ ہم کیا آپ کی اولاد نہیں تھے؟“
 ”تم سب چارے لاڈلے۔ جاری اولاد ہو مگر حق تم لوگوں کی وجہ سے مجبوراً مجھے ایسا کرنا پڑا۔ ورنہ میں جائداد پرین رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی تم نے بدویائی کی تھی؟“
 ”کیوں اسی جان۔ ہم نے کیا بدویائی کی تھی؟“
 ”تم نے شیوہ کا پیسہ کیوں اپنے بزنس میں لگا دیا؟ تم انہیں جانتے تھے کہ شادی کے بعد اسے کچھ نہ بچے گا تو پھر کاشاد وہ اب بھی کچھ نہ کرنا لیکن تم سب بھائیوں نے مل کر اسے نوکری یا بزنس کے لیے اکسایا۔ مجاہدوں نے گھر بیٹھے اور بے کاری کے طعنے دیے۔ بڑی بھونے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر میں معلوم ہوتا کہ وہ محض خوابوں میں رہنے والا ایک بے پرواہ انسان ہو گا تو میں اپنی بہن کی شادی نہ نہ کرتی اس سے۔ کیا تم سمجھتے تھے کہ شیوہ علی بھراؤنگا اور اندھا ہے۔ اسے کچھ پتا نہیں۔ اس کے کانوں میں یہ آوازیں نہیں پہنچتی تھیں، تم لوگوں کے بدلے ہوئے تیر و تہیں دیکھتا تھا۔ بقول تم لوگوں کے کہ وہ تو محض خوابوں میں رہنے والا ایک نوجوان ہے عملی زندگی کو کیا جانے۔ یہ بات ہم زور درست نہیں۔ خوابوں اور خیالوں میں رہنے والے لوگ بڑے نازک طبع اور حساس ہوتے ہیں، یہ بات تم نہیں جان سکتے ہیں جانتی ہوں اب جبکہ وہ کچھ نہ بے ریتار ہو گیا تھا تو میں اسے کس طرح مالوس کر دیتی، اب جو رقم تم دونوں مجھے شیوہ علی کے قرض کی قسط میں دو گئے وہ نصیر صاحب کو حق کر رہے تھے۔ اور ان ضرورت مندوں کی ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہیں گی۔ پھر ایک دن ہم اپنا باغ اور حویلی ان سے واپس لے لیں گے۔“

اب کہتے سننے کو کیا رہ گیا تھا۔ پھر بھی بڑا بیٹا بول پڑا۔
 ”اسی جان: آپ نے دیکھا کہ اس نے بزنس بھی کیا کیا ہے؟“
 ”ہاں میں جانتی ہوں۔ مگر اب تم لوگ اس سے کوئی بات نہیں کرو گے۔ اسے صرف رہنے دو۔“
 بزنس تو چلنا تھا سو خوب چلا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس پر جنت کے دردازے بھی لھلھ گئے تھے۔ اور وہ حسین جہروں، ہرے لال نیلے پیلے آجیوں کی دھنک میں گھر کر رہ گیا۔ اب اس کی بد وقت و دنیا نوعیت کی ہوئی تھی۔ گھر میں وہ بہت کم وقت دیتا تھا۔ مگر جتنا بھی دیتا۔ مینٹا پنٹا کرتا رہتا۔ اور اسے خوش دیکھ کر ہر روز اور خوشیوں کا ہن بکا بھٹکا ہوجاتا۔ بچے بھی بہل جاتے، خدائے اسے ایک بیٹی بھی دے دی تھی۔ اور شیوہ اس کو کھنٹوں کھلاتا تھا۔ بہت پیار کرتا تھا اس سے۔ اوپر سے جتنے میں خوشیوں نے ایک بال کیسے اور کین کی تعبیر کوا لی تھی۔ دو بٹر روم اور ایک ٹرانگ روم پہلے ہی بنا ہوا تھا۔ اوپر کا حصہ ملکی ہو گیا تھا۔ خوشیوں نے اسے فرنیچر اور ضروری سامان سے آراستہ کر دیا تھا۔ ایک زینہ گھر کے اندر سے اوپر تک آتا تھا۔ دوسرا زینہ باہر سے تھا۔ اب اس کا اپنا ایک علیحدہ گھر تھا۔ اور ہونے والے سال کو اوپر بلوایا تھا۔ اب خوشیوں اپنی بیوی بچوں کے پاس تھیں۔ اور دونوں بچے ان کا دل بھلاتے تھے۔ ان کی نوکرائی بھی اوپر لگی تھی۔ اس چیز نے دونوں بیٹیوں اور بیٹوں کو بولھلا دیا تھا۔ بڑی بھالو ج نے اپنی بہن مہروز کو خوب برا بھلا کہا بولیں۔
 ”کیا ہم نے یہ سارے سارے باپڑا اس کے لیے کیے تھے سب برائیاں اس لیے کی تھیں کہ وہ الگ ہوجاؤ؟ ہم تو سمجھتے تھے کہ تم ہمارا ساتھ دو گے۔ مگر تم نے تو ہمیں شرمندہ بھی کر دیا اور مالوس بھی کیا؟“
 ”باقی: شیوہ علی میرے شوہر ہیں میں ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہ سکتی۔ اب وہ اپنے ہیں یا میرے میرے سہارا تاج ہیں۔ آپ لوگ ہمارا نگرہ چھوڑ دیں۔“

ہر بہت خوش اور ٹھیک ہیں: مہروز کچھ بیزاری سے بولی۔
 ”خدا کرے تم ٹھیک رہو۔ ہمارا بھی تو مقصد یہی تھا کہ تم ہمیشہ خوش اور تہتی رہو؟“ بہن نے اسے گلے سے لگایا۔
 پھر کئی دن گزر گئے۔ شیوہ گھر نہیں آیا۔ مہروز اور خوشیوں نے پشیمان تھیں۔ یہ سبلا موقع تھا جو وہ گھر سے غائب تھا۔ مکان کے متعلق انہیں اپنے نوکر سے جو خبریں ملتی تھیں۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا جیسے شیوہ مکان پر نہیں جاتا۔ کیونکہ جب نوکر کو مکان پر بھی گیا وہ نہیں ملا۔ مکان کے ملازمین سے پوچھا جاتا تو وہ کوئی سنا نہ کر دیتے۔
 ”یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے دہن؟ خوشیوں پوچھا تو وہ چپ ہو گئی۔ پھر بولی۔
 ”مما۔ جب سے انہوں نے مکان کھولی ہے۔ وہ مکان پر نہیں ملتے۔ کہاں ہوتے ہیں کچھ پتا نہیں؟“
 ”تم نے اس سے پوچھا تھا۔؟“
 ”نہیں؟“
 ”کیوں؟“
 ”اس لیے کہ انہیں کہیں غصہ نہ آجائے کہ میں ان کے آنے جانے کا حساب رکھتی ہوں؟“
 ”عجیب سوچوف لڑکی ہے۔ ارے اگر بیوی حساب نہیں رکھے گی تو کون رکھے گا باہر ولسے؟ سوچی نے سخت بے میں مہروز کو ٹوٹا۔ تو مہروز انہیں مدھم بے میں بتانے لگی۔
 ”مما۔ اصل میں انیلا احسان ان کی کالج کی دوست ہے۔ وہ لندن سے بیوشن کا کورس کر کے آئی ہے۔ اور اس نے اسی جگہ اپنا پارلر کھولا ہوا ہے۔ شیوہ کو اسی نے کسٹمس کی شاپ کھولنے کا شور دیا تھا۔ ان کی دکان اس کے پارلر کے ایک حصے میں ہے۔ دکان تو نوکروں پر رہتی ہے اور خود وہ انیلا خود سناہ جنت میں؟ اس کے ہنٹوں پر اداسی مسکراہٹ کبھری۔
 ”اوہ۔ تو یہ جکر چلایا ہے اس نے۔ بیٹی کچھ کرو۔ ورنہ خواب و خیال میں رہنے والا وہ لوکا اس کی۔“

خود ساتھ جنت میں لھو جائے گا۔ پھر ہاتھ نہیں آئے
گھاٹا
مہر وز سہم گئی۔
”مٹا بجے ان سے ڈر لگتا ہے آپ ہی بات کر
لیجیے گا۔“
وہ کچھ نہیں بولیں۔ بہو کے ہاؤز جبر سے کلاط
دھکی رہ گئیں۔ آخر دو دن بعد وہ آیا تو خفاغوش تھا۔
مہر وز نے اس سے کھانے کے لیے پوچھا تو اس نے
انکار کر دیا ہوا۔
”میں کھا کر آیا ہوں“ مہر وز چپ ہو گئی تو اس
نے کہا۔
”کیوں بیٹا، کیا تم نے کوئی دوسرا گھر بنالیا ہے؟“
ان کے چہرے پر دکھ پھیلا ہوا تھا۔
”نہیں ماما۔ یہ کیسی بات کہہ دی آپ نے؟“
اس نے گھر اگر جواب دیا۔
”مہر بیٹی کیا کہوں۔ آج قیاسے دن تم گھر آئے
ہو، لاگو کر دوں پھر بیوی تو تم ملنے نہیں، بچے کیا پایہ
یا کیا بیکار ہے رہتے ہیں۔ اور جب آئے تو
گھر کی زینت سب کچھ اسے ہو۔ دو دن بعد بھی نہیں خیال
دیا کہ یہاں اپنی ماں، بیوی اور بچوں کے ساتھ کھانا
کھائیں گے، ایسا تو شایب ہی ہوتا ہے جب ہم سے
زیادہ محبت اور دلدادگی کرنے والا موجود ہو۔“
”بیوی، ایسی بات نہیں دوستوں نے باری دی
تھی، رات کو دو رات ہی پروگرام بھی تھا۔ رات بھر جاتے
رہے۔ آج کھل کو تو وہ وقت آنے کا نہ تھا۔ دکان پر
کام نکل آیا۔ پھر کھانے کا وقت ہو گیا، ایک دوست نے
نہاری منگوائی مجبوراً شریک طعام ہونا پڑا۔“
”ٹھیک ہے ماما، تمہاری ان کہانیوں پر کم سے
کم میں یقین نہیں کر سکتی، تم تجاہلوں سے نکلے تو سزاؤں
میں جیٹس گئے۔ تم نے جو یہ مجھ سے مانگا میں نے
دے دیا۔ جو چاہا تم نے کر لیا۔ جہاں میں سمندر زوری
کی، ماں کے اعتماد کو جیسے پیچان، بیوی کی حق تلفی
کی، بچوں سے دور رہے، اس سے آگے میں اور کیا
کہوں، میں گھر میں بیٹھنے والی عورت، تمہارے تعاقب
میں کہاں کہاں جا سکتی ہوں۔ مگر کم سے کم جھوٹ کو تو

ایسا شعار نہ بناؤ، تم تجھے سوکر مر دیتے فون کے، جتنی
خلاف ورزیاں کر کے اٹھائے، اعتبار کے عمل سمار کر کے
اس کے لیے کوئی عدالت نہیں ملے گی تو شاید تبتاری
بھول ہے، مہر و تبتاری ہوئی ہے، گھ واولوں سے
کٹ کر رہ گئی ہے زبان کوئے کی زبان کاٹ جائے
گی، مگر میں تبتاری ماں نہیں جس طرح پیدا کیلئے اسی
طرح ناپید بھی کر سکتی ہوں۔ ماں بھی کمزور نہیں ہوتی،
سنبھل جاؤ، اگر تبار کے کسی بھائی کو تبتاری یہ باتیں
چٹا چل گئیں تو تین سر اٹھانے کے قابل نہیں رہوں گی،
کیونکہ میں تبتاری سے لیے ان سے لڑتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ
ان سے پٹ گئیں۔

”مہاجان! مجھے معاف کر دیجیے اب ایسی کوتاہی
نہیں ہوگی“
نوفشانی نے اس کی طرف خاموشی سے دیکھا اور
اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر چل گئیں۔ تب وہ مہر و
سے مخاطب ہو کر بول چھینے لگا۔
”تم بیوی یا رگ کیوں لگی تھیں۔ کیا تمہیں بھی اب
مجھے سمجھنے سے کاشفی ہو گیا ہے؟“
شیوہ کے لیے میں طعنہ تھا۔ مہر و نے یکبارگی
اس کی شدت فشان آنکھوں کو دیکھا سنبھلی اور مسکرا کر
بولی۔
”مجھے سمجھنے سمجھنے سے کمزورت نہیں۔ میں اب
بھی یقین نگار کے کر لے گی ان حوروں، پرلوں سے
بہتر ہوں جو انیلا احسان نے اپنی خود ساختہ جفت میں
لا کر رکھی ہیں، میرے چہرے پر کوئی دوسرا چہرہ نہیں
لگا۔ یہ میرا اپنا چہرہ ہے اور یہ بھی سن لیں کہ میں
آپ کی دکان پر تری لکھی آپ کو بتانے کہ جن کی طبیعت
خراب ہے وہ آپ کو آوازیں دے رہا ہے۔ لوگر
چھٹی پر بٹھا اس لیے مجھے جانا پڑا، وہاں عارف نے
مجھے اندر پہنچا دیا اب کسی لوگ سے نہیں کہیں کہ باتیں
کر رہے تھے، مجھے انیلا سے باتیں کرتے دیکھ کر آپ
آرویں ہو گئے۔ انیلا نے مجھے بتا کر وہ ابھی مڑتی دیر
قبل ہی چلے گئے پھر میں آگئی۔ آخر آپ کو مجھ سے چھینے
کی کیا ضرورت تھی۔ اور انیلا سے کیوں جھوٹ بولا۔
آخر آپ مجھ سے کیا کیا چھپانا چاہتے ہیں۔ آج حسب

سارا بنا ذہن لگا کر بھیجے۔ غلام ہے میں کریمی
 اس کی ہوں۔ کیا لگا دکھوں گی آپ کو اس شخص سے
 انا تو ہو گا کہ میں اپنا منہ بند کر لوں گی۔ اور کچھ نہیں ہوں
 کی اس لیے کہ آپ میری محبت ہیں۔ میں آپ کی محبت
 میں، جس کی جلائی کا آپ کو احساس ہو یہ کچھ کہہ کر وہ
 میری سے کرے میں جلی گئی۔
 اور بہت پر ادنیٰ کر کر رونے لگی، شہوہ پریشان
 ہو گیا۔ سڑاٹھا تو دو دن بچے قریب کھڑے اس کی
 طرف دیکھ رہے تھے، وہ چمکا اور دونوں بچوں کو
 اپنے سے لگا لیا۔
 اچھے ہو بیٹا، وہ مجھ کو مانہ مجھ کر بولا۔
 بابا! آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں آپ کو بہت
 یاد کر رہا تھا۔ ڈاکٹر انکل نے اتنی کرٹوی دوا دی کہ
 اب تک میرا منہ کڑوا ہو رہا ہے۔ آپ اپنی کو منہ کر
 میں آپ میں دوا نہیں ہیں گا۔ اور آپ کے ساتھ
 دکان چلوں گا۔
 اچھا اچھا۔ میری جان ضرور چلنا۔ اب تمہیں دوا
 لگی ضرورت نہیں۔
 ابھی کس نے اتنی افزونہ کے نرم نرم گالوں پر
 اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اور بولا۔
 میری رانی بیٹی کیسی ہے؟
 پایا! اب تو آپ مجھے جھوڑ کر نہیں جائیں
 گے؟
 نہیں جیندا۔ میں ذرا کام سے چلا گیا تھا۔ اب
 میں جاؤں گا۔ اچھا تم دونوں اپنی دوائے پاس جاؤ۔
 کچھ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ابھی تک اس کے گالوں میں ہر روز
 لگی ہوئی سیکیوں کی آواز آتی تھی جو اسے بے چین
 رہی تھی۔ دونوں بچے دوڑتے ہوئے دوا کی
 اس کے طرف چلے گئے اور شہوہ آہستہ سے اسے
 سے میں آگیا۔ اور ہر دو کی طرف بڑھا۔ وہ اسی طرف
 میں منہ چھپاتے رو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اس
 پاس بیٹھ گیا۔ اور اس کا سناٹا کر اپنی گودیں رکھ
 ادا ہوا میں انگلیاں پھینے لگا۔ ہر روز جلدی سے
 دیکھتے تھے۔ اور اس کو بھری آنکھوں سے اس کو دیکھ
 لیا۔

لوشہ شیمو بیچوں اور حسناؤں کو میک اپ کی
درائشوں اور لپ اسٹک کے شڈ کی غیروں پر
روشن ڈالنا ہوں۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں عیشہ آزاد
رہا ہوں اپنی نیند سو یا اپنی غیبت جاگا۔ اپنے خواب
دیکھے چہرہ میں سب ایک دم سے کیسے کر لیتا۔ بیٹھے
بیٹھے گھبرا جاتا ہوں تو میرے قدم انٹلا کے بار کی
طرف اٹھ جاتے ہیں، وہاں پر لوں کے دیں میں
انکر کچھ دیر دل پشوری کر لیتا ہوں۔ بس میرا مقصود
یہ ہے کہ اس نے سنتے ہوئے کہا۔
”واہ صاحب۔ یہ کچھ دیر دل پشوری کیا کی گئی
دن اور اداؤں پر غیبت ہو جاتی ہے؟“ مہر و فیضیلا
کر بولی۔

”شیوہ آپ مکان بیچ دیجیے کوئی اور کام شروع
کر دیجیے یا کاروں کا شور دم کھول لیجیے۔ یہ دکان
آپ کو قرض انٹلا احسان کی وجہ سے لوگوں کی نظروں
میں مشکوک بناتی ہے۔“
اور شیوہ علی گری نظروں سے مہر و کو دیکھنے لگا۔
اس کی باؤں اس کے اندیشوں کو وہ جھلکا نہیں سکتا
تھا۔ وہ تو اس کی سوچوں سے زیادہ ذہین نکلی۔
”ہاں مہر و، شاید تم شک کرتی ہو میں تمہارے
مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا، مگر ان وقت
دکان کا مسئلہ ہے معلوم کروں گا کہ کوئی اچھا خریدار ملے
تو دام لگا دوں۔“

”ارے وہ آپ کی انٹلا احسان سے بڑھ کر کون
اچھا خریدار مل سکتا ہے آپ کو۔ وہ تو آپ کو
جی من مانگے داموں میں خریدے گی۔“ مہر و نے پھر سوچ
لگا ہوں سے مسکرا کر شیوہ کی طرف دیکھا۔
”ہاں کہتی تو تھیک چورنگ پہلے میں اس کا عذیر
لے لوں۔ پھر آگے کام کے لیے سوچوں گا اچھا ذرا میں
کپڑے بدل لوں۔“ یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم کی طرف
چلا گیا۔ اور مہر و اس کی معصومیت پر ہنسنے لگی۔

مہر و جانتی تھی کہ اس کا شوہر خاواں سے کہنے والا
ایک بے پروا۔ لہذا وہ تھا۔ جو زندگی کی حقیقتوں کو بھی
خاواں کی طرح نہ لاشا جانتا تھا۔ مگر حقیقت کوئی پروہ
تبع ہوتی ہے۔ اور بالآخر اپنے کو منوالی بنی بنی حساب

ایک رنگ سا آیا اور دوسرے لمحے وہ منہل تھی۔
لندن جانے سے پہلے وہ جس شخص کے زیادہ عزیز
اس اور اس سے محبت کرتی تھی وہ اس کا لڑکا اسان
اسان نے انٹلا کو یقین بنا کر اس سے وقتاً فوقتاً
رض کے نام پر کافی رقم لے لی جس سے وہ اپنی پوزی
ل میں کمی کو ترقی دیتا رہا۔ اور اس سے جو کچھ جھٹ بھی
تھا تارک۔ اور اس نے لندن سے واپسی پر انٹلا کے
خاواں کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن جب وہ آئی تو نشان
اسے مہر و نے رنگ یاد اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اب
اس کا بزنس پھیل گیا تھا۔ ایک اور گاڑی اس کی لکڑی
میں لگائی تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ایک مل اور
داما دہی بن چکا تھا۔ اور اس کی ایک بیٹی بھی بنائی
تھی۔ وہ اپنے لڑکا بنی انسان اور بھارو میں گھومتا تھا۔
اس چیز نے انٹلا کو بھر کر دکھایا تھا آخر اس نے ایک
ان دن کے اس سے ملنے کا نام ملے لیا اس دن
انٹلا نے اپنے اور پرانی توجہ دی اور بن سونکر اس کے
اس جا پہنچی۔ واہ کیا شاندار من تھا وہ لڑکا تو بچہ پر
ایک مینیٹیوٹ سوٹ پہنے اس کا غفلت تھا۔ جب وہ اندر
داخل ہوئی تو کچھ دیر تک وہ ایک جھکنا بھول گیا۔
اس نے تھا۔ کیا دعائی تھی۔ یہ انٹلا احسان نہیں بلکہ اس
کوئی حسین تصویر پر سکتا ہے۔ وہ ہوت رہ گیا۔
”سیلوامان ویسے ہو کیا پیچا ناہیں؟“ انٹلا نے
ان ادا سے مسکرا کر پوچھا۔

”ارے۔ میں وہی انٹلا ہوں جسے تم نے وعدوں
کی مہر و زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔“ وہ مسکرائی۔ امان
اب پوسٹ میں آچکا تھا کچھ خفیف سا ہنسنے لگا۔
”تمہیں کون جھٹا سکتا ہے۔ لگتا ہے حدیوں بعد
میں دیکھا ہوا اس لیے نگاہ نہیں پٹ رہی تھی۔ تم تو
خاواں کا لڑکا پہلے سے زیادہ کا فدا ہو گئی ہو۔“
”یہ آپ مجھے قدر دانوں کا حسن زن ہے۔ کتنی
میں نے آپ کو فون کیا مگر ملنے ہی نہیں ظاہر ہے
تم لوگوں سے وقت لینا پڑتا ہے۔“
”مجھے انوس سے انٹلا۔ دناصل دوسری فکری
کا نام ملے حد مصروف ہو گیا ہوں۔ وہ مسکرایا۔
”وہ تو میں دیکھ رہی ہوں مگر اپنے دوستوں کو تو
اپنی بھولتا میں نے سب سے پہلے انصاف سے یہاں

ہی متعلق ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ تم نے شادی کر
لی ہے، میرے لیے یہ کوئی سربراہ نہیں تھا۔ بتا داری
وعدہ نکلی نے میری آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ مگر صبر
اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوسری شادی میں کوئی
شرع نہیں۔ اب تمہارا کیا خیال ہے؟“
”وہ۔ وہ انٹلا۔ اسان بڑا بڑا کر بولا۔
”یقیناً دوسری شادی میں کوئی حرج نہیں مگر میرا
سسر خجے شوٹ کر دے گا۔ وہ ہوت بڑا آدمی ہے۔“
اس کا توجہ صبح بہت زیادہ ہے۔
”تیر خجہ۔ اس کا حال بھی نکل آئے گا تم مجھ سے
ملو تو سہی۔“ انٹلا نے کھڑے ہو کر اپنا کارڈ اس کی
طرف بڑھایا۔
”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اب تو میں تم سے ملتا رہوں
گا۔“

”اس کارڈ پر میرے بار بار کا پتہ درج ہے۔ میں
وہیں پر ہوتی ہوں میں متبدا انتظار کروں گی۔“ وہ مسکرائی
پرتی پتلی آن اور امان نے پریشان ہو کر سر پکڑ لیا۔
انٹلا کا دوسرا نشانہ شانی تھا۔
سب سے پہلے اس نے انٹلا کا شمار کیا تھا اور
اسے نیم ملے چھوڑ کر ڈولوش ہو گیا۔ دنیا کی ہر ترقی کی
طرح انٹلا بھی معصوم اور دوسروں پر اعتماد کر کے والی
لڑکی تھی۔ شانی سیلا مہر و تھا جس نے اسے سراہا تھا اس
کی نظر میں چاند خروں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اچھی
سیرت اور ذہانت کا قائل تھا۔ اور یہ دونوں چیزیں
انٹلا میں تھیں۔ ذہن اور بڑھی لکھی۔ صلیقہ مند۔ انجمن کالی
اور لنگو کا ستر جانتی تھی شانی نے اپنی محبت بھری باتوں
سے اس کو شیشے میں اتار لیا۔ وہ اس سے آزاد مطلق

تھی اسے اس پر بھروسہ تھا۔ باپ جانی کوئی تھا نہیں صرف
ماں تھی خوار و بار بھی سچا تھی تھی۔ اور یہی بری نظر رکھتی
تھی۔ گھر کا پورا نظام لوگوں کے سپرد تھا۔ آخر ایک دن
انٹلا شیشے شیشے ٹٹ گئی۔ اس کے اندھے اعتماد نے
اسے کہیں کا نہ رکھا۔ ہوش میں آئی تو رونی توڑ پھاٹی
سے کہا۔
”تم فوراً مجھے سے عقد کر لو اگر گھر والوں سے کچھ نہیں
کہہ سکتے۔“ ہم کوڑھ میں نہ گریں گے۔“
شانی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دسے پیار سے یقین

دلایا کہ تم جھوٹے ہو۔ میں تمہیں متناہی نہیں چھوڑوں گا۔ اس واقعے کو دوماہ گزرے تو اسے بتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس نے شافی کو پکڑا اور دتے ہوئے کہا۔

ایک عزت مآبی میرے پاس وہ بھی تم نے واہ پر لگا دی۔ اگر تم نے مجھ سے نکاح نہ کیا تو میں خودکشی کروں گی۔ میرے ہونے والے بچے کو اپنا نام دے دو؟ مگر اس نے پھر جھوٹی تسلیمیاں دے کر اسے خاموش کر دیا۔ اور یہ ملک بنی چھوڑ گیا۔ اس نے ماں کو سب کچھ بتا دیا۔ اور انہوں نے کسی رسمی طرح اس عذاب سے اس کی جان بچھڑا دی۔ تب ہی وہ دن برآمد ہوا کہ لندن چلی گئی۔ وہاں اس کی دوست بھی اس نے انیلا کی بڑی مدد کی۔ اس کا یہ طرح خیال رکھا۔ چار سال بعد جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر پاکستان واپس آئی تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ گھر میں تالا بٹلا ہوا تھا اور قرض کو بیخیر نہ سنبھال رہا تھا۔ افضال ایک غریب لڑکا تھا۔ انیلا اس کی مدد کر دیا کہ قرض بھی پھر اسے اپنی فرم میں ملازمت دلا دی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ چنانچہ آنے کے بعد اس سے اس کو شافی اور امان کے متعلق معلوم ہوا تھا۔ امان سے تو وہ مل چکی تھی اس کا جرم اتنا بڑا نہیں تھا۔ مگر شافی کا جرم گردن زدنی تھا۔ اسے تو شریعت بیخ نکمار کرنے کا حکم دے سکتی تھی لیکن اپنے جرم کو وہ خود سزا دینا چاہتی تھی۔ وہ اسے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ انہی سن پرست، بواہوس، اور مکار مردوں کے لیے انیلا نے بیوی بارگاہیہاں بچھا یا تھا۔ اور وہی کو اس نے کاسٹیک کی دکان کھولنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس طرح درپردہ شیوہ علی بھی اس کے کاروبار میں شریک ہو گیا تھا۔

اسی لیے انیلا نے حسین اور خیرو جوان لڑکیوں کی حینٹ اپنے پارلر میں بنائی تھی وہاں عقوقین عفت کو دلچسپی اور تفریح سارے لوازمات میسر کیے گئے تھے۔ وہیں بجانے، مساج کرنے اور ایک پکٹھان عتیقہ رہتا تھا۔ اور راحت کدہ الگو، جہاں لوگ ہنس بول کر چائے اور پان سے شوق فزا کر کچھ اچھا وقت

گزارا لیتے تھے، اب تو شان کی آمدورفت بھی شروع ہو گئی تھی۔ امان انیلا کے پاس آنے جانے لگا۔ اس کے بعد امان کا دل کچھ ایسا کھلکا کہ اس نے انیلا سے عقد کر لیا۔ یہ بات صیغہ لازم میں رہی۔ اور انیلا نے اچھی طرح اس پر اپنی گرفت سخت کر دی۔ خوب اسے لوٹا۔ کچھ دنوں بعد انیلا نے طلاق کے کاغذات تیار کروا کر اس پر امان کے دستخط لیے یہ طلاق نامہ اس کی پہلی بیوی کے لیے تھا۔ امان اس وقت شریک کے نقشے میں تھا جب اس کے دستخط لیے گئے تھے۔ امان کو نہیں معلوم تھا۔ مگر جب طلاق نامہ پہلی بیوی کو ملا تو جیسے ایک طوفان آگیا۔ بلی کا باب مسمیٰ آئی نہیں تھا۔ اس نے تحقیق کرانی تو معلوم ہوا کہ امان نے کسی بیویش سے بھی شادی کی ہوئی تھی۔ اس کی تحریک پر اس نے پہلی بیوی کو طلاق بخوانی۔ بلی کے باب نے اپنے دوستوں ڈی۔ ایس۔ بی۔ اور آئی جی سے مل کر انیلا احسان کے خلاف رپورٹ تیار کرائی اور امان کو عدالت میں کھڑا کر دیا۔ جہاں اس نے پورے واقعات سے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ میں نے انیلا سے نکاح ضرور کیا تھا مگر یہ سب بیوی کو طلاق نہیں دی تھی، چنانچہ اس نے ایک تحریر میں حلف نامہ داخل کر دیا اور بیوی کی طرف دوبارہ رجوع کر لیا۔ طلاق مسترد کر دی گئی۔ اس کے بعد امان نے انیلا احسان سے تعلقات ختم کر لیے۔ انیلا کو سخت ناگاہی کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی وہ اس شاک سے نکلی نہیں تھی کہ ایک رات اس کے بنگلے پر ڈاکہ بڑا۔ تین چار ڈاکو سوٹ بوٹ میں ملبوس جہرے پر نقاب اور ہاتھوں میں دستارے پہنے پستول لیے انیلا کی خواب گاہ میں داخل ہو گئے۔ انیلا بھر پور جھینکا رہی تھی۔ وہ بھرا ہوا پستول سر ہانے دھکے کر رہی تھی۔ اچانک اس کی آنکھ کھل پڑی کوئی شخص اس کے اوپر چھکا ہوا تھا اس نے فوراً ایک ہاتھ سے اس کی نقاب لڑائی اور دوسرے ہاتھ سے پستول نکال لیا۔ اب وہ شخص اس کے سامنے تھا۔ "تم امان؟" وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ "ہاں میں امان ہوں۔ ماشاء اللہ بڑی حسین اور

مہربان رہی ہو۔ کیا لندن سے پلاسٹک سرجری کروا کر آئی ہو؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ تیار ہوا بنگلہ ہے۔" وہ زمین اس طرح چوروں کی طرح نہوٹل ہوتا کہ وہ ہنسنا۔ "پھر کس طرح آئے؟" انیلا نے تیوری پڑھا کر پوچھا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ "بارت نے کراتا۔ اور ہمیں وہیں بنا کر عزت کے ساتھ لے جاتا۔ اس نے تختہ لگا یا پھر پلٹ کر اپنے ساتھیوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر چلے گئے۔" "اوہ عزت کے ساتھ لے جاتے؟" انیلا نے نفرت سے منہ مڑ کر کہا۔ "تم تو پہلے ہی میری عزت پر ڈاکہ مار چکے تھے۔ اب تو تمہاری تلاش بھی۔ آج صیغہ سے تم خود ہی میرے پاس چلے آئے، یقیناً تمہیں یہی پیشہ اختیار کرنا چاہیے تھا شافی، یہی تم پر زیادہ سوٹ کرتا ہے۔" اچھا پھر چھوڑ دو یہ بتاؤ دیکھیں گے کہ یہ ہے؟" "بہت اچھی گز رہی ہے؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے ریلوے گاڑا ہاتھ اس کی طرف کر کے اگلید فائر کر دیا۔ گھر میں دوہا کے کی آواز گونجی شافی نے ہر کچھ کی طرف گراؤ انیلا نے دوسرا فائر کر دیا۔ اس کے جواب میں باہر سے بھی فائرنگ آواز آئی اور اس کے ساتھی اندر آ گئے۔ انیلا کی ٹانگ میں باہر سے آنے والی گولی لگ گئی تھی۔ وہ اونچے ستر پر پڑی تھی۔ جب شافی کے ساتھیوں نے شافی کو جون میں لٹ پیت بنے صحن سے پڑا دیکھا تو انہوں نے غصے میں ساری گولیاں انیلا پر چلا کر دیں اور فرار ہو گئے۔ صبح جب اس واردات کی خبر نوکروں کو پہلی تو پولیس نے آکر دونوں لاشیں اپنی ٹول میں لے کر پوچھ پچھ شروع کر دی۔ بیوی بارگاہیہ اور شیوہ کی دکان پر پولیس کا یہرہ لگا دیا گیا۔ ساری لڑکیاں وہاں کے نوکروں اور آنے والوں سے تحقیق کرنا شروع ہوئی۔ شیوہ علی، امان کی اور لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ امان کے سر سے تو فوراً اپنے اثر و رسوخ سے حمایت کرا لی۔ لیکن شیوہ علی کی ضمانت نہ ہو سکی۔ اجازات انیلا احسان کے بیوی بارگاہیہ اور شیوہ علی کے۔

کاسٹیکس شباب کی بڑی بڑی سرخیاں لگی ہوئی تھیں۔ شیوہ کے بھائیوں نے بھی بڑا زور لگا لیا۔ انہوں نے اپنی ساری پونجی واہ پر لگا دی مگر شیوہ علی کو کوئی سزا سے نہ بچا سکا۔ اس صحت کمی لوگوں پر فرد جرم عائد کر دی گئی تھی کہ یہ لوگ انیلا احسان کے ساتھ مل کر غریب اور معصوم لڑکیوں کا کاروبار کر کے معاشے ہیں۔ بے راہ روی پھلانے کے ذمے دار ہیں۔ حالانکہ شیوہ علی اس سازش میں بزرگ شریک نہ تھا۔ اس نے انیلا کے لیے سوچا تھا کہ وہ ایسا بھی کر سکتی تھی۔ وہ تو شخص ایک شخص دوست کی دوستی پر قربان ہو گیا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ کچھ وقت کو بیمار کرنے اور اپنی زندگی کو بھی راسخوں بڑا لٹنے کی سزا اس نے بانی تھی۔ اور کچھ اپنی کوتاہیوں کا عذاب اس نے سہا تھا۔ کسی رسمی حوالے سے اس نے جرم تو کیا تھا خواہ اپنے بیوی بچوں کی صحت کلی کا جرم غیر معاشرے کا جرم۔ اسے سزا تو بہر حال ملنی تھی۔ سول کر رہی بڑے بڑے عزت وادوں کے چہروں سے نقاب ہٹ گئے تھے۔ بڑی رعایت کے بعد بھی کسے کہ چھ جہاں کی سزا سنائی گئی تھی مگر حال سزا یافتہ لوگوں کی نشت میں تو نام آگیا تھا۔ ہم روز روئے دتے پاگل ہو رہی تھی ماں الگ پریشان تھی، جانی سخت برہم، اور شرمندہ تھے کہ وہ کسی کو مذہم دھانے کے قابل نہ رہے تھے، چھ جہاں کی سزا کاٹ کر جب وہ گھرا یا تو بیوی اور ماں کے علاوہ سب کی نگاہیں بدل چکی تھیں، کوئی بھی اسے اپنا بھائی کہنے کا راہوار نہیں تھا۔ معاشرے میں جو عزت تھی وہ پٹکے ہی خاک میں مل گئی تھی۔ اب اس کے ساتھ بٹنا، اپنا یا تعلقات قائم رکھنا ناممکن تھا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں نے کلہن اور گلشن میں بنگلے خرید لیے تھے اور اپنے دونوں برونشن شیوہ کو دے دیے تھے اس کے قرض کے عوض۔ ماں سے کہا۔ "اگر آپ ہمارے ساتھ ہونا چاہتی ہیں تو آپ کا شیوہ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔" لیکن ماں نے انکار کر دیا۔ بھلا وہ اپنے لاٹھے اور سب سے چھوٹے سے کوس مصیبت اور تنہائی میں کس طرح چھوڑ کر چلی جائیں۔ انہوں نے کہا۔



”۱۲ ص ۱ کا نام خود کس نے رکھا ہے۔ اتنا آج
مجھے بتا دو“ بڑے بیٹے نے میز پر ہنر مند ملامت کہا۔
”اے لڑکے! کیا بولا گیا ہے۔ یہ اتنا غصہ کس
لیے؟“
”صحیح کہہ رہا ہوں“ بڑے بیٹے نے اطمینان سے کہا۔
”نام تو خود ہے اور حریف ساری مایوس والی!“



والا نوجوان اکیدم سنجیدہ ہو کر ابھی زندگی کی جدوجہد میں
لگ گیا تھا۔

وقت تیزی سے گزر گیا۔ کئی سال ماضی کا حصہ بن
گئے۔ دونوں بچے جوان ہو گئے تھے۔ ابھی تعلیم و تربیت
نے انہیں نکسا رو دیا تھا۔ بیٹا انجمن میں گیا تھا اور بیٹی ڈاکٹر
اور تیب ہی بھائیوں کا پھر آنا جانا شروع ہو گیا مہر و زکی
بیٹی افروز بالکل مال کی طرح حسین اور معصوم تھی۔ بیٹا
بھابھوں کو بچوں کے رشتے اور ان کی شادیاں قریب
لے آتی تھیں۔ سب نے شیوہ کو گلے سے لگا کر بیٹوں
کی بڑی دیکر دی تھی، ماں سے بھی معافی تلافی ہوئی تھی۔
پھر ایک دن بڑی بہن نے اپنے بیٹے کا رشتہ افروز
کے لیے شیوہ سے مانگ لیا۔ شیوہ نے کہا۔
”بھابی جان! افروز اور حمزہ کا اختیار رکھنا کو ہے۔“

ان کا جو فیصلہ ہو گا وہی منظور ہو گا۔
پھر منظر ان کے بڑے بیٹے کو گلے سے لگا کر یہ
رشتہ منظور کر لیا۔ دوسرے دن افروز کی منگنی کی رسم
اذا کر دی گئی۔ بڑے دن بعد اس گھر میں رون کی آہی
تھی۔ تہنوں کی بازگشت گونج رہی تھی پھر مہر و زکی
حمزہ کے لیے چھوٹے چھوٹے بیچے سندس پسند آئی۔
اور انہوں نے سب کی رضامندی سے رشتہ ڈال
دیا جو قبول کر لیا گیا۔ خوشحال اب کافی بوڑھی اور کمزور
ہو گئی تھیں۔ ان کی کبیریت خراب رہنے لگی تھی اسی لیے
حمزہ کی شادی میں حلیہ ہی کی گئی۔

افروز کی رخصتی پر حمزہ کی دلہن گھر آ گئی۔ اس
عرسے میں شیوہ علی نے اپنا آرٹ اسکول کھول لیا
تھا۔ زندگی اور مستقبل محفوظ ہو گیا تھا۔ پھر ماں کا
بھی انتقال ہو گیا۔

زندگی بدل گئی تھی۔ پہلا جیسا اب کچھ نہیں رہا تھا۔
شیوہ علی نے جو خواب دیکھے تھے ان کی تعبیر مل توئی مگر
بہت دیر بعد اور بہت کچھ گنوا کر زندگی کی شکست
ورجھت نے اسے یہ سبق ضرور دیا کہ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاک اپنی فطرت میں فوری ہے نہ ناری ہے

”جہاد“ بچو! اللہ تعالیٰ انکھیاں۔ جہاں رہو خوش رہو
آباد رہو۔“

شیوہ علی اس افتاد سے سخت سرا سید تھا اب وہ
خوابوں خیالوں میں رہنے والا انسان نہیں تھا۔ حقیقت
کی چوکت پر اس نے اپنی پورے لہان زندگی دھجی تھی۔ اس
نے اپنے بھائی بھابھوں سے آگے لپکتے جوڑے معافیوں
مانگیں، رونا کرنا شروع کر دیا۔ بولا۔

”اب لوگ یہاں رہیں۔ جو خدا ہی بیوی بچوں
کو لے کر چلے جائیں گے۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔“
مگر وہ بھائی یوسف علیہ السلام کے بھائی تھے۔ نام فہود
عزیز و شہرت پر جان دینے والے وہ نہیں رہے اور
چلے گئے۔ شیوہ علی نے پھر مہر و زکی طرف دیکھ کر کہا۔
”اگر تم بہن کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو عشق سے
چل جاؤ میرے پاس اب تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی
نہیں ہے مہر و زکی پر تو ہر تے قدیوں سے لپٹ گئی
اور انہیں ملنے نہ ملی۔“

”بہن! نہیں شیوہ! میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی چاہے
ساری دنیا لاپتہ ہو جائے۔ ہم آپ کے سنگ میل کر
روں گے۔ آپ کے ساتھ مل کر نہیں گئے۔ چاہا آپ
کامیاب ہوں من کا ساتھ ہے! ماں نے بھوکو
اٹھا کر سچ سے رکھا لیا۔“

”جہاد! بیٹا! اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔
یہ آزمائش کے دن بھی ختم ہو جائیں گے۔“
بھابی بھابھوں کے چلے جانے سے اکیدم تنہا
چھایا گیا۔ شیوہ علی کو چھتا دوں کی آگ جلا رہی تھی۔

”بھئی! یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ میں نے آپ
لوگوں کا کہا نہ مانا۔ اپنی من مانی کی اس کا حیا زہ پوسے

خاندان نے جھگڑا۔“ شیوہ علی ماں سے لپٹ کر رو پڑا۔
”ہاں بیٹا! یہ تو سچ ہے۔ یہ جو ہوا اس پر اللہ تعالیٰ نے
تمہاری یہ حق کر لکھی ہوئی تھی۔ مگر اب تو یہ کرنا اور۔“
عزت و سلامتی کا راستہ اختیار کر دیا۔

خوشحال نے وہ دونوں پورے کر لے پراٹھا
دیے۔ شیوہ علی نے ایک آرٹ اسکول میر بچوں کو
پیشکش کیا۔ کھانے کی ملازمت کر لی تھی۔ کچھ کرایہ آتا تھا۔
اور کچھ شیوہ کی خواہ گوارہ ہو جاتا تھا۔

اب وہ شوخ و چہل، جیسے ترائے اور خواب دیکھنے

”اجھا۔ اب کبھی امان مسکا پڑے۔ کوئی بات نہیں بچنے جانے دے۔ آجائے گی عقل“
 وہی تو چھوڑ رہا ہوں۔ کب آئے گی۔ اب دو سال کے بعد اس کی شادی ہے اور حریفیں ہیں کہ وہی پنچول والی۔
 احمد بے چارے کو کتنا افسوس ہوگا کہ کہاں شادی کرئی۔
 ”بھائی! اس کی شادی ہو رہی ہے۔“ حور دیں آگئی۔
 ”آپ کو کیا کسی کی بھی شادی ہوتی ہے۔ آپ جانیے۔ ماسی کو۔ ماسی کے پنچول کو اکھا کر کے کیلیے۔ تھپتھپ لگانے۔“
 ”وہ تو خیر میں اتنی دیر سے کر رہی رہی تھی۔ مگر شادیوں میں بھی تو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ کاش بیٹا۔ آپ لڑکی ہوتے تو آپ کو پتا ہوتا کہ کتنا مزہ آتا ہے۔“
 ”غش دو غش۔ میں یوں ہی لڑکا صحیح ہوں بیٹیا۔“
 ”لے ہاتھ پھڑکے۔“
 ”افدہ ہوتا تو لڑکیوں سے لوں رکھ لیتا۔“
 ”جیسے تمہاری بیٹی کو لڑکی نہیں ہوگی۔“ حور بڑا مان گئی۔
 ”لڑکی ضرور ہوگی۔ مگر عاف کرنا تمہاری طرح نہیں ہوگی۔“
 ”ہوگی۔“
 ”میں کیا ہم اتنے بڑے ہیں۔ اور تمہاری بیگمیں کیا رخاب کے پر لگے ہوئے ہوں گے۔ وہ سخت بڑا مان گئی۔
 ”حور! امان نے تیری اغلاذ میں پکارا۔ کیا ہر وقت بھائی سے لڑتی رہتی ہوگا۔“
 ”اور بیٹیا کو کچھ نہیں۔ جو ابھی سے آپ کی بہو کی شان میں قصیدے پڑھ رہے ہیں۔“
 ”وہ کوئی دل سے حقوڑی کہہ رہا ہے۔ خالی تہیں چھڑ رہا ہے۔ اتنی بڑی ہوئی ہے۔ مگر پنچول کی طرح لڑنا نہیں گیا۔ سارا وقت ماسی کے پنچول میں گھسی رہتے گی۔ تو عقل بھی تو پنچول کی طرح بوجھلے گی۔“
 ”بیٹا ہے۔ بھئی روک کر کہا تو وہ صرف گھوڑ کر رہ گئی۔ پورا گھر اس کی اس عادت سے بیڑا تھا۔ اور

پورے گھر میں بھی کون تھا۔ ایک بھتا اور دوسرے بابا۔ ایک امان تھیں جو اسے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ جانی تھیں اکیلے بن کا کھڑا ہوتا ہے۔
 اور لڑکیوں کو تو لیں بھی ایک بھم۔ دم سازی ضرورت ہوتی ہے۔ امان کو شش تو بہت کرتیں کہ اس کی ہر بات تو تیرے اور غور سے سنیں۔ مگر ظاہر یہی بات ہے۔ وہ اس کے ساتھ نہ زور زور سے سن سکتی تھیں۔ نہ آچل کوئی سکتی تھیں۔ تنگ آکر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔
 پہلے تو اس نے غلے کی لڑکیوں سے دو سنتیاں بڑھائیں۔ مگر ہر کوئی نہ اس کی طرح اٹھو تا تھا۔ نہ ہر کسی کے گھر میں کام کرنے والی آتی تھیں۔
 لڑکیوں کو گھر کے چھوٹے بڑے کام خود نمٹانے ہوتے تھے۔ کسی کے پاس اتنا قوتو نام نہیں ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھا باتیں بکھارتا رہے۔ اس نے ایک نئی راہ نکال لی۔
 ان کے یہاں ماسی جیرال آتی تھی۔ پہلے پہل تو وہ اکیلی آتی تھی۔ پھر ایک دن اپنے ساتھ اپنی بیٹی کو بھی لے آئی۔
 حور نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اسے یہ بھی ہوئی لڑکی لچکی لگی تھی۔
 ”اسے جیرال! اس کو مکوں لے آئی ہے۔“ امان پرانے زمانے کی ماں تھیں۔ واہوں کی ماری ہوئی۔ گھر میں جوان جہان لڑکا ہے۔ کہیں کچھ ہونے جلے۔
 ”بس بی بی جی! معقوڑے دول کی بات ہے۔“ جیرال، امان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اور دنی پاؤں دبانے۔
 ”اس کا بابا اس کی شادی کر رہا ہے۔ اپنے چلے کے بیٹے۔“
 ”تو یہ تو ابھی بات ہے۔ اس کا یہاں لانے سے کیا تعلق ہے۔“ امان کی سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا۔
 ”بس کیا بتاؤں۔“ جیرال نے غصہ کی سانس بولی۔
 ”مرد کیا ہے۔ جی مرد کے نام پر تہمت ہے خود نہیں لگاتا رکھا ہے۔ تو آنے والی کو کیا کھلائے گا۔ شرابی جو

بھی اسے قائل کر رہی دیا۔
 ”ماسی! تم نے اس دن کہا تھا کہ ضروری نہیں کہ بیٹی کا مقدر بھی ماں جیسا ہو مگر صرف کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے لیے عمل بھی ضروری ہے۔ اور عمل صرف تعلیم ہے۔ جوان کا مقدر بدلے گی۔ ورنہ پہلے تمہارا بچہ تمہاری بیٹی اور اس کے بعد اس کی بیٹی سب کا مقدر۔“
 ”اجھا۔ اچھا بی بی صاحب۔ ٹھیک ہے۔“ ماسی نے اس کی بیٹی کی گردن سے گھبرا کر کہا۔
 اس دن بیٹا گھر آئے۔ تو عجب منظر دیکھا۔ یعنی بچائے گھر میں اودھم بازی کرنے کے حور بڑی سنجیدگی سے قاعدہ کھول کر کسی کمر بٹھا رہی ہے۔
 ”فکر ہے اس نے بھی کوئی ڈھنگ کا کام کیا۔ بالآخر اتنی بڑی لڑکی کو قاعدہ پڑھتے دیکھ کر انہیں ہنسی بھی آ رہی تھی۔
 ”امان! یہ سورن کہاں سے نکل آیا۔ یعنی بچائے گھر میں شور شرابا۔ ہنگامے کے پہلی دفعہ کوئی ڈھنگ کا کام ہو رہا ہے۔“ کیا ماسی نے۔
 ”کیا باڈا ہو گیا ہے۔“ امان نے گھر کا وہ جولا کی پڑھ رہی ہے ناں۔ وہ ماسی کی بیٹی ہی تو ہے۔
 ”پھر ماسی! بھتا کہے۔“
 ”اے بھوت تھپتھپے لگا رہا کر۔ اکیلے ہے ناں۔ گھبرا جاتی ہے۔ کہتی ہے۔ اکیلی ہوتی ہوں تو عجیب سی سوچیں آتی ہیں۔“
 ”پنچول کو چیمز میں دے دیجیے گا تاکہ سسرال میں اس کا دل نہ گھبرائے۔“
 ”بیٹا ہے۔ بیڑا رکن بلجے میں کہا۔“
 ”اللہ نہ کرے جو سسرال میں بھی اکیلی ہو ماسا اللہ بھرے پڑے گھر میں دوں گی۔“
 ”اور میں تو کبھی ہوں اگر دوسری ہوں تو اور نہ آجائے۔ ان دو لون ہی کو ایک دوسرے سے لڑوائی رہا کر دوں گی۔ تاکہ ان کی نظر عنایت بچہ پر نہ پڑے۔ کیوں بیٹا! کیسا آئینہ ہے۔“ اس نے مسکراہٹ دبا کر بھائی کو چھڑا کر وہ چھپتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئے۔
 ”اے! بھائی! دن بدن سڑیل ہوتا جا رہا ہے ماس

کی شادی کروں؟
 "تو خود کوئی لڑکی آج کل توڑنے لڑکیاں
 دونوں دیکھنے پر کھنکھانے لگی۔
 "اتنا! میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں
 آئی۔ آپ ذرا باہر نکل جائیں۔ ہر جگہ آپ کو دیکھتے
 نظر آجائیں گے۔ یہی حال لڑکیوں کا ہے۔ میری شادی
 کے وقت کیا ہو جائے۔ اس دن چھو پھو بھی یہی
 بات کہہ رہی تھیں کہ کوئی ڈھنگ کی لڑکی ہی نظر نہیں
 آ رہی کہ شادی کی بات طے کر دوں۔ اتنا! یہ ڈھنگ
 کی لڑکی کیسی ہوتی ہے؟
 "اللہ جانتا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ہر ایک کے
 نزدیک اس کا مختلف منہم ہے۔ تمہاری پھوپھی کے
 نزدیک ڈھنگ کی لڑکی وہ ہے جو اپنے ساتھ ڈھیر
 سارا جہیز لے کر آئے۔ اور یہ صورت تو تمہاری بھی لڑکی
 نہیں تھی؟ آخری جہاز انہوں نے دل سے سوچا۔
 کتنی صفائی سے انہوں نے سارا الزام خود پر لگایا
 تھا۔

میں تو خود خود کو اپنی بہو بناتی مگر بھائی! جو
 میں سمجھتا ہوں ہے۔ یہاں تو شادی کے پچھلے سال
 ہی تمہاری شادی ہو چکی تھی اور اس کی عادتیں تو ابھی
 تو بڑی دلی ہیں۔ یہ کیا بڑا خیال پالنے کی؟
 اتنا! پھر پڑھانی نیک کام نہ دیکھے تھیں۔ ایسے
 طور اور اتنا! کو ساری زندگی گزار کر بھی نہیں کئے
 تھے کہ لوگ کس طرح اپنا واسی بچا کر سارا الزام
 دوسروں کے سر رکھ دیتے ہیں اور سر خود بھی رہتے
 ہیں۔

"بھئی ہم نے تو جابجا ہاتھ دیا کیا کریں۔ قسمت میں
 ہی نہیں تھا۔ اب سننے والے کی مرضی۔ وہ چاہے جو مطلب
 نکالتا ہے۔
 وہ نہ جانے کب تک انہی سوچوں میں گم رہیں
 کہ خود کی آواز نہ انہیں چڑھنا دیا۔

"اتنا! آج فریج کی بہن کی شادی میں جاؤں گی۔
 وہاں پھیلنے کے لیے لڑکی دیکھوں گی؟
 نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری خالہ نے ایک
 دور سے بتائے ہیں۔ بس وہیں جا کر دیکھ لیں گے۔

اب ہر ایک کے گھر میں کیا جھانپیں گے۔ تم لوگوں
 کیلئے۔ بس جہاں صرف اچھی صورت دیکھی جاتی
 جہاں کے لیے پسند کر لی۔

"نہیں اتنا! آپ جس طرح کی لڑکی کہیں گی اس
 طرح کی دیکھوں گی۔ آپ ایک دفعہ ہاں تو کریں
 نے منت سے کہا تو اتنا! کو ترس آ گیا۔
 "اچھا چلو چٹیک ہے۔"

"اور کیا اتنا! گھر میں ایک سے دو بولنے والا
 ہو۔ شور مچا رہا ہو۔ خوب ہنگامے۔
 "بس تمہاری تان تو نہیں آکر لڑنے کی کہ گھر میں
 ہنگامے ہوں۔ کوئی زور زور سے بات کرنے والا
 نہ جانے کتنا باتیں کرنے کا ہو گا ہے؟ اتنا! بڑا بڑا کر
 گئیں۔

شام کو وہ لب جب تیار ہو کر نادیر کی بہن کی
 شادی میں چلی گئی۔ ایسی تقریبوں میں اس کا دل
 بہت لگتا تھا۔ ہر طرف شور مچتا تھا۔ جیسے
 نادیر کے ساتھ کام کرتے کرتے اس نے اپنا مشغور
 جاری رکھا۔ یعنی لوگوں کو دیکھنے کا۔ اور جانے
 صورت دیکھنے کے وہ بھی ایک چیز نوٹ کر رہی
 کہ کون لڑکی سب سے زیادہ بول رہی ہے۔

"نادیر! یہ نیلے کپڑوں والی کیسی رہے گی؟ اس
 ایک تیز تیز بولنے والی لڑکی نادیر کو دکھائی۔
 "خدا کے واسطے! نادیر نے ہاتھ تھوڑے۔ اس
 بات سمجھنے کے لیے تو تمہارے بھائی کو کان میں کوئی
 لگانا پڑے گا۔"

"اچھا! اس لڑکی کو دیکھو، یہ کیسی ہے۔ ٹینک
 اس نے دھڑے دھڑے کہا۔

"میری مافوق پریم! تم اپنی اتنا! پر ہی جھڑپ
 نادیر نے رسالے سے کہا۔ ورنہ جس طرح کی لڑکی
 پسند کر رہی ہو یا تو بھائی تمہارا خون کر دیں گے
 جان خود یہ فریضہ انجام دے لیں گی؟

"اچھا! کیوں نہیں کرو؟ اس نے نادیر سے
 کا سلسلہ ترک کیا۔ اور خود اکیلے ہی یہ فریضہ
 لگی۔ اس بے دھیانی میں خیال ہی نہیں رہا۔ کوئی
 بڑے دھیان سے نوٹ کر رہا ہے۔ اور اگلے

اب اس کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ تو اتنا! بولتی بولتی
 کہہ رہی تھیں کہ نہ جانے کس نے یہ مہربانی کی تھی اور
 اللہ کے گھر کا پتا دیا تھا۔

"تب نادیر بی بی نے یہ انکشاف کیا کہ لڑکے کی ماں
 نفس نہیں خود اسے پسند کیا تھا۔

"اچھا! اتنا! کو ذرا حریفین آیا ہو۔ بھلا خود میں
 ہی کون سی بات تھی۔ سارا وقت تو اپنی سیدھی جڑوں
 کا پتا پر باپ بھائی سے صلواتیں سنتی تھی۔

اور بھتیانے سننا تو اتنا! سے صاف کہہ دیا۔
 "اتنا! ابھی کوئی ضرورت نہیں ہے شادی کرنے

کی۔ کیوں؟ اتنی مشکلوں سے تو رشتہ آیا ہے؟
 خود کی حریفیں جب تک کسی نامل لڑکی کی طرح
 نہیں ہو جاتیں۔ تب تک کوئی ضرورت نہیں اس کی
 شادی کرنے کی۔ ہم پر اس کی دو روٹیاں بھاری ہیں

"یہاں! اللہ کرے! ہم پر اس کی روٹیاں بھاری
 ہیں۔ ایک ہی تو نازوں پہلی بیٹی ہے میری! اتنا!
 کی کا پیو منہ پر رکھ کر چکوں چکوں روٹے لگیں۔

"افو! میرا مطلب نہیں تھا، بیجا بگڑ گئے! اتنا!
 اس کی۔ ہم لوگ تو اس کی حریفیں برداشت کر لیں

تو سسرال والے تو نہیں کریں گے۔ اور خدا عزوجل
 ایسی دینی بات ہو گئی تو۔ میں بھائی ہوں اس کا

میں چاہتا۔ اسے چھوڑنا ہوتا ہوں تو اس کا مطلب
 نہیں ہے مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ اور اسی

کہہ رہا ہوں کہ کل کو اس کو کوئی تکلیف پہنچے تو
 اٹھا کر لیں۔ جب تک وہ بی بی اسے بھی کرے گی۔ اور

اپنی پیچور بھی ہو جائے گی؟
 "اچھا! اتنا! بادل تو آستہ راضی ہو گئیں۔ شاید

اس کی کہہ رہا ہو۔ لیکن جب انہیں یہ پتا چلا کہ
 اس کی طرف اسی بات سے تھی کہ اس کی پانچ ندیں

اور سب کی سب بننے لگنے والی۔
 "اگر نادیر نے اسے سمجھا یا بھی۔ کہ بعد میں صرف

یہ وہلے گا۔ اور وہ بھی کچھ اتنا! چاہیں ہو گا
 کہ خوش ہوا جائے۔

مگر وہ خود ہی کیا جس کی سمجھ میں بات آجائے۔
 لہذا اتنا! کو اپنا فیصلہ خاصا سمجھ معلوم ہوا کہ کوئی ضرورت
 نہیں ہے ابھی شادی کرنے کی۔ خاموشی سے بی۔ اے
 کیا چلے۔

لیکن بات جب اتنا! کی عدالت میں پہنچی تو ان کا
 رویہ خاصا مختلف تھا۔

"رشتہ بہت اچھا ہے۔ اس کو فضول باتوں کی پھینٹ
 نہیں چڑھایا جا سکتا۔ اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ
 دو سال کے بعد حور باقی خواہش سے دستبردار ہو جائے
 گی۔ ہو سکتا ہے اس خواہش میں اور شدت پیدا ہو
 جائے۔ تب کیا اس کو گھر بیٹھے بوزھا کر دیں گی؟

"یا اللہ! اتنا! نے سر دوڑوں با عقول میں تمام کیا۔
 باپ کی الگ منطق تھی۔ بیٹے کی الگ۔ اور ان دونوں
 کے درمیان وہ گھن پکڑ بن چکی تھیں۔

اور جس کا یہ سارا مسئلہ تھا۔ وہ سارے کھڑاک سے
 بے خرابی دنیا میں لگیں تھیں۔ اب وہ کیا کرتیں لیکن ظاہر
 ہی بات تھی کہ حرف آخر بابا کا ہی فیصلہ ہوتا تھا لہذا تاخیر
 سے ہی سہی مقرر انہوں نے ہاں کر دی۔

اور وہ جو اس فکر میں تھی کہ بھائی کی شادی کے
 موقع پر خوب ہنگامہ ہوگا۔ رونقیں لگیں گی۔ سارے
 ہنگاموں، رونقوں کو چھوڑ کر پیادیں سدا رکھی۔

"یا اللہ اتنے ہنگامے! اتنے لوگ، اتنا شور! اس
 کی خوشی قابل دید تھی۔

نادیر تو ذات پکی کر رہ گیا۔ دنیا کی لڑکیوں کو
 زیور پکڑنے، شوہران سب کی خرمی ہوتی ہے مگر کتا
 ہے تم بھی نہیں بدلو گے۔ نہیں تو میں لوگوں کی ہنگاموں
 کی خوشی ہے۔ حالانکہ سچ تھے تمہارا سسرال گھر کم اور
 لشکر خانہ زیادہ کم رہا ہے۔ یہ تو فی حق خاقان۔ ان
 کو تو میں دو ہفتوں سے یہیں براجمان دیکھ رہی
 ہوں۔ کیا ان کا ولیہ ہونا باقی ہے؟

"کیا بدتمیزی ہے۔ وہ میری خلیا ساس ہیں؟
 "جانتی ہوں۔ کوئی چھاساس ہیں تو کوئی چھاساس

وہ بھی ایک نہیں دو دو تین تین۔ اور سب کو یہیں
 براجمان رہنے کا بہت شوق ہے؟

”اس قدر مزا آتا ہے کہ جنس کیا بتاؤں، سب کے پاس اپنے زمانے کے اتنے قصے ہیں کہ پورا دن بھی ختم ہو جائے مگر ان لوگوں کی باتیں نہ ختم ہوں“
”بھئی، مجھے تو بخش، ان قصوں کو اپنے آپ ہی تک محدود رکھو تو بہتر ہوگا، یہ بتاؤ، احمد بھائی کیسے ہیں؟“

”بہت اچھے ہیں، وہ ایک دم مسکرا پڑی، سچ ناویر میں بہت خوش قسمت تھی، کچھ اتنا اچھا شہر ملا ہے“

”اچھا۔۔۔ آ۔۔۔ ناویر نے اچھا کر لیا کیا۔
”مگر شاید یہ جلد احمد بھائی نہ کہہ سکیں۔ ان کو تو قدوری سی انبار مل ہیو ملی ہے ناں“ اس نے کہتے ہوئے اپنا چہرہ اکشن میں چھپا لیا حور کے تکیے کی رتج سے پچھنے کے لیے۔

وقت یوں پر لگا کر اڑا کر اسے اپنی بھی مدد بردہ چیں رہی، اتنا اسے دیکھ کر ہوا کر تیں۔
”یا اللہ! اکی تو خدا اس کے کھیلنے کو سنے کے دن تھے کہ کھیلے۔۔۔ ہر سہ پہر بڑے ٹکڑی فٹے داری اس کے سر پر آئی، اور اب ایک دم دو جڑواں بچوں نے تو مجھے اسے ملکی کا نانی ہی پٹھا ڈالا۔
”ناویر اس دن اس سے ملنے آئی تو جیسے اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

ملکہ لباس، سوتے پہوٹے، چہرے پر تمکین۔
”بے زاری کے ملے جلتے تاثرات۔
”یا اللہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں، تم تو برسوں کی مرہض لگ رہی ہو“

”کچھ نہیں، حور نے پھکی مسکرا ہٹ سے جواب دیا۔
”برسوں بیٹا بھی کٹے تھے۔ وہ بھی بے چارے پریشان ہو کر گئے ہیں۔ کیا کروں دونوں اس قدر شیطان ہیں کہ جتا نہیں سکتی، بات کو سوتے ہی نہیں ہیں۔ اور دن کو سونا چاہتے ہیں“

”اسے پتہ؟ میں نہیں بتاؤں؟“ حور کی ساس نے پاندان گھیسنے ہوئے جوابا کہا: ”آج کل کے بچوں کو ایسا

بنا دیا گیا ہے کہ ماں بھی پریشان، باپ بھی پریشان کیا ہم لوگوں نے بچے نہیں پالے۔ آج کل کے ہی انوکھے ہیں۔ اب بھونہم چاہتی ہیں کہ گھر میں نہ ہو۔ ہنگامہ نہ ہو۔ سب منہ میں تالا لگا کر پھر۔۔۔
”ماشاء اللہ! گھر ہے کوئی قبرستان نہیں۔ سارا دن لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے کوئی گھنٹی نہ بجائے پچھ پچھ کر باتیں نہ کی جائیں۔

”کیوں بھئی، بچے ڈسٹر ب ہوتے ہیں۔ واہ! واہ! واہ! بچے نہ ہونے ایک دم لاش صاب کی اولاد ہو گئے سانس بڑھاتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئیں۔ تو ناویر نے روئے سخن اس کی طرف کیا۔

”کیوں بھئی، یہ کیا قصہ ہے؟“

”سچ ناویر! میں بہت پریشان ہو گئی ہوں، اس کے گلے لگ کر دو پڑی، بچے شور سے بے وقت اٹھ جاتے ہیں۔ پھر سونے کے لیے پچھتے ہیں۔ کبھی جھجھکاتے ہیں۔ میری پندرہ خود غرض ہوا پوری نہیں ہوا یہاں رساقیت سے بھی کوئی بات کہو تو سب کو کھینچ لگ جاتے ہیں۔ پھر آپ کو کوئی تحفہ پر تو بٹھا کر کھلانے کا نہیں۔ اب روتے ہوئے بچے دیکھوں کام دیکھوں۔ بہت عجیب و غریب شے ہو چلا ہے۔ ناویر! تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ بعض اوقات شادی کے بعد زندگی کتنی مشکل ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے گھر میں بقول تمہارے ہر وقت فکر ہی چلتا رہتا ہے اور وہ سب چیزیں جن پر کبھی میں جان دیا کرتی تھی اب سب از کار رفتہ ہو گئیں۔ وقت یوں بھی قیام کرتا ہے کہ آپ حیران بھی نہیں ہو سکتے۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے۔“ اس نے ناویر کے گلے ہوئے منہ زار بغیر کہا۔

”کہ مجھے الگ گھر دیں؟“

Samsol

ہیئر ٹکٹر

ریشمی کالے بالوں کا راز

Samsol
HAIR COLOUR
with
LANOLIN CREAM



بلیک
ڈاڈک براؤن
میڈیم براؤن
لاٹ براؤن
مہاگنی
آؤمبر

گناہ و جہالت

کاولٹ



حرم کے والد حیات بیگ ایک بڑے بزنس میں تھے۔ حرم ان کی اکلوتی بیٹی تھی جس سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے۔ حرم کی والدہ سربارہ بانو اپنی ذات میں مکمل رہتی تھیں۔ وہ فیشن اور نام و نمود کی دلدلہ تھیں۔ وہ حرم کی شادی ایک بڑے بزنس میں کے بیٹے فخر ملک سے کرنا چاہتی تھیں لیکن حرم اس کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ وجاہت علی کو دل دے بیٹھی تھی۔ وجاہت علی کا بچہ میں اس سے سینئر تھا لیکن ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اسے اپنے والد حرم کے بیچ طبقاتی فرق کا احساس تھا۔ تعلیم مکمل کرتے اس نے حرم کے کاغذ میں ہی پیکر رتبہ کر لی تھی جب وجاہت علی نے اپنے جذبات اظہار کیے تو حرم کی سوجھ بوجھ انکار مل گیا۔ اس نے اسے باب حرم کے بارے میں بتا دیا حیات بیگ کو وجاہت علی بہت پسند آیا لیکن سربارہ نے معاف انکار کر دیا۔ انہوں نے حرم کے کاغذ جانے پر بھی پابندی لگا دی۔ حیات بیگ اپنی اکلوتی اولاد کو دیکھی زندگی کے انہوں نے حرم کو اجازت دے دی کہ وہ وجاہت علی سے چپ چلتے شادی کرے۔ بعد کے حالات وہ خود سنجال لیں گے۔

حرم نے اپنی پہیلی کے دلور کی شادی میں جانے کا بہانہ کیا اور عدالت میں جا کر شادی کر لی۔ تین دن وہ ہوٹل میں وجاہت علی کے ساتھ رہی۔ واپسی میں وہ گاڑی چلا رہی تھی کہ گاڑی سامنے آتے دھڑک سے ٹکرائی۔



گھنٹی دوبارہ بجی۔ جھاگ بھری نے ایک بار پھر حرمت کی طرف دیکھا۔ پھر بچے کو اسی طرح سینے سے چپکاٹے جا کر دروازہ کھول دیا۔
 وہ بارہ بالوں سے کھڑی تھیں۔
 ان کے کپڑے لباس سے بھیکے ہوئے تھے۔ نیچے فرش پانی سے تر ہو رہا تھا۔ آج برسات بھی تو بیت جم کر پڑی تھی۔

جھاگ بھری کی آغوش میں بچہ دیکھ کر اپنا گلیا آغل جھٹک کر سکھاتے ہوئے ان کے ہاتھ دھک سے ایک ہی لمحے میں وہ ساری صورت حال جان لیں۔ وہ اپنی ناگوری نہ جھپٹا سکیں اور چہرے پر عجب سے تاثرات لیے اندر آ گئیں۔
 ”آخر آبی گیا یہ مغوس اس دنیا میں۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ فوڑا سے پیشتر اسے یہاں سے لے جاتا پھر ابھی تک کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو؟“
 انہوں نے ایک نگاہ بے سدھ بڑی حرمت پر ڈالی۔
 ”آپ کا انتظار کر رہی تھی جی“ جھاگ بھری نے جھجکتے ہوئے کہا۔
 ”پتیا ہوا ہے؟“
 اس نے سوچا شاید ہی اطلاع ملا کہ پتھر دل کو کھچا ڈالے۔
 وہ بارہ بالوں نے نیچے پر نگاہ تک ڈالنا گوارا نہ کیا۔

”مجھے اس سے کوئی عزم نہیں ہے۔ ہمارا اب اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔“
 جھاگ بھری کے تاثرات دیکھ کر انہوں نے اپنا لہجہ بدل ڈالا۔
 ”دیکھو جھاگ بھری! میں بھی مال ہوں اور یہ سب دل پر پتھر رکھ کر اپنی بیٹی کی بخت میں ہی کر رہی ہوں۔ اسے دیکھو، کیسے اپنی زندگی برباد کر ڈالی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ پتیا بھی زندگی کیسے گواہے گی! اس بچے کے ساتھ اسے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ کل ہم نہ ہوں گے تو اس کا کیا ہے گا۔ اس کے لواؤں پر جوانی برباد کرنے کی قسم کھاتی ہے۔ میں ایسا

کے ہونے دوں۔ اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ یہ بچہ اس سے دور رکھا جائے۔“
 جھاگ بھری پر خاطر خواہ اثر ہوا۔
 وہ بارہ بالیں: جلدی کر دیں۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ حرمت پوش میں آگئی تو معصیت کھڑی کر دے گی۔ تم نے خوش بخت کو اطلاع دے دی؟“
 جھاگ بھری جلدی سے بولی۔
 ”وہ تو ایک ایک دن انتظار میں گن گن کر کاٹ رہی تھی۔ آج بتا نہیں کیوں نہ اسکی۔ میں عذری چلی جاتی ہوں۔“
 بچہ تو کچھ ہی تو سوچتی سے باہل ہو جاتے تھے۔ ساری عمر آپ کو دعا میں دے گئی تھی۔
 وہ حرمت کو بھول گئی اور اسے اپنے بیٹی یاد آگئی جو اولاد کو ترس رہی تھی اور اس مذہب جاننے والے اس کے اندر ہی زندگی چھونک رہی تھی کہ کچھ صاحبہ ہونے والا بچہ اس کی جھولی میں ڈالنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔
 حرمت بیٹی کو دوبارہ ماں بن سکتی تھیں مگر اس کی بیٹی کے لیے تو ایسی کوئی آس دکھائی نہ دیتی تھی۔
 اس کا ماں اسے بہت چاہتا تھا اس لیے اس کے سر ایلیں کی کوششیں کئے باوجود بھی دوسری شادی پر تیار نہ ہوا بلکہ اسے بچہ کو ڈالنے کی اجازت بھی دے ڈالی۔ اور کچھ صاحبہ کو ساتھ میں لٹکائی رقم بھی دے دی تھیں۔ اس کی بیٹی کی زندگی اس بچے کے طفیل سنور جاتی۔

وہ بارہ بالوں بہت فیاض تھیں اور انہوں نے اس خدمت کے عوض جھاگ بھری اور خوش بخت کا منہ حقیقتاً موتوں سے بھر دیا تھا۔
 جھاگ بھری اب سوچ رہی تھی کہ کچھ صاحبہ اگر واقعی ظالم ہوتی تو اس بچے کو زندہ ہی کیوں رہنے دیتیں۔ چنا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتیں اور کون دیکھنے والا تھا۔ یہ بچہ انہیں بخش کر تو انہوں نے احسان ہی کیا تھا۔
 جھاگ بھری بچے کو اپنی اور منی میں متاع حیات کی طرح چھپائے لپکتی چھپتی باہر نکل گئی۔ وہ بارہ بالوں نے ایک بار پھر اسے سختی سے یاد دلایا تھا کہ آج کے بعد اس بچے پر ان کی کبھی نظر نہ پڑنے پائے اور اس

کی بیٹی ان سے کوئی تعلق نہ رکھے۔

”یوں سمجھو کہ یہ بچہ پیدا ہوتے ہی مر گیا۔“
 انہوں نے منہ پھیر کر — حرمت کے سامنے کا یہ آخری باب بھی بند کرتے ہوئے کہا۔

اپنے پیلوں میں ایک ننھے سے گرم گرم وجود کا احساں کر کے حرمت کے چمکے ہوئے اعصاب پھر اس قدر پُر سکون ہوئے تھے کہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔
 اس کے علی کی اسات اب محفوظ باہتوں میں تھی۔ اپنے بچپن کی کھلاں پر اسے پورا اعتبار تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے بچے کی جان بڑھ کر حفاظت کرے گی۔

پھر خوش آ یا تو وہ بارہ بالوں کے سوگوار چہرے سے نظریں غماز میں۔ ان کے برابر جھاگ بھری سر جھکاٹے کھڑی تھی۔

حرمت کچھ دیر تک خالی الذہن انہیں دیکھتی رہی پھر بے ساختہ اس نے اپنے پہلو کی طرف — ہاتھ بڑھائے اس کے ساتھ ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا پیلو سونا پڑا تھا۔

وہ ننھا قرشتہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔
 حرمت کی بے چینی سوا ہو گئی۔

”امی میرا بچہ کون لے گیا ہے؟ کہاں ہے وہ؟“

وہ بھول گئی کہ ماں سے اس نے کبھی براہ راست اپنے ہونے والے بچے کی بابت بات نہیں کی، وہ اس معاملے میں بے حد سر دھری رہی تھیں۔

وہ بارہ بالوں خاموش رہیں۔ جھاگ بھری کا سر زبرد جھک گیا۔ وہ آغل کے کنارے سے آگے کو بھٹنے لگی۔ حرمت نے اٹھنا چاہا مگر نفاست سے جکڑ گیا۔
 ”آپ بولتی کیوں نہیں۔ میرا بیٹا مجھے لار دیں۔“

یاں وہ بیٹا ہی ہے نا۔
 اسے دور نہیں سے آئی مسز واٹ کے مسرت امیر لیمے کی بازگشت یاد آگئی۔ وہ اسے بیٹے کی یاد رکھ دے رہی تھیں۔

وہ بارہ بالوں نے بڑھ کر اسے سنبھالا۔
 ”تم لینی رہو حرمت! ابھی ہمارا طبیعت ٹھیک

نہیں ہے۔ تم نے اپنے آپ کو اتنا کم زور بھی تو کر لیا تھا۔ اور پھر حالات بھی ایسے ہو گئے تھے ہونی کو جلا کون ٹال سکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے۔“
 ان کا لہجہ ہمدردی سے بھرا تھا۔

حرمت بڑی طرح ڈر گئی۔
 وہ اب مزید کسی بڑی جڑی سے متعل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو کب سے علی کی نشانی کو گود میں بھر کر ہی بھڑک رہی تھی۔
 پیار کرنے کو تو یہ ہی تھی۔
 آج تو اس کی بے قراری کو قرار نصیب ہونا تھا۔

”آپ۔ آپ۔ آپ۔ کیا کیا چاہتی ہیں؟“
 وہ بارہ بالوں نے اس کی پیشانی پر اسے ہونے والوں کو پیار سے سونارا۔

”بچے کو دیکھنے کی خواہش فصول ہے میری جان! میں پیلیوں میں بات نہیں کر رہی۔ یہ بات نہیں بتائے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ نہیں لگتی بار کہا تھا کہ اپنا خیال رکھو۔ صحت میں وہ پی لو۔ کچھ کھاؤ پیو۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ تم نے ایک مردہ بچے کو بڑھ دیا تھا۔“

”نہیں۔ یہ حرکت تھے اختیار پیچھے بڑی۔“
 سے اس بے رحمی کی اسے امید نہ تھی۔ اس کی امید کا آخری چراغ بھی گل کر دیا گیا تھا۔

”نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ صدمے کی شدت سے اس کی حالت غیر ہونے لگی وہ بڑی طرح ہلک پڑی۔“

”خدا میرے ساتھ یہ ظلم نہیں کر سکتا۔“
 وہ بارہ بالوں کو اس سے اسی رخ عمل کی توقع تھی۔ وہ جذبات سے جاری چہرے کے ساتھ اسے روتے دیکھتی رہیں پھر غمگساری کا لبادہ اور کھ کر صبر کی تلقین کرنے لگیں۔

”صبر کرو خدا کی بھی مرضی تھی۔ بندہ تو بے بس ہے۔“
 مگر حرمت کو صبر کیونکر آتا۔ اپنی جان پر گزرتے والے تمام صدمے اسے یاد آ رہے تھے۔ یہ امتحان تو ختم ہونے کو نہ آتا تھا۔ پتانیس کس گناہ کی وہ یوں بے درپے سزا جیل رہی تھی۔

کس قدر بد نصیب یوں میں ماں۔ کتنی سبز قدم ہوں۔ علی نے میری زندگی میں قدم رکھا تو میں نے

خود اپنے ہاتھوں اس کی جان لے لی۔ ایک اسی احساس نے مجھے نہ جھپٹے دیا نہ مرے۔ اب میں اس کی امانت بھی نہ منجھال سکتی۔ اس کے جلنے میں کیوں نہ مر گئی؟ یہ خیال اس کے لیے ہمیشہ ہی سو جان روح بنا رہا تھا کہ اس روز وہی دوزخیز رنگ کر رہی تھی اور جانتے کے وقت علی نے اسے دور دھکیل کر خود اس پر قربان کر ڈالا تھا۔

میرا یہ بالوں کے پھلنے پھارنے کا اس پر کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے جوش و خواس سے عادی ہو رہی تھی۔ اس پر جیسے کوئی جنون سوار ہو گیا تھا۔ علی، میں نے تیارا سوگ پتھر میں کرنا لیا مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں خود بھی مر جاؤں گی اور اس ساری دنیا کو بھی مٹا ڈالوں گی۔

اس نے ساری چیزیں توڑیں پھوڑیں شروع کر دیں۔ اس سراسی کیفیت پر میرا یہ بالوں کے بیروں تلے زمین کھسک گئی۔ انہیں ایسی سورتوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ انہوں نے بے شکل تمام جھاگ جھری کے ساتھ مل کر حرمت کو تباہ کیا اور حیات بیک کو کال کرنے دوڑ پڑی۔

گلابی کا انتظام ہوتے ہی وہ اسی شام کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

حرمت کو میرا یہ بالوں نے زبردستی خواب آور گویاں دے دی تھیں۔ وہ اب ڈر رہی تھیں کہ سو دھکال سنگین نہ ہو جائے۔ اس صدمے کا اثر حرمت کے دماغ پر نہ پڑا۔ کہیں وہ بچ بچ بائیں ہی نہ ہو جائے پتھر تو سارا کام جیتے کر بجائے بگڑی جاتا۔

حرمت کے جنون نے انہیں بری طرح خوفزدہ کر ڈالا تھا۔

بچی کی جان پر گزرنے والے اس نے صدمے کو جان کر حیات بیک کو مگو ہوئے۔ وہ خود بچی کی حوال نصیبی پر حیران تھے۔

میرا یہ بالوں نے اس باد ہوشیاری کی بھی کہ حیات بیک کو بھی اصل صورتحال سے بے خبر رکھا۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں بچی کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر حیات بیک اسے اصل حقیقت بتا دیں۔ حیات بیک انتہائی پشیمردہ ہو گئے تھے۔

کاش میری بچی کی یہ خوشی اسے مل جاتی۔ عقل کی بات کہ میں حیات بیک کی بیٹی کو اس کی یہ خوشی مل جاتی اور دنیا کو ایک نئی داستان مل جاتی۔ میرا یہ بالوں نے دانت پس کر یاد دلایا۔ خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ حرمت کی دوزخ تک جیسے جیسے کے عالم میں رہی تھی۔ باب نے اگرچہ بچی کی طرح اپنی شفقت اور محبت کے سامنے میں نہ سمیٹا ہوتا تو شاید وہ اس حادثے کے کبھی بھی سمیٹیل نہ پاتی۔

اگرچہ میرا یہ بالوں بھی حرمت کے اس کی دلجوئی میں لگی رہتی تھیں۔ ان کی راہ کا آخری کاٹنا بھی ٹیکل کیا تھا۔ اب انہیں حرمت سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ انہوں نے بچی پر محبت کی انتہا کر ڈالی۔

حرمت کی ذہنی حالت دگرگوں تھی مگر وہ ماں کی حاجت اور باپ کی شفقت کا اندازہ کرتی تو دل پر پتھر لکھ کر میرے کھسکے کو کشش کرنے لگی تھی۔ دل پر آنا تو بھڑکنے کے بعد تو اسے لگتا تھا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی جس سے ہو گئی ہوں۔ خوشی اور غم کا احساس بھی مٹ گیا تھا۔

کبھی کبھی وہ بچے چلن پر جھاگ جھری سے اس روز کیانی اپنی بار بار لوجھی کہ جھاگ جھری بھی بالآخر ہاتھ جوڑ پیتی۔

”بس کرو بے بی، مجھ میں یہ داستان دہرانے کی ہمت نہیں ہے۔“

دماغ الیے میں جھاگ جھری کے دل کا چور اس کی زبان سلب کرنا تھا۔ اس کا منہ میرے کورنے مارنے لگتا تھا۔

رنگ و بو کی اس دنیا میں حرمت کے لیے کوئی کشش نہ رہی تھی مگر وہ ماں باپ کے خیال سے زبردستی جیتے پر مجبور تھی۔ حیات بیک کو اپنے لیے دل گرفتہ ہو گئی تو چھپ چھپ کر آنتوں بہا لیتی مگر ان کے سامنے انھیں جھیکنے نہ دیتی۔

مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جیسے روٹھ گئی تھی۔ خدا خدا کر کے اس کی حالت کچھ سمجلی تو میرا یہ بالوں کی جان میں جاں آئی۔ یہاں اگر وہ بھی اپنی چند دلوں کی دل لگی جھلکا

دوبارہ گھر پھر دہرا دیاں منبھالنے میں لگ گئی تھیں۔ وہ جانی اچھی تھوڑی تھیں کہ دو دن کی رفاقت کو زندگی کا روگ بنالیتیں۔ زندگی کے اس سفر میں تو جلنے کوں کون ٹکراتا ہے۔ اب آدمی ہر موڑ پر لو پڑاؤ نہیں ڈال سکتا۔

پھر ان دنوں فخر ملک کی آمد و رفت ایک بار پھر بڑھنے لگی۔ دراصل میرا یہ بالوں نے خود ہی اسے فون کر کے شکوہ کیا کہ وہ تو یہاں کا راستہ ہی بھول گیا ہے۔ حرمت اسے یاد کرتی ہے۔

یہ سن کر فخر ملک پر توجہ سے متاثر ہو کر کسی کیفیت طاری ہوئی۔ وہ سر کے بل دوڑا چلا آیا مگر اگر مایوسی ہوئی۔ حرمت نے تو اس سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا۔ میرا یہ بالوں نے البتہ خوب خاطر و آسائش کی اور شہزادہ بھی بتا کر حرمت کا نام تو انہوں نے اپنی طرف سے جوڑا تھا۔

فخر ملک کھسا گیا۔

میرا یہ بالوں نے اسے صاف کوئی سے بتا دیا کہ وہ تو اسے حرمت کے لیے بہت پسند کرتی ہیں۔ مگر ساری بات حرمت کی پسند کی ہے۔ اور وہ ذرا اور مزاح کی لڑکی ہے۔ بالکل کی دوسری لڑکیوں کی طرح سلی اور پھیر دی نہیں۔

یہ اعتراف تو فخر ملک کو بھی تھا کہ حرمت عام لڑکیوں سے مختلف ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ شخص دل ہی دل میں حرمت کو چاہنے لگا تھا۔ اس کی زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئی تھیں۔ وہ یورپ میں بھی کھانی وقت گزارا کرتا تھا وہاں بھی لڑکیاں اس کی وجہ سے ادرا اس سے زیادہ اس کی دولت سے متاثر ہو کر اس کے گرد و بالوں کی طرح منزلان تھیں۔ وقت گزرا ہی کے لیے فخر ملک کو وہ رنگین تیلیاں بہت جھانکی تھیں اور اس نے ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا مگر شریک حیات کے طور پر وہ ایسی بھولی میں آن گئے والی کسی لڑکی کا انتخاب نہ کر سکا۔

وطن لوٹ کر حرمت کو دیکھا تو دل بار بیٹھا۔ اس کی صبح رنگت، بڑی بڑی آنتیں منساہ گھنے بال اور سب سے بڑھ کر اس کا جتنا ب، اس کا ٹھٹھا اٹھارہ تیرا اس کی دور دور رہنے کی عادت یہ سب

فخر ملک کو اپنی طرف مائل کرتا چلا گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ حرمت شاید اسے اس نگاہ سے نہیں دیکھتی مگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ حرمت کے آگے نہ بڑھنے کی اطلاع پر وہ اپنی تمام مصروفیات ترک کرتے دوڑا چلا آیا مگر حرمت نے اس سے دھک سے بات ہی نہ لی۔ وہ آتا تو حرمت اپنے کمرے سے باہر ہی نہ نکلتی تھی۔ فخر ملک اپنی توہین تو ضرور محسوس کرتا تھا مگر اسے بنا رہا بھی نہ جانتا تھا۔ پھر حرمت آہ و بھوک تبدیلی کے لیے شہر سے چلی گئی تو اس نے سوچا کہ اب اس پتھر سے سر پھر ڈنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے خود کو دوسری دلچسپیوں میں غرق کر دیا۔ مگر حرمت کے لیے پسندیدگی کے حیات اب بھی موجود تھے۔ اس لیے میرا یہ بالوں کے ایک ہی اشارے پر بھاگ آیا۔

میرا یہ بالوں اس حوصلہ افزائی کے بعد اس نے تواتر سے آنا شروع کر دیا۔

میرا یہ بالوں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ خود حرمت کو اس شادی پر آمادہ کر لیتا ہے تو بیگم آبادار اسی کا ہے۔ انہیں اور حیات بیک کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

فخر ملک دیکھ رہا تھا کہ حرمت اب بھی اسی طرح جا رہی ہے۔ اس کی محبت میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اس کی خاموشی اور اداسی۔ دیکھ کر فخر ملک کے دل کی غیب کی کیفیت ہو جاتی تھی۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ وہ اپنی ماں کی طبیعت کے اتنے بگڑے ہوئے ہیں۔ اتنی چپ اور آدم بنے لڑکیوں رہتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایسی دل گزرا کرتے والی سوگوری کیوں تھرتی ہے۔ اسے کیا دکھ ہے کیا تکلیف ہے۔ وہ ایسی ہی ہزاروں باتیں جانتا چاہتا تھا۔ مگر حرمت اس کا موقع ہی آئے نہیں دیتی تھی۔ فخر ملک کو اندازہ تھا کہ اس کی محبتوں کا اثر کم از کم اس لڑکی پر اپنی جلدی آسانی سے نہیں ہونے والا اس لیے اسے کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ وہ ثابت قدمی سے اپنے غا زبیر ڈٹا ہوا تھا۔ دوزار کسی نہ کسی پہلے جلا آتا کبھی پھلوں کی باسکٹ لیے آتا کبھی کیک تو کبھی کوئی اور سوغات۔

حرمیت اس کی لائی ہوئی کسی شے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھی تھی۔ چنانچہ تو درکنار تھا۔ شروع شروع میں تو وہ فاجر ملک سے خاصی چڑھ جاتی تھی۔ اُسے دیکھ کر بے زاری سے بڑا سا۔ منہ بنا کر اٹھ جاتی تھی۔ یہ سب وہ جان بوجھ کر نہیں کرتی تھی۔ اول تو اُسے اپنے گھر میں کسی غیر دم کا بے محابا نہ تھکے چلے آنا نقلی پسند نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ ان دلوں اس کا دل بوری دنیا سے اگلیا ہوا تھا۔ اُسے کسی شے سے رغبت نہ رہی تھی۔ وہ لوگوں سے ملتے جلتے سے کتراتے لگے تھی اور پھر فاجر ملک سے بڑی ایک وجہ مال کا ورہ بھی تھا وہ اب بھی مایوس نہ تھیں۔ اور فاجر ملک کا ذکر اسی بیمار دل سے کرتی تھیں۔

پھر وقت گزرنے کے ساتھ حرمیت کے رویے کی یہ شدت پسندی کم ہونے لگی۔ فاجر ملک بہت ثابت قدم نکلا تھا مگر مال ہونے کے بعد حرمیت کے متعلق پر ایک ایسا پڑا تو تعلق اس اثر آتا تھا کہ کبھی کبھی اُسے دیکھ کر فاجر ملک کے قدم اٹھانے لگتے تھے۔

وہ اس قدر پاکیزہ لگتی کہ صرف اُسے چھونے کے خیال سے ہی وہ خوف زدہ ہو جاتا وہ اُسے الٹی دلی لگتی جو صرف پوچھنے کے لیے ہی بنائی گئی ہو اپنی نفسانی خواہشوں کی جھنٹ چڑھانے کے لیے جن۔

پھر بھی فاجر ملک کی طلب کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس منانے کا مقولے سے اختیار تھا۔ وہ اُسے اپنے محل نما گھر کی رانی بنانا چاہتا تھا۔ اور باوجود اس کے کہ حرمیت نے بھی اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی۔ وہ اس کی طرف دیوانہ وار بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

فاجر ملک کی محبت کسی طوفان کی طرح تیز و تند تھی۔ جو اپنی راہ میں آنے والی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا جاتی تھی۔ اس کے لیے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ حرمیت کی چاہتی ہے۔ اس کا مطلب نظر یہ تھا کہ خود وہ کیا چاہتا ہے اور حرمیت ان دلوں اس کی اوکھیں خواہش بنی ہوئی تھی۔ وہ اس کی تمام تر بے اعتنائی اور بے لوثی کے باوجود اس کی طرف کھینچا چلا آ رہا تھا۔

حرمیت کا رویہ اب نسبتاً بہتر ہو گیا تھا۔ وہ

بادل خواستہ سہی فاجر ملک کی موجودگی برداشت کرنے لگی تھی۔ اُسے دیکھ کر منہ بند کر لیا تھا جانی تھی نہ ہی۔ دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں بیٹھ جاتی تھی اور فاجر ملک کے لیے یہی ایک بڑی فتح تھی۔

اور مہربانہ بالو بھی چپکے چپکے حرمیت کو زندگی کی دلچسپیوں میں حصہ لینے پر آمادہ کرنے میں لگ پڑی تھیں۔

وہ مایوس سے کوئی نہ کوئی پروگرام ترتیب دے دیتیں یا کبھی گھر پر ہی کوئی نہ کوئی تقریب رکھ لیتیں۔ حرمیت کو ان کے اصرار پر پھر لا محالہ مہالوں کو بخور تھی بہت سی دینی ہی بڑی۔ مہربانہ بالو خوش تھیں کہ حرمیت پر جو اچا ہوا خوش رفتہ رفتہ ترشح رہا ہے۔ یہ کام بہت خیر آ رہا تھا مگر وہ بھی بہت لمبہ حوصلہ تھیں۔ انہوں نے آج تک جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اُسے تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیا تھا۔ اس وقت تو قابلہ ایک خم زدہ نرم و نازک کم زور سی لڑکی سے تھا۔ سب ہی طے چلنے والوں کو انہوں نے یہی یاد دلایا تھا کہ حرمیت کے نازک ذہن پر اس خوفناک حادثے نے کچھ زیادہ ہی اثر چھوڑا ہے۔ اس نے موت کو اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ اب دنیا کی رنگینوں سے اُس کا جی اٹھ گیا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی پڑنورہ اور فتویٰ پر مبنی ہے۔

سب پر سن کر تانف سے سر ہلاتے ہوئے حرمیت کی دلجوئی کی کوشش میں لگ جاتے۔

حرمیت جانتی تھی کہ کوئی بھی اس کے دل پر گزرنے والی قیامت سے واقف نہیں اس لیے وہ کسی سے بھی اسناد و بائٹ نہیں سکتی تھی۔ بس دل میں اُٹھنے والی ٹیوں کو چھپانے ہوئے جبراً اس کو ان کے کوشش کرنی رہتی تھی۔

انسان اگر منافق ہو بھی تو اپنے آپ سے منافقت نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہو تو پھر وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ حرمیت بھی کچھ ایسی ہی کیفیت کا شکار تھی۔ اپنے کمرے کی تنہائیوں میں بھی اُس کے ہونٹوں کی دنیا دکھا دے کی مسکراہٹ سسکیوں میں بدل جاتی تھی۔ اور وہ بند دروازوں کی آڑ میں چپکے ہی چپکے اپنے جیون ساکھی اور اپنے بچے کا سرگ سنانی رہ

جاتی۔

حیات بگ اور شا کر ملک نے مل کر ایک نئی عظیم الشان فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور مہربانہ بالو نے اسی فیکٹری میں ایک تفریب کا اہتمام کر دیا۔ وہ لوگوں بھی ایسے مہالوں کی تلاش میں رہا کرتی تھیں۔ انہیں ملے گئے اور لوگوں کی بھڑ بھڑ جمع کرنے میں بہت لطف آتا تھا اور اب تو حرمیت کا ذہنی علاج بھی مقصود تھا۔

انہوں نے تفریب کی تاریخ طے کی دعوت نامے بنائے اور پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق عین ایک دن پہلے نامزدی طے کا مہانہ کر کے ہر پڑ گئیں۔ حرمیت میری جان! مجھ سے تو اٹھنا محال ہے۔ اب ساری ذمہ داری تنہا ہی ہے۔ مجھے مہالوں کے سامنے کسی شرمندہ کام موقع نہ ملے۔ یہ گھر تنہا رہا ہے۔ میرے بعد تم ہی مالک ہو۔ اور تم کو چاہی ہو کہ حیات منزل کی دعوتوں کا ذکر تو لوگ دلوں تک کھنکھرتے ہیں۔

انہوں نے یوں تکیے پر سر ڈال دیا جیسے اتنا کچھ بولنے کے بعد حرمیت کم زور سی محسوس کر رہی ہوں۔

اپنے کندھوں پر ایک دم سے اپنی بڑی ذمہ داری اٹھانے پر حرمیت کو کھلا ہی تو اُٹھی۔ اُسے ایسے کاموں کا کوئی تجربہ تھا نہ دلچسپی۔ ساری نگہ لائی نہ پارہ بالو ہی کرتی تھیں، وہی سینو کا انتخاب کرتیں۔ کرکاری ٹھنک کر دیں ہوں تو ان کے آرائش سے لے کر فریڈر کی ترتیب بدلنے ملک سارے انتظامات ان ہی کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ حرمیت تو بس ان کی ہدایت پر سرسری سا جائزہ لے لیا کرتی تھی۔ یا مہالوں کی خاطر تو اسے کچھ انتظامات دیکھ لیا کرتی تھی۔ زیادہ ہو گیا تو مہالوں کو اپنی دس دیں اور بس۔ اکثر تو اس کے لیے لباس کا انتخاب بھی مہربانہ بالو ہی کیا کرتی تھیں۔

مال کی کسمپندی دیکھ کر اس سے انکار ہی نہ کیا گیا۔

مہربانہ بالو اپنے ڈولے میں مزید رنگ بھرنے کے لیے ڈاکٹر کے پاس سے بھی جو آئیں۔

حرمیت نے کوئی راہ فرار نہ دیکھ کر وہی دلی زبان سے مال کو آمادہ بھی کرنا چاہا کہ وہ دعوت ملتوی کر دیں

مگر مہربانہ بالو نے اس کے لیے یہ جیسے عزت کا مسئلہ تھا۔

ایسا پہلے کبھی ہوا ہے۔ اور تم فکرت کرو۔ کوئی شکل نہ تو مجھ سے مشورہ لے لینا۔

حرمیت کو سب سے بڑی مشکل تو یہی پیش آرہی تھی کہ اُسے اپنے خود ساختہ تنہائی کے غول کو توڑ کر زندگی کی گھاگھی میں حصہ لینا پڑ رہا تھا۔

اس کے اگلے چند روز بڑے معروف گزرنے اور اُسے دیکھ کر مہربانہ بالو سوچ رہی تھیں کہ انہیں یہ ترکیب کیسے کیوں نہ ہوگی۔

حرمیت نے سارے انتظامات نہایت ہی خوش اسلوبی اور سلیقے سے پیشائے تھے۔ مہربانہ بالو اور حیات بگ نے پھر اُسے اتنا سراہا کہ وہ شرمندہ ہو گئی۔ سارا کام تو مہربانہ بالو نے ہی پیشایا تھا۔ وہ تو صرف ہدایتیں دیتی رہی تھی۔

دعوت کا دن آن پہنچا۔ سارے انتظامات کا آخری جائزہ لے کر پھر حرمیت غسل لینے چلی گئی۔

آج مہربانہ بالو کی طبیعت بھی قدرے بہتر تھی۔ فریڈر بھی حرمیت کی ساڑی باندھے بالوں کا اوجھا جھوڑا بنائے وہ ملک بک سے تیار بھی تھیں۔ گالوں میں لباس کے چم رنگ لکٹیوں کے جڑاؤ اور زرخیز جھول سے تھے۔ ساڑھی کے پلو کو سیت ہوا بروغ دمک رہا تھا۔ البتہ آج بھی انہوں نے آرام کی ہی سہولت چھوٹی تھی کہ بقول ان کے چلنے پھرنے سے مارے کمزور دی کے سر چکرانے لگا تھا۔

حرمیت بنا کر نکل و آج صبح موت دلوں بعد اُس نے اپنی سنگھار منظر کے بیوی آئینے میں اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔

چہرہ دھل کر نکھر نکھر تو لگ رہا تھا مگر جھل سی آنکھوں میں ایک مستقل اداسی نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے سے ہونے لگے تھے۔ کبھی یہ آنکھیں بات بے بات مہرت سے جھپکنے لگتی تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑا کرتی تھی۔ مگر آج اپنے آپ کو دیکھ کر اُسے بے طرح گھبراہٹ ہونے لگی۔

اتنے دلوں سے وہ اپنے آپ کو بھولی ہوئی تھی۔ ہار سنگھار کی فطری خواہش ہی ٹٹ گئی تھی۔ بننے سورتے

کی زیادہ شوقین تو وہ پہلے ہی نہیں مگر علی کی سہاٹی چوٹی لنگاہوں کے لیے خود کو خوشی خوشی سنوارا کرتی تھی۔

اور اب تو وہ ایک کوکھ بڑی بیوہ تھی۔ اس خیال سے دل پر گھر نہ لگتا تھا۔

اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے وہ ہنٹ کاٹتی رہ گئی۔ تب ہی اس کی چھٹی جس نے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس دلا یا ساتھ ہی آئے میں اس کے عکس کے عین پیچھے ایک اور عکس ابھرا۔ وہ بڑی طرح چونک کر بیٹی۔

فاخر ملک سامنے کھڑا بڑی پشیمانی لنگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

فاخر ملک اُن کے گھر بلاروک لوگ آئے لگا تھا۔ وہ آج کی صحت میں صبح اپنے گھروں کے مدعو تھے۔ مگر اس کے یوں بے تکلفی سے دندنا تے ہوئے اپنے کمرے تک چلے آئے پر حرمیت اپنے غصے اور ناگوارگی پر قابو نہ پاسی۔ ساتھ ہی اسے جیاد اور غیرت کے احساس نے بھی مغلوب کر ڈالا۔ وہ فاخر ملک کے سلتے دوپٹے سے بے نیاز کھڑی تھی۔

اس نے غصے سے سرخ چہرے کے ساتھ اگدم بڑھ کر سینکڑوں لٹکا ہوا اپنا استری شدہ دوپٹہ کھینچ کر شالوں پر پھیلا دیا۔ اور برہمی سے بولی۔

”آپ۔ بیباں“

فاخر ملک اس کے پر شتاب جھبکا ہوا چہرہ جانوڑ لے چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ سا اثر رہا تھا۔

”جی۔ خادم۔“ اس نے گردن کو خم دیا۔

”آپ یہاں کیوں آئے۔ آپ کو دستک پتا چاہیے تھی۔ یہ میز خٹے خلاف ہے۔“

حرمیت کا جی چاہ رہا تھا کہ اسے کھڑی کھڑی سناوڑے مگر وہ مہمان تھا۔ ماں کی ناراضگی کا خیال سامنے آ رہا تھا۔

فاخر ملک نے اس کے لب و لہجے کا قطعی برا بھلا مانا۔

”ایہوں میں حجاب نہیں ہوتا۔“

حرمیت ایک قہر آلود دنگا اس پر ڈال کر رہ گئی۔

پھر ہنٹل ضبط کر کے بولی۔

”اُمی اپنے کمرے میں ہوں گی، اور شاید اپنے مہمان کی منتظر ہیں۔ آپ وہاں جا کر خوشی اپنا بیٹے کا یہ بظاہر

کر سکتے ہیں۔ وہ قطعی ناراض نہیں ہوں گی۔“ فاخر ملک مسکرا دیا۔

”آپ کی جس مزاح غصیب کی ہے۔“

کیا ستم ظریف تھی۔ وہ تو خوشی کی ہر شے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ بیٹی منڈا کی کا نام بھی بھولنے لگی تھی۔

فاخر ملک اس کی زخمی نگاہیں دیکھ کر جیسے تڑپ اٹھا۔

اس نے اچانک ہی آگے بڑھ کر حرمیت کے شالوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”حرمیت! میں تو تیارا مہمان بننا چاہتا ہوں۔ آج نہیں دیکھ کر میں اپنے آپ کو بھی بھول رہا ہوں۔

تمہاری سادگی میں بھی کس قدر حسن ہے۔ تم اوروں سے کتنی مختلف۔ کتنی اویسی ہو۔ کون سا جادو ہے تمہارے پاس۔ مجھ پر کیا بڑھ کر چھوڑا ہے تم نے۔ آئی ایم ریڈی اُن لوگوں۔“

اس کے اس بے باکانہ اظہار محبت پر حرمیت نے اگدم براہِ رخصت ہو کر اس کے ہاتھ اپنے شالوں سے جھٹک ڈالے۔

اس کے انداز میں اتنی لغزت و حقارت تھی کہ فاخر ملک ایک لمحے کو دنگ رہ گیا۔

حرمیت جانتی تھی کہ فاخر ملک چپکے ہی چپکے اسے پسند نہیں کرتے۔ مگر اس بے تکلفی اور بے باکی کی اسے امید نہیں تھی۔

”حرمیت! آپ کا رویہ میری نگاہ سے بالکل آگے ہے۔ یہ بے رحمی کیوں؟“ فاخر ملک کے اب قدر سے متاثر ہو کر اپنا بیا۔

”آپ کو یہ سمجھنے کی فکر میں بلکان ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ حرمیت تڑپ سے بولی۔

”یہ دیکھو۔“ فاخر ملک صاحب میں آپ سے اتنی بے تکلف مزاح نہیں کہ آپ یوں بغیر اجازت منہ اٹھا لے میرے کمرے تک چلے آئیں اور مجھ سے ایسی بے ہودہ باتیں کر لیں جیسے یہ سب میری پسند نہیں ہے۔“

”تو مجھے آپ کو کیا پسند ہے۔ آپ حکم کو کر لیں۔“

فاخر ملک اب بھی اسے اپنی والہانہ نظروں کی گرمی سے نگہلاتی کی کوشش میں لگا تھا۔

حرمیت نے نیکی نظروں سے اسے دیکھا۔ اور اس پر سر موثر نہ دیکھ کر دوبارہ غسل خانے میں جا کر گنگناہ سے دروازہ بند کر ڈالا۔

یہ اس کی فحش اور مینار کی واضح اظہار تھا مگر فاخر ملک کی پشیمانی پر بلنگ نہ آیا۔ وہ اسے حسن کی ایک آؤ بھڑک کر شانے اچکا کر گنگناہا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

گنگناہوں کی قسمیں ہوتی ہیں۔ اور وہ صرف نازک کی ہر قسم سے ہنٹ چکا تھا۔

کچھ لوگوں کی جھک دیکھ کر ام ہوتی تھیں کوئی غبت کے دوقلوں سے لگتی تھیں کسی کو ظاہری شان و شوکت متاثر کرتی تھی تو کوئی ذاتی وجاہت اور صلاحیت سے مدعو ہوتی تھی۔ کسی کو دلشہ خلی ہونے والے مرد جہانے تھے ہی کو حار جاز مزاج والے۔ وہ ایک ایک کر کے حرمیت پر بھی تمام وار پھینچ اُتار رہا تھا۔

مبارہ ہاؤس نے خود ہی فاخر ملک کو سہلنے سے حرمیت کے کمرے میں بھیجا تھا کہ وہ اسے اُن کا بیٹا پہنچا دے کہ جہان آئے گئے ہیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ کسی نہ کسی طرح دونوں میں بے تکلفی پیدا ہو اور بلا غلطی رہے۔

انہوں نے فاخر ملک کو پاس بلو کر سرگوشی سے بیاں دیا۔

”بیٹا! حرمیت نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی۔ کیا کوئی عجیب سرگوشی ہوئی ہے۔ اس کا مزاج ہی کچھ الگ ہے۔ تم نے میرا بیٹا دے دیا۔ کیا بولی تھی؟“

”ارے آئی! اتنا کہنے کی ضرورت ہی نہیں اتنے دی اس نے۔ ویسے دھیج رکھیں، اب ہی ہوتی خانہ کو دھیرے دھیرے جھکا یا جاتا ہے۔“

”تو سنا ہوتا ہے۔ میں بھی اس کا خاذا پر ڈٹا رہوں گا۔ یا غازی بنوں گا یا خجندیہ۔“

”خجندیہ نہ دلا۔ وہ اگر خجندیہ ہے تو میں بھی کم خجندی نہیں ہوں۔“

اس کا بلند حوصلہ دیکھ کر مبارہ ہاؤس کی ہمت بندھتی جیسے رہا۔

فاخر ملک سست ہو رہا تھا۔ حرمیت کے شالوں کے اپنے ہاتھ بار بار اس کے تصور میں آتے تھے۔

آج کس قدر قریب تھی وہ۔ اگر وہ چاہتا تو اپنے ہونٹوں سے اس کے دیکھتے ہوئے رخسار چھ لینے کی جسارت بھی کر سکتا تھا۔ مگر آج زندگی میں پہل بار اس نے اپنی کسی انسانی خواہش پر ضبط کا بندھن نہ بٹھا تھا۔ اسے جلد ہی نہیں تھی۔

حرمیت جیسے منفرد لوگ کو اپنی طرف مائل کرنے میں کچھ دیر تو لگتی ہی تھی۔ سفید جانی کے کرتے میں گیلے ہاتھوں سے اس کا حسن کس قدر توجہ شکن لگ رہا تھا۔ وہ جیسے جیسے رخسار گنگناہ چہرہ، برہم انداز، نیکیے چوٹوں، وہ گالوں کی پیش، ہونٹوں کے خم، دل جیل چل اٹھا تھا۔ اس کی کسی گستاخی پر وہ دبا دھسے زیادہ کیا کہ دلتی غصے سے مزید لٹلائی، لہجی صحتی یا اظہار تہی جزو ذاتی۔ اور یہاں تو یہ معاملہ تھا کہ اس کے بغیر لبوں سے گائیاں کھا کر بھی طبیعت بے مزہ نہیں ہوتی تھی۔

کمرے کو تو فاخر ملک بہت کچھ کر سکتا تھا مگر وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی جلد بازی کر کے نہ بنایا۔ کھیل بگڑا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اطمینان کے لیے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے حرمیت کی ماں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ اسی طرح پیش قدمی کرتا تو ایک روز اس دوشیزہ کو ضرور تسخیر کرے گا جس کے سوا گھر میں ایک ممکنیت تھی۔

مہمان آئے شروع ہوئے تو حرمیت کو طوطا کر رہا باہر آتا ہوا مگر اس کا مودہ سخت خراب تھا۔

مبارہ ہاؤس نے اس کے سفید لباس کو دیکھ کر چپکے سے ٹوکا۔

”آج تو خوشی کی فصل ہے۔ کوئی اور رنگ پہن لینا تھا بیٹا۔“

حرمیت کچھ نہ بولی۔ مہالوں کے سوالگ کو حل دی۔ وہ فاخر ملک سے کھٹکھٹ رہی تھی۔ کھٹکھٹنے کے دوران بھی اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

فاخر ملک دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔ آخر کو اپنی تو کوئی کسی سے غنا نہیں ہوتا جس سے کوئی تعلق ہو۔ شکایت اور فحش بھی اسی سے ہوتی ہے۔ وہ حرمیت کی رکھان کو اپنے ہی مٹی پہناتا رہا۔

حرمیت کو پتا تک نہ چلا اور مہربانہ ہارنے چلے
 یہی چلے مہالوں میں یہ بات پھیلا دی کہ وہ حرمت کا
 رشتہ فاجر ملک سے لے کر سنے لگی ہیں۔
 مہال جو اتنی رشک میں پڑ گئیں۔ فاجر ملک کے
 لیے تو کتنے ہی خاندان اس نگارے بیٹھے تھے مگر آج
 کو غفل میں فاجر ملک کی حرمت سے دلچسپی کوئی ڈھکی
 چھپی نہیں رہی تھی۔ فاجر ملک کی نگاہیں حرمت کے
 تقاضے میں تھیں۔ وہ بہانوں سے اُسے غافل کرنے
 کی کوشش میں لگا تھا۔ بار بار اس کی راہ میں ٹھکانا
 حرمت جتنا مضبوط تھا وہ اتنا ہی لطف لے رہا
 تھا۔

اور یہ سب مہالوں کی نگاہوں سے کوئی ہٹا ہوا
 نہ تھا۔ ناٹنے والے قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں۔
 حرمت حسد اور رشک سے لبریز دلوں نے پھر
 جھوٹی مسکراہٹوں کے ساتھ مہربانہ ہار کو دلی مبارکباد
 بھی دی۔
 فاجر ملک کے رویے سے سب کے ماتھے ٹھنکے
 تو تھے مگر مزید چنگوٹیاں بھینچنے سے پہلے ہی مہالوں
 کی اطلاع نے سب کی زبانیں برتا لے ڈال دیں۔
 بیگم ملک جو سن کی چنگیاں لیتے ہوئے دل ہی دل
 میں خفیہ لگا رہی تھیں کہ جب حرمت کے جہر کی صورت
 میں فکری میں حیات بیگ کے شیر ان کے شیرزبان
 حرم جو جیس کے توان کے پیرانٹ میں کتنا اضافہ
 ہو گا۔

حرمت فاجر ملک کے رویے سے ختم ہونے لگی
 کا شکار تھی۔ مال سے شکایت کرنا تو بے سود تھا۔ حتی
 چاہ رہا تھا سب کچھ چھوڑ دیا اپنے کمرے میں جا کر
 بنانا بے مگر آج مہربانہ ہارنے سے سختی سے اُسے
 ایسا کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ آخر ان کی طبیعت جو
 حزاب تھی۔

مہال جب ڈانٹنگ ہال میں جمع ہوئے تھے حرمت
 موقع غیبت جان کر چیکے سے باغ میں چلی آئی۔ اس کا
 دل سخت گھرا رہا تھا۔ یہاں تنہائی ملی تو کچھ سکون کا
 احساس ہوا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھنے کے
 جھنڈ کے نیچے آ بیٹھی اور دو لڑکیاں بچوں کے
 پیالے میں منہ رکھے آخری تائیوں کے اداس سے چاند

کو کھنکھائی۔

وہ فاجر ملک کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس
 شخص نے اُسے زہر کر۔ رکھا تھا۔ ہاتھ دھو کر اس
 کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ آج نہ جانے اس کے حوصلے کتنے
 کیوں بڑھے ہوئے تھے جبکہ اُسے تو اس کی قربت سے
 وحشت ہوتی تھی۔ کتنے سختی سے وہ آج شام اس
 کے کمرے میں اس کے کندھے دوپے اس کی آنکھوں
 میں آنکھیں ڈالے اُسے گھور رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا۔
 اس کی یہ گستاخ آنکھیں تو بھری تو ڈالے۔ پتا نہیں
 وہ کس خوش فہمی کا شکار تھا۔

تب ہی اُسے اپنے پیچھے جاری ہو جانے کی
 پرجوش سانی دی۔ اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔
 یقیناً اس کی تنہائی میں زبردستی دخل انداز ہونے والا
 فاجر ملک کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔
 فاجر ملک کے مخصوص پیر فیم کی مانوس خوشبو
 نے اس کے خیال کی تصدیق بھی کر ڈالی۔
 وہ ہمیشہ خوشبوؤں میں لیسار رہتا تھا شاید اسے
 قوت شام بھی مدد سے حسات پر چھانے کا فن آتا
 تھا۔ یہی تو لڑکیاں اُسے دیکھ کر آہیں بھری تھیں اور
 ان کی مائیں اس کے گن گاتی تھیں۔
 وہ بچوں کی نہ لٹ کر دیکھا۔ اسی طرح بیٹھی رہی
 گویا فاجر ملک کی آمد سے زہر پھر دلچسپی میں
 بے نیازی کی یہ ادا فاجر ملک کے دل کو
 لوٹ گئی۔

لڑکیاں تو اس کی قربت کے بہانے دھونڈتی
 تھیں اور ایک یہ بھی کہ جہاں اس کا سایہ دیکھتی تھی
 ہرن کی طرح بدگ آتھی۔ اور اس وقت تو اس نے
 بے اعتنائی کی حد تک کر ڈالی تھی۔ یعنی کہ اس کا آنا نہ
 آنا اس کے لیے برابر تھا۔

وہ کھنکھار پھر کچھ میں شونی بھر کر لولا۔
 ”بڑی بوڑھیاں ہیں کہ لڑکیوں کو لوں رات
 کے وقت خوشبو لگا کر مچھلوں کے نیچے نہیں بٹھایا
 اٹھا نہیں ہوتا۔ جن عاشق ہو جاتے ہیں۔ خبر ہے
 عاشق ہونا ہے وہ لڑکیوں بھی۔“ اُس نے جلد ادھر
 چھوڑ دیا۔
 حرمت نے سنا مگر سر اٹھا کر دیکھنا تک گوارا

کیا۔ جیسے وہ کسی اور سے مخاطب ہو۔ وہ سپاٹ چہرہ
 لیے بیٹھی رہی۔
 فاجر ملک سے یہ بے رحمی اب مزید رواشت
 نہ کی گئی۔ وہ سارے تکلفات بالائے طاق رکھ کر حرمت
 کے نزدیک برآمدے کے ننگے فرش پر ہی
 بیٹھ گیا۔ اس کے شانے حرمت کے شانوں سے
 ٹکرائے۔ حرمت پر اسل پڑی۔
 ایک دلنواز خوشبو فاجر ملک کے وجود سے نکل
 کر حرمت کے اطراف میں پھیل گئی۔ حرمت کو آج پہلی
 بار فاجر ملک کے حذروں سے خوف محسوس ہوا۔ وہ اس
 کی شخصیت میں دراڑیں ڈالنے پر بعد تھا۔ اور وہ اگر
 ضدی ہو نہایت قدم ہو اور عشق میں دیوانہ بھی ہو تو
 اُس سے ڈرنا ہی چاہیے۔

اُس نے اٹھ کر جانا چاہا مگر فاجر ملک نے اپنا
 ہاتھ سختی سے اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
 ”حرمت آج میں جواب لے کر ہی اٹھوں گا۔ آخر
 تم مجھے اتنا جانتی کیوں ہو۔ تیار سے مال باپ کو
 خچے پسند کرتے ہیں پھر کیا وجہ ہے جو میں نہیں اچھا
 نہیں لگتا۔ میں تو۔۔۔ پہلے ہی تو ہے کہ چکا ہوں تھے
 تم سے محبت ہو گئی ہے۔ کیا تم مجھے شادی کرو گے؟“
 حرمت کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے ہاتھ
 چڑا کر اچھا مگر فاجر ملک کی گرفت مضبوط تھی۔
 حرمت کے حلق میں کھولیں پیدا ہونے لگی عمل کے
 بعد کسی دوسرے مرد کے بارے میں سوچنا بھی اس کے
 لیے گناہ تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے فاجر ملک اُسے دعوت
 گناہ دے رہا ہو۔

اُس نے آگے بگولا ہو کر فاجر ملک کی آنکھوں میں
 آنکھیں ڈال کر اُسے گھورا۔
 فاجر ملک کی آنکھوں میں اتنی بھی جیکہ حرمت کی
 آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔
 ”نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔“ اُس نے دانت
 پیسے اور ایک جھلکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پاؤں چمتی ہوئی
 پلٹی گئی۔
 فاجر ملک کا اس شدید رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ
 جڑاں پریشان ہو گیا۔
 حرمت سیدھی۔ اپنے کمرے میں آ کر بند ہو گئی۔

اُسے اپنی ماں کی ہدایتوں کی بھی پروا نہیں رہی۔ وہ آخری
 مہال جلنے تک باہر نہیں نکلی۔ فاجر ملک کی اس پیشکش
 نے اُسے جھجھو کر رکھ دیا تھا۔

آخر وہ مازوں میں آجائے اُس کی اتنی واضح
 ناپسندیدگی اور ناگواری کے باوجود وہ کیوں اُس کے
 پیچھے کیوں پڑا ہوا تھا۔ یہ مگر ہر پسندیدہ چیز کیوں
 حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جان کیوں نہیں لیتا کہ وہ
 اُس کے لیے نہیں بنی۔ اُس کے دل کے دروازے
 صرف ایک شخص سے لیے کھلے تھے اور اب ہمیشہ کے لیے
 بند ہو چکے تھے۔ اب کوئی بھی طعنے الفاظ انہیں دوبارہ
 نہیں کھول سکتے تھے۔

وہ ان انتہا پسند لوگوں میں سے تھی جو زندگی میں
 صرف ایک بار پتلا کرتے ہیں اور لوٹ کر کمرے نہیں
 اُسے اب زندگی میں کسی سہارے کی ضرورت
 نہیں تھی۔ وہ اگر اپنی زندگی سے خوش نہیں تھی تو یہ ظہن
 بھی نہیں تھی۔ اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے
 پر چھوڑ دیا تھا مگر اس کے علاوہ وہ زندگی میں اور کوئی
 جدید دیکھنا نہیں چاہتی تھی، خواہ اچھی یا بری۔
 وہ اپنے لیے ہونے والوں کے دھیرے ہو کر کوئی
 نیاحل بصر نہیں کر سکتی تھی۔
 ایسا اُس کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔

اور یہ فاجر ملک ہر موڑ پر راستہ روک کر کھڑا ہو
 جاتا تھا۔ کبھی نگاہوں کے پیغام سے کبھی اپنے کس سے
 بھی اپنے الفاظ سے محبت کا لہجہ دلاتے پتلا بیٹھا
 تھا جبکہ اُس کے دل میں ایسی کوئی چاہ نہیں تھی۔ اُس
 وہ اپنی ماں کا ارادہ بھی مہانہ رہی تھی اُس
 نے تہیہ کر لیا کہ وہ ان کے اور فاجر ملک کے خواب
 کبھی ترمیم نہ پتیر ہوئے دے گی۔

مہربانہ ہاروں تک بار پھر اس سے خفا ہو گئیں۔
 انہوں نے اُس کی حکم عدولی پر دلی دلی زبان میں ابھی
 خاصی سرزنش کر ڈالی۔

حیات بگ خاموشی سے قسمت کی اس کروٹ کا
 جائزہ لے رہے تھے۔ فاجر ملک کا یہ واضح جھکاؤ
 انہیں اپنی بیٹی کی نئی خوشیوں بھری زندگی کی توفیق
 تو دے رہا تھا مگر وہ زبردستی کے قائل نہیں تھے۔
 ادھر مہربانہ ہارنے انہیں خاموش اور غیر جانبدار

پہنے کی تلقین کر دی گئی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے شاکر ملک بھی اُن
 بربرہ غلامی کا شکار ہو چکے تھے کہ وہ دوستی کی اس دُور کو
 قریبی رشتہ داروں میں بدلنا چاہتے ہیں۔ حیاتِ ملک
 نے جواب کے لیے مہلت مانگی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ
 حیات کی رمانتدنی جو تو کجیہ بات آگے بڑھانی چکے
 مگر حیات کسی طور ادا بھی ہوئی دکھائی نہ دی تھی۔ مہتری
 وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسے ہی احساسِ دلالتے کر اس کی
 زندگی کس قدر دورانِ اور بے رنگ ہو کر رہ گئی ہے۔
 اور عجب تنہا رہنا کس قدر سونامیوں کا ہوتا ہے۔
 وہ اپنی زندگی پر تانے لگی باطن پر ایسا ہونے کا تانہ
 دیتی تھی۔ مگر حیات ملک اسے یوں ساری غم تبا کاٹ
 دینے کی اجازت بھی نہیں دے سکتے تھے۔ یہی کالو بونہ
 ایک پتھر کی بل کی طرح حیاتِ ملک کو اپنے سینے پر دھرا
 غموں پر ہوتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کل جب وہ وہیں رہیں
 گئے تو حیات پہاڑی زندگی کس طرح گزرا ہے گی۔
 اس دن قوت کو ناسنے کی مرنے سے دو جا رہا لے
 کھا کر اٹھ کر جائے دیکھ کر وہ بار بار آنکھوں سے دھککا

کہہ چکا ہوں۔ دوست وہی ہے جو دوست کو اس
 کی غلطیوں پر روکے۔ جو میرا فرض بننا ہے وہ میں
 بہر حال ادا کرتا رہا ہوں۔
 میرا یہ بالو کو اس بات کا اطمینان البتہ تھا کہ
 حیات بیک کو ذاتی طور پر فائز ملک میں کوئی خرابی
 دکھائی نہیں دی، ہاں اس کی کچھ سرگرمیوں کے بارے
 میں وہ ضرور نا پسندیدگی ظاہر کرتے تھے۔
 حرمت اینڈ الٹ میں تو فائز ملک کو مالوس
 ہی کو جی بھی مگر فائز ملک اس کی توقع سے زیادہ ٹیٹ
 ثابت ہوا۔ چار باجے دوں بعد وہ پھر آن دھماکا۔
 اس نے اس غیظ جھڑی سے میرا یہ بالو کا دل
 دہلا ڈالا تھا کہ کہیں اس کے لئے موت کو نہیں چھوڑ دی۔
 آخر کوئی کہاں تک ان کی تنگ مزاج بیوی کی ناز برداریاں
 کرتا۔

حرمیت اُسے دیکھ کر چونک گئی۔ اس شخص نے
تو جیسے اب کمرے کا راستہ دیکھ لیا تھا۔
"بی فریڈے، وہ جان بوجھ کر بڑی بد اخلاقی
سے بولی، کوئی کام اتنا فحش ہے؟"
فائرملک بڑی لگاؤٹ سے اُسکے بڑھا۔ اس کے
ہاتھوں میں کچھ پیکٹ تھے۔
"پچھلے آپ کے لیے لایا تھا۔ میرا ایک دوست
ماڑے گیا تھا تو میں نے لیوٹر خاص یا اُس نے ایک
پیکٹ کا اوپر ہی کاغذ بھرا ڈالا۔ اندر سے خالص ریشم کی
تہ تیغی ساڑنی جھلک اُٹھتی" اور یہ کچھ میک اپ کی
چیزیں اور جیلوری وغیرہ ہیں۔ بیٹا فائرملک نے پریشانی
نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پیکٹس پلنگ پر رکھ
دئے۔

ہے۔ وہ اپنا ہنرمیں اُسے نرمی سے بھی تو سمجھا سکتی ہے۔
 فخر ملک نے اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھے تو حثت ہو لیا۔
 میں جانتا تھا۔ میریوں کو لانا تمہیں اچھا نہیں لگے گا۔ اسی لیے میں اب تک اپنی والدت میں مقیم رہتا ہوں۔ کوئی شلوان شان محض نہیں لانا۔ مگر میری ہر چیز پر تمہارا ہی حق ہو گا۔
 حرمیت کے حوصلے اب جواب دینے لگے تھے۔ وہ دوبارہ ہی ہوئی۔
 "فخر صاحب! خدا کے لیے مجھے پریشان مت کریں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" اُس کے یوں نرم پڑ جانے پر فخر ملک کے دل کی کلل کھل گئی۔
 اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے قبول کر لو۔ اُسی وقت وہ بارہ اٹھائے کرے میں قدم رکھا۔
 ان کے ہونٹوں پر ہنس مسکراہٹ تھی۔
 "کیسے نہیں قبول کرے گی۔" اُس نے خلوں سے لائے ہوئے حرمیت کو اشارہ کیا۔
 "اچھا! ایک نہیں دلا یا۔ ایک دیکھو ہی منگوائی۔ فخر تبتے نے کیا سوچا ہو گا۔" وہ حرمیت سے مخاطب ہوئی۔
 حرمیت ان کی طرف سے یوں کھٹکے رکھ لینے پر چوڑ ہو رہی تھی۔
 فخر ملک اپنا نیت کی تصویر بنا ہوا تھا۔
 "نہیں! آئی! کیا بات ہے۔ میرا اپنا ہی گھر ہے۔"
 "ہاں ہے تو تمہارا ہی گھر مگر خوش کاموقع ہے۔ اور خوش باشی سے بھرپور ہے۔ یہاں کچھ اہتمام سے منالیتے۔ وہ اصل حرمیت بڑے شوخی سے منا با کرتی ہے۔ اپنی سالگرہ اس بار اس نے تباہیا نہیں تو میرے ذہن سے بھی بات آ رہی تھی۔ سارا دن گھر میں بند پڑی رہتی ہے۔ کم از کم آج تو میں اسے حیات کے ساتھ باہر بیج دیتی۔ کچھ ٹھوکی چھری۔ ستر کی رون رون دیتی تو یہی جانا ہے۔
 وہ بارہ بالوں میں ساتھ ہی فخر ملک کو اٹھکے سے

اشارہ کیا۔ اُس نے جھٹ سے پشیمکش کی۔
 "اب بھی دن گزرا نہیں ہے۔ آپ کہیں تو میں یہ فرض انجام دے دوں گا۔"
 یہ تو اور بھی اچھی بات ہوگی۔ وہ بارہ بالوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ جاؤ حرمیت! اپنی سالگرہ کی خوشی میں فخر ملک کو جانتے ملاؤ۔ اور ہاں اچھا سا ایک بھی کھانا اب یہ تعہذ لایا ہے۔ تو ٹھیک تو صحت بننا ہے کیوں؟ انہوں نے فخر ملک سے پوچھا۔ اُس نے تاغیر میں گردن ہلا ڈالی۔
 حرمیت گڑ بڑا سی گئی۔
 "نہیں امی۔"
 "اسے کیا نہیں امی۔ جب دیکھو بند کرے ہی پڑی رہتی ہو۔ چہرہ کیسا اتر گیا ہے۔" وہ بارہ بالوں نے حکم ادا کیا۔
 "آئی پلیز میں کہیں نہیں جا رہی۔" حرمیت قدرے ناگوار سی سے بولی۔
 "میرا حق نہیں چاہ رہا۔"
 "حرمیت! وہ بارہ بالوں نے نظروں ہی نظروں میں تیبہ کی۔ میں جو کہہ رہی ہوں۔"
 حرمیت بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔
 وہ بارہ بالوں نے تبتہ کر کے آئی تھیں کہ حرمیت کی قسم توڑ کر ہی دم لیں گی۔ وہ فخر ملک کو تسلی دے آئی تھیں کہ وہ حرمیت کو اس کے ساتھ کہیں تفریح پر جانے پر ضرور رضامند کریں گی۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ حرمیت حادثے کے بعد سے اتنی تنہا پسند اور قنوطی ہو گئی ہے کہ کہیں آنا جانا ملنا ملنا ناپسند ہی نہیں کرتی۔ شاید اس کی کوششوں سے شیک ہو کر زندگی و پیچوں میں دوبارہ حصہ لینے لگے۔
 "چلو میرا اچھا بھائی۔ وہ بارہ بالوں دوبارہ وہیں میں خوش تو ہوں یا حرمیت کم زور اور دازیں بولی۔
 "چلو میری خوشی کی خاطر ہی۔ بہت سعادت مند بیٹی ہے میری۔ کبھی میری بات نہیں فالتی یا آخری جملہ وہ بارہ بالوں نے فخر ملک سے کہے۔
 حرمیت مجبور ہو گئی۔
 وہ بے دلی سے بال بنا کر باہر آ گئی۔
 فخر ملک یوں خوش تھا جیسے اُسے ہفت اقلیدہ کی

دولت مل گئی ہو۔ اُس نے اور وہ بارہ بالوں دونوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو کامیابی کی داد دی۔
 فخر ملک گنگناتے ہوئے گاڑی اٹھا کر گئے۔
 لگا۔ حرمیت شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔
 فخر ملک کن اکیوں سے اُسے دیکھ کر مسکرا پڑا۔
 نہ جانے اس بیت طنز کو موم کرنے کا فلسفی منتر کون سا تھا۔
 آسمانی رنگ کے لباس میں ملبوس حرمیت اُس کے دل میں بھی جا رہی تھی۔
 "کس ہونٹوں میں چلیں؟" فخر ملک نے رائے چاہی۔
 "کسی میں بھی نہیں۔" حرمیت اُسی طرح رخ موڑنے بولی۔
 "ریشیورینٹ؟"
 "نہیں۔" حرمیت کا جواب مختصر تھا۔
 "تو تھیر؟" فخر ملک نے حیرت ظاہر کی۔
 آپ تو اپنی سالگرہ کی خوشی میں مجھے چائے پلوٹے لائی ہیں۔"
 "اول تو میں ایسی کوئی خوشی محسوس نہیں کر رہی اور دوسری بات یہ کہ میں آپ کو اپنے ساتھ نہیں لائی بلکہ مجھے خود زبردستی آپ کے ساتھ آنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور انجان مت ہیے فخر ملک صاحب! لیتنا یہ سب آپ ہی کی خواہش پر ہوا ہے۔" حرمیت بھری بیٹی تھی۔
 فخر ملک دل کھول کر ہنسا۔
 "کمال ہے۔ آپ تو بڑی عقل مند نکلیں۔" ویسے حرمیت میری کجی میں ابھی تک نہیں آیا کہ نہیں کس طرح مخاطب کروں۔ کبھی تر اتنے قریب لگتی ہو کہ بے اختیار تم کہہ بیٹھتا ہوں حالانکہ اُسکے تکلف عموماً میں لوگوں سے کم ہی ہوا کرتا ہوں پھر بھی تم سے اتنا ڈر لگنے لگتا ہے کہ منہ پر آپ جناب آ جاتا ہے۔ نہیں کیا اچھا لگتا ہے۔ فخر ملک یوں بولا جیسے ان کی بڑی دوستی چل رہی ہو۔
 "میری کہ آپ مجھے مخاطب نہ ہی کیا کریں۔"
 "یہ تو نامن ہے۔" فخر ملک آج بہت پر اہتمام تھا۔ حرمیت بادل غور سے نہی۔ اس کے ساتھ باہر نکلنے پر آمادہ ہو تو پھر بھی پھر فرٹ سیٹ کا دروازہ کھولنے پر بلا حثیت۔
 "میرے بھی کوئی حق۔" اُس کے لیے یہی کافی تھا۔

کامیابی زینہ بہ زینہ پڑھتی ہے۔
 "مخاطب ہونے بغیر بات نہ کی بھی تو نہیں۔" اُس نے مزید کہا۔ اظہار کی بڑی اہمیت ہے۔
 ہے کہ وہ مرد نہیں کہیں کے پاس زبان ہوا اور وہ حرمیت کا دل نہ جیت سکے۔ اور مجھ سے مراد ان کا شرا دعوا ہے۔
 حرمیت تکی سے مسکرا پڑی۔ فخر ملک اُس کے سامنے چاہے کتنا ہی سرخشا۔ الفاظ کی کتنی ہی جاودگری دکھاتا کم از کم اُس کا دل نہیں جیت سکتا تھا۔ اُس کی حرمیت کے سارے دعوے اُس کے نزدیک لغافعی سے زیادہ اور کچھ نہیں تھے۔
 فخر ملک نے ڈراماٹک کرتے ہوئے کہا۔
 "چلیے آپ مجھے جانے نہیں پلانا چاہتیں۔ نہ ہی میری طرف سے ایک کو لڑو رنگ ہی پائی جیسے میں آتنا بڑا امیر بان تو نہیں۔"
 حرمیت نے جانے کیا سوچ کر انکار کر دیا۔ یہ شخص تو اُس کی تمام تر بے رخی پر بھی بدلہ نہ پڑتا تھا۔ یہ وقت تو کسی دس دس دہائی میں ٹالنا ہی تھا۔
 البتہ وہ کسی ریشیورینٹ وغیرہ میں چلنے پر آمادہ نہ ہوئی۔
 فخر ملک نے کار ایک کو لڑا سپاٹ پر روک دی۔
 کچھ ہی دیر میں حرمیت بولیں لگیں۔
 حرمیت بچہ منسوب کو اسٹرک کے ذریعے آہستہ آہستہ حلق سے نیچے اُتارنے لگی۔
 فخر ملک کو لڑو رنگ پیتے پیتے بار بار اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ مگر کچھ سوچ کر رک جاتا۔ اچانک اُسے جیسے کوئی خیال آیا۔ اُس کی آنکھیں جھپک جھپک اٹھیں وہ ایک منٹ۔ کچھ کر گاڑی سے نیچے اُتر گیا۔
 حرمیت نے اُس کے جانے پر کوئی توجہ نہ دی اور گاڑی کا شیشہ نیچے کیے باہر دیکھتی رہی۔ باہر زندگی کا گلیا گلیا عروج پر تھی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ ہر طرف روشنیاں چلنے لگی تھیں۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ لوگوں جو کسے ایک دوسرے سے خوش کہیں میں معروف تھے۔
 ان کے چہرے پر ایک الٹھی کی چمک تھی۔ اور وہ اطراف سے بے نیاز ایک دوسرے میں ہی کھوئے ہوئے تھے۔ بچے جوان بوڑھے سب اپنی اپنی دھن میں

ملن تھے۔ ایک رونق سی لگی تھی۔

حرم کی کوئی کوئی آنکھیں باہر جی تھیں لیکن اس کا ذہن جلنے کہاں جھٹک رہا تھا۔

اسے احساس تک نہ ہو سکا۔ کہ کب فائز ملک آکر گاڑی میں والیں بیٹھا۔ اس کا چہرہ جذبات کی لہر سے تپ رہا تھا۔

”آج رات ہے۔“ اس نے کہا اور حرم کا ہاتھ تھام کر اپنے خیمے سے ہوئے موتیا کے دھیرے سے نازک نازک چھوڑنے والے گھر سے اس کی کلائیوں سے لپٹ ڈالے۔

حرم کو جسے کسی تجھنے ڈنگ مار ڈالا۔ اس کے ذہن میں کوئی خوبصورت لمحات ایک دوسرے سے گڈمڈ ہونے لگے۔

عالم سے خودی میں اس کے بالوں میں گھرے جانا ہوا علی، اس کی کلائیوں میں موتیا کے لنگن پہناتا ہوا علی۔ علی اور اس کے یہ پسندیدہ بھولوں یوں لگا جیسے حل تھے علاوہ کسی غیر مرد نے اس کی کلائیوں میں گھرے پہنا کر اس کی کلائیوں کے گردا گرد لپیٹ دی ہو۔

وہ ناپاک ہوئی ہو۔ اس نے اندکرم کی بیچ کے ساتھ اپنے ہاتھ کیپٹ لیے اور فائز ملک کے پہنائے ہوئے گھرے بڑی طرح فوج کر پتی پتی کر ڈالے۔ فائز ملک اس قدر تو بہین اور تنک پر سفید پڑ گیا۔

حرم کے چہرے پر وحشت تھی۔ اس کی سانس بے ربط ہو رہی تھیں۔ چہرہ پیسے میں تر ہو گیا اس نے نیم جان سا ہو کر سر تھام لیا۔

فائز ملک جو بڑی طرح چونٹ کاٹ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”حرم! بتا رہی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اگر لو اکل رائٹ ہیں اس نے حرم کا چہرہ اونچا کرنا چاہا مگر حرم نے اس کا ہاتھ جھٹک ڈالا۔

فائز ملک جھٹکا اٹھا۔

”آخر کیا وجہ ہے اس قدر نفرت کی؟ میں جتنا قریب آنا چاہتا ہوں تم اتنا دور جیا گئی ہو۔ آخر کیا

کمی ہے مجھ میں؟

اس کی جھلاٹ بھی بجاتی تھی۔ اپنی محبت و لگاؤ کے جواب میں اسے بے رقی ہی ملتی تھی۔

”کیوں قریب آنا چاہتے ہیں آپ۔ میں نے پہلے بھی کوئی بار کہا ہے۔ آج بھی کہتی ہوں۔ تم نے کسی کی محبت چاہیے نہیں خود کسی سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میری جان چھوڑ دیوں نہیں دیتے۔ حرم تھوڑا چپکے سے بولی۔

اس قدر نفرت آمیز لہجے پر فائز ملک کی محبت کی شدت اور بے تابی پر اس کی پیرٹنے لگی۔ حرم کی طرف سے اس کی جاہت کو ہنسی ہی دھتکارا گیا تھا۔ وہ بھی آخر انسان تھا۔ جذبات سے بھر پور مرد تھا۔

انما وجود داری رکھتا تھا حرم کے رویے سے اس کی مردانگی کو خیس ضرور پہنچتی تھی۔ مگر وہ نظر انداز کر جاتا تھا۔ اپنی تمام تر بے اعتنائیوں کے باوجود وہ اسے عزیز سمجھتا۔ اس وقت وہ کس قدر جاوے حرم کے لیے یہ گھر سے فریاد لایا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ حرم کو اس نے لائے ہوئے قیمتی تحفے پسند نہیں آتے تھے تو کیوں نہ اپنی محبت کی گمان کا احساس دلانے کے لیے بھولوں کا یہ خوشبودار تھوڑے۔ وہ یقیناً اسے پذیرائی دیتے لیکن جس نفرت و حقارت سے حرم نے اس سے ہاتھ دھو کر گھرے فوج پہنے تھے۔

فائز ملک کو یوں لگا تھا جیسے اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا گیا ہو۔ یہ چوٹ اتنی شدید تھی کہ اس کا لورا وجود جل رہا تھا۔

اس نے ایک بدلی بدلی نگاہ حرم پر ڈالی۔ ”تو کیا کوئی اور ہے جسے تم چاہتی ہو؟“ اس کے لیے میں شک و شبہ کی جھلک تھی۔ حرم نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔“

اس دو لوگ اعتراف پر فائز ملک کا چہرہ مت گیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار ایک کراہٹ نکل گئی۔ حرم نے اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑ دیں۔

”ہاں ہے۔ کوئی اور جسے میں چاہتی ہوں اور چاہتی رہوں گی۔ اس کے علاوہ کسی کو بھی نہیں۔ میری

محبت، میری ہر چیز پر اس کا حق ہے۔ میرا وجود اس کی امانت ہے۔ میری سراسر اسی کے لیے وقت ہے۔ بس یہی کچھ سننا چاہتے تھے آپ یا کچھ اور بھی؟

شاید اس نے آج پہل بار اپنی محبت کا یوں برملا اظہار بغیر کسی جھجک کے کیا تھا۔ ان کے درمیان شام سا چھا گیا۔

فائز ملک کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو گئے۔ ”کون ہے وہ؟“ اس نے سردی آواز میں پوچھا۔

”میں اس کا جواب دینے کی پابندی نہیں۔ حرم نے اس سے بھی زیادہ سرد لہجے میں کہا۔ فائز ملک بڑی طرح بھرا تھا۔ غرا کر کھڑا ہوا۔ ”تو چہرہ یہ کیا چکرتے ہے۔ جب تم اپنی محبت میں اتنی ہی جاتی ہو تو تنہائی میں کونسا چہرہ ہے۔ مجھے جاوے کیوں ڈالا؟ جاوے ہاں ہے۔ میرے ساتھ کون سا کھیل کھیل جا رہا ہے؟“

”میں یہ سب نہیں جانتی۔ حرم بڑی طرح انگلیاں سرور رہی تھی۔ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔“ ”کیا تنہائی میں اسے پسند نہیں کرتی؟“ فائز ملک جیسے معاملے کی تہ تک چاہتا تھا۔

حرم کو یہ ذکر اذیت دے رہا تھا۔ ذہن کے ٹانگے کھٹنے لگے تھے۔ اس نے تڑپ کر فائز ملک کو دیکھا۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مگر اس سے میری محبت کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ہمیشہ میرے دل میں رہے گا۔ اور میں اس کی جگہ نہ کوئی دوسری دے سکتی۔“

فائز ملک نے چونٹ پیچھ ڈالے۔ اس نے زخمی نظروں سے حرم کو دیکھا۔ پھر ایک جھٹکے سے گاڑی اشارت کر ڈال۔ وہ ایک جنون کے سے عالم میں ڈراؤنک کر رہا تھا۔ اور اطراف کی شے سے لے لیا تھا۔ اس نے اس سختی سے چونٹ دانتوں تلے دبایا تھا کہ جن جھٹک پڑا تھا۔

حرم بت بن بیٹھی رہی۔ اسے حیات منزل

کے گیٹ کے قریب اتار کر فائز ملک ایک لفٹا کپے بغیر تیز رفتاری سے گاڑی اڑائے گیا۔

مرد بارہ بانو نے حرم کو اکیلا آتے دیکھا تو ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ حرم کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی سمجھ گئی کہ کوئی سنگین بات ہو چکی ہے۔ وہ اس کے پیچھے پکلیں۔

”فائز نہیں آیا؟“ ”کیوں؟“ ”چنانچہ حرم اپنے کمرے تک پہنچ کر ساٹا چہرے کے ساتھ ملین۔ ایسی بلینیز میں تھک گئی ہوں۔ آرام کروں گی۔“

مگر میں کیا پوچھ رہی ہوں۔ فائز کیوں چلا گیا۔ کوئی بات ہوئی۔ تم نے کچھ کہہ دیا؟ مرد بارہ بانو جواب نہیں دیتی۔

”اول تو اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ اگر کبھی بھولے جھٹکے لگیا تو آپ یہ سب اسی سے پوچھ لینا۔“ حرم نے دروازہ بند کر لیا۔ مرد بارہ بانو بے لگام کھڑکے کی طرح آگے چلیں۔ پھر سوٹ کر رہ گئیں۔

یہ لڑکی ضرور کوئی نہ کوئی کھلا کر آتی تھی ورنہ فائز ملک اتنا بد مذہب تو نہیں تھا کہ اسے اندر تک چھوڑنے بھی نہ آتا۔ ناخن انہوں نے زبردستی جھجواہ تو ای خوش منہی میں رہیں کہ فائز ملک جو شکار ڈکا ہے۔

بالآخر حرم کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوئی جانے کا خوشخوار سفر ہو۔ شام کا سہانا سماں ہو، تنہائی ہو تو اس بات کا امکان بھی تھا کہ فائز ملک کی خوش بیانی حرم کے دل پر اتار کر ہی جائے۔ اب وہ چھپتا رہی تھیں کہ بیٹی کی سرکشی اور ہٹ دھرمی کا صحیح اندازہ نہ لگا سکیں۔

حرم اس رات بڑے عرصے بعد سکون کی نیند سوئی۔ اتنے دنوں سے فائز ملک نے اس کا ذہنی سکون درہم برہم کر ڈالا تھا۔ روزانہ ٹیک پڑتا تھا۔ آج اس کے ہوش ٹھکانے آئے ہوں گے۔ تنہائی اس کرا اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ

رہے گا کہ خاموشی سے راہیں بدل ڈالے۔
 کتنے ہی دن گزر گئے۔ فاضل ملک واقعی ملٹ
 کر نہیں آیا، ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ بارہ بالو کی
 پریشانی بڑھ رہی تھی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ حرمت
 نے ضرور ایسا کچھ کہہ دیا تھا کہ فاضل ملک راستہ بدلتے
 پر مجبور ہو گیا۔ وہ اتنے اپنی پھیل زندگی کے بارے
 میں متاثر بھی تھی حالانکہ انہوں نے حرمت کو اپنی قسم
 دے دھی تھی۔ اب فاضل ملک نے بھی ہر مرد کی
 طرح ایک ان چھوٹی بیوی کا تصور باندھ رکھا تھا۔
 وہ یہ حقیقت کیسے بھٹک رہا تھا کہ وہ کسی ایسی لڑکی
 سے شادی کرے جو بیوی اور ماں بننے کا مرحلہ طے
 کر چکی ہو۔
 سن کر ہی عشق کا مجھوت اُتر گیا ہوگا۔ انہیں فاضل ملک
 کے رشتے سے زیادہ اپنی بدنامی کی فکر پڑ گئی۔ فاضل ملک
 یہ انگلیاں یقیناً خود تک تو محدود نہ رکھے گا۔ اب
 تو جو جو باتیں نہ اچھالی جائیں کہ تھا۔
 وہ بڑی طرح حرمت کی ناعاقبت اندیشی پر
 پہنچ رہا تھا۔
 مایوسی کی انتہا پر پہنچ کر انہوں نے حیات بیگ
 سے رجوع کیا۔ حیات بیگ نے ان کے خدشات سے
 اتفاق نہیں کیا۔
 ”حرمت اتنی ناچھ نہیں ہے۔ ہماری بیوی مجھے
 ہے۔“
 تو پھر فاضل ملک کو کیوں نہیں آیا۔ اور بھائی
 بھی تو غائب ہو گئے ہیں۔
 ”ملک تو خود اپنی پریشانی میں ہے۔ حکومت سے
 چھپا پھر رہا ہے۔ یوں مجبور و پش ہے۔ حیات بیگ
 نے انگلیاں کیا۔
 ”اے ہے۔ خیر تو ہے۔“ وہ بارہ بالو پریشانی ہو
 گئیں۔
 ”خیر ہے ہی۔ اور نہیں ہی سمجھ رہا آدمی ہے۔ ملک
 ملکا کر کے کام لے گا یا حیات بیگ بولے۔
 ”در اصل مارشل لا کا حکم نے اپنی کارکردگی دکھانے کے
 لیے احتساب کا عمل شروع کر رکھا ہے۔ سیاست دانوں
 کے اثاثوں کی جان بین ہو رہی ہے۔ گڑھے سے
 اکھاڑے جا رہے ہیں۔ اب شاہر ملک کے پاس

فی الحال اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ بھاگ نکلے۔
 وہ بارہ بالو کو ایسی کاروباری امیدوں سے
 کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں تو بس یہی تھی کہ مستقبل کی
 فکر کھائے جا رہی تھی۔
 فاضل ملک کی اس میں وہ کی اچھے اچھے رشتے کوٹا
 چکی تھیں۔
 پھر بہت سارے دن اسی طرح گزر گئے۔ ملک
 کی کوئی خبر نہیں مل سکی۔ سنسنے میں آیا کہ وہ ملک سے
 باہر چلے گئے ہیں۔
 بیوی اور بھائی ان کے ساتھ تھے۔
 وہ بارہ بالو کو ان کی فیملی سے ایسی بے مروتی
 کی امید نہیں تھی۔ جانے کی اطلاع تک نہیں دی تھی۔
 پھر کئی ماہ بعد وہ لوگ جس طرح اچانک گئے
 تھے۔ اسی طرح اچانک واپس بھی چلے آئے۔
 اور اس شام ملک اور ان کی بیگم کو اپنے گھر میں
 دیکھ کر وہ بارہ بالو حیران ہی ہو گئیں۔
 وہ لوگ بڑے اچانک سے آئے تھے، بڑے
 سب سے چاندی کے قتال میں سرخ سر پڑنے سے دھکی
 ہوئی، اوزار و اقسام کی ہتھیائیاں تھیں، دھیر سارے
 پار پھول تھے۔
 ان لوگوں نے آتے ہی اعلان کیا کہ وہ آج
 یہاں سے جواب لے کر ہی جائیں گے اور وہ جواب
 لازماً اثبات میں ہونا چاہیے۔
 ”بس ہیں: اب میں آپ کی ایک نہیں سمون
 گی۔ آج تو آپ کو ہماری پھیلی ہوئی بھولی بھرتی ہی ہو
 گی۔“ بیگم ملک نے وہ بارہ بالو کو کرپٹ سے گلے
 لگاتے ہوئے کہا۔
 وہ بارہ بالو تو گویا مدی مراد برائی تھی۔ ان
 پر شادی نہ کر کی سی کیفیت طاری تھی۔ اپنی بدگمانی
 پر انہوں نے سو سو لعنتیں بھیجیں۔
 انہوں نے اب مزید وقت ضائع کرنا مناسب
 نہ سمجھا۔ جھٹ سے نامی بھر ڈالی۔
 بیگم ملک ان کا منہ ہٹا کر دانے لگیں۔ ملاخاؤں
 نے مبارکبادیں دینی شروع کر دیں۔
 حیات بیگ بیٹھا گئے۔ وہ حرمت کا عذر
 جانے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ بارہ بالو

انہیں ایک طرف لے گئیں۔
 ”حیات! خدا کے لیے یہ بے وقوفی مت کرنا۔
 آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ بلاسو ہے کچھ انکار
 کر دے گی۔ اب اس کا یہی ایک علاج ہے کہ آپ
 خدا کا نام لے کر اپنی طرف سے بات طے کر لیں۔“
 الشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
 اس بات کا تو حیات بیگ کو بھی سو فی صد
 یقین تھا کہ حرمت کا جواب انکار میں ہی ہوگا۔ انہوں
 نے بہت سوچا پھر بالآخر یہ جواب اٹھانے کا فیصلہ کر ہی
 لیا۔
 بیگم ملک اپنی ہونے والی بیوہ کے لیے خاص طور
 پر سعودی عرب سے انگوٹھی خریدوائی تھیں۔ اور اسے
 پسنا ناچا رہی تھیں۔
 ہماری طرف سے اسے منگنی کی انگوٹھی بھیجے سارے
 ارمان تو میں شادی ہو کر لے کر دوں گی۔ اور ان لیں
 اس کے لیے میں ایک ماہ سے زیادہ کی بھرتی نہیں
 دینے والی۔ وہ بہت خوش تھیں۔
 وہ بارہ بالو کچھ پھلکی سی گئیں۔ بہ حال انہوں نے
 ایک تہیہ کر لیا تھا کہ حرمت کی ایک نہ سنیں گی اور
 اپنی سوا کچھ چھوڑیں گی۔
 وہ ایک عزم کے ساتھ انھیں اور حرمت کو
 بازو سے پکڑ کر لا کر ان کے سامنے لا کھڑا کیا۔ انہیں حرمت
 کے رد عمل کی بھی اب قطعاً پروا نہیں تھی۔
 انہوں نے حرمت کو صرف اتنا کہا تھا کہ۔
 ”ارٹنگ روم میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں جن سے
 اس کا ملنا ہے۔ حذر فرمادی ہے۔“
 ان کے خیور کچھ ایسے تھے کہ حرمت چوں بھی نہ
 سکی۔ ماں کے غصے سے اس کی اب بھی جان نکلتی
 تھی۔ وہ جس جگہ میں تھی۔ اسی میں اٹھ کر ان کے
 ساتھ کھینچی چلی آئی۔
 وہ بارہ بالو نے اسے لا کر بیگم ملک کے سامنے
 لا کر کیا اور ساتھ ہی اس کے شرابی دوپٹے کا آچل اس
 کے سر پر ڈال دیا۔
 ”بسم اللہ کہتے ہیں۔“ انہوں نے کہا اور بیگم ملک نے
 حرمت کو گلے سے لگا کر اس کی پیشانی چوٹی پھر اس کے

کچھ سوچنے سمجھنے سے منتر غمخس ڈبیر کھول کر میرے
 کی دیکتی تھیں انگوٹھی اس کی انگلی میں پسنا دی اور خوش
 خوش بولیں۔ ”اب یہ میری اسانت ہے اور اپنی اسانت
 اب میں زیادہ دن آپ کے پاس نہیں رہنے دوں
 گی۔“
 وہ بارہ بالو کے سینے سے جیسے ایک بوہا اُتر
 گیا وہ جھٹ کر بولیں، ”آپ ہی کی بیٹی ہے بھائی۔“
 جب جی چاہے نہ جائیں۔
 ”یہ بات ہے تو میں تو ابھی ہی اپنی بیوہ کے
 حاتی ہوں۔ بیگم ملک بولیں تو سب جھٹ پڑے۔
 حرمت کے پیروں تلے زمین کھسک گئی تھی۔ وہ صبح
 معین میں بھجلی رہ گئی۔ اس کی ہر اسان نگاہیں حیات بیگ
 کی آنکھوں سے نکلیں وہ غلطیوں پر جرائے۔
 حرمت سے اب وہاں ٹھہرانہ کیا وہ تیرہری سے
 وہاں سے چلی گئی۔
 بیگم ملک نے اس کے یوں چلے جانے کو شرم
 پر غموں کیا۔
 ”بڑی شرمیل ہے میری بیوہ۔“
 ”ماں بہت مختلف ہے میری بیوی آجکل کی
 لڑکیوں سے۔ اور میں نے ابھی اسے کچھ بتایا بھی تو
 نہیں تھا حیران بھی ہو گئی تھی۔“ وہ بارہ بالو نے وضاحت
 کی تھی۔
 ”میرا جلد بغیر و خوبی پٹ جانے پر ان کی مسرت
 کا کوئی ٹکنا نہ تھا۔“
 حرمت بعد میں اب چاہے کتنا بھی وادیا چاتی
 انہوں نے اپنی سی کر گزرتے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
 (باقی آئندہ)





ریڈیو کا کوئی آرٹسٹ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ان کے مرنے کے بعد انہیں پوج کر مرہ پرستی کا اظہار کریں۔ سو یہ روش بدلنے کے لئے قدم ہم اٹھاتے ہیں۔ عارف صہبائی اس مقام پر ہیں کہ واقعی ان کے لئے کچھ کر کے ہم سب اپنے اپنے مقام اور اختیار کا حق ادا کر سکتے ہیں۔

یوں عارف صہبائی کی ہندو سال پیشہ کی تحریروں میں سے بہترین تحریروں میں سے ایک گلدستہ بنایا گیا اور اس گلدستے کی خوشبو کو زیادہ مہکایا کرنے کے لئے ان کا ایک بالتفصیل یا تصویر انٹرویو کرنے کا پلان بنایا گیا اور یہ قلم فال جوہی نوید کے نام نکلا۔ بقول نسب راشد کے ”جوہی میں ایک بہترین سرجن چھپا ہے۔“ یہ بات میں سے بات نکالنے اور اس میں سے اپنے

اس وقت وہ لہجے کے لئے ہوٹل شام میں آئی تھی مگر بالکل غیر متوقع اس کی نظر عارف صہبائی پر جا پڑی تو اسے حیرت کے ساتھ ہی ساتھ خوشی بھی محسوس ہوئی اور وہ اپنی مخصوص میز کی طرف بڑھنے کے بجائے عارف صہبائی کی طرف قدم اٹھائی چلی گئی۔ عارف صہبائی سمجھتے ہی برس کے ایک خوب اور اسرار سے خوش پوش و خوش اخلاق شخص تھے اور اسے یقین تھا۔ وہ دور جوانی میں بہت زیادہ ہی مہ جبینوں و نازنین دلوں کی دھڑکن رہے ہوں گے۔ اس سے ان کی جان پہچان ان کے انٹرویو کی غرض سے ہوئی تھی۔ ان دنوں اس نے نیا نیا ”ایکشن میگزین“ جو ان کا تھا۔ کچھ اس کامیو شروع سے پہنچ پند تھا پھر کچھ عارف صہبائی کی تحریروں کا ایسا چارم تھا کہ وہ خوشی

سنگاہ چن کر آج پڑھی

پچھلے محرم

مطلب کی بات چن لینے میں ماہر ہے کسی ماہر سرجن طرح اس کی زبان چلتی ہے۔ رکتی ہے اور باتوں میں سے لفظوں کا آپریشن کر لیتی تیز بین نگاہ سے ناسور الگ اور باقی ماندہ زخم پر تسلی ڈھارس کے ٹانگے لگا جاتی ہے کہ بین السطور سوچنے کا سامان رہے۔ یوں جوہی نوید پہلی بار عارف صہبائی کے گھر گئی خوب ڈھیر ساری باتوں کے درمیان اس پر جو کچھ اس کی راز تھا کہ عارف صاحب نہ صرف اپنی تحریروں میں خوبصورت دیکھتے تھے بلکہ درحقیقت وہ اصل زندگی میں لفظوں سے بھی زیادہ پرکشش شخص رہتے تھے۔ ان کے ہر لفظ سے محبت کی مہکارا نکلتی تھی۔ اپنی بیوی کے لئے انہیں لفظ نہ ملتے تھے کہ

خوشی اس میگزین میں بطور اسٹنٹ ایڈیٹر کے شامل ہو گئی۔

عارف صہبائی کا موضوع معاشرتی اصلاح سے بھرپور کمائیاں ہوتی تھیں جس میں قانون کی بالادستی کو ہمیشہ اولیت حاصل تھی اور یہی ان کے فلم کی تحراری تھی۔ قارئین ان کے فلم کے جادو میں اس بری طرح جکڑے ہوئے تھے کہ پر زور مطالبہ کرنے لگے کہ ایکشن میگزین کا کوئی شمارہ صرف عارف صہبائی کی تحریروں اور انٹرویو سے مزین کر کے ترتیب دیا جائے۔ یہ بات مدیر اعلیٰ کے سامنے پیش ہوئی تو سب نے اس مطالبہ کی حمایت کی اور مدیر اعلیٰ سید نور عالم نے دو ٹوک انداز میں فیصلہ دے دیا کہ ”راٹر ہو یا فلم بی بی

اپنی محبت کی تشریح کر سکتے۔ ان کی بیگم کی شخصیت درحقیقت ان ہی کی شخصیت کا عکس تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود اسے اس بات پر حیرت ضرور ہوئی تھی کہ جب اس نے ان کی فیملی کے ساتھ ان کی تصویریں دیکھنے کی استدعا کی تو وہ ہزیز ہو گئے مگر بہت جلد سنبھالنے لگے۔

”دراصل بیگم ایک فیملی گید رنگ میں شریک ہونے کے باعث اس خواہش کی تکمیل کرنے سے مجبور ہیں۔“

لہجہ انتہائی قار اور مضبوط تھا کہ اس نے ان کی ہی مختلف زاویوں سے چند تصویریں انار کر انٹرویو کمپوزنگ کے لیے دے دیا اور قارئین نے پورا پرچہ ہی بے حد سرانزدگ کیفیت میں پڑھا اور اسے ایک نادر تحفہ تسلیم کیا۔ یوں زندگی اسی رفتار اور موڑ سے چلتی رہی لیکن جوی نوید کے دل میں عارف صہبائی کی شخصیت کا بہت گہرا عکس بیٹھ گیا۔ اسے باؤفا پر محبت مروجہ اسے شکریم کے قابل لگتے، خود اس کے والد بھائیوں میں بھی عصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس لئے عارف صہبائی کو وہ اسی قطار میں کھڑا رکھ کر پوری عزت و شکریم سے پیش آتی ان کا فون جب بھی آتا تو ہر

کام روک کر ان کی بات توجہ سے سنتی۔ کوئی توجہ طلب بات ہوتی تو فوراً اس کے سدباب کے لئے تجویز پیش کرنے لگتی۔ یعنی بہت اچھی خاصی اندر اشیئنگ تک ہو گئی تھی۔ دونوں کے درمیان، سو اس وقت عارف صہبائی کو دیکھ کر اس کے ذہن پر خوشگوار تاثر پیدا ہوا تھا۔ دفتر سے اٹھتے وقت قطعاً اسے اپنے ارد گرد کوئی قابل توجہ بات نظر نہیں آ رہی تھی، لیکن اس وقت تو چاروں اطراف میں منظر ہی منظر کھڑے ہوئے تھے۔ قابل توجہ اور قابل ستائش اور ان منظروں میں دل بنے دھڑک رہے تھے عارف صہبائی۔ سو وہ ان کی میز کے قریب جا کر اس طرح کھڑی ہو گئی کہ پہلی ساعت ہی اس پر نظر پڑی لیکن عارف صہبائی اس وقت کسی گہری سوچ میں کم تھے۔ اس کی آمد اور اس کے کھڑے ہونے پر قطعاً ”متوجہ

نہیں ہوئے یہاں تک کہ اسے ڈھونڈ بن کر انہیں خود اپنی طرف متوجہ کرنا پڑا۔

”ہیلو مشرعارف! آئیے ہیں آپ۔“

عارف صہبائی نے چونک کر سر اٹھایا۔ جوی نوید کا سامنے پایا تو مسکرا کر بولے۔

”ارے مس جوی! آپ! آئیے ناں کھڑی کیوں ہیں۔ بیٹھ جائیے پلیز۔“ اسے بیٹھنے کی آفر کے ساتھ ہی انہوں نے دوشترے اپنے لئے کافی اور اس کے لئے اسیم روٹ کا آرڈر دے دیا۔ وہ مٹا کرتی رہ گئی مگر عارف صہبائی نے ایک نہ سنی۔ سو اس نے اعصاب ڈھیلے ڈال کر ان سے آئندہ ماہ کی تحریر پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے لفظوں کو جمع کیا۔ انہوں نے چونکا انداز دیکھا تو مسکرا کر بولے۔

”مس جوی! لگتا ہے اس وقت بھی آپ کیل

کائنات سے لیس ہو کر پوری تیاری میں ہیں۔ بانی گاڈ! آپ کا جو انداز ہے ناں اسے دیکھ کر مجھے کسی جنگل کا سماں یاد آ جاتا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں بنگال ٹائیگر کے شکار کرنے سے پہلے کی تمام تر موڈنٹ ایک کے بعد ایک کر کے در آتی ہیں۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ بنگال ٹائیگر انسان کو مارتا ہے جبکہ آپ انسانیت کو ممکنہ قتل ہونے کے خدشے دھوکے سے بچانے کے لئے اپنی توانائیاں خرچ کرتی ہیں اور یہ بات یہ پوائنٹ اہم ہے کہ آپ کو طاقت کے ایک الگ وکڑی اسٹینڈ لے جاتا ہے ممتاز کر دیتا ہے اس سے۔“

”ارے مشر! آپ تو مبالغہ آرائی کر گئے۔ میری تعریف میں کہاں میں کہاں۔“

”مس جوی! میں رائٹر اور شاعر ضرور ہوں، لیکن آپ نے دیکھا ہوگا۔ بہت کم مبالغہ آرائی کرتا ہوں۔ میری پہلی ترجیح کو پورے کرنا۔ حقیقت کو چھپایا ہے تاکہ لوگ خوابوں کے مسحورم میں ہی نہ رہیں، اپنے اچھے برے کا خود موازنہ کر کے فیصلہ کر سکیں۔ سو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کام میں اپنی معاون کی تعریف میں۔ میں مبالغہ آرائی کر جاؤں۔“

”اچھا تو یوں کہئے۔ آپ رائٹر اور ایڈیٹر کے نازک

تعلق سے ہر اسال ہیں۔“

عارف صہبائی نے عقبہ لگایا اور جوی کو مانا نہ دیا۔ ان کے قہقہے میں بھی ایک الگ گون اور متوجہ کر لینے کی پوری صلاحیت ہے۔ انہوں نے چپکے کھانا میز پر رکھا۔

”مس جوی! آپ نے توجہ پوچھتے میرے دل کی بات کہہ دی واقعی ایڈیٹر رائٹر کا رشتہ اتنا نازک ہے کہ دانشوں پیسہ آ جاتا ہے۔ یہ ایڈیٹر ہی کی تو مہارت کی بات ہے، وہ رائٹر کی کس بات کو کس طرح پروموٹ کرتا ہے۔ کرتا بھی ہے یا اصل پیغام کا گلا گھونٹ کر تحریر کو بے رنگ، بے مقصد کر دیتا ہے بانی گاڈ! پروف ریڈر سے زیادہ خطرناک ہے ایڈیٹر۔“

جوی کو بھی ہنسی آ گئی۔ مشرعارف نے توجہ سے دیکھا پھر بولے۔

”مس جوی! آپ ہنسی رہا کریں۔ شاید آپ کو کسی نے بتایا نہیں کہ آپ ہنسی ہوتی اچھی لگتی ہیں۔“

جوی نے سر اٹھا کر دیکھا مگر لہجے کے خلاف ان کی آنکھوں اور چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا سوائے توجہ اور تقدس کے۔ اسے اکثر مردوں کی نگاہوں میں ایک خاص طرح کی بے باکی اور جھجک لینے کی حکومت کرنے کی پر غور اند چمک دکھائی دی تھی۔ مگر عارف صہبائی کی طرف وہ جب بھی دیکھتی ان کی آنکھوں میں خاص طرح کی اطمینان بخش دھارس بھری توجہ پھوٹتی رہتی۔ ایک خاص طرح کا احساس تحفظ دیتی ہوتی۔

یہی وجہ تھی اس نے عارف صہبائی سے بھی بطور ایڈیٹر کے بات چیت نہ کی۔ وہ قاری اور فین کے درمیانی تعلق سے ایک مرکزی تعلق بنا کر ان سے مطالب ہوتی اور کبھی مایوس بھی نہ ہوتی۔ سو اس نے لطف کے بعد پوچھا۔

”مشرعارف! آپ کا ناول کس درجے تک پہنچا اس بار آپس داتاں تو ہو چکی ہے جبکہ آپ ہمیں ہمیشہ اس تک اپنی تحریر سے نواز دیتے ہیں۔“

”یقیناً“ مس جوی! اس سے انکار نہیں لیکن اس بار کچھ پر اہم مزاحیہ ایسے آگئے ہیں۔ میرے لکھنے کی رفتار

میں بہت فرق پڑا ہے، دراصل اس بار میں جو کہانی لکھ رہا ہوں۔ اسے آپ آپ جتنی سمجھ سکتی ہیں۔ جسے میں اس کے راوی سے سننے کے بعد اپنے اسٹائل میں ضبط تحریر میں لا رہا ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن مشرعارف! آپ قارئین کے جذبات اپنے پارے میں تو جانتے ہی ہیں ناں۔ ایکشن میگزین ہماری کاوشوں کے بعد آپ کی تحریر سے جتنا ہے۔ آپ کی تحریر ہمیں ہر صورت ملنی چاہئے کیونکہ کبھی آپ کی تحریر میں تھقل پیدا نہیں ہوا۔“

”یہ تو ہے، شروع سے میں نے اس بات کا خیال رکھا ہے۔ پڑھنے والے جس طرح چاہتے ہیں جو چاہتے ہیں اس پر قلم اٹھاؤں اور ہٹا کی کپ کے ان سے تعلق قائم رکھوں، لیکن اس بار کہانی کچھ انکسہ ہی لگتی ہے۔“

”لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے یہ ایک نئی کہانی ہے جس کا راوی کوئی اور ہے۔“

”جی ہاں یہی تو اصل مسئلہ ہے اگر میں چاہوں تو تھخیلی طور پر اس کہانی کو کوئی نہ کوئی موڑ دے کر اس کا اختتام کر سکتا ہوں مگر اس طرح اس کا اصل اور ندرت خیال متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔ دوسری طرف کہانی کا راوی اچانک ہی مجھ سے کم ہو گیا۔“

”راوی کم ہو گیا ہے۔ میں سمجھی نہیں کچھ؟“

کیا آپ کے بال گر رہے ہیں؟

بیونے بکس کا خلیا کوڈ

سوہنی ایئر آئل

سوہنی ایئر آئل تیار ہوا کر لیا ہے۔

بہت عمدہ دھندل دیتی ہے، دھندل دیتی ہے۔

بیونے بکس

۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔

جوہی نے تھیر سے دیکھا تو عارف صہبائی ہنس پڑے پھر بولے۔

”کیوں مس جوہی! یہ شہر تو اتنا بڑا ہے کہ کتنے ہی جیون آئے کم ہوئے پھر آئے اور کھو گئے۔ یہ کوئی تھیر خیز بات تو نہیں کہ میرا روی بھی کم ہو گیا۔ ہو سکتا ہے اس کو کوئی ذاتی پر ایلم آڑی ہو۔“

”پھر مشر عارف! اس کا کیا حل ہو سکتا ہے۔“

”یہی تو اتنی دیر سے میں سوچ رہا ہوں۔ دیکھتے ایک آدھ دن انتظار مزید کر دیکھتے ہیں پھر کوئی دوسری صورت نکالتے ہیں۔“

”مگر مشر عارف! اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی۔ آپ یوں کیوں نہیں کرتے کہ اس تحریر کو مجھ سے ڈس کس کر لیں۔ تاکہ کمائی کو کوئی نیا موڑ دیا جاسکے۔“

”کمائی نیا موڑ تو خود ساتھ لاتی ہے۔ جس طرح ہر تصویر اپنا موضوع اور رنگ ساتھ لاتی ہے لیکن خیر یہ تجویز اتنی بری بھی نہیں۔ آپ بتائیے کیا آپ فارغ ہیں۔“

جوہی نوید نے خاموشی سے ان کو دیکھا۔ اسے قلعا“ امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اس کی بات مان لیں گے کیونکہ بہر حال وہ ضدی اور تخلیق کار کی طرح اپنے کام کے معاملے میں بہت حساس اور سکی سے بھی تھے۔ لیکن جب انہوں نے اس کا اعتراض حرف غلط کی طرح منادیا تو اس نے جلدی جلدی اپنے ذہن میں اپنی مصروفیات کی کھلکھولیشن کر کے فارغ وقت پیدا کرنے کی کوشش کی پھر مسکرا کر بولے۔

”آپ کب اس کمائی پر کام کرنا چاہتے ہیں۔؟“

”ابھی اور اسی وقت لیکن کیا آپ بھی فارغ ہوں گے۔“

”ارے کیوں نہیں سرا! ابھی ایک بجایا ہے۔ شام تک کے لئے میں فز ہوں۔ فرمائیے آپ کا کیا پروگرام ہے۔ آپ دفتر میں چلے گا یا گھر پر کام کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔“

”دراصل گھر کے احوال میں کافی پرسکون خیال کرتا ہوں میں خود کو اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔“

”ارے نہیں سرا! بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا بلکہ یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی چلتے۔“

اس نے نشوونما سے ہاتھ صاف کر کے تجویز قبول کر لی تو عارف صہبائی بل پے کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور جوہی نوید نے دفتر کے اپنے کولیک شای فاروق اپنی آئندہ کی مصروفیات سے آگاہ کیا۔ بتائیں اس نے یہ کیوں ضروری خیال کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض کاموں کی کوئی وجہ نہ ہو تب بھی وہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ سو وہ عارف صہبائی کی کار میں بیٹھ کر ان کے شاندار بنگلے پر جا پہنچی۔

عارف اسے سیدھا اپنی اسٹڈی روم میں لے کر اور جوہی نوید کو عجیب سا لگا کہ گھر میں ہونے کی کیفیت کا ڈیرا تھا جبکہ وہ اپنے بچوں کی شرارتوں اور شور و شغب کے قصے ہیئت مزے لے لے کر سنا رہا تھا اور خاص کر اپنی بیگم صاحبہ کا ذرا تہی محبت توجہ سے کرتے کہ اسے مشر عارف کی قسمت پر رشک آئے لگتا لیکن یہاں تو اس نے کچھ سوچ کر بڑی سی میز پر گرد بچھی کر سیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے سوال کر لینا ضروری سمجھا۔

”مشر عارف! بیگم صاحبہ اور بچے دکھائی نہیں دے رہے۔“

عارف صہبائی صاحب نے ہنس کر الماری کھول کر مسودہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ سگریٹ جلا کر گھرا لیتے ہوئے وہ اس کے سامنے ہی میز پر تنک گئے اور مطمئن لہجے میں بولے۔

”مس جوہی! دراصل گرمیوں کی چٹشیاں گزارنے میری بیگم اپنے میکے یعنی برطانیہ چلی جاتی ہیں۔ اس لئے ان سے ملاقات نہیں کروا سکوں گا۔ ویسے جو ہم یہاں کرنے آئے ہیں۔ اس کے لئے خاموشی اور تمنا کی بہت اشد ضرورت ہے۔“

”جی یہ تو ہے لیکن پھر بھی بیگم صاحبہ کی موجودگی میں گھر اور زیادہ خوبصورت دکھائی دیتا۔“

”خوبصورت یا محفوظ؟ سچ بتائیے مس جوہی! آپ خود کس گھر میں غیر محفوظ محسوس کر رہی ہیں۔ جوہی نوید نے بے بسی سے اپنے کیونکس

کا ان کو دکھائیے۔

”مس جوہی! پورے پندرہ برس سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن میں آپ کے بارے میں اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا کہ آپ جوہی نوید ہیں۔ آپ کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ کبھی ہمارے درمیان کسی بات میں ہو میں حالانکہ ایڈیٹر رائٹری حیثیت ہمارے درمیان بہت حساس رشتہ قائم ہے۔“

”آپ نے مجھ پر ایسا مگر سر! بار! قارئین کو تحریروں سے لپی ہوئی ہے، ایڈیٹر کی ذات کیا ہے۔ وہ کون ہے۔ اس نے کن حالات میں شعبہ جوان کیا۔ اسے اس کے بغیر غرض؟ یہی وجہ ہے کہ آپ نے بھی میرے حلق کچھ نہ پڑھا، رہا حیاں تعلق تو مجھے اس سے انار میں لیکن بہر حال ذاتی زندگی تو ایک پرست افغیہ الہیات ہوتی ہے اس سے کسی رائٹر کو کیا پچپی۔“

”کسی رائٹر کی دلچسپی کو چھوڑیے۔ میری بات سمجھئے تو آپ کی ذاتی زندگی جاننے کا بہت شوق

ہو گا اور سوجاواہ ایک بہت بڑی ضرورت ہیں اس کے ادارے کی۔ اس لئے برملا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اب مزگی مول لینے سے بہتر ہے جلد سے جلد بات کر لی جائے سو خود کو قابو کر کے بولے۔

”آپ نے یہ اندازہ کیونکر لگایا سرا کہ میں خود کو غیر معمولی محسوس کروں گی، وہ بھی آپ کی موجودگی میں۔“

”کیا واقعی آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں مس جوہی کہ لوگ میری قوت میں احساس تحفظ محسوس کریں۔“

”سرا! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ تو سر لے کر یہ تنک خویوں کا مرقع ہیں بھلا آپ سے شکایت ہو سکتی ہے۔“

”ارے واہ! آپ نے تو بتانا ہی شروع کر دیا۔“

”آپ نے کوشش کی لیکن درمیان ہی سے سنجیدہ ہو کر لے لے۔“

”مس جوہی! پورے پندرہ برس سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن میں آپ کے بارے میں اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا کہ آپ جوہی نوید ہیں۔ آپ کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ کبھی ہمارے درمیان کسی بات میں ہو میں حالانکہ ایڈیٹر رائٹری حیثیت ہمارے درمیان بہت حساس رشتہ قائم ہے۔“

”آپ نے مجھ پر ایسا مگر سر! بار! قارئین کو تحریروں سے لپی ہوئی ہے، ایڈیٹر کی ذات کیا ہے۔ وہ کون ہے۔ اس نے کن حالات میں شعبہ جوان کیا۔ اسے اس کے بغیر غرض؟ یہی وجہ ہے کہ آپ نے بھی میرے حلق کچھ نہ پڑھا، رہا حیاں تعلق تو مجھے اس سے انار میں لیکن بہر حال ذاتی زندگی تو ایک پرست افغیہ الہیات ہوتی ہے اس سے کسی رائٹر کو کیا پچپی۔“

”کسی رائٹر کی دلچسپی کو چھوڑیے۔ میری بات سمجھئے تو آپ کی ذاتی زندگی جاننے کا بہت شوق

ہو گا اور سوجاواہ ایک بہت بڑی ضرورت ہیں اس کے ادارے کی۔ اس لئے برملا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اب مزگی مول لینے سے بہتر ہے جلد سے جلد بات کر لی جائے سو خود کو قابو کر کے بولے۔

”آپ نے یہ اندازہ کیونکر لگایا سرا کہ میں خود کو غیر معمولی محسوس کروں گی، وہ بھی آپ کی موجودگی میں۔“

”کیا واقعی آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں مس جوہی کہ لوگ میری قوت میں احساس تحفظ محسوس کریں۔“

”سرا! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ تو سر لے کر یہ تنک خویوں کا مرقع ہیں بھلا آپ سے شکایت ہو سکتی ہے۔“

”یہی چند قدم پر شاید تمہاری آنکھوں کے موڑ پر۔ جوہی پلیز بتاؤ نا تمہاری حقیقی زندگی کیا ہے کیا تھی۔“

”سورہی سرا! بات کسی طرح ہماری پالیسی سے مچ نہیں کرتی اگر آپ اس وقت خالی الذہن ہو رہے ہیں تو یہاں سے چلنا چاہوں گی۔“

”لیکن اگر میں تمہیں جانے نہ دوں۔“

”کیا مطلب سرا! آپ تحریک تو ہیں۔؟“

”یقیناً! لیکن میں آج تمہاری کمائی سے اس کمائی کو موڑنا چاہتا ہوں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے سرا! میری کمائی سے آپ کی اس کمائی کو کیا موڑل سکتا ہے بھلا اس سے میرا کیا تعلق۔“

”تعلق ہے تمہارا ہی تو تعلق ہے۔ پلیز تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو جوہی!۔“

”سرا! واقعی اس وقت اپنی بات سمجھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں بے ربطی آپ کے افعال و اعمال سے ہی نہیں، لہجے سے بھی جھلک رہی ہے۔“

”شکر خدا!۔ تم نے میری بے ربطی محسوس تو کی ورنہ لوگ تو میرے ہر جملے ہر بات میں جانے کس کس کا انداز سخن تلاش کر کے مجھے داؤد بنے ہیں۔ لیکن کل ہی میں نے پڑھی تھی اک نظم فرض کرو اگر تمہیں ایک سال ہو جائے مرے ہوئے تو۔“

”جوہی بانی گاڈ! اس نظم نے میری بے ربطی کو مستواخ کر دیا۔ جوہی! کیا واقعی لوگ ہماری تحریروں میں اپنے دکھ دیکھ کر ہماری تحریروں سے خط اٹھاتے ہیں وہ پند کرتے ہیں ہمیں صرف اس لئے کہ ہم جو کہتے ہیں وہ ان کے دل کی بات ہے ان کی بات ہے۔ ہماری اپنی باتیں کون سے لگا۔ جوہی! جو ہم کہنا چاہتے ہیں۔ جس کے لئے کہنا چاہتے ہیں لوگ وہ کیوں نہیں محسوس کرتے۔“

”سرا مجھے آپ کافی ڈیپریس لگتے ہیں ورنہ یہ تو سامنے کی بات ہے بات اپنی ہو یا کسی اور کے دل کی تحریر کرنے کا ہنر تو ہمارا ہے ناں۔ اس لئے اگر کوئی تحریر یا کسی کا کردار ہٹ لٹ پر آتا ہے تو یہ درحقیقت

ہو گا اور سوجاواہ ایک بہت بڑی ضرورت ہیں اس کے ادارے کی۔ اس لئے برملا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اب مزگی مول لینے سے بہتر ہے جلد سے جلد بات کر لی جائے سو خود کو قابو کر کے بولے۔

”آپ نے یہ اندازہ کیونکر لگایا سرا کہ میں خود کو غیر معمولی محسوس کر رہی ہیں۔ جوہی نوید نے بے بسی سے اپنے کیونکس

ہے۔ یہی تو وہ یقین ہے جس کے بل پر وہ زندگی سے نظر ملا کر چل سکتی ہے۔ چند لفظ کہنے میں کتنے ہی بے وقت و آسان لگیں مگر سب کچھ واؤر لگا جاتے ہیں اور وہ زندگی بھر کی عزت چند لفظوں کے عوض ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ سچ تھا کہ اس کے دل میں ان کے لئے محبت کا جذبہ تھا مگر وہ کسی دوسرے کے گھر پر بھی قبضہ کرنے والی نہیں بن سکتی تھی لیکن اگر یہ معاملہ نہ بھی ہوتا تو تب بھی محبت کو سنبھال کر عقیدت ہی کو اپنی شخصیت کا ہر اول دستہ بنائے رکھتی۔ محبت تو عقیدت سے کچھ درجے نیچے کی بات ہے اور وہ مسٹر عارف کو بلند درجے پر رکھنا چاہتی تھی۔

”مس جوہی! آپ شاید جا رہی ہیں۔؟“ بکثرت عارف صہبائی کی آواز اس کے کانوں میں بڑی تو اس نے چادر سنبھالی۔ مسودہ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مسٹر عارف نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ اب بھی پہلے کے موڈ میں تھے سو اس نے گلا کھینکھار کر کہا۔

”سرا آپ کی تحریریں پڑھ کر مجھے بھی لکھنے میں تھوڑی بہت شدید حاصل ہوئی ہے۔“

”کیوں نہیں ایک ایسے ایڈیٹر کے لئے لازمی ہے“ وہ اچھا راستہ ہو۔ مجھے والا ہو مگر مس جوہی! آپ اچھی رائٹر ایڈیٹر ہونے کے باوجود ایک ناکام قاری ہیں۔“ انہوں نے درمیان سے اس کی بات قطع کر کے کہا تو وہ رک کر انہیں حیرت سے دیکھنے لگی۔

”یہ! یہ آپ نے کیسے کہہ دیا سر! ایک اچھا ایڈیٹر میں تھوڑا تھوڑا قاری اور رائٹر ہو، تب ہی تو وہ بہتر صلاحیت کا مظاہرہ کر سکتا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں۔ میں ایک ناکام قاری ہوں۔“

”ہوں کیونکہ میں نے تمہیں جتنا سمجھا ہے۔ اس سے یہ بات واضح تر ہے۔ تم صرف لفظوں کو پرکھتے تنک قاری ہو۔ سفید کاغذ پر بکھری نلی کالی روشنائی سے جھانکتے لفظ گنتی ہو۔ غور کر کے جہاں لفظ بکھر رہے ہوتے ہیں۔ انہیں لڑی میں پرو کر ترتیب دیتی ہو۔ فاضل لفظ تمہارا قلم مٹا چلا جاتا ہے لیکن جوہی! کیا یہ ضروری ہے کہ جو لفظ تمہیں غیر ضروری و فاضل

لگے، وہ واقعی ہو بھی۔ تمہیں کیا پتا۔ ایک رائٹر کس لفظ کو کتنی پسند، کتنی ریاضت کے بعد لکھا۔ کس جملے میں اس کا کیا تجربہ تھا، انہیں مارتا ہے۔ اس جملے میں زندگی کی کتنی ہی ساعتیں بیٹھیں ہوں پھر وہ ایک آگے کالچہ تراشا ہو جوی! تمہارا قاری ہو۔“

جوی نے کتنا جاہل۔ نئی دلیل دے کر اپنی قیامت ثابت کرنا چاہی مگر لفظوں نے ساتھ نہ دیا اور وہ ان کی نیپیل پر چھوڑ کر اٹھ آئی۔

دوسرے دن شامی سے ملاقات ہوئی تو اس ہنس کر پوچھا۔

”ہاں جی۔ کیا ہوا تمہارے ان ونڈر اولڈ کمانی کے موڑ کا۔“

”کمانی رک گئی ہے شامی۔“ اس نے مختصراً کر جان چھڑائی پھر دوسرے کا کوئی وقت تھا جب عارف صہبائی کمانی سمیت اس کے دفتر چلے آئے۔

”مس جوہی! یہ سچے آپ کی امانت۔“

اس نے مسرت سے دیکتے چہرے سمیت کہا یہ سچ واقعی خوش کن تھا ورنہ وہ تو سوچے تھے کہ ان کا پرچہ اب ان کی تحریروں سے محروم ہے۔ رائٹر تو یوں بھی حساب اور ہتھ دل جاتے ہیں۔ اس لئے امید واقعی بھی کہ وہ کل کے روپے ان کے لئے اپنی کوئی تحریر نہ دیں گے مگر خلافِ توقع چلے ہی آئے تو اس نے ان کی مہارت میں کوئی چھوڑی۔ وہ کوئلڈز تنک بی رہے تھے تب ہی اس بے گلی سے تحریر کے آخری صفحے دیکھنے شروع کمانی حسب روایت بہت اچھوتی تھی مگر اختتام آتے آتے ایک خلش سی گئی۔ اس نے سرا پوچھا۔

”مسٹر عارف! یہ کبک“ تحریر کی یہ خلش بہت دنوں کو مانٹ کر رہی۔ کیا اس کا اختتام خوش نہیں ہو سکتا۔“

عارف صہبائی نے دیکھا پھر گہری سانس لے کر کھینکھارے۔

”ہاں جی! یہ جو ہمیں کئی دنوں تک اس تحریر کے میں گرفتار رکھتی ہے۔ آپ کا کیا خیال۔“

”میں آپ سے متفق ہوں لیکن مسٹر عارف! لوگ رہنا چاہتے ہیں تو ان کی ترجیح ہوتی ہے کہ ان کے دل انٹرٹینمنٹ ہو۔ ان کا ذہن بر سکون اور کے لبوں پر ہنس ہو۔ زندگی میں تو یوں بھی بننے کے کم مواقع ملتے ہیں تو کیا ضروری ہے۔ ہم اپنی دل میں بھی دکھ ہی کی تصویر کشی کریں۔“

”نہیں۔ ضروری نہیں لیکن بعض کمائیوں کی اپنا انجام خود ساتھ لایا کرتی ہے جیسے اس کمائی راوی کے ساتھ وہ انجام ہمراہ آیا کسی پردیس سے ملنے والے عزیز ازاں کی طرح مس جوہی! آپ ہی کے کوئی طویل سفر طے کر کے آئے، چاہے وہ دکھ کیوں نہ ہو تو ہمیں ذہن دیتا ہے کہ ہم اپنا درد بند کر سکیں۔“

”آپ نے ٹھیک کہا بلکہ میں خود بھی اس کی قائل ہوں کہ دکھ اور خلش کے رنگوں سے جو تصویر بنائی گئی وہ زیادہ تابناک ہوتی ہے۔ زندگی کی آرٹ جی میں سب سے اہم ترین۔ لیکن پھر بھی ہمیں کبھی ہنس بھی تو پیٹ کرنی چاہئے۔ آپ اس پر کبھی کچھ لکھتے نا۔“

”کوشش کروں گا۔“ وہ خاموشی میں لپٹے ہوئے کہے۔ جوہی ان کی طلب جانتی تھی مگر یہ رائی اس کرنا چاہتی تھی۔ سو آنکھیں بند کر کے کام میں لگی۔

اور ایک دن شامی نے ایک دن زندگی کا سب سے اہم فیصلہ اس کی میز پر لا رکھا تھی تو جیران ہی کے ساتھ کام کرنے کا فیصلہ ہو گیا تھا لیکن بھی وہ قہر نہیں لیا تھا۔ وہ شامی کے بارے میں ایسا نہیں لیکن اب جبکہ اس نے پروزہ کی ڈالا تو اس کا اعدادہ طریقہ سے اس خواہش کے اظہار کا راستہ سمجھا دیا تھا۔ ماں اور بھائی سب نے اس رشتے کو قبول کر لیا تھا۔ وہ سب ہی چاہتے تھے کہ وہ بھی ان کی خوشیوں سے اپنا حصہ پانے والی بنتی لیکن

بات منگنی پر اگر رک گئی تھی۔ شامی منگنی کے بعد اپنے شعبے ہی سے مسلک یورپ کے نور پر نکل گیا تھا۔ اس کی کچھ فوٹو گراف انگریزین بھی نہیں اور کچھ وہ کیمرہ ورک میں مزید مہارت کے لئے ایک آدھ کورس بھی شروع کرنے والا تھا۔ فوٹو گرافی اس کا ذریعہ معاش ہی نہیں اس کا شوق بھی تھا۔ اس لئے وہ اپنے اس فن اور شوق میں مزید ندرت کی طرف قدم بڑھانے کو ہمیشہ تیار رہتا۔ چھوٹی سی عمر میں اس کا کام بڑے پیمانے پر نہ صرف منظر عام پر آیا تھا بلکہ پسندیدگی کی سند بھی پا چکا تھا لیکن وہ اب بھی خود سے مطمئن نہیں تھا۔ شاید یہی اس کی کامیابی کا راز تھا۔ بقول اس کے جو شخص جہاں مطمئن ہو وہاں رہا کرے۔ مٹی کے ڈھیر میں ڈھل گیا کیونکہ تجسّس ہمیشہ زندگی کو میسر دیتا ہے۔ رفتار ہی زندگی کا پتا سمجھائی ہے سو وہ ہمیشہ نئے گوشے اور نئے جہانوں کو رخ کرنے کے لئے تیار رہتا۔ پھر اس کا پیش خیمہ تھا لیکن وہ اتنی دور جا کر بھی جوی کو بلا مبالغہ دن کے چوبیس گھنٹے یاد کرتا۔ اتنے تو اتارے کہ جوی کو خود پر رشک آنے لگتا۔ وہ اپنے جذبات سے گہرائی لگتی اور جب اسے یہ معرکہ درپیش ہوتا تو شعوری طور پر عارف صہبائی کے کسی نہ کسی ناول پر ان سے بحث کرنے لگتی تاکہ لفظوں میں دل کا ابائل نکلتا رہے۔ پھپھو لے پھوٹے رہیں۔ اندر ہی اندر تو لاوا ابلتا رہتا ہے۔ بس وہ اس شوریدہ سری سے بچنے کے لئے ان سے لالچی بحث و مباحثہ کرتی رہتی اور عارف صہبائی جواب دیتے رہتے کہیں گم ہو جاتے اور ان پر جب یہ چپ کا دورہ پڑتا تو اسے لگتا کاغذ پر بکھرے لفظ ان سے نہیں زیادہ شور مچاتے، اپنے ہونے کا یقین دلا رہے ہیں۔ پھر وہ کرکشی۔

”مسٹر عارف! آپ کے لفظ کس قدر بولتے ہیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کی طرح اپنا احساس دلاتے ہوئے“ کمانی نہ بولے تب بھی یہ لفظ خود ایک کمانی بن جاتے ہیں۔“

”شاید لفظوں کی قسمت میں کمانی ہی بن جانا لکھا ہوتا ہے۔“

”مگر مسٹر عارف! کمانی لفظوں کا ہی دوسرا روپ

145

144

ہے۔
 ”ہاں مگر بعض لفظ گوئے ہوتے ہیں۔ بس سن سکتے ہیں۔ بول نہیں پاتے اور ایسے لفظ کہانی ہی بن جاتے ہیں۔ مس جوہی! آپ نے کہانی بن جانے والے لفظوں کی ترتیب دیکھی ہیں ان کے نام کا کتبہ تک نہیں ہوتا۔ ان کی لوح مزار پر لوگ پونہی سرسری سا گزر جاتے ہیں جانے بغیر کہ وہاں کتنا قیمتی دنیا بابت لفظ دفن ہے۔“

”مگر مشاعرہ! لفظ لکھنے والا لفظ سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ لکھنے والا ہوتا ہے شمار لفظ صفحہ قرطاس پر بکھرے چلے جاتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے ایسا بھی ہو لیکن بعض دفعہ لفظ بہت قیمتی ہو جاتے ہیں۔ مس جوہی! کہنے نہ کہنے کے درمیان قید یا کبھی کہہ دینے کے باوجود رد کر دینے جانے کے غم سے بندھال۔ آپ نے ایک بار کہا تھا۔ میں مسکراہٹ پر کچھ لکھوں۔ مس جوہی! آپ بتائیے آپ نے کبھی کسی غم زدہ لفظ سے تعزیت کی۔“

جوہی کیا کہتی۔ خاموش کی خاموش رہ گئی لیکن عارف صہبائی اسی تواتر سے یہ سوال کئے چلے گئے۔

خاموشی کی زبان سے اتنے خلوص سے کہ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم گردانے لگی، مگر یہ احساس جرم یکفخت ہی ختم ہو گیا۔ بس اچانک ہی۔ جب اس کے دفتر میں وہ قالم عالم حسن کی دیواری داخل ہوئی۔ عورتیں بیس کے درمیان تھیں لیکن رعب حسن اور جمال کا یہ عالم تھا کہ اب بھی نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ شریقی آنکھوں کے جام بننے کو اب بھی دل لچکا جاتا۔ وہ پہلی بار میں تو اس حسن و جسم کی کوئی تعریف کر ہی نہ سکی تھی۔ اب نگاہ ٹھیک زاویہ سے جمائی جاتی تھی کہ عکس جاوید پائی کرنے لگتا خاموش تھی مگر لکڑا۔
 انگ انگ نظم پر آمادہ ہے سو بدقت اس نے اپنی یہ متاثر ہو جانے والی کیفیت چھپائی۔ کرسی سے کھڑی ہو کر اخلاق سے بولی۔

”فرمایے محترمہ! آپ کو کس سے ملنا ہے۔“
 ”صرف تم سے۔“ نہایت نخوت بھرا لہجہ وہ احساس تذلیل سے بلبلانہ تھی۔

”مگر مجھ سے آپ کیوں ملنے کی خواہش تھیں۔۔۔؟“
 ”صرف اس لئے تاکہ دیکھ سکوں کہ وہ کون جس کے لئے عارف مجھ سے بے مہر و وار کھنڈے۔“
 ”پھر کیا نہ دیکھا آپ نے۔۔۔؟“ نہ جانے اسے چرانے میں کیوں مڑا نہ لگا۔

اور وہ حسن قابل پیر بننے لگا پھر سنبھلا تو ناز شہسبکی کٹ بالوں کو جھلانا ہوا گویا ہوا۔
 ”بظاہر میں ایسی تو کوئی بات نہیں کہ کوئی ایک بار دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کی تمنا کرے لیکن تم قسمت ہو کہ وہ تمہیں سراہتے ہیں۔“

”یقیناً“ مشاعرہ کے سراہنے کا انداز نہایت شائستہ اور مہذب ہی رہا ہو گا۔ مس عارف! تعریف سے آپ کو دکھ ہوا تو مجھے افسوس ہے لیکن رکھے مشاعرہ کے معیار کو چھوٹا ہر ایک کے بس بات بھی نہیں۔

”باب۔ آل۔ کس معیار کو چھو لیا تم نے۔۔۔؟“
 ان کے انداز میں تعلیم کم انتظام سے زیادہ جہاں جھلک مارنے لگی مگر وہ جوہی شامی تھی استقامت کھڑی اسی ٹھہرے ہوئے لمحے میں بول رہی تھی مشاعرہ اور اپنے سادہ مقدس تعظیم بھرے کی روداد بیان کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے ختم ہو گئے مگر تعلق کی پہنچ احاطہ تحریر میں آئی تعلق کی تکتہ آفرینی واضح ہوئی اور مس عارف سوچا۔ لڑکی انہیں بتا رہی ہے۔ بس اسی پہلو سے کھا گئیں۔ کھٹ کھٹ کرتی آئی تھیں۔ وہ زور و لوث گئیں۔ اس نے سکھ کا سا لیا مگر شام کے عارف کا متوقع فون آگیا تو اس نے جی جان سے کہا۔

”مشاعرہ! کیا میں نے کبھی آپ سے کسی کے تعلق کی امید لگائی۔ آپ نے کبھی میرے سے ایسا عندیہ لیا جو بیگم صاحبہ اس غلط فہمی کا ہو گئیں۔ انہیں سمجھائیے۔ وہ غلط چالبی سے دروازہ کھول رہی ہیں۔“
 عارف صہبائی خاموش تھے اس کے چپ

لے تو صرف اتنا۔ ”غلط چالبی سہی مگر مس جوہی! کیسے کہہ سکتی ہیں۔ وہ غلط دروازہ ہی کھول رہی ہیں۔ جوہی کا شہسبکی پتا ہوتا۔ تم ہی میری شخصیت کا کوڑا ہو جس سے میں لائیجیل مسئلہ کے بجائے مل ہوئی حقیقت کی طرح واضح ہو سکتا ہوں۔“
 ”مشاعرہ! آپ اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ مجھ میں اور آپ میں صرف ایک وجہ تعلق ہے اور وہ صرف رائٹر ڈیڑہ کا رشتہ ہے۔“

”شاید ایسا بھی ہو لیکن میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ کوئی مجبور نہیں کر سکتا سوائے میرے دل کے۔“
 ”تو پھر سن بیٹھے مجھے بھی کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔“
 ”میری میری انا اور خودداری کے اگر آپ سمجھتے ہیں آپ پرے کے لئے آپ کی تحریریں صرف میری ذات کا سبب حاصل کرنے کے لئے ہیں تو میں واضح کر دوں میں آج ہی اس اوارے سے استعفیٰ دے رہی ہوں۔ جو کام بات میرے بھرم، میری ناموس پر حرف لڑکی کا سبب بنے۔ وہ مجھے قبول نہیں۔ آپ کی مس ہوں یا آپ میرے لئے اس لئے اہم تھے کہ کا تعلق ہمارے قلمی معاونین میں سے تھا اور

”اور بس۔ کیا واقعی مس جوہی! ہمارا تعلق یہی ہے۔“ انہوں نے سوالیہ انداز میں پوچھا مگر لگا سوال نہیں زیادہ دکھ تھا۔ اس کے لہجے میں۔ خلش، لکڑا کے پر افسانہ ہی میں نہیں ان کے لہجے میں بھی تھی مگر اب وہ مزید کسی قسم کی معرکہ آرائی میں شرکت کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ نوکری اس کا دل بھی مجبوری میں۔ عقیدت جمع محبت کی قابل ہو رہی تھی لیکن کسی رسوائے زنا کہانی کا کردار بننا کی محبت بھری داستان میں دل نہ ہونا وہ قطعاً ”کووارا“ کی رکتی تھی۔ جبکہ اس کے خوابوں کی تعبیر اگلے ہی سوڑ پر اس کی منتظر تھی پھر جھلا وہ اس آٹھارے کا حصہ کیونکر بنی اگر مشاعرہ کا اپنی مسز کے کوئی جھگڑا ہے بھی تو اسے ان دونوں کو خود ہی مل کرنا چاہئے وہ کیوں بیچ میں ٹھہری جائے بس اس کی اس نے مزید بحث کرنا فاضل سمجھا۔ فون

رکھ دیا۔

مگر دوسرے دن اخبار کی سرخی چیخنی ہوئی سی تھی۔ مشاعرہ کی کار کا زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بیگم عارف معمولی زخمی ہوئی تھیں جبکہ وہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھے مگر اس وقت اس کا کسی بھی تعلق، انیت کے سبب ہاسپٹل دوڑا جانا جلتی پر تیل کا کام گرتا۔ سو وہ جی کڑا کر کہ گھر میں رکی رہی۔ دفتر سے سید نور عالم کا کتبی مرتبہ فون آچکا تھا۔ وہ ہاسپٹل سے ہو کر بھی آگئے تھے اور اس کے ہاسپٹل نہ پہنچنے پر اس کی انتہائی کج خلقی پر خوب غصہ ہو رہے تھے اور یہ ان کا حق تھا۔ وہ ان کو اپنے بزرگوں کی طرح سمجھتی تھی اس لئے ان کی تمام تر کڑوی کسینٹی باتوں کو سن رہی تھی مگر آخر تک۔

شام تک اس کا اپنا بھی ضبط جواب دے گیا۔ کسی بھی تعلق سے کسی تشکار یا جیسے ہوئے تعلق سے ایک طویل راہ و رسم تھی۔ ان کی لفظوں کی جاوہری کی اسیر تھی وہ اس لئے خوبصورت گلاب کے پتھوں کا گلدستہ لے وہ بالا خرا ہاسپٹل جا پہنچی وہ ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار تھی مگر کمرے میں سوائے عارف صہبائی کے کوئی نہیں تھا۔ ہاں بس کمرے کے باہر ایک بوڑھا ملازم تھا جو مناجات میں مصروف تھا۔

”صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے۔۔۔؟“
 ”بس ٹھیک ہی ہیں۔ دعا کریں اللہ کرم کرے۔“
 میرے صاحب نے بڑے دکھ دیکھے ہیں صاحب نے میرے۔۔۔ وہ ایڈیٹر تھی۔ رائٹر نہیں کہ اس جیل سے کہانی کشید کر لیتی۔ سو سراٹھائے اندر داخل ہو گئی۔ گلدستہ رکھ کر واپس لوٹ آئی پھر تیرا دن تھا جب وہ پرائیویٹ روم کا دروازہ کھول رہی تھی تو اس کے کانوں میں مشاعرہ کی آرزو آواز سنائی دی۔

”پلیز عارف! مجھے معاف کر دیجئے دیکھئے میں شرمندہ ہوں اپنے کئے برس۔“
 ”یہ حادثہ صرف شرمندگی کا متقاضی ہے۔ بولو عصمی! کیا واقعی ایک سواری کروینے سے میری زندگی

کے اس بوجھ میں کمی آجائے گی؟ آخر کیا ملا تمہیں
مجھے اس طرح معذور کر کے۔“
”معذور نہیں عارف! ادا کز کتے ہیں آپ بہت
جلد چلنے پھرنے لگیں گے۔ اور“
”اور یہ کہ یہ محض طفل تلسیاں ہیں۔ یہ میں جانتا
ہوں کہ میں اب بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکوں
مگا اور یہ محض تمہاری دوا چنگی کے سب سے ہو گا۔“
”عارف پلیر میں واقعی آپ کی مجرم ہوں۔ مجھے
اس سے انکار نہیں لیکن یہ بھی تو دیکھئے۔ میں نے بھی
خود کو صرف آپ کے لئے محض کر دیا ہے۔ میں صرف
آپ کی ہوں۔“

عبد نبھایا۔ بس مجھ سے بد عہدی کی۔
 ”یہ جھوٹ ہے بد گمانی ہے عارف اور نہ زندگی
 کتنی ہی خوش رنگ چکا چونکہ کرتی راہیں کھلی تھیں
 میں بھی رہی تو صرف آپ کی چاہ میں۔ میں نے
 محبت کی آپ کی چاہ میں۔ آپ اسی سے بڑا میر
 محبت کا جواب لاسکتے ہیں کہ آپ کو سیر نہ کرنے
 خواہش میں۔ میں نے اپنی فطری خواہشات کو دبا
 رکھا۔ مجھے آرزو تھی کہ میں معصوم سی زندگی پور
 کرتی مگر مجھے لگا وہ بننے والے ہونٹ بھی مجھ سے آج
 کو جدا کر لیں گے اور میں آپ کو کھونے کا رسک
 لے سکتی تھی۔ بس اس لئے میں نے عمتا کا روپ لیا
 ماں کہنے اور ماں بننے کی لذت بھی گنوا دی۔ میں وا
 حاسد اور شکی ہوں مگر یہ میری مجبوری ہے عارف
 دیکھئے۔ کیا آپ مجھے معاف نہیں کر سکتے؟“
 ”کر سکتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ میں نے کبھی
 سے بدلہ نہیں لیا۔ لیتا چاہوں بھی تو نہیں لے سکتا
 کیونکہ میرا دل محبت سے پر ہے اور محبت بھرے دل
 کسی کو دکھ نہیں دیتے۔“
 ٹھنڈی سانس بھرنے کی آواز سنائی دی۔ جہوی
 لوٹا چاہا مگر اپنا نام سن کر اچانک ٹھم گئی۔ مسٹر عارف
 جہوی سے مسٹر عارف کے تعلق کی نوعیت جاننا چاہتا
 تھیں۔ اس کی زندگی آنکھوں میں کچھ آئی تھی اور
 مسٹر عارف تھے سکون سے کہہ رہے تھے
 ”جہوی صرف میری اصلاح کار تھی۔ ایڈیٹر اور
 راسخ کا تعلق تھا اس کا میرا لیس۔“

لو اعرازی طرح اپنے دل پر ثبت کر لی۔ تصادف و غلاظت اس کی ذات میں نہیں تھا۔ سو وہ سمجھتی یہ سب دنیا میں بھی کیس نہ ہوتا ہو گا اگر ہوا تو نفسِ خریوں کی ندرتِ آفرینی، کمانی کو وہ آفتاب کے کامنہا ہے۔ اخبارِ برہمتی تو جتنی حساس لوگ خریوں کی عبارتوں میں نہیں لکھ گئے۔ یہ تو کسی کی داستان کے چند کوار ہیں۔ جنہیں تاریخ اور کاسفر کرنا ہی تھا۔ وہ لکھنے کو تو بہت ہی مقدس سمجھتی تھی پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ لکھنے والے کے لئے اس کی رائے ڈمگانی یا وہ اس کے اظہار کو حریف کر کے برہمتی اور غناہ گار بنتی تحریر کو اپنی سمجھ نہ سہی مگر لکھنے والے کی قلبی واردات، اپنی چاہی کا آئینہ دار ہوتی ہے پھر آئینے میں عکس کو وہ لکھ کر بھلا دیتی۔ یہی وجہ تھی وہ تحریریں برہمتی۔

اول میں دیکھتی اس کو حقیقت مان لیتی لیکن درخت حقیقت ہے کیا وہ اب سمجھی تھی۔

وہ ناراض سی کھڑی رہی کہتی بھی کیا۔ تہسید بانی تھی نہ خیال ہاں البتہ سوال ضرور تھا مگر خود لا جواب ایسا کہ ہونٹ نہ چلیے تھے جو سوچ کر آتی تھی۔ ان کے کردار پر اتنا سفاک تبصرہ کرے گی کہ خود لفظ کانپ کانپ جائیں مگر ذات سامنے تھی۔ کردار گواہی ہوئے لگا تھا اور لفظ ہاتھ سے چکنی پھل کی طرح پھسل گئے تھے۔ عارف صہبائی بڑی دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کتنی ساعتیں خاموش گزر گئیں۔ تب انہوں نے ہی پہل کی۔

”مس جوہی! بالآخر آپ نے فیصلہ بدل ہی دیا

”ہاں۔“

راستوں پر وہی حسن مجسم ایسا تھا۔ فخر و غور سے
تہی گردن، مختارت، بھری نظروں سے دیکھنے والا مجسم
جمال مگر بے رنگ۔

”تم انہی میں کس کی اجازت سے آئی ہو؟ آخر
تمہیں بلکہ تم جیسی لڑکیوں کو آسائشوں اور مقام کی
حرص کا سیدھا ترن راستہ یہی کیوں دکھائی دیتا ہے؟“
”مسز عارف! آپ ہوش میں تو ہیں۔“

”میں ہوش میں ہوں مگر تم شاید اپنا مقام اور
حیثیت بھول گئی ہو۔ کسی اور طرف نظر کرو۔ کسی اور
امیر زارے کو کھیرو۔ تم سب دفتروں میں کام کرنے والی
لڑکیاں ہو، ہوتی ہو جاوہر حشم کے لئے۔“

”مسز عارف! ایک دم اس کا ہاتھ اٹھا اور نقش
چھوٹا چلا گیا۔ ان باتوں کا اس سے بہتر جواب کوئی
نہیں تھا۔ گو یہ تہذیب کے خلاف حرکت تھی مگر
بد تہذیبی کے آگے آخر تہذیب کب تک سمجھو
کی کیفیت میں رہتی۔ اسے یہی سوچا، سو وہ جواب
دے کر آگے بڑھ گئی۔

مسز عارف کی طرف بھی دیکھنا ضروری نہیں
سمجھا۔

~~*

یہاں تک کہ دن پر دن آئے اور گزرتے چلے
گئے۔ شامی لوٹ آیا تو اس کی شادی کی تیاریاں شروع
ہو گئیں۔ وہ مگن و خوش تھی۔ جب اچانک عارف
صہبائی ملنے چلے آئے۔ وہ وہیل چیر بر تھے۔ ملازم
ہمراہ تھا۔ بڑی بھابی نے خوش آمدید کہا اور وہ بہت دیر
تک دلائل سننے کے بعد دل برا گئے ان سے ملنے
ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ اپلوں کے پیلے جوڑے میں
میں وہ رنگوں کی کان بن گئی تھی۔ اٹھن اور زرد رنگ
کے امتزاج میں اسے لگتا تو زرد چاہئے تھا مگر زرد رنگ
میں خوشیوں، مسرتوں کے روپیلے رنگ بھرے خوابوں
نے طوفان مچا دیا تھا۔ عارف صہبائی کتنی دیر تک اسے
نکتے رہے پھر گلا کھنکھار کر بولے۔

”مس جوہی! میں اس دن عصمی کے رویے کی
آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔“
اس نے تنفر سے انہیں دیکھا۔ اور طفر سے کہا۔

”حالانکہ سر معافی تو مجھے مانگنی چاہئے تھی۔
کی عزت یا تب تکم کے ساتھ بدسلوکی تو میری طرف
سے ہوئی تھی۔“

”نہیں مس جوہی! وہ سلوک ایک عزت مآب
کا درست رد عمل تھا، مجھے خوشی ہوئی تھی آپ
رد عمل پر۔ یقین کریں اگر آپ اس وقت خاموش
سے سب سمجھ جاتیں تو میں آپ کو بے حس
روح سمجھتا۔ مجھے دکھ ہوتا۔“

اس نے نظریں اٹھا کر پھر بولی۔
”واقعی کیا آپ کو دکھ بھی ہوتا ہے؟ آپ بروکھ
معنی آشکارا ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے سر! آپ مجھے
خوبی لفظوں کو برونے، سوت کات کات کر دیا
دینے اور یقین کا پچھل سروں سے کھینچ لینے والوں
صف میں ہیں۔ میں آپ کو اس غی کے روپ میں
ہوں جو بستیوں میں آنکھیں پھین کر چراغ بانٹا
تھا۔ آپ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں سر
نہیں۔“

لجھ بھرا گیا تو مسز عارف نے اسے دیکھا۔ پھر
توانائی سے۔ پھر کچھ کے بغیر ملازم کو چلنے کے
آواز سن دینے لگے۔ اس نے بڑھ کر تھا پھر بھی نہیں
روکا بھی نہیں۔

~~*

اور زندگی نے سفر پر محو پرواز ہو گئی شامی نے
سے پہلے اس پر استغناء واپس لینے کا باواؤ ڈالا۔ ایک
سید نور عالم کی منشا نہیں تھی۔ دوسرے وہ خود
وزن کی تخصیص کے آزادی کا قائل تھا سو اس
حکم ماننا پڑا۔ مسز عارف کی تحریریں ابھی تک اس
پے ل رہی تھیں لیکن خاموشی کا جو حصار تھا وہ
تھم سا گیا تھا مگر بکھرتے تھم جاتا ہی تو بھونچال کی
ثابت ہوا۔ اچانک مسز عارف برین بریمبرج کا
ہو گئے جب تک وہ اور شامی بیٹھے تب تک زندگی
ایسی پر پروے گرائے جانے کا انتظام ہو رہا تھا اور
بوڑھا ملازم مسز عارف کی بیٹی سے لگا ہوا ڈیس مارا
رو رہا تھا ان دنوں میری سے کہہ بیگم عارف اس کی
کے آگے گنگ تھیں۔

”باباجی! حوصلہ کریں!“ جوہی سب سے پہلے
آگے بڑھی چپ کرانے لگی مگر خود روٹی تو ساون
ہاواوں سے زیادہ چھانچوں بری، اتنا اتنا کہ جل مصل
ہو گئی۔ آنسو گھٹے تو زندگی کے کونین اتھا خاموشی
پھیلی تھی ایک زرد گلاب تھا شیشہ دل پر گر رہا ہوا بوجھ
پڑھا ہوا۔

”جوہی! سننا خود کو۔ مسز عارف کی کی واقعی
پوری نہیں ہو سکتی لیکن یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ ان
کا صرف صبر کرنا چاہئے۔“

اس نے سر ملا کر سامنے رکھے مسودے کو دیکھا
بھی دستک ہوئی وہی بوڑھا ملازم سامنے کھڑا تھا۔
”مس جوہی سے ملنا ہے۔“

”افوہ باباجی آپ آئیے آئیے۔“ وہ اٹھ کھڑی
ہوئی۔ شامی اسے ہت بندھانے کو کہتا اپنے کمرے کی
سمت بڑھ گیا اور جوہی مجسم توجہ ہو کر اس ملازم کو
دیکھنے لگی۔

”کہنے باباجی! اس سلسلے میں ملنا تھا آپ نے مجھ
سے۔“

”وہ جی بی صاحب! یہ صاحب کا آخری افسانہ تھا
بی۔ انہوں نے مجھے اپنے جانے سے تین دن پہلے دیا
تھا۔ کہنے لگے۔ ”رحیم جی! یہ آپ بہت احتیاط سے لی
لی صاحب کے حوالے کیجئے گا۔ یہ امانت آپ کے
نوا کے جی۔“

اس نے مسودہ میز پر رکھ دیا۔ چلنے لگا پھر مڑا اور
بولے۔

”بڑے یاد آتے ہیں سرکار! بہت بھلے لوگ تھے بی
جی! ایسے لوگ برسوں میں آتے ہیں مگر منٹوں
میں اٹھ جاتے ہیں۔ پیچھے حیرت افوس چھوڑتے
ہیں۔ اچھا جی چلوں آپ۔“

دروازہ کھول کر وہ باہر نکل گیا تو اس نے بے دلی سے
السانہ سامنے رکھا۔ ایک انسان کی حیثیت سے مرنے
کا دکھ تھا اسے مگر اعتبار اٹھنے پر ان کے ٹکے لفظوں کی
طرف دل کش کرنے سے تیز رہا تھا مگر لفظ کشش
فعل سے بھی زیادہ تیزی سے اسے اپنی طرف کھینچتے
چلے گئے۔

تحریر میں تذکرہ تھا افسانہ نگار کا جو مصور بھی تھا۔
جو خود خاموش تھا مگر اس کے رنگ بولتے تھے۔ یہاں
تک کہ اس کے رنگوں نے زندگی پائی۔ ایک ایسے اس
کی زندگی کے کیوں بر مسرت بن کر سمٹ آئی مگر یہ سر
خوشی زیادہ دیر کے لئے نہ تھی۔ دھواں بن کر مسرت اڑ
گئی تو راکھ بن گئی۔ وہ اس راکھ سے لفظ بنانے لگاڑنے
لگا۔ تب بس اچانک وہ مڑا ہوا شخص پھر سے جی اٹھا۔
زندگی ترنگ میں دھل گئی۔ پھر اچانک جانے لگا ہوا وہ
لفظوں کا بھاؤ مول کرنے والا بخارا، وہ جوگی اندر رہی
اندر پھر سے مر گیا۔ جیتا تو وہ پہلے نجی نہ تھا مگر نظر کے
سامنے تو تھا۔ سو مر گیا تو ایک تصویر نکلی۔ ایک نامکمل
تصویر۔ سوال کرنے والے نے پوچھا۔

”مصنف کیا مصور بھی تھا؟“
جواب دینے والے خاموش گھرنے لگا۔
”مصنف لفظوں سے بت کر رہی ہی تو کرتا ہے۔“
یوں زندگی اور لپ ہوئی اور منظر بھی بدل گیا۔
خاموش گھر میں رنگ شامی پرندوں کی طرح چچھمانے
لگے۔ زندگی نے پوچھا۔

”یہ کون بت ہے جس کو تراش رہے ہو۔“
مصنف نے کہا۔ ”یہی تو راز ہے جسے صرف وہی
سمجھ سکتا ہے جو یہ ہے مگر زندگی سنو۔ تم نے کبھی کسی
جج کو آخری فیصلہ سناتے ہوئے دیکھا ہے۔“
زندگی نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔ مصنف جج ایسے ہر
فیصلے کے بعد اپنا قلم توڑ دیتا ہے۔“ تو مصنف مسکرایا
پھر بولا۔

”مس زندگی سمجھو یہ بھی میری زندگی کی آخری
تصویر ہے۔ میں نے وعدہ کیا ہے کسی کی ہنسی پیٹ
کرنے کا۔ لفظ میری ملکیت سہی لیکن حیات۔ فانی
لفظوں میں وہ رچاؤ نزاکت کہاں جو میں مسکراہٹ پر
کچھ لکھوں۔ یہ مسکراہٹ صرف دھنک رنگوں سے
ہی پور پورے کی جاسکتی ہے۔ تم دیکھنا جب یہ تصویر
مکمل ہوگی تو مسیحا کی کاروب دھارے کی۔ ان کسی کی
طرح، ان کھلی مسکراہٹ کا بھی ایک اثر ہوتا ہے۔
سوچ اور اطمینان کا اچھوتا کسی نیشن مسکراہٹ بھی اور
مسکراہٹ چھپا بھی لیتا، حسن ہے زندگی کا نایاب

حسن۔

زندگی ہنس پڑی۔ پھر رسول بعد جب مصنف کا کمرہ کھولا گیا تو دروازے پر دو عکس تھے۔ ایک وہ جو تصویر میں مجسم تھا۔ ایک عکس وہ تھا جو تصویر میں کیس نہیں تھا مگر مصنف کے دن و رات اسی کے تابع تھے کپکپاتے ہوئے دو عکس اور کیس بیچ میں مصنف کا وجود۔

کمانی یہاں تھم گئی تھی۔ راوی چپ کھڑا تھا اور جوہی کی سائیں رکنے لگی تھیں اور کیس قریب مسٹر عارف صہبائی مول سے بیٹھتے تھے۔

”کبھی کبھی ہمارا دل چاہتا ہے۔ مس جوہی! ہم صرف اپنا دکھ لکھیں۔ شام الم کا قصہ چھیڑیں۔ بین کریں اور سب لوگ ہمیں ساکت دم سا دھم دیکھتے چلے جائیں اور کہیں یہ کمانی واقعی ان میں سے کسی کی نہیں یہ بتی کسی اور ہی پر بیتی ہے اور وہ راسخ کے سوا کون ہو سکتا ہے۔“

اس نے ساتتیں بصارت کے ہم رکاب کر دیں تو پڑھا۔

اور پھر دو عکس ڈبائے آنسوؤں کی طرح کپکپاتے رہے۔ کمرے میں ہر طرف چالے ہی چالے تھے۔ ان کے حرفوں کے ”ان کے خوابوں کے چالے اور بیچ کر کے دل لٹا تھا۔ بجھا ہوا راکھ شدہ۔ ایک عکس نے اس راکھ کو پلوں میں باندھا اور ایک عکس وہیں دل کی تڑپ بنا کر بیٹھ گیا۔ اسے گزرا تو خاموش کمرے نے کہا۔

”مے عکس دل! تمہیں پتا ہے یہ مصنف کیوں مرا؟“ عکس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”نہیں۔“ دل کے گنبد سے صدا ابھری تو کمرے میں کبھی ٹوٹی سانسوں کے تانے بانے آپس میں الجھنے لگے اور تنہائی نے کہا۔

”یہ شخص صرف اس لئے مر گیا کہ تمام عمراس نے اس سے محبت کی جس سے نفرت کرتا رہا اور تمام عمر اس عکس کی بے مری کا شکار رہا جسے پوجتا رہا۔ اس وقت سے جب وہ عکس ابھر کر کسی سانچے میں بھی نہیں ڈھلا تھا۔ سنو یہ نامکمل ادھ کلی مسکراہٹ پر

ثبت ہونٹ دیکھو کس کے ہیں ہاں صرف تمہارے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔ وہ مصنف لفظوں کا یو پارے تھا۔ سو اگر تھا۔“

”سو اگر مگر محبت رکھنے والا۔ تمہیں پتا ہے اس نے تمام عمراس عکس کو کیوں چاہا جس سے نفرت کرتا رہا۔“

خاموش سائیں سائیں عکس ڈولنے لگا تو خاموشی نے اس عکس کا ہاتھ تھام لیا پھر کہا۔

”تم اسے ازیت پسندی کہہ سکتے ہو مگر جس نے لمحہ ازیت گاہ میں گزارا ہو۔ اس کے لئے تو ازیت ہی نشہ و سرور بن جاتی ہے پھر جب مطمح نظر انتقام لینا ہو یہ ازیت تو اور بھی دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ وہ عکس تمام عمراس محرومی کا شکار رہا۔ اچانک اک حادثہ کے سبب ہی سہی اس کا احساس محرومی ختم ہونے

دن آنیچے تو اسے عجیب سا لگا۔ اسے یہ عجیب لگنا ہی چاہئے تھا۔ اس شخص کی طرح جس کے ہاتھوں میں آنے آتے شدت پیاس سے جام چھوٹ جاتے تو

آنسو ہی نقش کشی مٹا دینے کا سبب بن جاتیں۔ یہ الٹی دو سرانام نقش کشی ہو جائے تو یہ انہوئی تو نہیں اس نے بھی سوچا جو ماہ و سال خشک بن کر گزر گئے۔ ان کا حساب نہیں لیا جاسکتا مگر جو خوشیاں چھین گئیں۔ ان کا انتقام جاسکتا ہے۔ بس نہیں سے اس نے غور سے عکس مگر حادثے سے مول چرے کے حسد کو جھٹلا

ہوئے اس چہرے کی ازیت بڑھانے کو کہا۔ ”میں زندگی میں صرف جس لڑکی کو چاہا وہ تم ہی تو ہو۔ سو میری جیب میں ہی نہیں میرے دل میں بھی تمہارا ہی تصویر ثبت ہے۔“

نامکمل تصویر کی آنکھوں میں آنسو ابرائے مگر نے نظریں موڑ لیں۔ سینے میں نہیں اچھی مگر وہاں سر جھکائے عکس نے نامکمل تصویر کو دیکھا

نامحسوس بندھن میں بندھے ہاتھوں کو اور مصنف تھا جسے اپنی محبت کا یقین دلایا تھا

آنکھوں سے دیکھتا ہوا۔

”یہ محبت کی انتہا ہے کہ میں نے تمہیں چاہا مگر

تمہارے لئے خار نہیں بچھائے۔“

دوسرا عکس تڑپ کر سامنے آگیا۔ مصنف سے ہٹنے لگا لڑنے لڑنے تھک گیا تو دیکھا۔ مصنف بے دم سا اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ مگر چھائے ہوئے

دل کی طرح دونوں عکس باہم اس کے گرد کھڑے تھے جیسے کسی موڑ پر جدا ہوتے ہوئے دل۔ تنہائی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور کھلی آنکھوں میں پیاس

و میدی کھول رہا تھا۔

محبت یا کر بھی تشنہ کام رہنا اور مرجانا عام تحریروں کا انتقام تو نہیں تھا مگر یہ انتقام ہو گیا تھا اور وقت یہ وہی طرح بین کر رہا تھا۔ محبت کی قسمت پر اپنی قسم

لکھ لکھوں پرا مصنف کی حوالہ نصیبی پر کچھ بھائی دیتا تھا سوائے آپوں سسکیوں کے اور یہی آپیں سسکیاں ہی تو محبت کا مراد و سوغاتیں ہیں۔

جوہی پڑھتے پڑھتے تھک گئی۔ روئے لگی۔ وقت کی طرح پھر روتے روتے سنبھلی بھی نہ تھی کہ فون کی تیل

اٹھی اس نے ریسیو کیا تو دوسری طرف کوئی اس کی طرح آہنا ہوا تھا۔

”ہیلو کون ہیں آپ۔“

”کوئی نہیں یا شاید کچھ ہوئے ہی کا زعم تھا مگر یہ زعم غور آج ٹوٹ گیا جوہی تمام عمر میں کہتی رہی ”میں

ہوں“ عارف نہیں ہونے کا ہمیں بھرے رہے اب نہیں ہیں تو لگتا ہے۔ حاوی ہیں اور میں ہونے

دے بھی لگتا ہے۔ نہیں ہوں۔ جوہی! تمام عمر میں نے ان کی کوئی تحریر نہیں پڑھی مجھے لگتا تھا۔ وہ وقت

بہاد کر رہے ہیں۔ مجھ سے بھاگنے کے لئے قلم کاغذ کا مارا لیتے ہیں۔ بس اسی حسد میں نے ہمیشہ انہیں

اور ان کی تحریروں کو نظر انداز کیا مگر آج یہ آخری تحریر کہ سوچتی ہوں۔ کاش میں اپنے ارادہ میں ہی اٹل

ہوتی تاکہ اس گمان میں تو ہوئی کہ عارف کی جیب ہی میں دل میں بھی میری ہی تصویر نقش ہے مگر اب گمان یہ بھلا وہ بھی کہاں جوہی آج مجھے رونا آ رہا

میرا دل چاہتا ہے میں مسندوں روؤں۔ عارف نے ملنے والی محبت پر اپنے زعم پر۔ حسد تمہاری

الی پر۔ عارف کے دل میں تمہارے مقام پر۔ خود

پر۔ ان گول گوتھنے سے بچوں پر جنھوں نے میری رقابت سے روٹھ کر دنیا میں آنے کو فضول سمجھا آرزو

جب تک آرزو رہے۔ تسلی رہتی ہے لیکن جوہی! آرزو حقیقت کا روپ دھارنے کے بعد چھین لی جائے

تو ازیت بن جاتی ہے۔ عارف نے جتنا کرب، جتنی ازیت سہی۔ آج مجھ میں وہ ازیت دو آتشہ ہے۔

جوہی! تم یہ ازیت سوچ سکتی ہو۔“

یہ سخت کہتے کتے ریسیور سے سسکیاں، ہچکیاں گونجنے لگیں۔ وہ دلاسا دینا چاہتی تھی مگر اس نے زیادہ

جھا جوں رونے لگی۔ شامی کسی کام سے آیا تو حیران رہ گیا۔

”جوہی! تم پھر رو رہی ہو۔“


جوہی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر بڑھائی۔ ”کوئی موسم ہو وصل و جگر کا۔ دل والوں کے لئے ایک موسم ہے۔“

آنسو بے تحاشا سسکیاں۔ کہتے کہتے شامی کو پھر سے دیکھا پھر بیانی سے انداز سے بولی۔

”شامی! یہ محبت کا نول وہیں کیوں کھلتا ہے جہاں آنسوؤں کا پانی رہتا ہے۔“ شامی کیا کہتا۔ چپ کا چپ

رہ گیا اور وقت اس سے اس سے کہیں زیادہ خاموش تھا۔

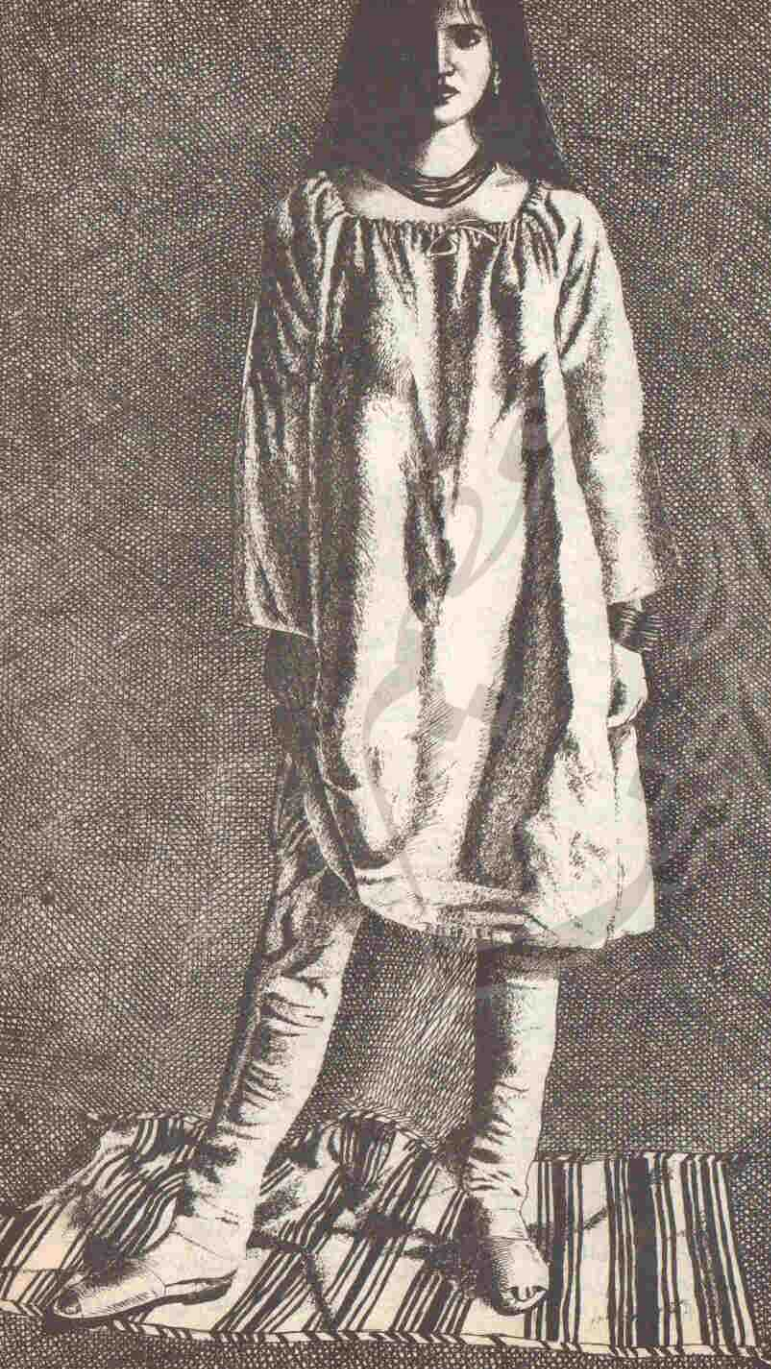
~~*



کیا آپ کے بال گر رہے ہیں؟
بیوفی بکس کی ٹیبلٹ کرنا
سو فی ستر آمل
سو فی ستر آمل
بیوفی بکس
بیوفی بکس

کڑی ہوئی کیسے

مکمل ناول



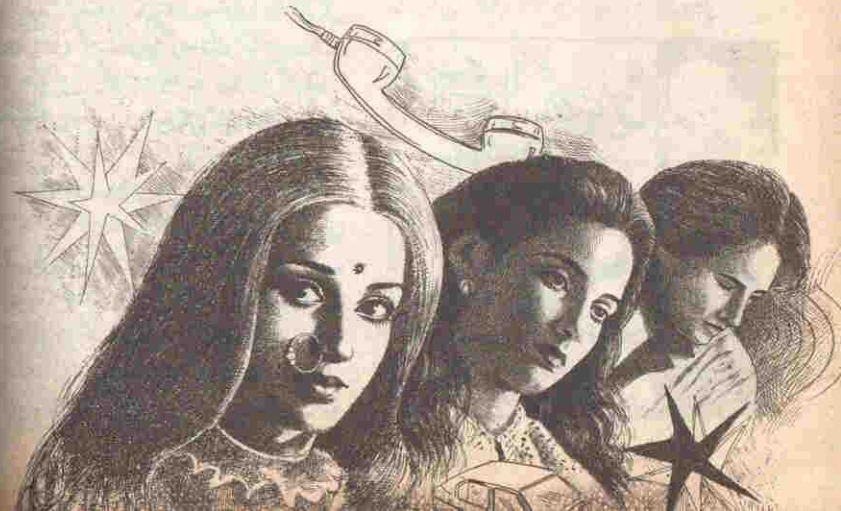
دیدار نصیب ہوا تھا کوفت اور بے زاری محسوس سمیت
مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ ایٹ جو گرز جو کہ باوجود سہمی
حاصل کے حد درجے گندے اور مہلے ہو چکے تھے
اب اس کی احتیاط کے زمرے سے نکل چکے تھے لہذا
جہاں اور جدھر پاؤں پڑا وہ تیز تیز قدم اٹھاتی "نور
منزل" کی طرف بڑھ آئی۔

ابھی بیل دینے کا قصد کر رہی رہی تھی کہ عقب سے
ذکی کی کار کا ہارن سن کر بے ساختہ ہلٹ کر دیکھا وہیل
ایئر کنڈیشنڈ کار میں بیٹھا کھڑکیوں کے شیشے چڑھائے وہ
شاید موسم انجوائے کرتا آیا تھا جب ہی اتنا فریڈش لگ
رہا تھا۔ اس نے گردن موڑتے ہوئے لاشعوری طور پر
بھیگے دوپٹے کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا۔

"ارے عطش! تم ابھی پانی ہو۔ مجھے پتا ہوتا

گھر پہنچے پہنچتے وہ کافی سے زیادہ بیگ چکی تھی۔ سفید
جینز کے پانچے سڑکوں پر پھیلے بے تماشائی پانی کے
چھینٹوں سے گندے ہو کر اس کی طبع نفس پر بڑے
گراں گزر رہے تھے مگر موسم کی مسکرائشیں اور
خرمستیاں کسی بھی احتیاطی تدبیر کرنے سے پہلے اسے
زیر کر چکی تھیں۔ عنانی کرتے اور بڑے سے چادر نما
دوپٹے نے بھی بھیک کر اپنا وزن دگنا کر لیا تھا۔ شولڈر
بیگ کو پولیستھین سے کور کرنے کے باوجود انک پین
سے لکھے ہوئے نوٹس کے خراب ہو جانے کا خدشہ
اسے حد درجے متشکر کر گیا۔

موسم کا مزہ وہ کیا خاک لیتی کہ آج کو بھیس نہ ملنے
کے باعث جتنی دقت اور دشواری اٹھانے کے بعد
اسے نور منزل کے سفید گیٹ کا دوفر لاٹنگ فاصلے سے



تھیں یونیورسٹی سے یک کر لیتا۔ اسے دیکھ کر ذکی نے شیشہ اڑاتے ہوئے کہا تھا۔

جھانکوں مہینوں برس رہا تھا کہ جیسے آج کے بعد ہر سے گا ہی نہیں سواس تک ذکی کی آواز بہت ہلکی آتی تھی۔ جواباً وہ محض سر کو خفیف سی جنبش دے کر رہ گئی۔

اس اثناء میں گیٹ بھی کھل چکا تھا۔ ذکی اس سے پہلے ہی کار اندر بے گیا تو وہ بھی رنج سبھ قدم اٹھائی لان گرا اس کر کے لاؤنج کے مرکزی دروازے پر آکر رک

گئی۔ شیراں گیٹ بند کر کے پانی میں تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنے کوارٹر میں چلی گئی تھی۔

اس نے دوشہ کا آچل اور کرتے کا واسن ہاتھ سے نچوڑا اور جو گرز وہیں اتار کر پھینکے ننگے پیروں سے اندر چلی آئی۔ لاؤنج میں حسب معمول اک شور مچا ہوا تھا۔

عجبی لان کی طرف والی گلاس وال سے گرتی رم جھم کا مزہ لینے تقریباً سب ہی وہاں موجود تھے۔ کوئی صوفے پر تو کوئی کارپٹ پر براجمان نہی ٹھٹھے میں مصوف تھا۔ وہ اپنی موجودگی کا ٹوس نہ لے جانے کے باعث خود بھی کسی کو مخاطب کیے بغیر بچی اماں والے پورشن کی طرف چلی آئی۔ شوڈر بیک میں رکے ہوئے ٹوس کی اس حد تک فکر بھی اسے کہ جلتے جلتے ہی اس نے انہیں نکال کر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ الٹ چلت کر اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس کی تسلی ہوئی تو وہ گھروں کے آگے بنے ہوئے اس چھوٹے سے لونگ روم میں آگئی جہاں مریم حسب معمول کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی تھی۔ ان جی بھی کھڑکیاں کھولے بارش کی ہلکی ہلکی ہواؤں سے لطف اندوز ہوتی وہ کسی کمرے کی تریابی میں مصروف تھی۔

”سلام علیکم آئی۔“ مریم کے پاس تخت پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے اس نے سلام کیا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

”وعلیکم اسلام۔ آج بہت دیر کردی عیش اداوی پوچھ رہی تھیں تمہیں۔“

”جی بس اس بارش نے پراہم کردی تھی۔ کوئی نہ ملنے کے باعث یونیورسٹی سے پیدل آ رہی ہوں۔ شدید تھکن کے باعث دوپہر تھیں پر لیٹ گئی۔“
”ہائے اللہ۔ تم اتنی دور سے پیدل آ رہی ہو۔“
مریم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر بے حد تردد اور ناگہ سے اسے دیکھا اور پھر فوراً ہاتھ پکڑ کر بغض دیکھی اس کی تشویش بجا تھی کہ اتنی تیز بارش کی بوچھاڑ اسے اتنی دور سے بھیجتی آ رہی تھی۔
”تم کوئی رکشہ کر لینیں عیش! اس طرح اتنی دور پیدل چلی ہو۔“

مریم کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی، لہجے میں رقت اور دکھ شامل تھا وہ کچھ سہا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا منہ مریم کو پریشان کرنا تو ہرگز نہ تھا وہ ٹوس یوں ہی کہہ رہی تھی۔

”کنوینس کوئی مل نہیں رہی تھی آئی اس لیے ناہا مجھے پیدل آنا پڑا۔ جبکہ یوں اور پکینوں میں اس حلے میں سوار ہو نہیں سکتی تھی۔“
اس نے اپنے پھیلے پیروں کی طرف اشارہ کیا تو مریم فوراً ”جوگی۔“

”تو تم اب تک یہ کیلے پڑے بنے بیٹھی ہو۔ جانا کرک کرک کہیں نہیں چرچنے ہو جائے۔ اور فوراً ”چکن“ آؤ۔ میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتی ہوں۔“
ایک طرف رکھ کر مستعدی سے اٹھتے ہوئے مریم فوراً ”حکیمہ انداز اختیار کیا۔“

”نہیں آئی! کھانے کا اب وقت نہیں رہا۔“ آپ معلوم ہے کہ میں عصر کے بعد کچھ کھانے کی عادی نہیں ہوں۔ ہاں البتہ اگر کافی مل جائے تو بڑا احسان ہو گا۔“

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی جو کہ بارش کے طفیل ہو چکی تھی اور وال ہلاک دیکھتے ہوئے کھانے کے سہولت سے انکار کر کے کافی کی فرمائش اس کا تکلف سے کی کہ مریم جاتے جاتے رک گئی۔

”حسن کی کیا بات ہے عیش! یہ تمہارا کمرہ حق ہے تمہارا اس پر تم خود کو ہم سے الگ کر رہی تھو۔“ بڑے گلہ آمیز انداز میں مریم نے کہا تھا

وہ نام ہی ہو گئی تو ہلکے سے مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور مریم کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”میں ہرگز بھی خود کو آپ سے الگ نہیں سمجھتی۔ میں الگ ہوں بھی نہیں۔ میرا آپ کا خون ایک والدین ایک ہیں۔ پھر بھلا میں کس طرح یہ سوچ سکتی ہوں۔“

اس کے لہجے میں یقین اور مضبوطی تھی، مریم نے اس کی گہری آنکھوں میں جھانکا جن کی نیلا ہٹوں میں رنج اور جھٹلانہ سکی تو نرمی سے مسکرا دی۔

”اچھا تم کپڑے بدل لو چاہو تو شاور لے لو اور پکین میں کافی تیار کرتی ہوں۔“ اس کے محبت سے لہجے میں اس نے میکانیکی انداز میں گردن اثبات میں دالی اور ٹوس والا بیک متاع عزیز کی مانند سنبھالتی ہوئی کمرے کی جانب بڑھ گئی جو کہ مریم اور اس کا مشترکہ تھا۔

”پتا نہیں کب جذب ہو گی تم اس ماحول میں عیش؟“

مریم خود سے سوال جواب کرتی کمرے سے باہر آئی اور لانچ سے گزر کر پکین میں جانے کا ارادہ تھا کہ دستے میں سمجھ بھائی نے روک لیا۔

”عیش! آئی یونیورسٹی سے؟“ ان کے سوال میں اس نے زیادہ کرید تھی۔

”جی ہاں۔“

”اچھا۔ تو پھر اداوی جان کی طرف بھیج دو۔ وہ ہمارے ہی اس۔“

اس کے مختصر ”کہہ کر خاموش ہو جانے پر انہوں نے آتے ہوئے انداز میں ننھے اشعر کا ہاتھ تھاما اور اسے بڑھ گئیں۔

”کیا ہوا عیش! صاحبہ کہاں گئیں۔ کیا اب تک کمرے سے باہر نہیں نکلیں محترمہ؟“ ذکی نے دور سے لہجے میں ہانک لگائی تھی۔

”ہاں وہ ذرا چپچپ کرنے لگی ہوئی ہے۔“ مریم راسیت سے جواب دیتی وہیں صوفے پر آ بیٹھی اصل میں تھک بھی تو بہت تھی ہے۔ بارش کے

باعث کنوینس نہ ملی تو یونیورسٹی سے ہی پیدل آئی ہے۔“

”اوہ۔“ ذرا کی ذرا لاؤنج میں موجود افراد کے چہروں پر تاسف لہرایا۔

”تو تو ضرور۔“ کیا تھی اس قدر خراب موسم میں گھر سے نکلنے کی۔“ تاکی اماں نے گرمی کی شدت اور جس سے گھبرا کر دوشہ جھٹلتے ہوئے ناک بھونچ رہا تھا۔

”بڑھائی بھی تو کرنی ہوتی ہے اماں جانی۔“ صدف نے مستخر سے کرہ لگائی۔

”اے میں کہتی ہوں مار پڑے ایسی بڑھائی پر کہ لڑکیاں دیدہ ہوائی ہو جائیں۔“ صدف کی بات پر وہ

قدرے چپ کر بولی تھیں۔ وہ اپنی بات کے جواب پر دوسرے سے ہنس پڑی۔

مریم کا دل ”تور منیل“ کے مکینوں کی ان باتوں پر سلگ کر رہ جاتا تھا مگر کسی سے کچھ کہنے کی اس کی خیال نہیں تھی کہ یہاں جرات اطہار کی بڑی کڑی سزا مقرر کر رکھی تھی سب نے۔

”دیدہ ہوائی کی تو خبر نہیں البتہ مزاج کی تیزی کسی طور کم نہیں ہوتی اس کی نہ کسی سے بات نہ چیت نہ سلام نہ دعا نہ اٹھائے گھر میں داخل ہوئیں اور فوراً اپنے کمرے کی راہ لی۔“ سحر بھابی اپنے کمرے سے جانے کس کام کے لیے دوبارہ تشریف لا چکی تھیں۔

”اور کیا ابھی یہاں سے گزری مگر مجال ہے کہ کسی بڑے کو سلام کیا ہو۔“

تاکی اماں نے جھٹ مبالغے سے کام لیا ورنہ جس لمحے وہ اندر آئی تھی صرف سحر بھابی اور مہ دوش کے ساتھ انعم اور کاشان ہی بیٹھے تھے یہاں۔ ایچو میں ذکی بھی آگیا تھا مگر اس وقت تک وہ اندر جا چکی تھی مگر تاکی اماں کو تو موقع ملا تھا اس کی خود سری اور بے ادب طبیعت کو کوئے کا۔

”صل میں وہ بارش میں بھیجتی آئی تھی۔ شاید تھکن کے باعث آپ پر نظر نہ پڑی ہو۔“ مریم نے مجرمانہ انداز میں لجاجت سے عذر پیش کیا۔

”تو کیا آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی بارش نے۔“ گھر

تک تو جلی آئیں اور یلینوں کے لیے بصارت جواب دے گئی۔ ”صدف نے کسی کے بھی بولنے سے پہلے زہر خند لہجے میں کہا۔
 ”رے میں نے کہا ضرورت ہی کیا تھی اس سخت بارش میں موٹی یونیورسٹی جانے کی۔“ تالی اماں کی سسکی گھوم کر وہی آئی تھی۔
 ”صبح موسم اتنا خراب نہیں تھا اماں جانی۔“ انعم شاید بچن سے برآمد ہوا تھا۔ بڑے مزے سے بولتا ہوا ان کے قریب آ کر۔ تالی اماں نے چشمیں لگا ہوں سے اسے گھورا تو اس نے کچھ شٹا کر ذکی کی طرف دیکھا آنکھوں میں استفہام درج تھا۔
 ”اماں جانی کو تمہارا موسمیاتی خبرنامہ کچھ پسند نہیں آیا“ ذکی تھا تھا۔

مریم نے تاسف سے سر جھٹکتے ہوئے اٹھ جانے میں ہی عافیت جانی کیونکہ اب تالی اماں اپنی اولادوں کے ساتھ مل کر مزید کئی گھنٹے ہی پروگرام نشر کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں جبکہ اس کے اندر اتنا عمل نہیں تھا کہ مزید سنی۔
 کیلے بال تو لیے میں لیٹے بچن میں آگئی تھی۔ شاید لاؤنج سے گزرتے ہوئے ”رواں بھرے“ کا کچھ حصہ اس کے کانوں میں بھی پڑ گیا تھا لہذا خاموشی کے ساتھ ساتھ چہرے پر ناگواری کے تاثرات بھی درج تھے۔ مریم نے جانتے ہوئے بھی اس سے کچھ نہ پوچھا اور کافی ٹائم بعد اسٹینکس اس کی طرف بڑھا دیا۔
 ”تو تھیںکس آبی میں اسٹینکس وغیرہ شوق سے نہیں کھاتی۔“ صرف کپ اٹھاتے ہوئے اس نے کہا اور بارہنکے لگی تھی کہ وادی جان چلی آئیں۔
 ”بیٹا! آج اتنی دیر کروی تم نے خبر بھی ہے کہ کس قدر پریشان تھی میں۔“ وہ اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے مختصراً ”تاخیر کا جواز پیش کیا۔“
 ”چلو وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھ سے آکر مل تو لیتیں۔“ کب سے بھیجا تھا میں نے سحر ابن کو۔“
 انہیں شاید زیادہ قلق اسی بات کا تھا کہ اس نے اگر ان کی قدم بوسی نہیں کی تھی۔ بڑے گول کمرے

میں ہر آنے والے کی حاضری لگنی ضرور سمجھی جاتی تھی۔
 ”جی بس مجھے خیال نہیں رہا کہ آپ کو سلام کر آؤں۔“ اس نے ہیشہ کے شہرے ہوئے مسجدہ میں کہا تو وادی جان کے ماتھے کی شانیں دگنی ہو گئیں۔
 ”ہاں جی! اب بڑوں کی اتنی اہمیت ہی کہاں کر انہیں دو انگلیوں کا سلام جھانڈا جائے۔ گھر آگئیں نظر پڑنے پر بات کا جواب دے دیا۔ کچھ کم احسان نہیں ہے۔“ وادی جان حسب توقع بڑی جگزی تھیں۔ حد طے اور خفگی سے بولیں۔
 ”عطش بری طرح کبیدہ ہو کر رہ گئی۔“
 ”کیا ہو جانا عطش! تو تم یہ کہہ دیتیں کہ میں آپ سلام کرنے ہی آ رہی تھی وادی جان۔“

وادی جان کے وہاں سے جاتے ہی مریم نے اسے کمرے میں اپنے ساتھ لاتے ہوئے شکایتی انداز میں کہا تو اس نے یونہی ذرا سا گردن کو خم دے کر مریم دیکھا۔
 ”مگر یہ تو غلط بات تھی نا، آبی میں حقیقتاً“ اس طرف جانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی پھر بھلا جھوٹ کیوں بولتی۔“ اس کے لہجے میں تعجب کے بجائے محض استفسار تھا۔
 ”یہ جھوٹ نہیں ہوتا عطش! اخلاق بھی کوئی ہوتی ہے کڑیا۔ آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔“
 ”مگر میں اسے منافقت کہتی ہوں۔“ اس نے خالی کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔
 ”منافقت اور موت کو ایک ترازو میں نہیں تو عطش۔“ مریم کا انداز نا سحانہ تھا۔ ”بعض معاملات موت کے متقاضی ہوتے ہیں۔“
 ”میرا مقصد کسی کو ہرٹ کرنا نہیں ہوتا آبی! جب دل میں کسی کے لیے جگہ ہوئی نہیں تو کیا اسے یہ یاد رکھاؤں کہ میں اس کے لیے سو فیصد رکھتی ہوں۔ یہ تو دھوکا ہے۔“
 ”تو جانو! میں نے جب کہا ہے کہ تم کسی کو دھوکا نہ دینا۔“
 ”نمازشی محبت کی تو میں بھی قائل نہیں مگر یہ کہ

بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں اہمیت دی جائے۔ ہمیں نور منزل کے ماحول اور یلینوں کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے عطش! کہ اب یہی تمہارا گھر ہے۔ تمہیں یہیں رہنا ہے۔“
 بہت دیر اس کے ماتھے پر آئی ٹپیں ہلاتے ہوئے مریم نے حلاوت سے سمجھایا تو وہ اس کے شفیق لہجے پر ڈار ہوئی نظروں سے دیکھتی اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔
 ”میں نے قریب کسی کو آنے تو دیا۔ تم دیکھو گی سب لوگ تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ یہ گھر جس میں ابو کی جڑیں ہیں یہاں کے لوگ سب تمہیں پیار کریں گے۔ تم آگے تو بڑھو۔“

بالوں میں گردش کرتی انگلیاں اسے عجیب طمانیت بخش رہی تھیں۔ ٹھکن اور بے آرامی کے باعث بہت جلد وہ غنڈہ کی وادی میں کھو گئی۔ مریم کی کوئی بھی بات اس کی سماعت کی کہیں نہ بن سکی تھی۔
 ایسے لاؤ تو اس کے ماما بھی نہیں اٹھاتی تھیں جتنی کہ مریم کی شفیق طبیعت اس کے خیرے سستی تھی شاید خون کی کشش ہی ایسی ہوتی ہے۔ وہ جب بھی چٹھیوں میں وادی کے یہاں آتی تھی۔ مریم سے ایسے ہی محبتیں وصول کرتی۔
 ”تو یہ تو سو بھی گئی۔“ مریم نے اس کی خاموشی پر چونک کر اس کی جانب نگاہ کی اور مسکرا دی۔ اور تخت پر رکھے ٹیکے کو بھیج کر اس کے سر کے نیچے رکھا اور نماز کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عصر کا وقت نکلا جا رہا تھا۔
 کھر کیوں کے اس طرف کا منظر بہت بھلا تھا۔ بارش سے دھل کر ہر شے ٹھہر گئی تھی۔ رم جھم جھم چکی تھی مگر ابھی تک سورج کو بادلوں نے چھپا رکھا تھا۔ اک آدھ بجی سی کرن بادلوں کا سینہ چیر کر نکل بھی آتی تو جلد ہی کوئی بدلی اسے ڈھانپ دیتی۔
 ”بیلو بیلو۔“ باہر سے شور سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ کوئی آیا ہوا ہے جس کی قصد بق شاہ میر کی آواز نے کردی تھی۔ وہ سلام پھیر چکی تھی فوراً ”پلٹ کر دیکھا۔“ شاہ میر دروازے میں ہی کھڑا تھا اتنے دنوں بعد اسے

دیکھا تو بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی سے خوشی کا اظہار ہو گیا۔
 ”شہابی تم۔ بغیر اطلاع دیے آئے ہو۔“ وہ کتنی خوش لگ رہی تھی۔
 ”بس سوچا تمہیں خوش کر دوں! ایک اکلوتی تو بہن ہو میری۔“ اپنا مضبوط بازو اس کے شانوں پر پھیلاتے ہوئے وہ بہت چاہ سے بولا تھا۔ مریم تو اس کی اس بات پر سوچاں سے فدا ہوئے کو تیار تھی۔ بے تحاشا مسرت سے چمکتی نگاہوں سے اسے دیکھا، دل ہی دل میں اس کی ہلا سں لے ڈالیں۔
 ”مہی کہاں ہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔
 ”خالہ جان کی طرف گئی ہوئی ہیں صبح سے۔“
 ”تھے خراب موسم میں۔“ اسے کچھ حیرت ہوئی۔
 ”اگ ہو کر تخت کی طرف بڑھنے لگا مگر سامنے ٹینڈ کی وادی میں کھوئی عطش پر نگاہ پڑی تو وہیں رک گیا۔“
 ”ہاں! اصل میں وہ کئی دن سے بلا رہی تھیں۔ آصف آئے تھے اسیں لینے۔“ اس نے نگاہیں

جھکائے جھکائے جواب دیا تو شاہی نے نظریں بمشکل غطش سے ہٹائیں۔
”اور تمہیں لینے کب آرہی ہیں وہ؟؟“ شگفتہ موڈ میں کہتے ہوئے وہ صوفے پر جا بیٹھا اور شوز اتارتے ہوئے شوشی سے اسے دیکھا۔
”یکومت۔“ اس نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا تھا وہ ہنسنے لگا۔
”کھانا کھاؤ گے؟“

”نہیں۔“ بی الحال موڈ نہیں۔ چائے پلواد۔ موش سے کہہ کر بنو آج اس کے ہاتھ میں پلواد لٹھ ہے۔“
یا کٹ پونفام میں وہ اسے بیشہ نظر لگ جانے کی حد تک اچھا لگتا تھا۔ اس وقت بھی بے فکری سے بولتا وہ اسے یکدم بہت اچھا لگا تو نظر چرا کر وہ اچھا کتنی موش کی تلاش میں نکل پڑی۔

مریم کے قدم باہر نکلتے ہی دوبارہ اس کی نظریں سامنے تخت پر سوتی ہوئی غطش کا احاطہ کر گئیں۔ لیکن کمر کے سادہ سے بلی کرہائی والے سوٹ میں ملیوں گھٹی پلکیں رخساروں پر بچھائے سوتی ہوئی وہ اس قافل موسم کا سارا حسن چرائے ہوئے لگ رہی تھی۔
شاہ میر کا دل بے اختیار کچھ لنگھانے کو چاہنے لگا تھا مگر یہ سلسلہ کچھ زیادہ طویل نہ پڑا۔ تاکہ امی کی آمد کے ساتھ ہی کاشان اور الغم بھی اسے ڈھونڈتے چلے آئے تھے۔ ان کی فرمائشی لٹ کا سارا سامان وہ لے آیا تھا لہذا وہ کھینچ کھانچ کر اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

* * *

”یہ شاہی لایا ہے تمہارے لیے۔“ کتنا پیارا ہے نا۔“

دوسرے دن بھی موسم کی جولانیاں اپنے عروج پر تھیں لہذا اس نے یونیورسٹی جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے صبح کے ناشے کی تیاری میں سحر بھاگھی اور مریم کا ساتھ دیا اور اب اگر اپنے کمرے میں بیٹھ کر کچھ پڑھنے کا ارادہ کر رہی رہی تھی کہ مریم جانے کیا کیا اٹھا کر اس کے پاس چلی آئی۔

مریم کی شادی کے خیال سے کافی کچھ چچی اماں نے

شاہی نے منگوا یا ہوا تھا، کچھ کپڑے اور کچھ گھریلو مشینری تھی جس کے لیے انہوں نے باقاعدہ اس لٹ بنا کر دی تھی۔
تمام چیزیں دکھانے کے بعد ایک بہت حسین اور نفیس سائیٹ اس نے غطش کی طرف بڑھایا تو وہ متعجب سی رہ گئی۔

”میرے لیے؟“ آنکھوں میں استفہام تحریر تھا۔
حیرت بجا تھی کہ آج تک ”تور منزل“ کے مکینوں کے لیے وہ تو بہت کچھ لائی رہی تھی مگر یہاں سے اسے کبھی کچھ نہیں ملا تھا حتیٰ کہ پیار محبت بھی نہیں حق رشتے کا اعزاز بھی نہیں۔

”ہاں اور نہیں تو کیا۔“ مریم نے نظریں چرا لیں۔
اور وہ اتنی نا سمجھ تو نہ تھی کہ مریم کی آنکھوں سے جھانکتی چٹکی کھائی حقیقت کو سمجھ نہ پائی یقیناً ”شاہی“ سیٹ مریم کے لیے لی لایا تھا جسے وہ اس کے نام سے کہہ کر دے رہی تھی۔

”نہیں آئی! یہ آپ کے لیے آیا ہے۔“ آپ ہی رکھیں۔“ مریم نے استعجاب میں گھڑتے ہوئے اسے پیشانی سے دیکھا۔ مگر وہ بیوشہ کے لارواہ انداز میں کہہ رہی تھی۔
”مجھے تو یوں بھی چو لری کا شوق نہیں۔“ ماما کے کتے گولڈ کے سیٹ رکھے ہیں۔ مجھے ان چیزوں کی چاہ کبھی نہیں رہی۔۔۔ اور ویسے بھی مجھے جانا ہی کہاں ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں کو استعمال کر سکوں۔“

”غطش! اوہ۔“ مریم نے بہت نادم ہو کر کچھ کہنا چاہا مگر اس نے وضع داری بھلاتے ہوئے اسے روک دیا۔
”آپ اسے اپنے چیز میں لے جائیے گا۔ یقیناً“ آصف بھائی کو پھن کر دکھا میں کی تو وہ ایک عالم بھول جائیں گے۔“

اس کی ٹھوڑی کو شوشی سے چھوتے ہوئے وہ شوشی سے کہنے لگی تو مریم کا رنگ سرخ پڑ گیا۔

غطش نے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھا شرم و حیا کے حسین رنگوں نے اس کے ہلکے سانولے چہرے کو کس قدر پرکشش بنا دیا تھا۔ آصف کا نام ہی ڈھیر دیر گلال بھرا دیتا تھا عارضوں پر۔ محبتوں کا یہ روپ

پلو بھی کتنا دلکش تھا۔
”تم آج یونیورسٹی نہیں جاؤ گی۔“ اس کی محویت کو ڈالنے کی خاطر مریم نے موضوع بدل کر دریافت کیا تو وہ چونکی اور کمری سانس بھر کر سرٹنی میں ملا دیا۔
”موسم کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ کل کی طرح آج پھر کسی کرائس میں نہ چھس جاؤں“ اسی لیے نہیں جا رہی۔“ اس نے کتاب کھول بند کرتے ہوئے وجہ بتائی۔

”ہاں! اچھا ہی ہے کہ نہ جاؤ! خواہ مخواہ میں پریشان ہوتی رہوں گی اور ابھی بھی غصہ ہوں گی، کل تو وہ گھر پر نہیں تھیں اس لیے بچت ہو گئی۔“

مریم کی بات پر وہ سر جھکا کر س پڑی تھی وہ ٹھیک کہہ رہی تھی چچی اماں کو کہ اس کی ماں نہیں تھیں مگر حق خزانے اور خیال کرنے کا انداز ایسا ہی ہوتا جیسا کہ شاہ میر یا مریم کے لیے ہوتا تھا۔ وہ اس کی فکر بھی اسی طرح کرتیں کہ جیسے وہ بھی ان کی اپنی اولاد ہو۔

مریم کو انہوں نے دیواری سے اس وقت گود لیا تھا جب وہ کافی چھوٹی تھی۔ کئی سال جب ان کے یہاں اولاد نہ ہو سکی تو شاہ میر کے والد بھڑا صاحب نے پھوٹے بھائی سے استعجا کیا کہ انہیں اپنی جڑواں بیٹیوں میں سے ایک بیٹی دے دیں۔ گو کہ ان پر کوئی جبر نہیں تھا پھر بھی مریم کی والدہ کے چاہتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے بھائی کو انکار نہ کیا اور مریم کو ان کی گود میں ڈال دیا۔

مریم کے ساتھ جو جڑواں بچی تھیں وہ بچپن سے ہی کچھ کمزور تھیں لہذا ماما نے اسے خود سے جدا نہ کیا اور ہاں مریم بیگم بھڑا کی گود میں دے دی گئی۔ جانے یہ اس کے قدموں کی برکت تھی یا اللہ تعالیٰ کو ان دونوں کی گریہ و زاری پر ترس گیا تھا کہ اس واقعے کے ایک دس ماہ بعد شاہ میر ان کی زندگی میں حقیقی نو شیاؤں کے رنگ بکھیرنے چلا آیا مگر ساتھ ہی بیگم بھڑا کے لیے یہ خبر بھی تھی کہ وہ دوبارہ اولاد جیسی نعمت سے نوازی نہیں جاسکتی تھیں۔

لہذا مریم کی حیثیت اپنی جگہ مسلم رہی، ان کو بیٹا کی مل گیا۔ بیٹی اللہ کے کرم سے انہیں پہلے ہی مل گئی

تھی۔ ادھر جڑواں بچیوں کے بعد غطش کے والد حمزہ صاحب کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا اور یوں سب کی فیملی مکمل ہو گئیں مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ایک روز اسکول سے واپسی پر غطش کے دونوں بہن بھائی ایک سیٹ لٹ کا شکار ہو گئے یہ ساتھ حمزہ صاحب اور ان کی بیوی کے لیے اس قدر جان لیوا تھا کہ بمشکل ہی وہ بچھل سکے اور یوں ان کی ساری توجہ غطش کی طرف مبذول ہو گئی۔

نور منزل میں نور جہاں بیگم کا حکم چلتا تھا مگر اب یہاں ان دونوں کو اپنے مرحوم بچوں کی یادیں چین سے جینے نہیں دیتی تھیں۔ لہذا حمزہ صاحب نے تنگ آکر بالائی بالابا ہر جانے کے انتظامات مکمل کرا لیے اور جس روز یہ خبر نور منزل کے مکینوں کو ملی گویا ایک بم پھٹا سب کے سروں پر۔

نور جہاں بیگم نے آج تک اپنی اولاد کو من مانی کرنے یا اپنی کسی خواہش کو پٹا ان کی مرضی کے پورا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بچپن سے آج تک اپنی تمام اولادوں کے فیصلے انہوں نے ہی کیے تھے تعلیم، شادی بیاہ اور زندگی کے دیگر تمام امور ان ہی کی مرضی و منشاء سے طے پاتے تھے۔ مریم کو بیگم بھڑا کی گود میں ڈالنے کا فیصلہ بھی ان ہی کا تھا اور نہ بیگم حمزہ تو شاید ہر کزایا نہ ہونے دیتیں۔

مگر آج حمزہ نے، ان کے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے نے یہ کیا قدم اٹھایا تھا کہ وہ ان کا گھر ان کی راج دھانی ہی چھوڑے جا رہا تھا۔

”تم نے یہ فیصلہ بغیر میری مرضی کے کس طرح کر لیا حمزہ! کیا تم نے ماں کو مردہ تصور کر لیا ہے۔“ ان کا پاٹ دار گونہ جتنا لہجہ سب کو سہاوا کرتا تھا مگر آج حمزہ اس قدر دل شکستہ اور دل گرفتہ تھے کہ ان کے ذہن سے نور جہاں بیگم کا خوف بھی جاتا رہا تھا۔

”پلیز اماں جان! ایسی باتیں نہ کریں، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟“
ان کے تجھے میں حاجت اور عاجزی تھی۔ وہ اپنی والدہ کو بخوشی چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے تھے مگر یہ بھی

جانتے تھے کہ اگر وہ مزید کچھ عرصہ یہاں رہے تو ان کی بیوی دو بچوں کی دوائی اور ایک بچی کی عارضی جدائی سے جان دے دے گی۔

”ہاں جانتی ہوں میں کہ تمہیں اس انتہائی قدم اٹھانے پر کس نے اکسایا ہے۔ تمہاری بیوی تو شروع ہی سے اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اس سائے نے اسے اچھا موقع دیا۔“ اپنے زہر خند لہجے میں وہ طنز اور تضحیک کے سارے تیر چلا رہی تھیں۔

بیگم حمزہ نے تڑپ کر شوہر کی طرف دیکھا جن کی آنکھوں میں پسائی کا ذرا شائبہ نہ تھا۔ ”آپ قطعی غلط بات کر رہی ہیں اماں جان! رابعہ نے کبھی ایسا نہیں چاہا مگر اب حالات کچھ اور ہیں۔ یہ مزید یہاں رہی تو تیار پڑ جائے گی۔“ انہوں نے رسائی سے کہا تھا۔

”کیوں یہاں خدا نخواستہ کوئی دبا پھیلی ہوئی ہے؟“ نور جہاں بیگم نے کہا تو رابعہ پشیمانی سے ہونٹ کاٹنے لگیں ان کی گود میں بیٹی عطش مگر مگر سب کو دیکھ رہی تھی اور ماں کی آنکھوں سے جھرجھریں آتے ہوئے ہاتھوں سے صاف کرتے خود بھی حد درجے سراسیمہ نظر آ رہی تھی۔

”یہ بات نہیں ہے اماں جان! دراصل بچوں کی جدائی نے ہم دونوں کی ذہنی حالت پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی معصوم شکلیں ایک بل کے لیے نظروں سے نہیں ہٹیں۔“

حمزہ کی آواز بھیک گئی تھی۔ رابعہ دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

”اپنے مرے ہوئے بچوں کا ماتم کرتے ہو اور مجھ سے میرا جینا جاگتا بیٹا جدا کر رہے ہو تم اور کہتے ہو کہ میں ماں جاؤں تمہاری بات۔ مرے کا تو صبر آجاتا ہے مگر جینے کا نہیں۔ جیسے تم اپنے بچوں کو نہیں بھلا سکتے۔ ان کی دوری تمہاری جان کا روگ پینی ہے ایسے میں بھی تو تڑپوں گی اس کا خیال ہے تمہیں۔“ نور بیگم اب جذباتی ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھیں۔

حمزہ اور رابعہ سخت پریشان ہو اٹھے کہ انہیں کس طور سمجھائیں۔

”میں کوئی ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہا اماں جان!

انشاء اللہ جب ذرا زخم مندمل ہو جائیں گے تو لوٹ آؤں گی۔“ میری جڑیں ہیں یہاں۔ میرے معصوم بچوں کی کتنی قبریں ہیں اس زمین میں۔ کیسے کٹ کر رہ سکتا ہوں میں سب سے۔“ بڑے دلگیر لہجے میں کہتے ہوئے وہ ماں کے قدموں میں جا بیٹھے۔

”خدا را اماں جان! مجھے خوشی سے اجازت دے دیجئے۔“

”اور اگر نہ دوں تو۔۔۔“ ان کے آہنی لہجے میں فیصلہ کی پکار تھی۔

”آپ کے پاس آپ کے تینوں بیٹے موجود ہیں اماں جان۔ میں بھی لوٹ آؤں گی۔“ ماں کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے حمزہ نے ان کے گھٹنے تھام لیے۔

مگر نور جہاں بیگم کو ترس نہیں آیا۔ وہ اپنی رعایا کو آزادی کا روانہ تھا کراچی مطلق العنانی کو زوال نہیں دے سکتی تھیں۔ سو حمزہ کی التجائیں اور رابعہ کے آنسو کچھ کام نہ آئے اور انہوں نے صاف فیصلہ منادیا کہ حمزہ اول تو یہاں سے جائیں گے نہیں اور اگر گئے تو اکیلے ہی جائیں گے رابعہ اور عطش نور منزل میں ہی رہیں گے۔

رابعہ نے ان کا فیصلہ شائد کچھ تھام کر رہ گئیں۔ کتنی سفاکی سے وہ انہیں سزا سنائی تھیں اور تیسری صورت یہی تھی کہ اگر انہوں نے بعد میں جیلی نور منزل سے قدم نکالا تو گویا انہیں دیس نکالا مل جائے گا۔ پھر اس کے بعد ان کی صورت دیکھنے کا کوئی روادار نہیں ہو گا۔

گو کہ بھڑا اور بڑے چھوٹے بھانے اس فیصلے کے خلاف دیا دیا احتجاج بھی کیا مگر نور بیگم اپنے خلاف کسی کو بولنے کا حق دینے کی قطعی قائل نہ تھیں لہذا حمزہ کو سوچنے کے لیے محض تین دن کا وقت دیا اور ان تین دنوں میں رابعہ بیگم کی بگنی ہوئی صحت کے پیش نظر وہ ماں کی سفاک اور بے حس محبت کو ٹھکرا کر نور منزل سے چلے گئے۔

دینی آکر ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا، انہیں نہ اولاد کی بڑی خواہش تھی مگر رابعہ بیگم اب دل کا غامض اپنے ساتھ نکلائی تھیں۔ سو انہوں نے منع کر دیا کہ

دل رسک نہ لیں اور یوں حمزہ نے اپنے دل پر پتھر لگا دیا۔ اب عطش ہی ان کی کل کائنات تھی۔ یا پھر کسی جس کے لیے وہ ہر سال اتنا کچھ بھیجتے رہتے کہ بڑی دونوں بھادیں جل جل کر راکھ ہوئی۔ البتہ بیگم بھڑا اپنی سادہ طبیعت اور پر خلوص کے باعث مریم کے لیے کتنی چھاؤں والے شجر لگاتے تھے۔

وقت کا بہرہ اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا اور وقت وہ جتنی آیا کہ نور بیگم بچپانے کے باعث اپنا دل صاف و جلال کھونے پر مجبور ہو گئیں۔ بستر نے انہیں اتنا تو حمزہ کو معاف کر کے ایک بار شکل دکھانے کی راستہ بھیج دی گئی۔

اور حمزہ تو خود ماہی بے آب کی مانند تڑپ رہے۔ ماں کے ایک بلاوے پر دوڑے چلے آئے اور بار عطش نے اپنا وہ خیال دیکھا۔ ”نور منزل“ میں وقت اتنے لوگ رہتے تھے کہ پہلی مرتبہ آنے پر تو وہ ہٹکے یا دھجی نہ رہا کہ کس کا نام کونسا ہے اور کون کس کی اولاد ہے۔ اور بعد میں آنے پر بھی وہ سب سے مل نہ سکی۔

کچھ یہ بھی تھا کہ مہاسے بہت دوستی ہونے کے باوجود یہاں کے بکینوں کے ویلے گئے عم اس نے اپنے سینے میں بھی اتار لیے تھے لہذا یہاں آکر اسے وقت ایک گہری اجنبیت کا احساس ہوا کراتا۔ البتہ نور منزل اور صدیقہ بیگم (بھڑا کی بیوی) جنہیں وہ کاشان اور دیویمو کی طرح چچی بیگم کہتی تھی اس کا بے حد خیال تھا۔

تینوں تایا اسے بابا کی طرح لگتے۔ شفیق اور خاموش طبع، دوستانہ مزاج والے مگر اپنی ماں کے خوف سے ان ہی اس سے سرسری سے رویوں کے ساتھ ملتے تھے۔ واوی جان کو رابعہ بیگم سے تو اللہ واسطے کامیاب ہو گیا تھا کیونکہ بقول ان کے انہوں نے ان کا سعادت مند بیٹا جوان کی جیش ابرو پر جان بچھاو کرنے کو تیار رہا تھا۔ ایسا شیشے میں اتار رکھا کہ وہ ماں کا گہری چھوڑ گیا تھا۔

عطش کی شکل صورت حتیٰ کہ عادت و انداز میں

بھی رابعہ سے گہری مشابہت پائی جاتی تھی شاید اسی لیے وہ پہلے ہی دن اسے اس سے بھی بدظن ہوئی تھیں۔ وہ واحد پوتی تھی ان کی جو ان کے حکم کو مشورے تک کاربہ دینے کے لیے تیار نہ تھی جبکہ باقی سب کی زندگیوں کی ذمہ داری انہوں نے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔

حمزہ صاحب کے آنے سے نور بیگم دھیرے دھیرے صحت یاب ہو گئیں تو پھر یہ آمد رفت کا سلسلہ چل نکلا۔ سال دو سال بعد وہ یا تو خود پاکستان آجاتے یا عطش کو بھیج دیتے۔ وہ دس بار دن مریم کے پاس رہ کر چلی جاتی۔

میٹرک کے بعد انٹر میں ایڈمیشن کے لیے بابائے اسے پاکستان بھیجنے کا قصد کیا تو ممانے نور منزل کے زہریلے رویوں سے بچانے کے لیے اسے لاہور کے کالج میں داخل کروا دیا۔ اور یوں پاکستان آنے کے باوجود وہ واوی جان کے زیر سیل نہ آسکی اور یہ بات انہیں پوری جان سے جلا گئی تھی۔

رابعہ پر بار انہیں شکست فاش دے جاتی تھیں اور انہیں یہ قبول نہ تھا کہ ہمیشہ کی طرح اب بھی ایسا ہی ہو چنانچہ انہوں نے بت کو کوشش کی کہ حمزہ عطش کو کراچی میں ایڈمیشن دلا دے مگر ایسا نہ ہو سکا مگر عطش ایسا نہیں چاہتی تھی لہذا انہوں نے صاف حذر تراش دیا کہ عطش وہاں اتنے لوگوں میں بڑھ نہیں سکے گی۔ یہ بات سن کر تو جیسے ”نور منزل“ کا ہر شخص بلا وجہ ہی اس سے بدگمان ہو گیا۔

”اور نہیں ہو گیا۔ یہاں تو سارے ان بڑھتے ہیں۔ وہ چلی ہی اس کی بجائے کرنے بھلا یہاں کیسے رہ سکتی ہیں۔“ مائی ماں نے حیلے دل کے پھوپھولے پھوڑے۔ مگر ہمیں یہ تو جنگل ہے جہاں ان کے تحفظ کو شدید خطرہ ہے کہ رابعہ بیگم انہیں یہاں آنے ہی نہیں دیتیں۔“ پھولی مائی نے بھی جھٹائی کا ساتھ دیتے ہوئے دل کی جلن کو زبان دی۔

مریم سب سستی مگر خاموش رہتی، فطری محبت کے باعث وہ عطش کے لیے نرم سوچیں رکھنے پر مجبور تھی۔ پھر سب کی اپنی اپنی زندگی ہے جیسے چاہیں گزاریں تو

پھر بھلا سب کو کیوں اعتراض ہے، وہ دل میں سوچتی ضرور مگر کہتی کچھ نہ تھی۔

صدقہ بیکم البتہ خاموش طبع ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ شروع ہی سے رابعہ بیکم سے انس رکھنے کے باعث دونوں بڑی جھڑپوں کی باتوں میں قطعی شریک نہ ہوتیں۔ یوں بھی ان پر رابعہ کا بڑا احسان تھا۔ ان دنوں جب وہ اپنی خالی گود کے سوینے پن کو محسوس کر کے زندگی سے بیزار ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے اپنے جگر کا ٹکڑا ان کی گود میں ڈالا تھا۔ بڑی قربانی دی تھی رابعہ نے ان کے لیے وہ آج تک اس احسان کے بوجھ تلے ہی ہوئی تھیں۔

انٹر کے بعد عیش نے گریجویشن بھی ادھر سے ہی کرنے کا سوچا اور یونیورسٹی میں لایڈیشن لے لیا۔ رابعہ بیکم پہلے ہی دل کی مریض تھیں، بی بی کی جدائی زیادہ شاق گزری تو حمزہ نے انہیں لاہور میں ہی فلیٹ لے دیا۔ سال میں ایک آدھ بار وہ خود بھی چکر لگا لیا کرتے۔

ابھی ڈیڑھ سال ہی سکون سے گزرا تھا کہ حمزہ کے انتقال کی خبر نے جیسے رابعہ کے وجود سے زندگی کا ایک قطرہ ہٹ چکا تھا۔ بھلا وہ اس کڑی دھوپ میں تن تنہا حمزہ کے بغیر جی سکتی تھیں۔ جن کے ساتھ وہ بڑے سے بڑے سانحہ سے گزر آئی تھیں۔

اور یوں ابھی وہ بابائے کھونے کا غم بھی پوری طرح نہیں سہا سکی تھی کہ ممابھی اسے چھوڑ کر چلی گئیں۔ اور وہ اس دنیا کے وسیع و عریض صحرائیں اکیلی رہ گئی۔ پھر کتنا ہی وقت گزر گیا۔ اسے کچھ بتانہ چلا۔

صدقہ بیکم اور مریم اسے بمشکل کراچی لانے میں کامیاب ہو سکیں مگر یہاں آکر اس کی حالت مزید غیر ہو گئی۔ مٹی مینے تو جیسے صرف بستر سے دوستانہ رہا اس کا اور پھر دھیرے دھیرے بہت سست روی سے وہ زندگی کے روہین کی طرف ساںل ہو سکی۔

گریجویشن اس کا مکمل نہ ہو سکا تھا۔ لہذا لاہور سے مانگوایشن کروا کر وہ یہاں دوبارہ سے پڑھنے لگی اور یوں بے دلی سے سہی وہ زندگی کی گاڑی چننے پر آمادہ ہو ہی گئی تھی۔ فارم ڈی Pharm D کا یہ آخری

سال تھا جو اس نے کراچی یونیورسٹی سے کرنا تھا۔ سمسٹر تو جیسے تیسے گزر گیا تھا اور اب وہ باقاعدہ سے پڑھنے لگی تھی کہ سوائے اس کے کسی اور کام اس کا دل لگتا بھی نہیں تھا۔

دوسرے دن نہ صرف یہ کہ بادل غائب تھے دھوپ میں بھی خاصی تیزی تھی۔ کراچی کا موسم بڑا عجیب ہوتا ہے۔ پل میں تولہ پل میں مالا ڈیپارٹمنٹ کی میڈیاں چڑھتے ہوئے اس نے کہ کون کہہ سکتا ہے کہ کل بارش اپنی انتہا پر ہی سوائے سڑکوں اور گلیوں میں جگہ جگہ ٹھہرے ہو پانی کے ٹالپوں کے کوئی چیز اس بات کی خاص گواہی دیتی تھی کیونکہ آج تو وہاں بھی بس نارمل سی چل رہی تھی کل والی ٹھنڈ کہ نہ سرمستی۔

رابعہ اسے دیکھ کر فوراً "قرب چلی آئی۔ کل چند اہم کلاسز اس نے مس کی تھیں، بہت غصہ اسے عیش پر۔

"آگئی تم آج۔ جانتی بھی تھیں کہ کل سڑک کی کتنی اہم کلاس ہے پھر بھی چھٹی کر کے بیٹھ گئیں گھر پر۔" اس کے قریب آتے ہی رابعہ نے آنکھیں نکالی تھیں۔

"بس یار! موسم ٹھیک نہیں تھا کل کا۔" اس عذر تراشا۔

"ایک صرف تمہارے لیے خرابی تھی موسم شہ انتہائی بد ذوق ہو تم سچ کل تو ہم نے صبح اتنا انتظار کیا کہ بتا نہیں سکتی۔ سر ملک کے علاوہ بس دو کلاسز اور تیں اور خوب بلہ گلہ کیا سب نے۔ ناصر گیلانی نا اس نے سب کو کل ٹیٹ دی تھی۔ سارا کینٹین خالی کرنے کے درپے تھے سارے لڑکے اور وہ ہمیشہ کا دل ٹھنڈا تھا۔

ذرا سا غصہ کر کے رابعہ تیز قدموں سے اس ساتھ چلتی ہوئی کل کی رپورٹ دے رہی تھی۔ "جھا۔" اس نے بنا کسی تاثر کے کہا۔

"تمہیں بہت پوچھ رہا تھا۔" اس کے نوٹس نہ پر رابعہ نے رک کر بڑے گہرے کھوجتے لہجے میں

اسے معاملے کی "توعیت" بتائی۔

"میرا خیال ہے کلاس میں ابھی کچھ وقت ہے۔" رابعہ ہنسنے پر اندر کچھ جھپٹے۔ "اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کلاس میں بھاٹک کر اندر بیٹھے ناصر گیلانی پر نظر پڑتے ہی یکدم فیصلہ سنا دیا۔

"میں کچھ کہہ رہی تھی۔" رابعہ چڑی گئی تھی۔ "ہوں۔ میں نے سن لیا تھا۔ ویسے کل کیا کیا کام ہوا تم مجھے بریف کرونا۔" اس نے شوڈر بیک سے لوٹ بک اور پین نکالتے ہوئے مصروف سے انداز میں گویا تسلی دے کر مطلب کی بات کی تو رابعہ اس کے متین چہرے پر پھیلی بے زاری محسوس کر گئی۔

"ان فیکٹ کل کے دونوں لیچرز میں نے ناصر گیلانی کو دے دیے تھے۔ آؤ میں تمہیں اس سے دوا دیتی ہوں۔" اس کے کہنے پر رابعہ کو خیال آیا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کا قصد کرتے ہوئے کہنے لگی۔ اور وہ جس چیز سے بچنا چاہ رہی تھی وہی سامنے آکھڑی ہوئی۔

"کیوں۔" کہنے اپنے لیچرز اسے کیوں دے۔ جبکہ وہ کل پر پرنٹ بھی تھا۔ "اس کی بھنوں واضح طور پر ناگواری کے باعث سکڑی تھیں۔

"وہ کلاس انڈین نہیں کر سکتا تھا۔" رابعہ نے پست لہجے میں کہا تو وہ تھکے بن سے بولی۔

"سقاوت دکھانے کے لیے تو وقت ہوتا ہے ان حضرت کے پاس اور پڑھائی کے لیے چند گھنٹاں بھی نہیں۔ اونہ سخت چیز ہوتی ہے مجھے ایسے اسٹوڈنٹس سے۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ یہاں اسٹڈیز کے لیے آیا بھی نہیں۔ وہ تو صرف اپنی کم شدہ دنیا کی تلاش میں ادھر اٹکا ہے۔" رابعہ نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔

اس کی گہری کھوجتی آنکھوں میں کچھ تھا۔ "طش ایک لمحے کو ٹھک سی گئی۔

"تم سے سب کس نے کہا؟" "خود ناصر گیلانی نے بتایا ہے کہ وہ یہاں تمہیں تلاش کرنے آیا تھا اور اب بھی یہاں پڑھنے کا مقصد

محض تمہیں اور تمہارے دل کو موم کرنا ہے۔" رابعہ نے اس قدر آسانی سے انکشاف کیا کہ وہ چند سیکنڈ اپنی جگہ پر ساکت رہ گئی۔ پھر نظر پھیر کر گہری سانس بھر کر بولی۔

"میں پھر نہیں ہوں رابعہ کہ مجھے تراشا جائے۔ ناصر محض وقت کا زیاں کر رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ وہ اپنی نادانی کی یوں تسخیر بھی کرنے بیٹھ جائے گا۔" چہرے کے جھکے تئور ناگواری کے غماز تھے۔

اس کی بات پر رابعہ کاموڈ آف ہونے لگا گویا وہ ایک طرح سے بچی کہہ رہی تھی کہ رابعہ ان دونوں کے اس خاموش تعلق کے اشتہار چھاپ رہی ہے۔ "بہت افسوس ہوا ہے عیش! کہ تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔ کسی کو جاننے کے لیے تو ایک لمحہ بھی بہت ہوتا ہے جبکہ ہم تو چھ سات ماہ سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور اب تک تم میرے اور اپنے درمیان اجنبیت اور بے اعتباری کی دیوار اول روز کی طرح اٹھائے کھڑی ہو۔"

رابعہ کے لہجے میں ہی نہیں آنکھوں اور چہرے پر بھی آرزو کی رقم خمی وہ دل میں بے طرح شرمندہ ہو گئی ناصر کی حماقت کے باعث وہ اس پیاری سی لڑکی کا دل دکھا بھی تھی۔

"آئی ایم ایک شرعی علی وبری سوری رابعہ۔ میرا مقصد ہرگز بھی تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ مجھے تو صرف اس لیے غصہ آیا کہ ناصر اس قسم کی فضول باتوں کو سب سے کہتا پھرتا رہا ہے۔" بڑی سرعت سے رابعہ کا ہاتھ تمام کر اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

رابعہ نے دیکھا وہ واقعی چہرے سے بھی ابھی ہوئی لگ رہی تھی۔ سوچت من گئی اور اس کی تسلی کے لیے بتانے لگی۔

"ناصر نے ایسا صرف مجھ سے کہا ہے کیونکہ کل میں نے اس کے گھڑی گھڑی سوال کرنے پر اس کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ وہ تمہارے لیے اتنا مضطرب تھا کہ میں خود حیران ہونے لگی۔ پر سب شاید تم نے اس کی لفٹ کی آفر بھی قبول نہیں کی تھی۔ بہت افسرہ تھا وہ تمہاری بے اعتنائی کے باعث۔"

”پلیز رات نہ! کوئی اور بات کرو۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔

اگلے لمحے ناصر اپنی طرف آتا دکھائی دیا تو اس کے ماتھے کے بل دگنے ہو گئے۔ وہ شعوری طور پر ناصر کو نظر انداز کرتی میڈم کے آنے پر کلاس میں چلی آئی۔ وہ ناصر کیلانی جولاہور سے کراچی تک محض اس کی خاطر سفر کر کے آیا تھا۔ اپنا بڑا سارا آپس کھرچھوڑ کر یہاں کے ہوٹل میں وہ صرف اس کے لیے اگر کر کا تھا۔

کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی کہ وہ کس طرح کا شخص تھا کہ وہ اسے اہمیت نہ دیتی تب بھی ہمہ وقت دل و جان بٹار کرنے کا عندیہ دیتی نگاہیں اس کا ہی طواف کیا کرتی تھیں گو کہ اس کے انداز و اطوار میں عامیانی یا چھوڑ پن نہ ہوتا تھا مگر کچھ تھا جو اسے ٹھٹھاتا تھا شاید اس کا زمیندارانہ بیک گراؤ نیز جس میں تعلیم کی اہمیت محض ڈگری کے حصول تک تھی۔ اس کے خاندان کی شاید ہی کوئی لڑکی کالج تک پہنچ سکتی تھی۔ البتہ مزیدادہ تر تعلیم یافتہ تھے اور اب نئی سہولتیں راہیں خود تلاش کر رہی تھیں تو ناصر کیلانی بھی عیش کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرنے کا خواہشمند ہو چکا تھا۔

گو کہ ناصر نے کبھی اپنی خواہش کا اظہار اس سے نہیں کیا تھا تاہم اس کی آنکھیں اور غیر معمولی رویہ اسے اس کی اہمیت اور حیثیت ضرور بتاتا تھا۔

* * *

آسمان کالی کالی گھٹا دے گیا آپ آئے تو موسم مزہ دے گیا کرے سے آتی شاہ میر کی گنگناہٹ اسے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے ہچکچاہٹ میں مبتلا کر گئی سمجھ میں نہ آیا کہ اندر جائے یا باہر ہی رک جائے یونورشی سے واپس پر وہ اس وقت اتنی انگریز اسٹ ہوئی تھی کہ ایک لمحے کی تاخیر بھی زہر لگتی۔ رانگ چیریز جھوٹے ہوئے وہ آنکھیں بند کیے گنگنا رہا تھا مگر چھٹی جس نے کسی کی آمد کا احساس دلا تو درازی آنکھیں کھول کر دیکھا وہ دروازے میں کھڑا کھڑا ہی کھڑی تھی۔ جانے اسے کیا سوچھی

دوسرا شعر بڑے جذب سے گنگنا شروع کر دیا۔ عشق تجھ جیسا دشمن بھی کوٹے مار کر زندگی کا پتا دے گیا آپ آئے تو موسم مزہ دے گیا ”ارے تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ اب اتنا اچھا بھی نہیں گاتے محترم کہ بندہ کھڑے ہو کر سننے لگ جائے۔“ مریم نے اندر آتے ہوئے اسے کھڑا دیکھا تو ٹوٹے ہوئے قصداً بلند آواز میں کہا۔

”وہ میں دراصل۔“ مریم کی بات پر وہ گڑبڑائی گئی کیونکہ شاہ میر آنکھیں کھول کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ”ایک تو مریم! تم لڑکیاں ہوتی بڑی جھلس جھلس ہو ذرا کسی بن اچھی صلاحیت دیکھی۔“ لکین جلنے۔“ اس نے بظاہر مریم سے ہی مخاطب ہو کر کہا تھا۔

عشش اس کی بات کا نوٹس نہ لیتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی جبکہ مریم اس کی بات پر ادھار کھائے اس سے لڑنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ وہ پوچھ پٹھا۔

”عشش اس وقت آتی ہے گھر۔“ لہجے میں سنجیدگی اور استفسار تھا۔

”بچھلے دنوں تو اتنی دیر نہیں ہوتی تھی مگر آج کل کچھ کلاسز دھیر میں ہونے لگی ہیں اس لیے لیٹ ہو جاتی ہے۔“ مریم نے قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا کیونکہ اس میں بلاوجہ کھوج لگانے کی عادت نہیں تھی شاید ہی بھی وہ کسی کے متعلق سوال کرتا تھا لہذا آج جب اتنے نکمیر لہجے میں اس نے عشش کے متعلق دریافت کیا تو اس کا متعجب ہونا کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

”ویسے تم نے یہ سوال کیوں پوچھا۔“ اس نے فوراً حیرت کو الفاظ دے دیے۔

”بس ایسے ہی۔“ مجھے لگا جیسے وہ اس گھر سے اور اس کے مکینوں سے بے زار ہے جیسا کہ یہاں آنے کا دل نہیں چاہتا اس کا۔ ”شاہ میر نے تو گویا اس کے مزاج اور احساسات کا تجربہ کر رکھا تھا۔

”نہیں شہابی! ایسی بات نہیں۔ اس کی تو نیچری ایسی ہے۔ زیادہ بات چیت کرنے یا کھلنے سننے کی عادت

اس کی۔ دراصل بچپن سے اکیلے پن کے باعث اس میں طبع ہو گئی ہے۔ پھر یہاں تو وہ ابھی تک ہی نہیں ہوئی۔ تم براست مانا کرو۔“

”بھلا برا ماننے کی کیا ضرورت ہے۔ یوں بھی ماہر وقت یہاں رہتا ہوں۔ چند دن گھر تو بندہ کھڑے ہو کر سننے لگ جائے۔“ مریم نے غلطش کو یہاں کھلنے کے لیے نہیں آئی۔ اب اسے یہیں رہنا ہے ہم لوگوں کے ساتھ پھر بھلا یہ دیکھ اینٹ کی مسجد کھانے کی کیا تک ہے۔ اور پھر اب تو اسے یہاں رہنا ہے۔ آج چھ ماہ سے زائد گزر چکے ہیں۔“ اس کے انداز پر مریم نے متفق ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

”میں جانتی ہوں کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر ابھی یہاں ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔“ اس کے ساتھ جس طرح کا سلوک روا رکھا جاتا تھا اس میں جاننے پھر بھلا دل میں جگہ کیسے بنے۔

”دل گرفتگی سے اسے تیار ہی تھی۔“ ہایا کے انتقال سے وہ ویسے ہی منتظر تھی اس پر اس کی بے وقت موت نے تو اسے بالکل توڑ کر ڈالا ہے۔ اب سنبھلنے میں خود کو سمیٹنے میں کچھ لگے گا۔“ وہ رسانیٹ سے کہہ رہی تھی۔ شاہ نے اسے دیکھا۔ بن کی محبت نے نئے رنگ اسے ہوئے تھے اس کے چہرے پر۔

”تم نے شروع میں اسے دیکھا نہیں تھا کہ کیسے اس سے بے زار تھی وہ۔ اب تو بہت ستر ہو گئی ہے۔“ شاہ نے رنگ پر مگے ہوئے تھے اب آئے ہو اسی

”اب کہہ رہے ہو۔“ ”چھابا بایا اچھا۔ مقررہ عالم میں بار اتم جیتیں۔“ اس سے مریم! تمہیں تو ویل صفائی ہونا چاہیے اپنا ہر کلائنٹ اسی طرح باعزت بری کر لیا۔ ”وہ اس کے لیے چوڑے لیچے سے الجھ کر کھڑے ہوئے بولا تو وہ اسے کھورنے لگی۔

”پہا خیر! تم چل کر چائے پی لو! وادی جان نے کو بلوایا ہے۔ میں بھی کہنے آئی تھی۔“ ایک بار وہ اس سے کہہ کر عشش کے کمرے کی طرف

بڑھ گئی تھی۔ شاید اسے بھی ”فرمان شہابی“ سنا تھا۔ لہذا چند منٹ بعد وہ مریم کے ساتھ آتی نظر آئی۔ ابھی اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے مگر وادی جان کی اس روز والی کھلی کو دور کرنے کے لیے مریم اسے بیکسل ساتھ لانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ شاہ میر نے دیکھا ایک جینز اور گھرے کرتے اور بڑے سے ہرنگ دوٹے میں منہ دھونے کے باوجود وہ کچھ زیادہ فریش نہیں لگ رہی تھی حتیٰ کہ ابھی تک جو گرز بھی نہیں اتارے تھے مگر مریم کی خاطر وہ بابل خواستہ آگئی تھی۔

”جانے یہ کب یہاں ایڈجسٹ کرے گی۔“ مریم کی طرح وہ بھی سوچتا ہوا ان کے ساتھ لاؤنج میں آگیا جہاں چائے سرو کی گئی تھی۔

”حسب معمول اس کی آمد کا نوٹس کسی نے نہ لیا (ہاں اگر نہ آتی تو سب کو خوب خیال آتا اس کا) سو بلند آواز سے سلام کر کے ویسے بٹا کہ کس نے جواب دیا اور کس نے نہیں۔ خاموشی سے ایک طرف بیٹھی موش کے قریب کرسی پر ٹک گئی۔ شام کی چائے حسب معمول بالوں کے دوران پی جا رہی تھی۔ سب تو سب لوگ گھر میں موجود نہیں ہوتے تھے سب کے آئے جانے کے اوقات مختلف تھے۔ کوئی کبھی کھالیتا تو کوئی کبھی۔ لہذا شام کی چائے پر وادی جان اپنی تمام ”رعایا“ کو جمع کرنے کی عادی تھیں۔ ٹھکن بیماری جیسے عذر بھی اس وقت قابل اعتناء نہ جاتے۔

چائے کا اسے شوق تھا نہ عادت۔ لہذا مریم اس کے لیے اسکاوش بنالانی تھی سب کے درمیان اس کے لیے یہ تکلف دوسروں سمیت خود اسے بھی کچھ خاص نہیں بھاتا تھا تاہم مریم کی محبت کے آگے وہ مجبور تھی۔

”ارے برسات کا موسم ہے۔ لیمو کی شکنجہ جبین بنانی چاہیے تھی۔ یہ موا شربت کس کام کا۔“ سب سے پہلے وادی جان نے ہی نکتہ اعتراض اٹھایا تھا۔ ”مجھے کھانا پسند نہیں۔ گلا خراب ہو جاتا ہے میرا۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ ناگواری سے کچھ بڑبڑا کر چپ ہو گئیں۔ مریم نے بھی کچھ کہنے

کا ارادہ موقوف کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ باتوں میں شریک کر لیا۔ موضوع گفتگو اگلے ایک دو روز میں منعقد ہونے والی ہندی کا فکشن تھا جس کے لیے مہوش نے بڑی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ آخر کو چیتا خالہ زاد کی شادی تھی۔

صدف اور مریم کو بھی اس نے کسی حد تک راضی کر لیا تھا البتہ عیش نے بڑے بے تے انداز میں دو ٹوک انکار کر دیا۔ مہوش اسے راضی کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر اسے ایسی ہلا گھا والی تقریبات سرے سے پسند ہی نہیں تھیں اور یوں بھی اب تو ما اور بابا کے انتقال کے بعد اس کا ایسی کسی دلچسپی میں حصہ لینے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ جب وہ پاکستان سے باہر تھی تو یہاں کی شادی بیاہ کی تقریبات اس کے لیے توجہ اور دلچسپی کا بڑا سامان ہوا کرتی تھیں مگر اب دل میں کوئی خاص اہمیت رہی نہیں تھی۔

مہوش اس کے انکار سے مایوس ہو کر صدف اور مریم سے شادی کے گانے وغیرہ سکس کرنے لگی تو اس کی نظریں یوں ہی بجکتی ہوئی سب کے چروں کا طواف کرنے لگیں۔ اس وقت وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے خوش چکیوں، مذاکرات اور مشوروں میں مشغول تھے مگر اندر سے ان سب کے دل ایک دوسرے سے کتنے کبیدہ خاطر تھے۔ وہ جان چکی تھی۔

مائی اماں اور چھوٹی مائی کے جلاپے سے تو وہ شروع دنوں میں ہی واقف ہو گئی تھی جب وہ اس کو نصیحت کرنے اور سلی دینے کے بہانے ایک دوسرے کے خلاف خوب زہر افشیں اس کے پاس آکر۔ ایک دوسرے کو الزام دیتیں کہ ان کی نظر اس کی جائیداد پر ہے جو بابا اس کے نام چھوڑ گئے تھے۔ حتیٰ کہ چچی بیگم پر بھی بہتان رکھنے سے دونوں نے گریز نہ کیا۔ یہ تک کہ انہوں نے مریم کو اس منصوبے کے تحت گود ہری ہو جانے کے باوجود واپس نہیں کیا تھا۔

چیتوں اور دعویٰ کو پرکھنے کی حس اس کے پاس بھی تھی مگر ان دنوں وہ اتنی اب سیٹھی تھی کہ بس فکر لکڑ بکھتی سب کی سنی جاتی۔ دل میں تفرقہ جہ بھی لیتا تو کچھ نہ کہتی مگر جوں جوں اس کی طبیعت بھلکتی گئی

زبان کی گرہ کھلتی گئی۔ بے لحاظی وہ کسی سے نہ کرتی صاف گوئی سے کام لے کر آہستہ آہستہ اس نے مریم کو یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ بے زبان گائے نہیں نہ ہی کوئی نا سمجھ بھی ہے کہ جو چاہے کہہ دیا جائے جیسے چاہے موم کی ناک سمجھا جائے۔

دادی جان کی ظاہری شفقتوں میں بھی محبت کی گرمی اسے محسوس نہ ہوئی جس کا وہ پرچار کرتی تھی یا جیسے کہ مریم اور صدف وغیرہ محسوس کرتی تھیں۔ اس کے حصے میں تو ایک خاص قسم کی حدفاصل کی تھی جس سے آگے بڑھنے کی نہ اس نے کوشش کی انہوں نے چاہا۔ وہ تو ہمہ وقت اپنی شہنشاہی کرسی پر اجماع تھیں حکم ہی صادر کیے جاتی تھیں یہ بھی غرض نصیبی تھی ان کی کہ آج تک بیٹوں نے ان کے آگے سر اٹھانے کی کوشش کبھی نہیں کی تھی سوائے ان کے جن کی نافرمانی اور جدائی کے زخم آج بھی عیش و کچھ کرنازہ ہو جاتے تھے حتیٰ کہ ان کی موت کے بعد بھی وہ زخم یوں ہی ہرے تھے۔

تایا تئیں نظر پڑنے پر بہت پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتے، اس کا حال دریافت کرتے تو اسے بابا یاد آجاتے۔ ان کے چروں کی مماثلت اسے اور بھی ان کی یاد دلاتی تھی۔

بیک جنریشن میں مائی اماں کی تمام اولادیں خصوصاً ”ذی اور صدف کو تو اس سے اللہ واسطے کا تھا۔ انعام الیہ ایک خوش مزاج اور لالہ لالی سالہ لڑکا تھا۔ چاب کی تلاش کے علاوہ کوئی چیز اس کی نظر میں نہیں رہتی تھی۔ سب سے بڑے بیٹے اظہر اس سے تھے کیا سب سے ہی کئے کئے رہتے تھے کہ سحر بھی تھی، صرف نئے اشعر کو ان کی توجہ کا اعزاز حاصل تھا۔ دادی جان کے فیصلوں کی بد صورتی کا احساس اسے ان کے کشیدہ تعلق اور دونوں کے مابین موجود تناؤ سے ہوتا تھا۔ جنہیں شخص دادی جان کی ضد نے یکجا کیا تھا مگر آج بھی وہ ریل کی دوپٹوں کی مانند تھے۔ ساتھ چلتے بھی تھے اور الگ بھی تھے۔

مہوش کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ اظہر ہمالی کسی کو لیک میں انٹر سٹڈ تھے مگر دادی جان نے غلام

ماں کا بھرپور کردار ادا کرتے ہوئے انہیں ملنے نہ دیا تھا جس کا انتقام آج وہ سحر بھابی کو نظر انداز کر کے اپنے تئیں سب سے ہی لے رہے تھے اب یہ الگ بات کہ اس سے انیت صرف بھابی کو تھی جس کی تسکین کی خاطر وہ دوسروں کی کھوج میں رہیں طفر و تشیع ان کا مزاج جن چکا تھا۔

چھوٹی مائی بھی مائی اماں سے کسی طور کم نہ تھیں۔ دونوں دادی جان کی چھتیاں بھی تھیں۔ اس لیے زیادہ مائی کرنے اور زبان کے تیر چلانے کی آزادی ماصل تھی انہیں۔ مگر اس کے باوجود ساس سے دونوں بدتی تھیں۔ ان کو شروع سے جس پابند ماحول میں رکھا گیا بعد میں کسی اور نے اپنے بیٹے کے لیے دادی جان کو ہاں نہ کی جس کے باعث دونوں چھوٹی ہوئیں انہیں خاندان سے باہر کی لانی پڑی تھیں۔ اسی لیے صدیقہ اور رابعہ کی بڑی جھڑپوں سے کبھی نہ بچ سکی۔

کچھ یہ بھی تھا کہ مائی زبانی سب کے بارے میں سن کر بلکہ ان کی حقیقتوں سے واقف ہونے کے بعد دل میں مختلش رکھنا ذرا مشکل ہی تھا بقیہ کسر ”تور منزل“ کا مشعل کیلین بنے پر مجبور ہونے کے بعد پوری ہو گئی جذبہ تفرقہ کو کہ اتنا کرا اور اثر انگیز نہیں تھا مگر اس قدر بے ضرر بھی نہ تھا کہ وہ اسے آسانی سے نظر انداز کر دیتی۔

البتہ چھوٹی مائی کے برخلاف ان کی بیٹی مہوش اور بیٹا کا شان خاصگی سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک تھے ایک شادی شدہ بیٹی بھی تھیں ان کی جو کہ شادی ہی میکے آئیں۔ ان کے بارے میں اس نے ہی سنا تھا کہ ان کے شوہر خاصے جابر قسم کے شخص تھے میکے جانے پر پابندی اول روز سے ہی عائد کر رکھی تھی۔ شاید اسی لیے چھوٹی مائی زیادہ تر ابھی ہوئی نظر آتی تھیں۔ مہوش بھی اس وجہ سے کبھی کبھی بڑی ملول و مضطرب لگتی تھی۔

سب سے آخر میں چچی بیگم یعنی صدیقہ خاتون تھیں جن کی طبیعت اسے سب سے زیادہ اچھی لگی تھی، اپنے کام سے کام رکھنے والی خلوص اور رشتے کی

زباتوں کو بڑے سجاوے سے سمجھ کر عمل کرنے والی چچی بیگم مریم کے بعد اسے بہت عزیز تھیں۔ اگر ”تور منزل“ میں چچی بیگم اور مریم نہ ہوتیں تو وہ شاید ایک لمحہ بھی ان منافقت کی نقاب اوڑھے چروں کے ساتھ نہ گزار سکتی تھی جو کہ اس کے لیے تو کسی خاص منافقت یا مروت کا استعمال بھی نہیں کرتے تھے شاید اس لیے کہ اس کی پشت پناہی کرنے والے والدین منوں مٹی تلے جاسوئے تھے۔

کتنی ہی دیر وہ چپ چاپ بیٹھی سب کے چہرے پڑھتی رہی اور پھر اچانک نظر شاہ میر پر آکر مڑی جن دنوں بابا اور مائی وفات ہوئی، وہ شاید کسی ٹریننگ کورس کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ لہذا شروع میں اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ پہلے بھی جب بھی وہ چھٹیوں میں آتی۔ وہ کم ہی گھر پر ملتا تھا خصوصاً ”کمرشل پائلٹ کی چاب ملنے کے بعد اکثر ایسا ہوا کہ وہ دس بارہ دنوں کے لیے آئی بھی تو شخص دو چار دن ہی اس کی شکل گھر پر نظر آتی۔

اب جبکہ وہ کافی حد تک تمام لوگوں اور ان کے مزاجوں سے واقفیت حاصل کر چکی تھی۔ وہ چلا آیا اور اسے نئے سرے سے مشرب کر دیا تھا اس کی اہم ترین وجہ یہ بھی تھی کہ چچی بیگم کے جس پورشن میں وہ بہت سکون اور بے فکر سی رہتی تھی اب وہاں ہمہ وقت اس کی وجہ سے چوپال بھی رہتی تھی۔ جانے اس نے کتنے دوست بنائے ہوئے تھے کہ سارا دن آتا ہی بندھا رہتا تھا۔ بقول مریم ”وہ تھا ہی ایسا جہاں جاتا دوست بنالیتا تھا۔ بس کچھ اور زندہ دل شاہ میر میں بظاہر اسے کوئی خاص خالی نظر نہیں آتی شاید اس لیے کہ وہ واحد شخص تھا جس نے بنا کوئی سوال کیے اور نکتہ اعتراض اٹھائے اسے نور منزل کے کلین کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا حتیٰ کہ اپنے گھر میں اس کی موجودگی پر بھی اس نے ناک بھون نہیں چڑھائی تھی بلکہ اپنے چھوٹے سے اسٹڈی روم پر عیش کا قبضہ دیکھ کر بھی اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”مہوش مہوش۔۔۔ مریم“

لان کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں سے ہی اسے بلند آواز میں موش اور مرمک کو پکارتے شاہ میر کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ اور یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی۔ مگر میں گھٹے ہی موش کی پکار ضرور پڑی۔ وہ بلند فشار خون پر دو انیوں کے اثرات کے بارے میں پی ایچ ڈی کے ایک اسٹوڈنٹ کا تھیسس خاص طور پر آج اس کے گھر لائی تھی کہ سکون سے پڑھ سکے گی مگر ایسا ممکن ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

شاہ میر کی پکار سے دھیان ہٹاتے ہوئے اس نے دوبارہ نظریں مٹنے پر جمائیں اور ابھی ایک سطر بھی ڈھٹیک سے پڑھ نہ سکی تھی کہ وہ دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

”گھر پر نہیں۔“ اس نے تھیسس ایک طرف رکھتے ہوئے ”کوئی کام ہے کیا؟“ والے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے مختصراً ”کہا۔“

”کہاں گئی ہے؟“

”قالبا“ اس کی کسی کنز کی آج مندی ہے سب وہیں گئے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ وہ ”فروا“ ”فروا“ سب کا پوچھتا۔ اس نے ایک جملے میں جامع جواب دے ڈالا۔

”اوہ!“ وہ واضح طور پر چونکا تھا۔ قدرے تذبذب سے اسے دیکھا۔

”آپ کو کوئی کام تھا موش سے؟“ اسے تذبذب میں دیکھ کر بالآخر اس نے اخلاقاً ”پوچھ ہی لیا۔“ یقیناً وہ موش کے ہاتھوں کی چائے کا طالب تھا۔

”ہاں“ اس ایک کپ چائے چاہیے تھی۔“

”آپ بیٹھے میں ہاؤ بیٹی ہوں۔“

اب جب اس نے ایک طرح سے اس سے درخواست کر ہی دی تھی تو وہ کرسی کھٹکا کر اٹھ گئی۔

چائے کی طلب، بیشک کی طرح اس وقت اتنی شدید تھی کہ اس نے مروا ”بھی انکار نہ کیا۔ البتہ ممنونیت سے اسے دیکھتے ہوئے اسٹڈی روم سے باہر آکر لاؤنج میں بیٹھ گیا البتہ جوں ہی وہ کتابیں سمیٹ کر ایک طرف رکھنے کے بعد پچن کی طرف جانے لگی تو بے

ساختہ پکار بیٹھا۔

”غفلت پالیز“ چائے ذرا اسٹرنگ ہونی چاہیے اور وہ بھی دو کپ۔“

اس نے رکھتے ہوئے پلٹ کر بات سنی اور گردن کو خم دیتی آگے بڑھ گئی۔

شاید اس کا کوئی دوست بھی آنے والا تھا جیسی اس نے دو کپ کی ہدایت دی تھی لہذا وہ رُپے میں دو کپ نفاست سے رکھ کر چلی آئی۔ امید تو یہی تھی کہ وہ لان کی طرف اپنے کسی دوست کے ساتھ خوش کامیوں میں مصروف طے کا مگر خلاف توقع وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ کچھ حیران ہوئی اندر آئی تو وہ حسب معمول رانگک پیچیر پر چھوٹے ہوئے پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کا لایا ہوا تھیسس ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ چہرے پر واضح ناگواری کے تاثرات امتد آئے تھے جنہیں اس نے مشکل کنٹرول کیا تھا۔

”چائے۔“ اس نے پکار کر متوجہ کیا۔

”ہوں۔“ وہ ہنوز مصروف تھا سر جھکائے جھکائے بولا۔ ”سینئر ٹیبل پر رکھ دیں۔“ اس نے خاموشی سے

رُپے رکھی اور مختصر نظروں سے اسے دیکھنے لگی جو اس کی موجودگی سے باخبر ہونے کے باوجود ایسی چیز کو پڑھنے میں مگن تھا جس سے بظاہر اس کا واسطہ بھی نہیں تھا۔

”چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ بالا خرچہ کئی مہر آنا انتظار کے بعد اس نے کہا تاکہ وہ اپنا تھیسس

اٹھا کر اسٹڈی روم میں چلی جائے۔

”اوہ!“ وہ اس کے پکارنے سے زیادہ اس کے لہجے کے متعلقہ پن پر چونکا تھا۔ سراٹھا کر ایک نظر بغور اس کے سنجیدہ چہرے پر ڈال کر کپ اٹھا لیا۔

”آپ کیا ٹھنڈی چائے پینے کی عادی ہیں۔“ ایک سب لینے کے بعد اس نے دوستانہ لہجے میں استفسار کیا تھا۔

”کیا مطلب؟ کیا یہ چائے ٹھنڈی ہے؟“

”ہے تو نہیں مگر ہو جائے گی۔ اگر آپ نے اسے اسی طرح انتظار کرایا تو۔“ اس نے سامنے رکھے

دوسرے کپ کی طرف اشارہ کیا تو اسے بات سمجھ میں آئی۔ تو گویا اس کے لیے دوسرا کپ ہوا تھا۔

”مگر میں تو چائے نہیں پیتی۔“

”آپ پی لیں کیا حرج ہے۔“ ابھی بھی تھیسس

”اس مجھے عادت نہیں نہ ہی پسند ہے۔ چائے کے

ماتے میں کافی زیادہ اچھی لگتی ہے مجھے۔“ اس کا جو

کلام تھا اس کے باعث اسے بھی مروا ”جواب

دلا تھا۔“

”مگر کچھ عادتیں تو بدلتی پڑتی ہیں۔ مطالقت پیدا

کرنے کے لیے اور ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کی

صاحت کے حصول کے لیے انسان کو اپنے اندر لچک

الٹی پڑتی ہے تاکہ وہ ہزاروں میں تھامی کا شکار نہ ہو۔“

رانگک پیچیر کو گردش دیتے ہوئے اس نے سرسری

سے انداز میں ”کپ خالی کر کے رکھتے ہوئے کہا تو اس

کی تواریاں چڑھ گئیں۔ صاف اس روزوالے والے

کی طرف اشارہ تھا۔

”میں تھامی کا شکار ہرگز نہیں ہوں۔ آپ کو یقیناً“

ملاہمتی ہوئی ہے۔“ جھٹکے سے کھڑے ہوتے ہوئے

اس نے کچھ ایسے انداز سے کہا جیسے مزید کچھ سننے کا موڈ

”ضروری نہیں۔ یہ تو انسانی جسم کی حساسیت پر

زیادہ منحصر ہے ورنہ دو ایسے پکاروں کی روک تھام کے

لیے ہی دی جاتی ہیں۔“ اس نے دفاع کرتے ہوئے

متفق نہ ہونے کا عندیہ دیا تھا۔

”مگر یہ جرتل تو آپ کی بات کی تائید نہیں کر رہا۔“

سینے پر بازو پکڑتے ہوئے اس نے جیسے بحث کی۔

”یہ جرتل حرف آخر بھی نہیں ہے بلکہ اس میں تو

ایک پہلو پیش کیا گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر دوا در دوا

دوا بنے۔“ کپ رُپے میں رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

”ہوں تو ہے۔“ حسب عادت وہ کھل کر مسکرایا

تھا۔ ”وہ ہے یہ فارمیسی خاصا خشک اور پور سبکیٹ

ہے۔ ہر کوئی لیٹا پسند نہیں کرنا۔“ وہ پچن کی طرف

جانے کے خیال سے مڑی تو وہ اس کے ساتھ ہی

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا تھا۔

”مگر کسی چیز میں ہمیں دلچسپی پیدا ہو جائے تو پھر

چاہے وہ پور ہو یا خشک ہمیں اچھی ہی لگتی ہے۔“ اس

نے رگ کر کھڑکنے کے بجائے رسائیت سے کہا۔

اختیاری ہوئے ہیں۔

وہ اپنے دل کو راضی نہ پاتی تو جی میں آتا کہ ناصر گیلیا کو خوب کھڑی کھڑی سناٹے جو اس کے دل شکن اور ناگوار دہیے کو بچان کر بھی نظر انداز کر دیتا ہے جانے کس لمحے کا اسے انتظار تھا جھٹوں کے جذبے وقت اور موسم کے اسیر تھوڑی ہوتے ہیں کہ تیاری کر کے کسی درخت کی مانند اس میں پھل لٹنے کا انتظار کیا جائے بقول خلیل جبران ”محبت طویل قوت کا رد عمل نہیں ہونی بلکہ یہ تو ایک وحی کی طرح ہمارے دل پر اترتی ہے۔“ درحقیقت محبت یا تو ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی۔ اور ان دو انتہوں کے بیچ کوئی درمیانی راستہ نہیں ہوتا۔

اس نے گہری سانس بھر کر سوچا اور پہلے صفحے پر نظریں جمادیں پھر جانے کتنا ہی ٹائم گزر گیا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب بشران نے لان میں آکر دیوار کے کمر لپ روشن کیے۔ وقت کا اندازہ کر کے اس نے اپنے میں غایت جانی کہ کچھ دیر بعد کھانا لگنے والا تھا اور داوی جان کے حکم کے مطابق وقت مقررہ پر سب کا بڑے ڈائننگ روم میں جمع ہونا زبردستی ہو تھا۔ نور منزل کی اس روایت سے اسے بہت الجھن ہوتی تھی کہ یہاں سب کام باجماعت کیے جاتے تھے شاپنگ پر جانا ہوتا تو سب قافلے کی شکل میں جاتے یا کسی کے گھر پر جمع ہوتے تو بھی جلوس کی صورت گھر سے نکلا جاتا تھا۔ ایک کے بلاؤں کو گویا سب کے لیے دعوت عام سمجھا جانا یہاں کی بدترین روایات میں سے ایک تھا جبھی موش کے بعد اصرار پر بھی وہ ان سب کے ساتھ مندی کے فنکشن میں نہ گئی تھی۔

اٹھ کر اندر آئی تو لاؤنج میں مائی اماں اور چچی بیگم نظر آئیں حسب عادت مائی اماں ہی بول رہی تھیں اور کوشیہ کی پیل بنی چچی بیگم انہیں سننے میں بظاہر مجھو ہو کر صرف اپنے کام میں مصہمک تھیں۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی باتوں پر کان دھرے۔ چھوٹی مائی کی غیر موجودگی میں ان کے اوصاف گنوائے جا رہے تھے۔ اس کا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا۔

یہی چھوٹی مائی تھیں جن کے سامنے مائی اماں کا

شیریں لہجہ سننے سے تعلق رکھتا تھا جبکہ اس وقت اگر وہ اپنے متعلق ان کی زبان سے جھڑنے والے پھول چشتیں تو یقیناً ”آمر شکل نہ دیتیں۔ دلوں میں اس قدر نفرت ہونے کے باوجود وہ لوگ ساتھ کیوں رہتے ہیں وہ حیران ہوتی۔

جب دلوں میں محبت نہ ہو تو علیحدہ ہو جانا ہی ایسا ہے، کم از کم ایک دوسرے کی عزت تو رہتی ہے۔ اس کا نظریہ تھا۔ مگر نور منزل میں نور جہاں بیگم کا حکم تھا جہاں سب کو کسی میری کی طرح اپنے پیروں میں چھپا کر رکھنے کی عادت تھی اور افسوس اس بات کا تھا کہ اس کی وجہ ان سب کو پناہ دینا یا دنیا کے سرور و گرم سے چھپانے کے بجائے محض اپنی حکومت قائم کرنا تھا۔

یہ بات اگر وہ کسی اور سے سنتی تو شاید اعتبار نہ کرتی مگر خود اپنے دے لفظوں میں اپنی والدہ کی فطرت کا تذکرہ کیا تھا جس پر ہر تصدیق اس کے یہاں آنے پر ثبت ہو گئی تھی۔

~~*

دوسرے دن بھی لڑکے والوں کی طرف مندی کے جانے کا فنکشن تھا۔ موش شاہ میرے سے خوب لڑی تھی کہ وہ ان کے ساتھ کہیں نہیں گیا تھا البتہ اس نے کچھ نہ کہا۔ شاید میرم نے اس کا نقطہ نظر متاثر تھا اسے۔ لہذا جب سہ پہر کو وہ سب تیار ہو کر جانے کے لیے نکلیں تو موش نے اسے خاص طور شادی کا کارڈ لا کر دیا تھا وہ ساٹھ ہونے بنا نہ رہ سکی۔ ”مجھے معلوم ہو تا کہ تم اتنی اصول پرست ہو تو خال سے فون کرو اتنی مندی کے فنکشن کے لیے اسے کارڈ دیتے ہوئے موش نے مسکرا کر قدرے تحسین آمیز لہجے میں کہا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ محض یہی کہہ سکی۔ اتنی جلدی جانے کا جواز یہ تھا کہ انہیں گانوں کی ریسرسل کرنی تھی موش کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے لڑکیاں جمع کر کے لے جائے اس کی خالہ کی طرف لڑکیاں کم تھیں۔ اور چونکہ اس سلسلے میں اس کا اور دچی بالکل نہ تھی لہذا اسے نہ چھیڑا گیا کہ

صدیقہ بیگم نے کہا بھی کہ وہ ان کو جوائن کرے تاکہ میرم کی جلد متوقع شادی کے لیے ابھی سے اسے بھی متاثر کرنے کا اندازہ ہو جائے مگر اس کی شہری ہوئی طبیعت پر یہ بلکہ اور ہنگامہ آرائی والے کام کراں گزرتے تھے۔

ان کے جانے کے بعد اس نے پہلی فرصت میں ساحری ”تنزائیں“ اٹھائی اور بستر لیٹ کر مطالعے میں غرق ہو گئی پھر جانے کب اس کی آنکھ بھی لگ گئی۔ ”کہا بھی تھا میں نے میرم سے کہ میرا سوٹ پرپس کر کے رکھ دینا۔“ شاہ میرم کی آواز مردوں کو بھی جگانے کی صلاحیت رکھتی تھی وہ تو محض سوری تھی کیسے نہ جانتی۔

”تو بیٹا! رکھا تو ہے اس نے یہ گھرے شلوار سوٹ پرپس کر کے۔“ چچی بیگم اس افتادنا کمائی پر ہر اسالیسی دوڑی چلی آئی تھیں۔ اسے کم ہی غصہ آتا تھا اور جب آتا تو دیواروں پر ہلانے کا عادی تھا وہ۔

”یہ نہیں پسنا ہے مجھے۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوا تھا۔

”اچھا لاؤ یہ سوٹ دو۔ میں کر دیتی ہوں۔“ انہوں نے محبت سے کہا۔

”نہیں آپ رہنے دیجئے۔ کرلوں گا میں خود ہی، ایک کام کو کسی سے مگر کوئی سنتا ہی نہیں۔ موش“ میرم کتنی ہی لڑکیاں ہیں اس گھر میں۔ ”نروٹھے پن سے کہہ کر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا تھا۔

”بیٹا! سارے کام تو کر دیتی ہیں بچیاں۔ اب اگر ایک آدھ بار بھول چوک ہو جائے تو اتنا خفا تو نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ نامحانہ لہجے میں کہتے ہوئے دلار سے بولیں۔

”آپ کو معلوم ہے، سخت چڑھتی ہے مجھے اس کام سے۔ میرم کو اس لیے کہہ دیا تھا صبح ہی میں نے کل بھی شام کو یاد آگیا تھا مجھے کہ جانا ہے مگر پرپس کرنے کے خیال سے ہی ارادہ ملتوی کر دیا میں نے۔“ استری کا لپک لگاتے ہوئے وہ مستقل جھنجھلاہٹ میں بڑبڑانے جا رہا تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ چچی بیگم کے ہاتھ کی استری اس کی

کچھ میں نہیں آتی تھی اور میرم غلط فہمی کی بنا پر شلوار سوٹ پرپس کر گئی تھی۔ وہ باہر آئی تو چچی بیگم کپڑے استری کرنے پر بعد میں جبکہ وہ انکار کر دیا تھا۔

”لائے۔ میں کر دیتی ہوں۔“ چچی بیگم کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے اس نے اتنی تنجید کی سے کہا کہ وہ دونوں یکدم چپ ہو گئے۔

”نہیں رہتے دیجئے۔ میں کر لوں گا۔“ شاہ میرم نے فوراً وضع داری سے کہا۔

”دو منٹ کا کام ہے، میں کر دوں گی۔“ وہ نظر اٹھا کر بغیر استری اسٹینڈ کی طرف مڑ گئی صدیقہ بیگم نے بھی منع کیا مگر اس نے سہولت سے انہیں سمجھا دیا۔

”سوٹس آف یو۔“ دس منٹ بعد وہ کپڑے ڈنگر میں لٹکائے اس کے پاس آئی تو اس نے شکر سے کہا۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

اس لمحے بابا اسے بہت یاد آ رہے تھے، کتنا خیال رکھتے تھے وہ ماما کا۔ اس نے بھی انہیں کام کے لیے ماما کو بکارتے نہیں سنا تھا بلکہ اکثر یہی نہیں ماما کی مدد کرانے کو بھی بچن کے کام میں مصروف ملنے تو بھی خود عطش کے چھوٹے چھوٹے کام نبھاتے تھے۔ جبکہ نور منزل میں اس نے مردوں کو اسی طرح خواہشیں بر حکم چلاتے دیکھا تھا۔ گو کہ شاہ میرم کا انداز حاکمانہ یا لٹھیک آمیز تو نہ ہوتا تھا تاہم جب بھی وہ چھٹیوں میں گھر پر ہوتا۔ اسی طرح لاڈا اٹھوایا کرتا تھا جبکہ فقیرہ تمام لوگ جو وہ وقت ہی گھر میں پر اہتمام رہتے ان کی رو میں بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

اسے کبھی کبھی حیرت ہوتی کہ جب عورت کمانے میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹائی ہے تو پھر اس کی ذرا سی مدد کرانے یا معاونت کرنے میں یہ مرد حضرات اس قدر نزاکت کا خیال کہہ چلا جاتا ہے۔

”کیا آپ آج کے فنکشن میں انوائٹڈ نہیں ہیں۔“ وہ تیار ہو کر باہر آیا تو اسے لاؤنج میں بکھرے کشن سمیٹ کر رکھتے دیکھ کر سوال کیا۔

”ہوں تو مگر مجھے جانا نہیں۔“

”کیوں؟“ پھر سوال۔ وہ ذرا سی جھلائی۔
”بس مجھے شوق نہیں فنکشن میں شریک ہونے کا۔“ جواب میں جھٹکنا پڑا تھا۔

”کیوں ان فنکشنز میں بھلا کیا برائی ہے۔ اور بالفرض ایسا ہے بھی تو کیا آپ مریم کی شادی میں بھی اسی طرح الگ الگ رہیں گی۔“ اس کے موڈ کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ جرح کرنے لگا ہوا گیا تھا۔ اس نے زنج ہونے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا جسے شاید بحث کرنے کی عادت تھی۔

”مریم میری بہن ہیں جبکہ موش کی کزن سے میرا کوئی تعلق نہیں لہذا آپ کا سوال قطعی نامناسب ہے۔“ وہ قدرے چڑ کر بولی تھی جانے کیوں شاہ میر کو یکدم ہنسی آگئی۔

”پھر آپ ہی کوئی مناسب جواب دے دیجئے۔“ جملہ بڑا بے ساختہ تھا۔ اس نے بے حد اچھے سے اس کی طرف دیکھا مگر شاہ میر کے چہرے پر فقرے کا کوئی ”خصوصی تاثر“ موجود نہ تھا وہ سربجھکتے ہوئے آگے بڑھ گئی تو وہ بہیم سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے ہوئی پروا سے کی جانب چل دیا۔

اگلے روز شادی تھی۔ وادی جان سمیت گھر کے تمام افراد جانے کے لیے تیار تھے گو کہ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر موش کے خلوص اور مریم کے سمجھانے پر بال بال ناخواستہ تیار ہو گئی۔ ڈیپ بلو جارحٹ کے پلین سوٹ اور لائٹ سلور کام وائے دوپٹے میں لمبوس بالوں کی ساتھ سی چپا بنائے جب وہ مریم کے پاس آئی تو وہ جیوری سینے میں مصروف تھی اس نے اسے ڈسٹرب کرنے کے بجائے خاموشی سے ایک طرف بیٹھنے کو درست سمجھا۔

ذرا دیر بعد صدف اور سحر بھی بھی ادھر ہی چلی آئیں۔ انہیں مریم سے بنگالی جوڑے بنوانے تھے جو کسی نظر اس پر بڑی صدف کی رنگ طرز پر ٹپک اٹھی۔
”ارے عیش! تم اب تک تیار نہیں ہوئیں۔“ موش بھی اسی لمحے اندر آئی تھی۔ عیش کی طرف دیکھا جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ سحر موش اور مریم تینوں اس کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ ایک پل کے لیے تو وہ

بھی کچھ متحیر سی رہ گئی پھر صدف کے لبوں پر بکھرے طنزیہ تبسم کو دیکھ کر بدلتی خود کو کنٹرول کیا۔
”مجھے تیار ہونے کے لیے اپنا حلیہ سرتا پیر دلانا نہیں پڑتا۔ وہ جو کسی عقلمند نے کہا تاکہ نہیں محتاج زور و کاٹنے خوبی خدا نے دی۔“ اس کا انداز استہزائیہ اور طنزیہ ہرگز نہ تھا مگر کچھ تھاس کے لمحے میں کہ سب لمحے بھر کے لیے جب سے رہ گئے۔ مریم کی آنکھیں اور لب البتہ مسکراتے لگے تھے۔

”ذیل سیٹ۔“ شاہ میر کی آواز دروازے کی سمت سے ابھری تھی سب نے بیک وقت اس کی جانب دیکھا۔ انداز کھڑے ہونے کا ایسا تھا جیسے وہ کافی پہلے وہاں موجود ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے بے ساختہ تو صدفی فقرے پر صدف کا منہ نہ گیا جبکہ وہ کوئی تاثر دینے پر بنا کر چھوڑ گئی۔

”بڑی بات ہے صدف! ابوں کسی کو مذاق کا نشانہ نہیں بناتے۔“ مریم نے اس کے نکتے ہی ناوجہی لمحے میں صدف کو مخاطب کیا تو وہ اور سلگ گئی۔

”تو میں نے کون سا بھلا ادا کیا تھا اسے جو یوں محترمہ غور کا مظاہرہ کر کے گئی ہیں اور تم سب بھی اسی کی حمایت کر رہے ہو۔“ اس نے بالخصوص خاصے دیکھے تیروں سے شاہ میر پر نظر ڈالی تھی۔

”غور کی بات نہیں صدف! تم نے خراخواہ چھیڑا تھا۔“ سحر بھی نے بھی موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے اکثریت کا ساتھ دیا۔ ہمیشہ کی طرح وہ سب کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔

”افوہ ایسی کون سی بے ادبی کر دی میں نے ملکہ عالیہ کی جناب میں کہ تم سب میرے پیچھے لگے ہو۔ ان محترمہ کے مزاج تو دوسرے ہی نہیں ملتے یونیورسٹی میں بڑھ کر خود کو افلاطون سمجھنے لگی ہے وہ اس پر مستزاد ام لوگوں کا رویہ“ عیش کا چھالنا پڑا کر کہا ہوا ہے اسے۔
”اصل جگن تو اسے عیش کی تعلیم کی تھی خود اسے وادی جان نے باوجود خواہش کے انٹر سے آگے پڑھنے نہ دیا۔“

جبکہ عیش تو شروع ہی سے کواچیو کیشن میں بڑھتی رہی تھی اس پر ایسی روک ٹوک کبھی نہ ہوئی۔ شاید

لے کہ وہ نور منزل کے اینڈ میوں سے دور تھی مگر ابکہ وہ یہاں بھی آگئی تھی۔ وادی جان نے اسے میں داخلہ لینے سے نہ روکا تھا یا شاید روکا بھی تھا اس نے ان کے حکم کو درخور اعتنا نہ جانا تھا۔
”میرا خیال ہے صدف کہ تم عطش سے جھلمس کر رہی ہو۔“ اس کی شعلہ باری پر شاہ میر نے بے حد کی سی کہا تھا۔ اس کے تو ٹکوں سے لگی سر پر بھی۔ ترش کر بولی۔

”اوسہ جھلمس ہوئی ہے میری جوتی۔ اس میں ہے کیا جو اس سے جھلمس ہوا جائے۔“
”میرے تو تمہاری کم غلٹی ہے کہ تم ایسا کہہ رہی ہو وہ واقعی بہت اچھی ہے۔“ موش نے پہلی بار اسے اس میں جھل دیا۔

”میرے خدا کیسے پھونک دیا ہے اس نے تم پر جسے دیکھو اس کے حسن کی مالا جپ رہا ہے۔“ اس کی بات پر وہ بے حد دکھ اور ناسف سے سر ہٹا کر بولی۔

”جسے“ کے زمرے میں کون کون شامل کرنا چاہیے؟ سحر بھی کو پہلی فرصت میں کھد بھد لگ گئی۔
”اے اے سر اٹھا کر بے حد تیز نظروں سے انہیں دیکھو اور دیر پہنچتی کرے سے باہر نکل گئی۔“

”وادی ہوئی چھٹی۔ اب صدف سب کاموں آف آف کی۔“ موش نے ذرا سی ویر میں آنے والے اس کا نقشہ کھینچ ڈالا اور حقیقتاً ”ہوا اچھی رہی۔“

”مٹ مٹ بعد ہی موش اور سحر کی پیشی تائی اماں کرے میں ہو گئی۔ اور حسب توقع اور حسب خیال ان دونوں کو خوب خوش سنائی گئی البتہ شاہ میر مریم کو محض جھٹکی نظروں سے دیکھ کر ہی استہزائیہ متنبہ کر دیا گیا تھا کہ صدف سے ایسا رویہ پھر نہ روا رہیں۔ مریم تو عطش کی ماں جانی ہونے والے فطری طور پر اس کی حمایت کی سزاوار بھی ہی شاہ میر کا رویہ تائی اماں اور صدف کی نگاہوں میں نہ دھنک گیا۔

ایسا خاصا صال اور موڈ خراب ہو گیا تھا۔ موش کو نے زبردستی منایا اور وہ جس کی وجہ سے یہ سب

ہوا تھا۔ لان میں شعلتی اندر پیدا شدہ چوہیشن سے انجمن بیٹے دونوں کی یادوں میں غرق تھی۔ کتنا اچھا لگتا تھا اسے جب بابا اور ماما کے ساتھ وہ کسی تقریب میں جاتی تھی۔ بابا اسے دیکھ کر کیسے تعریفیں کرتے اور ماما کی بلا میں اپنی نظرس اسے کتنی مسرت سے ہمنار کرتی تھیں مگر آج اگر وہ حور بھی لگنے لگتی تو سراہنے والا بھلا کون تھا۔

مواگرے اور رات کی رانی کی محک لان میں گھومتی پھر رہی تھی۔ اس کا دوبارہ اندر جانے کے لیے دل ہی نہ چاہا اور جب وہ سب باہر نکلے وہ وہیں گھاس پر نرم روی سے چل رہی تھی۔

”بھس میں چنگاری ڈال لی جھالو دور کھڑی۔“ صدف نے زہر خند لمحے میں دانت کچکا کر کہا تو ساتھ چلا ڈکی بے ساختہ چونکا۔ نظر سامنے کھڑی عیش پر ڈال کر وہ اس کی طرف پلٹا۔

”کتنی بار سمجھایا ہے آئی کہ عطش سے نہ جلا کرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے مستقبل قریب میں اسے تمہاری بھابی بنانے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔“

اس کے قریب رک کر وہ اسے سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔ صدف نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا اور بولی۔

”اوسہ فیصلہ کر رکھا ہے۔۔۔ ارے پہلے موصوف سے تو پوچھو کہ وہ تمہیں گھاس بھی ڈالے گی یا نہیں۔ آئے نہیں سے بھابی بنانے والے۔“ ذکی کا جملہ اسے آگ لگا گیا تو وہ چڑ کر اس کی سائیڈ سے نکلتی چلی گئی۔

وہ ذکی سے بڑی تھی۔ اصولاً اس کی شادی اب تک ہو جانی چاہیے تھی مگر قسمت میں جانے کیا لکھا تھا کہ وہ ستا میں سال کی ہونے کے باوجود اب تک کتواری تھی اور یہی دکھ کسی نیزے کی مانند اس کے دل میں کھسا ہوا تھا، مریم کی منظمی پر بھی وہ یونی انگاروں پر لولی تھی اور اب عطش کے لیے ذکی دیوانہ ہو رہا تھا وہ اسے دیکھتی تو کڑھ کرہ جاتی اس پر سوا میر عطش کی بے نیازی تھی جو مزید جان جلاتی۔

”اوسہ عطش۔“ مریم نے قریب آتے ہوئے اسے

ساتھ لیا اور شاہ میر والی گاڑی میں جا بیٹھی، صدف نے اگر ہنگامہ کھڑا نہ کیا ہوتا تو شاید وہ خود عیش کو کچھ جیولری پہننے پر راضی کر لیتی مگر اب تو اس سے ایک لفظ بھی کہنا بے کار تھا سو وہ چپ چاپ کچھ لے کر اس کے ساتھ شادی کی تقریب میں شریک ہو گئی گو کہ وادی جان نے بھی دبے لفظوں میں اس غیر ضروری سادگی پر لیچ کر مگر اس نے بہت صاف لفظوں میں بتا دیا کہ ابھی اس کے والدین کو مرے انتاعصرہ نہیں ہوا کہ وہ خوشیاں مناتی پھرے۔

بات ہی ایسی کہی گئی کہ ہر کوئی اپنی جگہ نادم ہو کر رہ گیا خصوصاً ”مریم“ نے بہت سخت محسوس کی اور دل ہی دل میں اپنی کوتاہی کو تسلیم بھی کیا مگر بقیہ بزرگ حضرات اس کھلی تنقید اور طنز پر دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتے رہے۔

شاہ میر نے دیکھا۔ یہ سب کچھ کہہ کر وہ کس قدر آسودہ سی لگ رہی تھی اس کا چہرہ جسے ان سب کو آئینے دکھا کر بڑی شامانی اور سرشاری محسوس کر رہا تھا اور اس جذبے کا عکس اس کی آنکھوں میں اتر کر اسے بہت جاذب نظر بن گیا تھا۔

...

ناصر گیلانی گزشتہ دو ہفتوں سے غائب تھا۔ پورے ڈیڑھ ماہ منٹ میں یہ خبر بری طرح گشت کر رہی تھی کہ اسے اپنے شرمیلی کی رسم ادا کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ اس نے سنا تو بے طرح سکون محسوس کیا۔ شاہ میر بھی آج کل غلائیٹ پر تھا۔ لہذا اسے دونوں طرف ذہنی سکون اور یکسوئی حاصل تھی۔

”حیرت ہے وہ تمہاری خاطر یہاں چلا آیا اور تم کہتی ہو کہ تم اس کو اتنی بھی اہمیت نہیں دیتیں کہ اس کو کبھی سوچ بھی لو۔“ رائے حیرانی سے کہہ رہی تھی ڈیڑھ ماہ منٹ کے لان میں کولڈ ڈرنک کا سب لیتے ہوئے وہ اس کی بات پر مسکرا دی۔

”یہ جو دلوں کے معاملے ہوتے ہیں ہاں رائے! یہ دلوں میں ہی طے ہوتے ہیں، شعوری کوشش سے مقاومت اور مصاحبت تو ہوسکتی ہے محبت نہیں۔ ناصر ایک اچھا لڑکا ہے“ اسے کوئی اور اچھی لڑکی مل جائے

گی۔“ اس نے صاف گوئی سے کہتے ہوئے رائے کی طرف دیکھا۔

”مگر وہ تو تمہیں۔“

”پلیز رائے! کوئی اور بات کرو۔“ اس کے نوک انداز خاصا بیزاری لیے ہوئے تھا۔ رائے نے اس کے لیے چپ ہو کر گہری سانس بھری اور پھر سوچ کر پوچھنے لگی۔

”کہیں تم کسی اور کو آئی میں کیا تم کہیں انکس جلد اس لیے میں جھجک گئی۔ اس نے قدرے حیرت سے رائے کی جانب نظریں اٹھا دیں۔

اور یکدم اس کے زخم کھل گئے تھے۔ اندر ہی اندر کس تیزی سے درد پھیلا تھا۔ ماما اور بابا کی خواہش اس کے وجود میں سرایت کر گئی تھی کسی خوشی اس نے ان دونوں کی پسند فیضان کو قبول کیا تھا۔ اگلوتے ماموں کا اگلو بابا فیضان۔ اور فیضان نے اسے تو اس کے ساتھ کے لیے ماما اور بابا کو کس مشکل کنوٹس کیا تھا۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ عیش بڑھائی کے دوران ڈسٹرب ہو مگر فیضان اور ماموں جان کی پیہم کوششوں نے اسے ممکن کے خوب صورت بندھن میں جکڑ دیا تھا اور وہ کتنا خوب صورت وقت تھا جب اس کے دل کے کورے کانڈ پے ایک رشتے کے ساتھ فیضان کا نقش ہوا تھا۔

”بولونا عیش! چپ کیوں ہو۔“ رائے اس کی آنکھوں میں پھلتے دھواں دھواں احساسات کے شہار کو دیکھ کر گہرا کراسے جھجھوڑ بیٹھی تھی۔ اس نے پلوں پر بکھر گئے والی نمی جذب کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہوئے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔

”وہ۔“ رائے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فوری طور خوشی کا اظہار کرے یا اس کی آنکھوں سے ہلکی دیرانی پر نوحہ نکال ہو جائے۔

”کون ہے تمہارا فیانی؟“

”میرے کزن۔ فیضان وقار۔“ بدقت خود سنبھالتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

”اور تم مجھے آج بتا رہی ہو۔ جبکہ کتنی بار میں

نہیں ناصر کے لیے کنوٹس کرنے کی کوشش کی مگر تم نے سوائے اس کے لیے انکار کرنے کے آج تک نہ کیا۔ بہت افسوس کی بات ہے دل چاہتا ہے کہ تم سے کچھ قطع تعلق کر لوں۔“ رائے کی اہمیت بھری حلقی اس نے قدرے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”پلیز رائے! ناراض مت ہو۔ دراصل بابا اور ماما نے نور منزل کے تمام لوگوں کو بتائے بغیر میری ممکنہ اس وقت کی بھی جب میں میٹرک کے انگرام کے بعد پینٹوں میں کنڈیا وقار ماموں کے یہاں گئی تھی ماما بھی میرے ساتھ تھیں۔ وہ کھو سی گئی۔

”نور منزل میں وقار ماموں کا بزنس تھان کی کینڈن ہوئی جو کہ عرصہ ہوا انہیں چھوڑ گئی تھی۔ محض ایک بیٹے فیضان کے شکل میں اس کی یاد بانی تھی۔ فیضان یورپی اور ایشیائی وجاہت اور حسن کا خوب صورت امتزاج تھا اس پر مزاج بھی بڑا دوستانہ تھا سو وہ جلد اس سے کھل مل گئی۔ وہ اردو سے شناسا تھا مگر عبور انگریزی پر ہی حاصل تھا۔ لہذا اکثر بات کرتے کرتے غلط اردو بول جاتا تو وہ بے ساختہ کھکھکلا کر ہنس دیتی۔

”تمہاری بہن بہت بولی فل سے عطی آئی رطبی لائیک اسٹ۔“ وہ بے باکی اور بے تکلفی سے آنکھوں میں گہرے جذبوں کے دھنک رنگ لیے بولتا تو وہ سرخ ہو جاتی۔

بچی عمر کے حسین خواب بہت جلد اس کی آنکھوں میں بھی گھرنا سکتے تھے مگر ماما اور بابا کی تربیت نے اسے عام لڑکیوں سے قدرے مختلف بنا دیا تھا۔ یوں بھی نور منزل ایک دیوار جانے کے بعد وہ اور بھی مختلط ہو گئی تھی۔ چھپی اور جال کا کھیل بڑا نقصان دہ ہوتا ہے اسے اندازہ تھا۔ اس کے باوجود فیضان کے ساتھ سے انداز پر وہ تجو ب سی ہو جاتی۔ اس کی سنہری آنکھیں خود پر مرکوز محسوس کرتی تو ادھر ادھر کے موضوع چھیڑ دیتی۔

مگر دل میں اس کی ”عطی“ کتنی ہوئی آواز بڑا اودھم مچاتی تھی خصوصاً جب وہ بڑی آس سے اس کے مختلف گفت شلا تا اور پوچھتا۔

”تمہیں یہ گفت کیا لگا۔“

”بہت اچھا لگا۔“ وہ جواباً کہتی۔ دل رکھنے کے لیے نہیں بلکہ اس کے لیے کہ اس کی چوائس واقعی اچھی ہوئی تھی۔ جیولری سے لے کر ڈریسز تک وہ ایک ایسے ذوق کا حامل شخص تھا۔

”اور میں؟“ وہ فوراً ”معصومیت سے آنکھیں پٹھنا کر سوال کرتا تو وہ نروس ہو جاتی۔

”آپ بھی اچھے ہیں فیضان بھائی۔“ نظرس جھکا کر جلدی سے کہہ دیتی اور وہ اس کے بھائی ”کنے پر گڑ جاتا۔ ٹھیک ٹھاک شور مچا دیتا۔ ایک بار گھر اس نے حیرت سے کشادہ آنکھیں مزید داکر کے پوچھ لیا۔

”بھائی کنے میں بھلا کیا خرچ ہے۔“

”میں تمہیں اپنا لائف پارٹرن بنا چاہتا ہوں فوٹس گرل! اور تم میرا سارا روم خراب کر دیتی ہو۔“ اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگا کر اس نے بڑی آسانی اور روانی سے اپنا فیاضیہ اس کے سامنے بیان کر دیا تو وہ حیران اور پریشان ہو گئی۔

اس کی آنکھیں جن جذبوں کی کمائیاں سناتی تھیں، وہ اتنے سچے ہیں اسے اندازہ نہ تھا اعتبار کرنے کو دل چاہتا تو وہ اسے یورپی مردوں کی قلرٹ والی خوشے شمشک کرتے اس کے جذبوں سے صاف منکر ہو جاتی مگر اس روز اس نے بہت واضح لفظوں میں سب کچھ کہہ ڈالا تو وہ بھاگ کر ماما کے کمرے میں جا چھپی۔

پھر فیضان نے کتنا دردناک نہ پٹا دیا پر نہ نکلی اور بالآخر ماما اس اقتدار پر اقبال و خیراں چلی آئیں۔ استفسار کرنے پر فیضان نے الف سے لے کرے تک سنا ڈالا۔

”وہ میرے خدا! رابعہ بھانجے کی اس بے تکلفی پر تعجب کے باوجود ہنس دیں۔

پھر یوں ہوا کہ فیضان کی خواہش ماموں جان کی بھی خوشی بن گئی ماما کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ بھائی جو دیار غیر میں بس کر ان سے بہت دور ہو گیا تھا یوں فاصلے سمیٹنے کو تیار تھا تو بھلا وہ کیوں انکار کرتیں! البتہ بابا کو صرف یہی اعتراض تھا کہ فیضان کا ابھی میڈیکل کا آخری سال تھا۔ اس کے بعد اسے اسپیشلائزیشن کے لیے امریکہ جانا تھا۔ لہذا ایسی صورت میں جبکہ

عطش بھی ابھی صرف میٹک کر کے فارغ ہوئی تھی۔ یہ رشتہ طے کرنا دونوں کی تعلیم پر اثر انداز ہو سکتا تھا مگر فیضان نے کسی نہ کسی طرح انہیں کوئٹہ کر ہی لیا تھا۔

عطش چونکہ ابھی صرف سترہ سال کی تھی لہذا ماما اور بابا نے اس کی منتی کر دی۔ کیڑا جانے سے پہلے اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ جب وہ واپس دہی جائے گی تو زندگی اتنی بدل چکی ہوگی۔ بابا کے کہنے کے مطابق تو شروع شروع میں واقعی اس کا دل بڑھائی میں قطعی نہ لگا مگر فیضان نے اسے ایک بار ماما کی شکایت کرنے پر فون کر کے بہت لمبا چوڑا لیکچر دیا تھا کہ اس کا ماسٹر کرنا ماما اور بابا کا ہی نہیں فیضان کا بھی خواب ہے۔

تو پھر جو اس کی آنکھوں کا اولین خواب تھا وہ اس کی خواہش کیسے پوری نہ کرتی۔ جی جان سے بڑھائی میں جت لگی ماما اسے لاہور ایڈمیشن دلا کر اس کے ساتھ ہی رک گئیں۔ ایک سال اتنی تیزی سے گزرا کہ پتا بھی نہ چلا۔ فیضان کے خوب صورت خط اور فون اسے دنوں محسوس رکھتے۔

اس کا میڈیکل مکمل ہو گیا تو وہ خصوصاً اس سے ملنے لاہور آیا۔ وہ دن اس کی زندگی کے یادگار دن تھے جب بابا بھی پاکستان آگئے اور پھر ان سب نے ملک کر خوب تفریح کی ڈیڑھ ماہ کا عرصہ پلک بھینکتے گزرا۔ فیضان کی شکست میں باوجود جھنجھٹے اور شرمانے کے اس نے بہت انجوائے کیا تھا جبکہ وہ ذرا بھی تو اس کی فطری شرم و حیا کو اہمیت نہ دیتا۔ دوستوں کی طرح عطی یہ کر دو عطی پانی پلا دو۔ بار میرا سوٹ پرئیں کر دو کے نعرے لگا اسے بھی نازل کر دیتا۔

ساری چٹھیاں اوھر گزار کر وہ واپس کینڈا لوٹ گیا، وہاں سے اسے امریکہ چلا جانا تھا اور جو سی وہ امریکہ گیا۔ عطش کا دل جیسے کسی نے مٹی میں لے لیا۔ دنوں وہ اواس مصحفی اور ملول سی پھرتی رہی بے چین اور بے قرار بولائی بولائی سی گھر بھر میں گشت لگاتی رہی۔ مگر دھیرے دھیرے قانون فطرت کے مطابق اسے بھی سکون آ گیا کہ امریکہ سے فیضان کا صرف ایک خط ملا تھا جس میں اس نے اپنی خیریت کے

ساتھ انتہائی سخت شیڈول کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس ٹائم ٹیبل کے ساتھ وہ زیادہ جلدی جلدی اسے خط نہ لکھ سکے گا البتہ فون دوہفتے بعد آجائے۔

پھر دھیرے دھیرے فون کال کے وقفے بھی بڑھتے چلے گئے تھوڑے ایس میں لاہور یونیورسٹی سے آنرز کرنے کی خواہش لے کر یہاں آئی تو ناصر کیلانی کی چاہش اسے سخت جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر گئیں۔ دل میں فیضان کی یادیں اور رشتے کا تقدس اس قدر گہرائی میں اترا تھا کہ پھر کسی کی طرف نظر بھر کر بھی دیکھنا وہ بھر محسوس ہونا لگا کہ کسی جذبے کی پذیرائی کرنا۔

اوھر فیضان سے بات ہوئے عرصہ ہو چلا تھا۔ اپنی آخری کال پر اس نے یہی بتایا تھا کہ یہاں ہاسپٹل میں چھتیس چھتیس گھنٹوں کی اسٹریٹ اور ڈیوٹی ہوتی ہے لہذا اسے نوٹیفکیشن بھی پوری کرنے کی مہلت نہیں ملتی تو بھلا وہ کسی کو فون کیا کرے۔ اوپر وہ اس کی مجبوری جان کر سمجھوتے کی راہ چلنے لگی تھی کہ اچانک وہ بخ ہو گیا جو اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ بعد دیکر بابا اور ماما کی ناگمانی اموات نے اس کے حواس ہی معطل کر دیے۔ پے در پے حملے اس قدر جانگھم اور جان لیوا تھے کہ دنوں اسے ہوش نہ آیا کہ وہ کہاں ہے ماماں جان اس سانحے پر پاکستان آئے ضرور مگر فیضان ان کے ساتھ نہ تھا اس کی طرف سے انہوں نے ہی تعزیت کر دی تھی اور اس کا تو اتنا بڑا نقصان ہوا تھا کہ وہ فیضان کے خلاف دل میں کوئی شکوہ بھی نہ لاسکی۔

سارا وقت نور منزل کے ملبین اس کے ارد گرد جمع رہتے۔ لہذا ماماں جان سے وہ زیادہ بات بھی نہ کر سکی کہ وہ اسے فی الحال خاموشی اختیار کیے رہنے کا حکم سنا کر واپس لوٹ گئے۔ اور وہ ان ہیپ اندھیروں سے سر ٹکرانے کے لیے اکیلی رہ گئی۔

زخم کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو دھیرے دھیرے مندمل ہونے لگتا ہے البتہ ٹیسس اپنی جگہ موجود تھیں۔ وہ بھی رفتہ رفتہ زندگی کے معمولات کی طرف لوٹ آئی مگر دل کسی طور سمجھل نہ سکا فیضان کا نیا ایڈریس بھی اس سے کم ہو چکا تھا جبکہ ماماں جان نے کچھ دنوں

ہی انگلینڈ میں اپنا پرنس شروع کر دیا تھا جس کے باعث ان کا زیادہ تر وقت اوھر ہی گزرا لہذا باوجود اس دھیمے گوشوں کے ان دونوں سے اس کا رابطہ نہ ہو سکا اور وہ کراچی آگئی۔ یہاں اگر احساس ہوا کہ لکٹی ہی چرس اس کی لاہور والے گھر میں رہ گئی تھیں تو سوچا۔ نیلی فون انڈیکس جس میں ان دونوں کے سہزادے۔ ماماں جان کا پورا نامبرو ایڈریس اسے یاد تھا مگر فیضان کا یہ وہ وہیں لاہور میں بھول آئی تھی۔

”ہوں۔ تو گویا عرصہ آٹھ نوواہ سے تمہارا ان دونوں سے کوئی کانٹیکٹ نہیں ہو سکا، خود انہوں نے بھی پلٹ کر تمہاری خبر نہیں لی۔“ تمام بات اس کی زبانی سن کر رانمہ نے سوال کیا۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ویسے میرے یہاں آنے کا تو انہیں بھی علم نہیں تھا۔ البتہ میں نے چٹنی بار بھی کوئٹہ کی رابطہ میں ہو سکا۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ میں نے گھر میں کسی کو بھی اب تک یہ سب نہیں بتایا ہے حتیٰ کہ مریم اپنی کو بھی نہیں۔“ وہ خود کافی دنوں سے سخت دل میں جھٹلا رہی رانمہ سے سارا حال دل کہہ بیٹھی۔

”کیوں کیا تمہارے خیال میں وہ بھی تمہارے بقیہ رشتے داروں کی طرح اس رشتے کو ناپسند کریں گی۔“ اس کے اس اعتراف پر کہ اس نے یہ ساری حقیقت مریم سے بھی چھپا رکھی ہے رانمہ حیرانی سے پوچھنے لگی۔

”نہیں یہ بات نہیں۔ دراصل میری خواہش ہے کہ ماماں جان خود اگر یہ ساری بات دادی جان سے کہیں پھر میں بھی سب بتا دوں گی ورنہ بصورت دیگر سب یہی سمجھیں گے کہ میں نور منزل سے فرار ہونے کی خواہش کے باعث ایسا کہہ رہی ہوں۔“ اس نے صورت حال سے اسے آگاہ کیا۔

”مریم اپنی بھی یہی سمجھیں گی۔“ رانمہ کی حیرت بجا تھی۔

نہیں ایسا نہیں ہے۔ بس میں ابھی اس قصے کو چھیڑنا نہیں چاہتی۔ ماماں جان کو خط میں میں نے ساری صورت حال لکھ دی ہے۔ اب انتظار اسی بات کا

ہے کہ وہ خود کوئی عملی قدم اٹھائیں یا فیضان پاکستان آجائیں۔ اس سے پہلے اگر آپنی کوتاہیا تو وہ مجھے مجبور کریں گی کہ میں ماماں جان کو بار بار یہ یاد دہانی کرواؤں کہ میں ان کے بیٹے کی امانت ہوں جو کہ مجھے قبول نہیں۔ انہیں مطلع کرنا میرا فرض تھا اب آگے ان کی ذمہ داری ہے۔“ وہ خود کافی متفکر تھی مگر ذہن سے سوچنے کی عادت ایسی بڑی تھی کہ پریشانی میں بھی اپنی عزت اور انا کا کھتا سے نہ جانے دیتی۔

رانمہ بھی اس کی بات سے متفق تھی جب ہی خاموشی سے سر ہلا کر اس کی جانب دیکھا جس کی آنکھوں سے باوجود کوئٹہ کے متفکر چھپ نہیں پایا تھا۔

”ہو سکتا ہے وہ دونوں تمہارے ماسٹرز کرنے کے منتظر ہوں۔ اس کے بعد یہاں آئیں۔“ اس کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر رانمہ نے نسلی تمیز بے میں خوش آئند بات کی تو وہ مسکرا دی۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ اس نے صدق دل سے کہا تھا۔

”کیا تمہیں فیضان وقار سے محبت ہے عطش۔“ جانے کیوں رانمہ کی زبان سے پھل پڑا۔ وہ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکی تو نظریں پھیر کر دوسری جانب دیکھنے لگی اور پھر گہری سانس بھر کر اس کی طرف نگاہیں موڑ دیں۔

”اس رشتے سے جو کہ میرے اور فیضان کے درمیان ماما اور بابا نے استوار کیا تھا ان کی محبت اور خواہش نے اس بندھن کو حسن بخشا تھا رانمہ اس سے مجھے ان دونوں کی خوشبو آتی ہے۔ فیضان کی یاد کے ساتھ ہی ماما اور بابا کے خوب صورت اور مسکراہٹوں سے مزین وہ ہنستے ہوئے وکٹس چہرے میری آنکھوں کی پتلیوں پر آکر ٹہرتے ہیں۔ آپ ہی آپ آنسو بہنے لگتے ہیں۔ میں خود پر قابو ہونے لگتی ہوں اور شاید یہی محبت ہے۔ اب خدا جانے یہ محبت مجھے فیضان سے ہے یا ماما بابا کی یاد سے۔ میں نہیں جانتی۔ بس ایک اس جذبے کی اسیر ہوئی جیسے جارہی ہوں کہ آج نہیں تو کل وہ وقت ضرور آئے گا جب ماما اور بابا کا

خواب پورا ہوگا۔“
آنکھوں میں اشکوں کے موتی لیے وہ بڑے دلگیر لہجے میں یوں تو رائے نے بے قراری سے اس کا سر اپنے شانے سے لگایا۔ *۔*۔*
شاہ میر فلائٹ سے واپس آگیا تو گھر کے وہی معمولات شروع ہو گئے اس کے بہت سے کام غیر محسوس طریقے سے عیش کی ذمہ داری بنتے جا رہے تھے شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ موش کی بڑی بہن زہینہ دوسرے بچے کی ولادت کے سلسلے میں آج کل نور منزل آئی ہوئی تھیں لہذا شاہ میر کے وہ سارے احکامات جو موش کے حصے میں آتے تھے اس کی مصروفیات کی بنا پر موتا عیش کو بچالانے پڑتے۔
گوکہ مریم کی نظر اس پر پڑی تو فوراً ٹوٹ دیتی مگر اسے یوں مہمانوں کی طرح اعزازی سلوک حاصل کرنے سے چڑھتی تھی۔ لہذا خاموشی سے کام نہانے میں اس کی مدد کرتی رہتی اور مریم اس کی ممنون ہوتی جاتی۔

”یہ کھیرا بھی تو ہے آبی! پھر اگر میں نے یہاں تھوڑا سا کام کر لیا تو کیا ہوا۔“ اس کی شکر گزاری پر ایک روز اس نے جھنجھلا کر کہا تو مریم نے بے ساختہ حیرت سے اسے دیکھا حتیٰ کہ دروازے سے اندر آتا شاہ میر بھی اس کی بات پر وہیں رک گیا۔
”تمہاری اس بات سے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے عیش! میں شاید انظلوں میں نہ پتا سکوں۔“ مریم کا مسرت سے لبریز لہجہ خاصا غیر متوقع تھا اس نے حیرت سے اسے دیکھا جو اس وقت جو شیلے انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر کہہ رہی تھی۔ ”نور منزل کی زمین میں تم بھی اپنی جڑیں جیسا سکو مجھے تو جیسے یہ خواب ہی لگتا تھا۔ اس گھر میں تم اٹھ جیسے کس طرح ہوگی مجھے ہم وقت یہی فکر رہتی تھی۔“
”یہاں نور منزل میں بابا کی یادیں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں یہاں ممد الحسن بن کر آئیں آپ اور میں سب اس گھر میں پیدا ہوئے پھر بھلا میں اپنی جڑیں کہیں اور کیسے محسوس کر سکتی ہوں آبی۔ یہاں مجھے اپنائیت تو اتنی نہیں ملی جتنا کہ میرا حق تھا البتہ اپنے ہونے کا احساس ضرور حاصل ہوا ہے۔ یہ کم تو نہیں۔“ مریم ک خوشی دیکھ کر وہ جیسے سی بڑے شہرے ہوئے گھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔
شاہ میر کی جانب اس کی پشت بھی جھپی اس کی موجودگی سے بے خبر اس نے بہت سچائی سے کہا تھا یہ سچ ہی تو تھا کہ اسے اس گھر سے صرف اسی لیے انیسیت تھی کہ یہاں اس کے والدین کی یادیں تھیں اور سب سے بڑھ کر یہاں مریم تھی اس کی ماں جانی۔ شاہ میر اس کی بات نہ کر مگر آنا وہیں سے پلٹ گیا تھا۔
”نہیں کہیں بھی چلی جاؤں۔ یہاں کی بخشش مجھے ہمیشہ اپنا سایہ بنائے رکھے گی خصوصاً اس لیے کہ یہاں آپ ہیں۔“
مریم کے چہرے پر یہ پھیلتی آسودگی یقیناً اس کے خیالات کی بنا پر ہی وجود میں آئی تھی۔ اس نے لاڈ سے مریم کے کندھے پر سر رکھا آخری فقرے پر جیسے سر شار ہو گئی تھی۔
”مگر آپ بھی دیکھیں کب تک یہاں رکتی ہیں۔ موصوف آصف صاحب کی بے قراریاں آج کل خاصے عروج پر ہیں۔“ انگلی سے وہ مریم کو چھیڑ رہی تھی۔ اس کے شجیدہ اور متین مزاج میں شونی کے رنگ صرف مریم کے لیے بھرتے تھے۔
”تم سے کس نے کہا یہ؟“ مریم نے محبوب سے انداز میں گھورا۔

”چچی بیگم! شاہ میر سے ذکر کر رہی تھیں تب ہی سنا تھا۔“ اس نے ہنستے ہوئے بتایا تو مریم مزید شرارتی۔
اس لہجے اس کا دل چاہا کہ اسے فیضان اور ماموں جان کے متعلق سب بتا دے مگر بہت جواب دے گئی صرف یہی سوچ کر کہ پھر مریم ان سے بات کرنے پر زور دے گی جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم خط کا جواب ملنے تک تو وہ ایسے کسی بھی اقدام سے گریز برتنا چاہتی تھی۔

۔۔*

بارے میں قلیل اس کے سوچیں بھی تو کیا سوچیں
وہ غیر نہیں لیکن اپنا بھی نہیں لگتا

ایہ میری گنگنا نہیں صبح کے وقت زیادہ عروج پر تھیں۔ وہ پونیورسٹی کے لیے تیار ہو کر گھر سے لے کر لاؤنچ میں ہی وہ ذکی کے ہمراہ بیٹھا حسب خاصے اوپنچے والیوم پر گنگنا رہا تھا۔ اس نے اس سانسے سے گزرتی موش پر نظر ڈالی اور شاہ میر کی گنگناہٹ سے لطف اندوز ہوئی یا پھر کی جانب قدم مارنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ذکی کی آواز پر مرکز دیکھا یوں میں سوال خیر تھا۔

”مونیورسٹی جا رہی ہو؟“ اس کے مرکز دیکھنے پر وہ ایک جھلکا تا اس کے نزدیک آکر رک گیا۔
”جی ہاں۔“ اس غیر ضروری سوال کا اس نے اس مناسبت سے جواب دیا۔

”اوپنچے تمہیں ڈراپ کر دوں۔“ احسان عظیم نے انداز میں اس نے کہا تو عیش کی بھنوں تن۔
شاہ میر بھی اپنی گنگناہٹ میں بھول کر ان دونوں کی بات متوجہ ہو چکا تھا۔

”جی نہیں شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی۔“ خشک لہجے کے ساتھ اس نے آگے بڑھ جانا چاہا۔
”بہت شوق ہے تمہیں دھکے کھانے کا؟ جب گھر آؤ تو میں موجود ہوں تو کس لیے اتنے خیرے کرتی؟“ ذکی بدلتی پر اتر آیا تھا۔ عیش نے شعلہ بار سانس سے اسے گھورا، ذرا سی دیر بھی وہ نام نہاد لہجے کا مظاہرہ نہ کر سکا۔

”میں بد تمیزی برداشت کرنے کی عادی نہیں مسٹر۔ آئندہ مجھ سے بات کرنے سے پہلے ذرا سوچ لو۔“ اس نے سخت لہجے کا گھور اپن اس نے بڑا واضح انداز میں ظاہر کیا تھا۔

ذکی کے تو لکھوں سے گلی سر پر بھی۔ انتہائی گوار نظروں سے اسے سر تپ رہا تھا۔
”کیوں ایسی کون سی اہم شخصیت ہو تم کہ تمہارا حق قدر لحاظ کیا جائے۔ نور منزل کی سب لڑکیاں جس طرح رہتی ہیں تم بھی اسی طرح رہنا سیکھو ورنہ۔“
انہوں میں ضد اور رعونت سے وہ غرا کر لولا تو عیش اس کا سا ضبط بھی جواب دے گیا۔ بھلا وہ کون ہو تا تھا

اس پر عجب چمکے والے۔
”وہمکیاں کسی اور کو نہ ذکی! میں تمہاری زر خرید نہیں اور نہ ہی جانوروں کی طرح اپنے حقوق کی پامالی پر خاموش رہنا سیکھا ہے میں نے۔ اپنی گنگنا سوچ صرف اپنی ذات تک محدود رکھو مجھ پر لاؤ کر نے کی کوشش کی تو منہ کی کھاؤ گے۔“ نہایت غصے سے اس نے ذکی کو جواب دیا اور شاہ میر کے قریب آنے پر باہر کی طرف قدم پھسایا۔

”اومٹہ۔“ آئی کہیں سے نواب زادی، میں نے تو یونہی تحفظ کی خاطر ایک آفری تھی محترمہ کو مگر۔“ شاہ میر کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں وہ بڑی حقارت سے بولا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ آگے بڑھتی ہوئی عیش کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ رنج اور غصے نے اس کی حالت غیر کر دی۔ منسوب قدموں سے وہ واپس پلٹی اور ذکی تک آکر رک گئی۔

”تحفظ خلوص میں ہوتا ہے مسز ذکی غرض اور لاچ میں نہیں۔ میں اپنی طرح جھکتی ہوں آپ کے جذبہ تحفظ کو ایذا مند یو مجھے آپ کی پناہ یا حفاظت درکار نہیں۔ لہذا آپ تردد نہ ہی کریں تو بہتر ہوگا۔“
دارنگہ دینے کے انداز میں وہ طنزیہ نظروں سے اسے دیکھ کر پلٹ گئی۔

”ہائے ہائے اس لڑکی کی زبان ہے یا چلتی تلوار۔“
ذکی تھلا کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ عقب سے تائی اماں بیٹے کی اس عزت افزائی پر دہائی دینے کے سے انداز میں ناک پر انگلی رکھ کر یوں شاہ میر نے خاصی بے زاری سے ان دونوں کو دیکھا اور اندر چلا گیا۔

دیکھا ہے مجھے جب سے بے چین بہت سے دل کہنے کو کوئی تجھ سے رشتہ بھی نہیں لگتا راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے وہ دوبارہ گنگنا لگا تھا۔ باہر سے اب بھی نانا اماں اور چھوٹی مائی کے توبہ توبہ ایسی لڑکی نہ تو ہم نے کہیں دیکھی نہ سنی جیسے فقیرے گاہے بگاہے اس کی سماعتوں میں اترتے رہے لہذا کافی دیر تک وہ باہر نہ نکلا۔

۔۔*

تھک گیا میں کرتے کرتے یاد تجھ کو

چونک سا گیا۔

دیکھا وہ ان پھولوں کے باعث پریشان ہے۔
ہے تو؟ آخر یہ کسی کو کچھ بتائی کیوں نہیں۔
سوچ پر خود ہی جھنجھلا گیا اور کچھ سوچ کر اسے ہار
پھر اپنا ارادہ موقوف کر کے آگے بڑھا اور ڈیک
دیا۔

آخری بچی تیرے زانو پر آئے
موت بھی میں شاعرانہ چاہتا ہوں
غزل کے آخری شعر کے ساتھ ہی ڈیک
بند ہو گیا اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں
سامنے ہی شاہ میر کھڑا تھا۔ وہ بوکھلا کر سیدھی ہوئی
آنکھوں میں آنی کی ہے اختیار پھیلی کی پشت سے
ڈالی گروہ دھجکا تھا۔ عکس نے چاہا کہ اس کے
کنے سے پہلے اٹھ کر کمرے کی راہ لے لیکن وہ اس
ارادہ بھانپ چکا تھا لہذا فوراً اسے پکار لیا۔
”عکس پلے ایک سیکنڈ رکے۔“ اور وہ جو بیگ
کرانے کی تیاری کر رہی تھی ٹھٹھک کر رک گئی۔
”کی؟“ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
”کیا بات ہے؟ کوئی پرالم ہے کیا۔“ چند لمحوں
خاموش رہنے کے بعد اسے یہی جملہ سوچا جو اس
ڈالا۔

”نہیں۔ اس آل راینٹ۔“ پھینکی سی مسکراہٹ
لبوں پر سجاتے ہوئے اس نے اس کی موت
ممنونیت سے کہا۔ ”گروہ اتنا بے خبر اور بے شعور
تھا کہ اس کی آنکھوں سے جھلکتی ویرانی محسوس
کیا تا بھی بولا۔
”پھر آپ اتنی اپ سیٹ کیوں لگ رہی ہیں
سنیے پر بازو لپیٹتے ہوئے بڑی اپنائیت سے سوال کیا تو
شہر ری رہ گئی۔
”تو گویا عکس حمزہ اب تمہارا چہرہ کھلی کتاب
رہا ہے جس نے چاہا جہاں سے چاہا بڑھ لیا۔ تھ
تم پر ہمساری وضع داری پر۔ یوں دھوکا کا اشتہار
بننا ہے تو پھر خود کو سروسٹہ راز سمجھنا بھی جھوڑ
و ذہن نے اسے اچھے خاصی فہمائش کر ڈالی تھی۔ وہ خود
نادم ہونے لگی۔

اب تجھے میں یاد آتا چاہتا ہوں
کوئی آنسو تیرے دامن پر گرا کر
بوند کو موتی بنانا چاہتا ہوں
شاہ میر کی میوزک لائبریری بھی، مست ذوق کی حامل
تھی۔ اس لمحے چونکہ مریم اور چچی بیکم ہار کیٹ گئی ہوئی
تھیں لہذا وہ شاہ میر کی مخصوص راکنگ چیئر پر بیٹھی
جھجکیت کی غزل سن رہی تھی۔ یہ کوئی تیسری بار اس
غزل کو یاد آ رہا تھا کہ گیتا ناچار شاہ کو اٹھ کر اتار دیا۔
جائے اس کے ذہن میں کوئی کچھ بھی اٹھ نہ سکتی تھی کہ
وہ جب سے یونیورسٹی سے آئی تھی اسی طرح بغیر
کپڑے تبدیل کیے بنا کچھ کھائے ہیے مریم اور چچی بیکم
کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے موڈ کے
مطابق چپ چاپ بیٹھی تھی۔

شاہ میر نے اندر داخل ہوتے ہوئے بنا چاہ پیدا
کیے صوفے تک کا فاصلہ طے کیا۔ عکس اس کی
موجودگی سے بے خبر اب بھی آنکھیں موندے بیٹھی
تھی راکنگ چیئر کی گردش اس کے جاننے کا مظہر تھی۔
جب بھی مریم اور چچی بیکم کہیں گئی ہوتیں وہ عکس کی
موجودگی میں اپنے پورشن کی طرف آتے ہوئے کتر آتا
تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کی آمد سے خاصی قیدی ہو
جاتی تھی۔ نور منزل کے بڑے سے منقش دروازوں
والے گھر میں صرف یہی تین کمروں کا پورٹن اس کی
جائے پناہ تھی سو جب یہاں بھی شاہ میر آتا تو وہ خود کو
بندھا ہوا محسوس کرتی تھی، اسے اس بات کا بخوبی
اندازہ تھا لہذا جب سے گھر لوٹا تھا بڑے لاؤنج میں ظنیر
بھائی اور حمزہ بھی کے ہمراہ بیٹھا تھا مگر اس غزل کی
تکرار نے اسے مجبور کیا کہ وہ اندر چلا آئے۔

نظریں بے اختیار باندھتاں بیٹھی عکس پہ جارکی
تھیں جو اس وقت ڈارک براؤن جینز پر اہیل گرین
کرتے دوپٹے میں بلوس اس ماحول سے الگ کوئی اور
ہی شے لگ رہی تھی۔ اس کی گلابی رنگت اہیل گرین
رنگ میں کچھ زیادہ ہی چمک رہی تھی مگر چہرے پر
چھائے نظر کے باطل اس کے ذہنی خلفشار کے غماز
تھے۔ پیرا بھی تک جو کرزی قید میں تھے۔ ساتھ بڑے
شوئلڈ بیگ سے جھانکتے پھولوں پر نظر پڑی تو وہ کچھ

سوچتا رہا۔

البتہ وہ شاہ میر کی انسان دوستی کے متعلق جان کر
کافی متعجب ہوئی اس کے خیال میں تو اپنی فیملی جس
میں مریم بھی شامل تھی کے علاوہ صرف اور صرف
مہوش کا اسے خیال رہتا تھا باقی سب سے تو صرف
علیک سلیم تھی اس کی، حتیٰ کہ نور منزل کے لڑکوں
سے بھی اس کا کوئی خاص دوستانہ نہ تھا۔ وہ زیادہ تر
اپنے کو لیکر پائلٹ اور ایئر لائن کے لوگوں سے ہی ملنے
جلنے کا عادی تھا مگر آج جس طرح اس نے اس کی
اہمیت کو اپنی گفتیش سے ظاہر کیا تھا وہ کسی حد تک دل
میں مسرور ہو گئی۔

ممایا کے بعد صرف اور صرف مریم سے ہی کچھ
امیدیں رہ گئی تھیں اسے دگر نہ جس طرح ماموں جان
نے طوطا چمکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے بعد تو اس کا
سب پر سے اعتبار ختم ہو گیا تھا۔ آج مریم جانے کیسے
اسے وش کرنا بھول گئی تھی مگر اس نے دل پر نہیں لیا
کہ بہر حال بھول چونک انسان سے ہی ہوتی ہے
دوسرے دل میں یہ خیال بھی ہوا کہ شاید ابھی ممایا کی
برسی بھی نہیں ہوئی۔ لہذا مریم اسے وش کر کے ان کی
یاد آ نہ نہ کرنا چاہتی ہو مگر محبت کرنے والوں کو بھی بھلا
بھلایا جاسکتا ہے۔

رائمہ کے وش کرنے پر اس کے اندر کے کئی زخم
ایک ساتھ کھل اٹھے تھے۔ فیضان کے دیے وہ تمام
گفتش اور وہ وش کالز اسے یکدم ہی یاد آ گئیں جو اس
کی ہر تھ ڈے کے حوالے سے اس نے کی تھیں۔

”جائے اب کہاں ہیں وہ؟ بیڈر لیتے ہوئے اس
نے نگلیے میں منہ چھپاتے ہوئے سوچا۔

تھک گیا میں کرتے کرتے یاد تجھ کو
اب تجھے میں یاد آتا چاہتا ہوں
شاہ میر نے پھر وہی غزل لگا دی تھی اس نے نگلیے
کانوں پر رکھ لیا۔ ٹھکن گئی اور باپوسی بھی جانے کیسے
ننید اس پر جاوی ہو گئی۔ آٹھ بجس وقت کھلی۔ شام
ڈھل رہی تھی کمرے میں موجود شاہ رگوا تھے کہ مریم
اور چچی بیکم کی واپسی ہو چکی ہے۔ اس نے پہلی فرصت
میں دوش روم کا رخ کیا اور منہ دھو کر بیا ہرنگل آئی۔

ابھی بچپن میں جا کر ان دونوں کی مدد کرنے کا ارادہ ہی تھا کہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اندر داخل ہوئی مریم نظر آئی۔ ہاتھوں میں دو ٹک اٹھائے وہ وہیں چلی آ رہی تھی۔

”اُئی ایم ریلی ویری سوری عطش! میں صبح جانے کیسے بھول گئی۔“ قریب آنے پر وہ ندامت سے کہہ رہی تھی۔ اس نے برش روک گریباؤں کی جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا۔

”آج کا خوب صورت دن بہت بہت مبارک ہو تمہیں۔“ ٹک ٹیبل پر رکھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے مریم نے محبت سے کیا تو وہ جان گئی کہ شاہ میر نے خوب مریم کی کلاس لگائی ہے جب ہی وہ بے چاری اس قدر پشیمان تھی۔

”ٹھنک یو آئی۔“ جواباً وہ مسکرا دی۔ سو کر اٹھنے سے موڈ بھی خاصا فریش ہو رہا تھا۔ بھولنے والی بات اس نے قصداً نظر انداز کر دی۔ مریم اسے مسکراتا دیکھ کر اپنی پشیمانی بھول گئی تھی۔

”یہ لو کوئی جلدی سے لی لو اور پھر تیار ہو جاؤ۔“

”کیوں نہیں جانا ہے کیا؟“ ٹک تھام کر وہ فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

”ہاں آج میں تمہیں ڈنر کراؤں گی۔“ مریم کے لہجے سے مسرت جھلک رہی تھی۔

”کیوں۔ کوئی خاص بات ہے۔“

”حق لڑکی! آج تمہاری برتھ ڈے کی خوشی میں میں نے امی سے اجازت لی ہے باہر ڈنر کرنے کی اور شاہ میر کو بھی منایا ہے۔ وہ ہمیں لے جائے گا۔“ مریم کے خوشی خوشی پروگرام بتانے پر وہ ایک بار پھر ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہونے لگی۔

”مگر مجھے تو نہیں جانا۔“ بدقت تمام خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

”کیوں۔“ مریم اس صاف انکار پر احتجاجاً سختی سے بولی تھی۔

”بس میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ ٹک خالی کر کے رکھتے ہوئے اس نے بے چلک انداز میں کہا۔

”ہمیشہ اپنے دل کی پرواہ کرتی ہو۔ کبھی میری بھی

مان لیا کرو۔“ اب کے مریم کے انداز میں خفگی کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ بے چینی سی ہو گئی۔ شاذ ہی مریم بے انداز اختیار کرتی تھی جو اس کی جان پر بتا دیتا۔ شاکی تھا لہجہ مریم کا خاصا نہیں تھا بہت ضبط کے بعد اس منزل تک آئی تھی وہ۔

”پلیز آئی! آج میرا کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ پلیز اصرار مت کریں۔“ اس نے بجا جت سے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے میں اصرار نہیں کرتی مگر تم بھی انکار مت کرو۔ خاموشی سے اٹھ کر تیار ہو جاؤ۔“ اس کا انداز ٹالنے والا نہ تھا۔ حتیٰ لہجے میں بولتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔ ”گلے دس منٹ بعد تم مجھے لوگ روم میں تیار ملنا اور گرنہ خیر نہیں۔“ حکم سنا کر وہ جاری تھی کہ عطش پٹنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

بمقامیایا کی یاد بے طرح آ رہی تھی۔ اس کی برتھ ڈے اور کامیابی کے تمام دن وہ بہت خاص واقعہ کی طرح مناتے تھے۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد نہ ہوتے ہوئے بھی اکلوتی تھی جس سے ان کی ساری خوشیاں وابستہ تھیں مگر آج وہ سارے حسین دن قصہ پارینہ بن چکے تھے۔ شہر دل میں یادوں کا اک ہجوم تھا اور وہ تنہا۔

ٹھیک دس منٹ بعد مریم نے اندر جھانکا تو وہ یسین فکر شیفون کے سوٹ پر بلیک ٹیل والے دوپٹے میں ملبوس بالوں کی فریج ٹائٹ باندھتی نظر آئی۔ وہ توصیفی اور شاباش دیتی نظروں سے اسے دیکھتی اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔

”چلیں۔“ مریم اس کے اٹھنے سے پہلے ہی تیار تھی پروگرام جو نالیا تھا۔

”جی۔“ نازک سی سینڈل میں پیرو ڈالتے ہوئے اس نے سر ہلا کر کہا۔

”ہیلو معزز خواتین۔“ شاہ میر نے اسی لمحے اندر جھانکا تھا۔ عطش نے جھکے اسٹریپ لگاتے ہوئے اسے دیکھا۔ گرے شلوار سوٹ میں وہ ہنستا مسکراتا فریش موڈ میں اپنے دراز قد کے باعث بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”پہناتا ہے کہ نہیں۔“ ذکی دوبار پوچھ چکا ہے کہ کہاں اس سفر پر اور میں اب اسے ٹالنے ٹالتے چڑ گیا۔“ مریم اور اس پر نظر ڈالتے ہوئے وہ اندر آکر اٹھا۔

”ایک تو میں ان دونوں بہن بھائی سے سخت عاجز ہوں۔ صدف کو بھی ہر وقت یہی کھد بھد لگی رہتی ہے۔“ مریم نے بے زاری سے کہتے ہوئے پرسن اٹھایا۔ ”میرا حال تم کچھ مت کہنا امی کو میں نے سمجھا ہے کہ وہ کہہ دیں گی کہ ہم عطش کی فریڈ کے یہاں ہیں۔“ اس کی برتھ ڈے کا پتا چل گیا تو وادی جان کاہ انھادیں کی۔“ اس نے بے جلت شاہ میر کو بلایا۔

”کیوں۔“ آخر ہمارے کہیں باہر جانے میں ہرج ہی ہے۔“ مریم کی بات پر وہ ساتھ چلتے ہوئے چوگی۔

”وہ دراصل۔“ اس کے کڑے استفسار پر مریم لب گئی بے دھیانی میں اس کے سامنے زبان پھسل گئی تھی۔ شاہ میر نے اسے مشکل میں دیکھا تو بولا۔

”دراصل وادی جان کا موقف یہ ہے کہ اگر آپ اس میں تو اپنی خوشی میں سب کو شریک کریں۔ اکیلے ہی دو اینٹ کی مسجد بنا کر نہ بنیں۔ اس طرح دونوں فاصلے آجاتے ہیں۔“ لوگ روم کے دروازے پر کھڑے ہوئے اس نے سنجیدگی سے وادی جان کا ماضی سمجھنے اس کے گوش گزار کیا تو اس نے کچھ سوچ کر ہنستے ہوئے شاہ میر کو گہری نظر سے دیکھا۔

”کیا آپ کسی کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔“ ذہن میں موش کا خیال آتے ہی اس نے سوال کر ڈالا تھا۔

”شاہ میر نے اس اچانک استفسار پر بھنوس اچکا کر نہ کہنے کا عندیہ دیا اور پھر ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بات بکھر کر مسکرا دیا۔ مریم البتہ خاموش کھڑی تھی۔

”میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا۔ یوں بھی میں اسے لے جانا چاہتا ہوں اور کسے نہیں یہ ایک کمپیئر مسئلہ ہے اس ٹاپک پر پھر بھی بات کریں گے۔ خیر یہ بالکل تو یہ آرڈر کریں کہ کدھر جانا ہے۔ مسکرا کر گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس نے خوشگوار سی دال کیا تو مریم نے استغماہی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ساحل پر چلیں۔“ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شاہ میر نے مشورہ دیا تو اس نے بلا تکلف و بلا تامل سر اثبات میں ہلا دیا۔ کہ سمندر اس کی کمزوری تھا۔ کراچی کا سارا حسن اسے اسی سمندر کی مرہون منت لگتا تھا۔ یہ ساحلوں کے ساتھ لگا شر اسے کتنا عزیز تھا۔ کوئی اس سے پوچھے۔

دینی گنڈا اور لاہور میں بھی اس نے بہت سا وقت گزارا تھا مگر جو بات کراچی کی تھی وہ اسے کہیں محسوس نہ ہوئی روشنیوں والے اس خوب صورت شہر کی کشش نور منزل کے اندھروں کے باوجود اسے اپنا اسیر رکھتی تھی۔

کی دلو پچھتے پچھتے اندھیرا گرا ہو گیا تھا۔ ساحل پر بنے فلینس اور گھروں کے علاوہ ریسٹورنٹ کی جگہی ہوئی لائٹوں نے ماحول کو ایک دم روان پرور بنادیا تھا۔ مگر میوں کی ٹھنڈی رات میں پورے چاند کی چاندنی ہو اور ساحل ہو تو دل خود بخود غم بھلا کر خوشیوں کے راگ الاپنے لگتا ہے سو وہ بھی کیلی رست پر قدم رکھتے ہی سب کچھ فراموش کر بیٹھی۔ مریم اور شاہ میر اگر اسے آواز نہ دیتے تو شاید لہروں کے تعاقب میں وہ خاصی دور نکل جاتی اس نے مڑ کر دیکھا۔

”عطش واپس آؤ۔“ نیم ملنے اندھیرے میں دور ساحل پر کھڑی مریم اسے ہاتھ ہلا کر پکار رہی تھی۔ اس نے پلٹنا چاہا تو ایک تند تیز لہر سے فلینس توازن ڈگمگا گیا اور وہ ایک سینکڑں میاں میں گرنی چلی گئی۔

”ہما۔۔۔۔۔ بابا۔“ بے اختیار اس نے انہیں پکارا جو اس سے بہت دور تھے اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے اوپر کنٹرول کھو کر پانی کے رحم و کرم پر آگے نکل جاتی۔ شاہ میر کے مضبوط ہاتھ نے اسے کلائی سے پکڑ لیا۔

”یہ کیا حماقت ہے عطش! مرنے چلی تھیں بے وقوف لڑکی۔“ اسے کھڑا کرتے ہوئے وہ اس قدر سخت لہجے میں ڈیٹ کر بولا کہ وہ سن گئی سمندر کا ممکن پانی آنکھوں میں بھی چلا گیا تھا۔ اسے اس پر مستزاد شاہ میر کی ڈانٹ بے اختیار اتر رہی تھی وہ اس کا کندھا پکڑ کر روٹی تو پھر روٹی چلی گئی۔

”عطش! عطش! مریم ہانتی کا مٹی ان تک بمشکل

پہنچ سکی تھی شاہ میر اس کے بے موقع آنسوؤں پر
شہر را کھڑا رہ گیا۔ ”کیا وہ اسب ٹھیک تو ہے نا۔“
پلیز شہانی اسے پانی سے تو ہار لاؤ چاندنی نے لہروں کو
یا کل بنایا تھا ان کی شوریدہ سری سے گھبرا کر اس نے
شاہ میر سے التجا کی۔ تو وہ مضبوط قدموں سے ان دونوں
کو ساتھ لیے پانی سے باہر نکل آیا۔

ارد گرد اور بھی لوگ تھے مگر ورنگ ڈھے ہونے
کے باعث زیادہ رش نہ تھا لہذا اس افتاد کا کسی کو پتا بھی
نہ چلا۔

”کیا کرتی ہو عطش! لے کر میرا خون خشک کر ڈالا تم
نے۔“ آخر اتنے آگے جانے کی ضرورت کیا تھی۔ اگر
شہانی نہ ہوتا تو۔“ اس نے جھرجھری لے کر عطش کو
کندھے سے تھام کر ریت پر ہی بٹھالیا جو کہ اس
حادثے پر اب تک بدحواس ہوئی روئے جاری تھی۔
”اب پلیز رونما بند کرو۔ ایک تو حماقت کی اس پر رو
بھی رہی ہو۔“ شاہ میر جانے کیوں اتنا خفا ہو رہا تھا
اس نے جی بھی نظروں سے اسے دیکھا جو اس وقت
غصیلے تیروں میں اپنے مخصوص انداز سے ہٹ کر
خاصا مختلف لگ رہا تھا۔

”اچھا پلیز۔ تم اسے ڈانٹو تو نہیں۔“ مریم نے اس
کے آنسو صاف کرتے ہوئے سر پر کھڑے شہانی کو منع
کیا۔

”تو کیا انعام دوں انہیں۔ کارنامہ کیا ہے کوئی۔“
اس کے غصے کا گراف کسی طور نیچے نہیں آ رہا تھا۔ وہ
دونوں خاموش ہو گئیں۔ مریم سے رومال لے کر اس
نے اپنے آنسو صاف کیے اور چپ چاپ کھڑی ہو کر
کپڑے سکھانے لگی۔ شاہ کا مود آف ہو چکا تھا وہ
ایک طرف جا کر ریت پر پیٹھ گیا تھا۔ دوسری جانب وہ
بھی خاموشی سے کھڑی اپنے کپڑے سکھا رہی تھی۔

”تم دونوں آخر جیسے کس بات کی سزا دے رہو۔
میں یہاں تفریح کرنے آئی تھی کہ تم دونوں کی
نارا فکسی برداشت کرنے۔“ چند لمحوں بعد جب مریم
نے اچھا خاصا جل بھن کر کہا تو وہ دونوں ہی نا دم ہو کر
اس کے پاس چلے آئے۔ عطش کچھ نہ بولی اور مریم
کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

چلو آؤ۔ تم لوگوں کو کچھ کھلا ہوا دلوں۔ کیا یاد کرو گی
”شاہ میر کو اپنے موڈ پر قابو پانا آتا تھا وہ چپ چاپ اس
دونوں کے ساتھ ریگسٹروٹ میں چلی آئی۔“ کنارہ کی
آخری ٹیبل ان کی منتظر تھی۔

باوجود سخت بحث تحیص کے شاہ میر نے اسے مل
نے نہ کرنے دیا۔ بقول اس کے اس کی طرف سے کسی
گفت تھا مریم نے البتہ رستے سے اسے کلکشن
شاپنگ مال سے دو خوب صورت ریڈی میڈ سوٹ
دلانے جن کو شاہ میر نے پسند کیا تھا۔ وہ کیا بولتی کہ اس
کی پسند واقعی اچھی تھی وہ ایسی آئی تب بھی شاید یہی
ڈریس اپنے لیے پسند کرتی۔

اس چھوٹے سے حادثے کے باوجود انہوں نے
انجوائے کیا تھا۔ شاہ میر کی طبیعت میں شوخی اور
چونچالی تھی۔ جسکی تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے مخصوص
انداز میں ہنستا مسکراتا ہوا تھا۔

انسان فطری طور پر محبت اور عزت کا مظلومی رہتا
ہے۔ شاید اسی لیے شاہ میر کے رویے نے اسے بہت
متاثر کیا تھا۔ لہذا ان دونوں وہ بہت سرشار تھی البتہ
وقار ماموں کے خط کا انتظار اسے تمام وقت اپنے حصار
میں لیے رکھتا۔ اس کی زندگی کا دار و مدار اب دوسروں
کے فیصلوں پر ہے اس کا اسے شدید قلق تھا مگر
ماسوائے صبر کے کوئی چارہ نہ تھا۔

ذکی کی زبان درازیاں اور تائی اماں کی کڑوی
کسمپلی باتیں دیکھی ہی تھیں۔ اس نے تو یہاں تک
سنا کہ ذکی اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ بات یہی ایسی
تھی کہ اسکا روم روم جل اٹھا۔ ایسا تو وہ قیامت تک
برداشت کرنے والی نہ تھی۔ اس کا اندازہ ماں بنے کو
بجوبی تھا لہذا اس کے شیلے انداز میں چپک لانے کے
لیے تائی اماں نے ایک نئی چال چلی۔ اب اس کے
ساتھ نسبتاً پہلے سے بہتر رویہ روا رکھا جاتا اس کے
کھانے پینے پر نظر رکھ کر طعنے کرنے والی تائی اماں اب
اس کے یونیورسٹی سے آتے ہی صدف اور سحر بھائی
کو کھانا لانے کے لیے دوڑانے لگتیں۔ اس کا پاپٹم
اس کی حیرانی فطری تھی اور جب اسے اصل وجہ

علوم ہوئی تو شدید متغیر سے اس نے ان کی جانب
دیکھا بھی چھوڑ دیا مگر ان پر اثر نہ تھا۔ ذکی البتہ زیادہ روز
چولانہ پہن سکا اور اپنی آنٹی خود سری پر اتر آیا۔

صدف کا رویہ ماں اور بھائی کی اس خواہش پر کہ
مسلح ہو سونائیں مزید پر گشت ہو گیا تھا۔ بات بات پر وہ
لاٹ کھانے کو دوڑتی۔ سحر بھائی کے طنز بھی دیوڑھی
بے قراری پر چھوڑ کر ماندہ برتن لگے تو اس نے اپنے
پورشن سے لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ مریم کی اس وجہ سے
خوب شامت آئی واوی اسے ڈانٹیں اور چچی بیگم کو
بھی خوب سنایا جاتا کیونکہ ان کے خیال میں عطش کو
ان دونوں نے ہی مل کر سرخسایا تھا۔

”دونوں نے میں بلکہ ٹیبل نے۔“
عطش کو پروا نہ تھی۔ وہ محض وقار ماموں کے
جواب کی منتظر تھی مگر جوں جوں نا تم پر ہوتا جا رہا تھا اس
کی تشویش نا امیدی میں ڈھلتی جا رہی تھی اور ان ہی
دونوں جب وہ حد سے زیادہ چڑچی ہو رہی تھی۔ ناصر
گیلانی کا پو پوئل اس کے ارد گرد پھل چا گیا۔ وہ حیرانی
سے ساکت رہ گئی۔

سحر بھائی کی عقلی نظریں شاہ میر کے نظارہ لاہروا
رویے کی پر تیش بھی تھیں لہذا اس کی صلاحیت رکھتی تھیں
کو کہ انہیں فی الحال یقین نہیں تھا اس لیے محض
اشارے کنائیوں سے ہی طعنے جاتے۔ شاہ میر سب
سناتا اور سمجھتا تھا مگر کان لینے ادھر سے ادھر ہو جاتا۔
کیونکہ خواتین سے خصوصاً ایسی ناکوں پہنے چبانے
پر مجبور کر دینے والی خواتین سے وہ بحث کرنے کا خوگر
نہیں تھا۔

اس کے گھر سے اس کی دو بھیمیاں اور ایک بڑی
بہن آئی تھیں کچے اور چرے کے تاثرات سے ہی
سخت ناپسندیدگی کا واضح اظہار ہو رہا تھا۔ جس انداز
سے انہوں نے تنقیدی نظریں اس کے سراپے اور
نور منظر پر ڈالی تھیں۔ اپنی کمائی کی کا احساس دلاتی یہ
دیکھیں اس کے اندر جیسے سکتے شعلوں کو ہوا دے
سکتیں۔

نور جہاں بیگم کے لیے بھی یہ انداز تذلیل سخت
طیش کا باعث تھا۔ مریم اسے تو بمشکل اندر لے گئی مگر

تائی اماں اور واوی جان نے مل کر جس طرح ان کی
عزت افزائی کی اس کی آوازیں اسے چچی بیگم کے
کمرے تک سنائی دے رہی تھیں۔

ناصر کے گھر سے بھی صرف خانہ پری کے لیے آئی
تھیں۔ اسی لیے اس طرز گفتگو کے جواب میں اینٹ
چٹھری برسے۔ واوی جان کے دیدے کے آگے آج
تک کسی کو بدلنے کی ہمت نہ ہوئی تھی حیرت و
استعجاب کے ساتھ ساتھ شدید جلال نے انہیں اپنی
لپیٹ میں لے لیا جس کو انہوں نے عطش پر برس کر
ٹھنڈا۔

”واوی جان! یقین کیجئے مجھے اس بارے میں کچھ
علم نہ تھا ورنہ انہیں یہاں آنے سے پہلے ہی روک
دیتی۔“ اپنے غصے پر بمشکل ضبط کے پہرے بٹھاتے
ہوئے اس نے اذنا قاع کیا۔

”واہ بھئی۔ کیا معصومیت ہے۔ بنو کو کچھ خبر ہی
نہیں اور یہاں وہ موا کم ذات پارات سمجھنے کے درپے
ہوا جا رہا ہے۔“ تائی اماں کے ٹھٹھا جملے پر اس کا خون
کھول اٹھا۔

”تائی اماں۔ پلیز آپ خاموش رہیے۔“
”عطش۔ تمیز کیجھو ذرا۔ بہوں سے ایسے بات کی
جاتی ہے۔“

واوی جان کا رعب جلال اس کی بلند آواز پر جاگ
اٹھا۔

”ارے میں کیوں خاموش رہوں میں تو خدا لگتی
کرتی ہوں۔ تم جیسی لڑکیاں کالج یونیورسٹی جاتی ہی
اس لیے ہو تاکہ وہاں اپنے لیے کوئی اچھی اسامی
پھاس سکو ارے یہی تو گریہیں تمہارے اپنی ماں جیسے
جادو کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تمہارے
بھٹکنڈے۔“

ان کی زبان چلی تو رکے کا نام نہیں لے رہی تھی۔
واوی جان کی تائید کرتی نظریں اسے اپنی نظروں میں
گرا لیں۔

”میں کتنی ہوں خاموش ہو جائیے۔ آپ اب ایک
لفظ نہیں سنوں گی میں۔“
ان کی باتیں اور واوی جان کی خاموشی اسے چیر کر

رکھ گئیں تو وہ پھنکار اٹھی۔ تائی اماں کے لب یکدم ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس کی آنکھوں سے شرارے لپک رہے تھے۔

”اگر مجھے یہ سب ہی کرنا ہوتا تو یہاں آنے سے پہلے ہی میرا گھر بس چکا ہوتا مگر میں ایسی گھٹیا سوچ نہیں رکھتی، آپ کی طرح کہ رشتوں کا جال بچھا کر دولت ہتھیانے کی کوشش کروں۔“ زہر خند لہجہ اور شعلہ بار نگاہیں اس کے غصے کی غماز تھیں۔

”بری میں نہیں بری آپ کی سوچ ہے جب ہی اپنے ناکارہ بیٹے کو چارے کے طور پر استعمال کر کے میرے بابا کی تمام جائیداد پر قابض ہونے کا خواب دیکھا ہے آپ نے۔“

”عطش! چچی بیگم نے بالا خر آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔“ چپ ہو جاؤ بیٹا۔ ایسے نہیں کہتے۔“ شدت غصہ سے وہ کانپ رہی تھی۔

”دیکھ لیجئے امی! تائی اماں سے کچھ اور نہ ہو سکا تو انہوں نے پینتڑ بدل کر ساس کی طرف رخ پھیرا۔“ کیسے مجھ پر اور میرے بیٹے پر الزام لگایا ہے اس بدانت بھری چھوڑی نے آپ کے سامنے۔“ مگر مجھ کے آنسو بہانان کے لیے کوئی نام مشکل تھا۔

”عطش! تم نے بہت بد تمیزی کی ہے۔ معافی مانگو اپنی تائی اماں سے۔“ دادی جان تو خود اس کہانی میں شامل تھیں۔ عطش نے تڑپ کر جن نظروں سے انہیں دیکھا انہوں نے نظر پھیر لی۔

”معافی مانگ لو بیٹا۔“ چچی بیگم نے معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے ایسے پیار سے پیکار کر دیا کہ کوئی نادان ڈری سہی بچی نہ تھی جو ان کی بات پر جھٹ سرجھکا دیتی۔

”میں نے کوئی غلطی نہیں کی اور نہ ہی میں معافی مانگوں گی۔ جس کی جو مرضی میں آئے کر لے۔“

خود کو ان کے بازوؤں سے آزاد کراتے ہوئے اس نے دو ٹوک لہجے میں بلند آواز میں کہا اور تیز قدموں سے چل کر کمرے سے نکل گئی، مگر اسے پیچھے ایک طوفان چھوڑ آئی جس کی تباہ کاریاں اس کے تصور سے بھی زیادہ بھیاں تک تھیں۔

یعنی دادی جان اور تائی اماں نے مل کر اس کی اور ذکی کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”ہرگز نہیں۔ میں مرجاؤں کی تیا جان! اگر ذکی سے شادی نہیں کروں گی۔“ اس کا آہنی لہجے میں دیا گیا یہ جواب تیا جان کے لبوں کو تالا لگا گیا۔

”مگر بیٹا! تمہاری دادی جان۔“

”پلیز تیا جان! آپ ہی میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“ انہوں نے نرمی سے اسے سمجھانے والے انداز میں دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا تو اس نے عاجزی سے ان کی بات کاٹ کر جیسے التجائی۔

”جو رشتے مفاد پرستی کی بنیاد پر استوار کیے جائیں وہ پایدار نہیں ہوتے۔ خدا را! انہیں سمجھائیے کہ مجھے محض ایک صاحب جائیداد لڑکی سمجھ کر یہ فیصلہ نہ کریں۔“

اب کے اس کا سر جھکنے کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی پست تھا۔ تیا جان کی شریف النفسی کے باعث وہ ان کے سامنے ان ہی کی بیوی اور بیٹے کے متعلق اس صاف گوئی کے لیے نامور اور متاثر ہو چکی تھی۔ مگر جو بوری یہ تھی کہ اب دادی جان اگر کسی کی سختی تھیں تو وہ تیا جان ہی تھیں۔ شاید اس لیے کہ وہ اب ضعیف ہو گئی تھیں اور غالباً اس لیے بھی کہ ان کے بعد نور منسل کے فیصلے بڑے بیٹے اور سرپرست ہونے کی صورت میں ان ہی کو کرنا پڑے۔

”میں ایک عاقل اور بالغ لڑکی ہوں۔ سمجھ شعور رکھتی ہوں۔ اس فیصلے سے انکار کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں اس گھر کے لوگوں کو خود سے کم تر یا حقیر جانتی ہوں لیکن یہ سچ ہے تیا جان کہ یہ رشتہ مجھے منظور نہیں۔ اس کی وجہ آپ بھی جانتے ہیں۔“

نظر میں نیچے کیے وہ دھستے لہجے میں دو ٹوک انکار کر گئی تھی مگر انداز اس قدر لجاجت لیے ہوئے تھا کہ تیا جان کو لگا اگر انہوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تو وہ بکھر جائے گی اس وقت اسے کسی شدید جذباتی سارے کی ضرورت تھی۔

لگتی ہی دیر اس کی بات کے اختتام پر وہ کچھ بھی نہ

تھک۔ پیٹیم بھتیجی کے ساتھ یہ جبر وہ کسی طور بھی کرنے کے حامی نہ تھے خواہ اس کے لیے اس اپنی والدہ بیوی اور بیٹے کے سامنے جواہر کیوں نہ لائے۔ آخرت میں اللہ کو اور میدان حشر میں ہاتھی کو بھی منہ دکھانا تھا انہیں۔

”تیا جان! میں نے ہمیشہ بابا کی طرح آپ تینوں عزت کی آپ کو ان ہی کی طرح سمجھا ہے۔ آپ نے کیا اگر میری جگہ صدف ہوئی تو بھی آپ کا یہی فیصلہ ہوتا۔ کیا آپ دادی جان کے اس غیر منصفانہ رویے پر کوئی سر جھکا دیتے۔ پلیز بتائیے نا۔“

ان کے خاموش وجود کو ترقی نظروں سے دیکھتے تھے اس نے پوچھا تو وہ جیسے چونک سے گئے۔ اولاد کا کوئی بھی رے بڑے بڑے ظالم کا دل ایک سرور کا بیٹا ہے وہ تو پھر انسانی حقوق کے علمبردار تھے سامنے کوئی غیر نہیں سگی جیتی تھی۔

”بیٹا! بڑی تڑپ سے انہوں نے اس کا سر تھپتھپاتے سینے سے لگا تھا۔

اور نہ جانے کب گئے رکے ہوئے آنسو اس کی ہونٹوں سے بہہ نکلے۔

اس بے بسی کے عالم میں جب آج صبح وقار ماموں نے خط لے کر اس کی آخری آس بھی توڑی تھی، تیا جان کا فراخ سینہ دل کا درد بکا کرنے کے لیے بہت سی لگا اے، ضبط کی شدت کے باوجود اس کی ہچکیاں نکلتی تھیں۔

ایضاً ان نے امریکن نیشنلٹ کسی ساتھی ڈاکٹر سے مل کر لی تھی۔ وقار ماموں تو اس قدر پشیمان اور طویل کہ اس سے فون پر بھی بات کرنے کے قابل نہ تھے خود کو۔ اسی لیے انہوں نے قلم کا سہارا لیا۔ اپنے بیٹے کی یہ خود غرضی اور وعدہ خلافی خود انہیں افسوس اور ہمنوی کے علاوہ مضمون اور منظر بھانجی کے سامنے سخت شرمندہ کر گئی تھی جس کے باعث ان نے فیضان کو عاق بھی کر دیا تھا مگر یہ اس کے سامنے کا تدارک نہ تھا۔ ہر غلطی کا ازالہ اور ہر گناہ کا دورہ نہیں ہوتا۔

ایضاً اسے زندگی کے حسین خواب دکھا کر بیچ راہ

میں چھوڑ گیا تھا اس سے بڑھ کر دکھ کیا ہوتا۔ خواہ ماموں جان اسے عاق کر سیں یا دنیا کے خزانے اس کے قدموں میں ڈالے جائیں۔ اس کی تھی دامن کا کوئی متبادل نہ تھا۔

کل ناصر گیلانی کے گھر والوں کی آمد اور تائی اماں سے جھڑپ نے ہی اسے سخت ڈسٹرب کر رکھا تھا کہ تا بوت میں آخری کیل ماموں جان کے خط نے ٹھونک دی۔

لہذا سرپرست اس کے پاس سوائے آنسو بہا کر اپنے غم کو کم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ماموں جان نے اس سے بہت معافی مانگی تھی اور اسے اپنے پاس کینڈا بھی بلایا تھا مگر اسے اندر تو جیسے آگے قدم بڑھانے اور پیچھے قدم ہٹانے کا حوصلہ بھی نہیں بچا تھا۔ ایسے میں ایک مہمان مضبوط کندھا میرا آیا تو اندر کے ٹھنکن پانی لینا ہر کارستہ دیکھ لیا۔

”بس کرو بیٹا! پریشان نہ ہو۔ آنسو صاف کرو میں اماں سے بات کر لوں گا۔ زندگی انسان کو صرف ایک بار ملتی ہے تم نے اچھا کیا کہ کسی جبر کو بھی سے بغیر مجھ تک اپنا فیصلہ نہ پچاؤ۔ اب میں جانوں اور میرا کام۔“

اس کا سر شفقت سے تھکتے ہوئے انہوں نے اسے خود سے علیحدہ کر کے حد محبت سے کہا۔ اس وقت وہ انہیں اپنی صدف سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ ”مگر کیا؟“ انگلی کی پوروں سے گالوں پر ڈھلکے اشک صاف کرتے ہوئے اس نے قدرے ہلرا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ غالباً کچھ کہتے ہوئے جھجک رہے تھے۔

”کل جو لوگ آئے تھے کیا تم انہیں۔ میرا مطلب اس معاملے میں تمہارے ساتھ اماں نے کوئی زیادتی تو نہیں کی۔“ اس کی حیرت سے کشادہ آنکھیں ان کے سوال پر حیا سے جھک گئیں۔ سر بے اختیار لٹی میں ہلا۔

”ہوں۔“ وہ گہری سانس بھر کر کسی سوچ میں گھڑی بھر کے لیے متوقف ہو گئے۔

”تم جانتی ہو ان لوگوں کو وہ کون ہیں۔“ جانے کیا

سوچ کر انہوں نے اس سے استفسار کیا۔

”بہت زیادہ نہیں سوائے اس کے کہ غالباً“ ان کا تعلق جاگیردار فیملی سے ہے۔“ اس نے کچھ میں غماض جواب دیا۔

”محض جاگیردار فیملی سے ہی نہیں بلکہ بہت بڑا سیاسی گھرانہ ہے ان کا سینئر آفیسر گیلانی کا بیٹا ہے وہ لوہا جس کی بہن کل شریف لائی تھیں اور اب ان کا منتقن خان اپنی بے عزتی پر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ جانی ہوان کی شرافت کا یہ تار انکار پر بہت آسانی سے ڈھسکتا ہے۔“

”تھک گیا مطلب۔“ تایا جان کی بات پر ذرا دیر پہلے جو سکون کا سانس اس نے لیا تو وہ بھی پائیدار نہ تھا۔ پھر نبی مصیبت نیا خیال۔ وہ شکست خوردہ انداز میں صوفے پر تنک گئی گویا قدموں میں جان ہی نہ تھی۔ ”مطلب یہ کہ تمہارا اب یونیورسٹی جانا خطرے سے خالی نہیں۔“ باوجود کوشش کے تردد اور نظران کے لہجے سے چھپ نہیں رہا تھا۔ کمری تشریف ان کی آنکھوں میں چل رہی تھی۔

”مگر تایا جان! میرا آخری سال ہے۔“ وہ پریشانی سے بول پڑی۔ یوں بھی تاثر گیلانی اس حد تک جاسکتا ہے وہ نہیں سمجھتی تھی مگر تایا جان کے سامنے وہ اس کی حمایت میں ایک لفظ نہ بولنے کا تہہ کر چکی تھی۔ کتنی عجیب بات ہے کبھی کبھی اپنی پوزیشن آکورد ہونے سے بچانے کے لیے انسان کو کیسے کیسے راز سینے میں دفن کرنے پڑتے ہیں۔

”مجھے معلوم ہے بیٹا! اسی لیے اگر میری صلاح مانو تو شادی کرلو۔“

”جی جی۔“ ان کی بات اسے اندر تک ہلا کر رکھ گئی۔ فیضان کے علاوہ بھلا کسی سے شادی کا تصور بھی کر سکتی ہے وہ۔ ”نہیں ہرگز نہیں“ دل میں جیسے گردان ہوئے لگی۔ اور پھر کیا شادی سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔

”دیکھو بیٹا! میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور

کر۔“ اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگا اختلاف جان نے دھیسے لہجے میں اسے سمجھایا۔ ”لڑکی باپ اور بھائی کی سب سے زیادہ فراموش کرتے ہیں اور اس جب وہ اپنے لڑکی ہو جاتی ہے تو اس کا شوہر محافظ بن جاتا ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حمزہ کے انتقال کے بعد تم بے باور ہو جاؤ گے۔ سہی یہ حقیقت ہے کہ تایا بیٹہ تایا ہی رہیں گے باپ نہیں بن سکتے۔ وقت اور جذبات کا ہمارا انہیں تمہارے خلاف فیصلہ کرنے پر بھی مجبور نہیں۔“

وہ حیرت اور بے حد پریشانی سے ساکت بیٹھی بات سن رہی تھی۔ ”اس لیے میری تمہیں یہی نصیحت ہے کہ تمہیں کل کرنا ہے آج کر ڈالو۔ زندگی کا شریک اور پریشانیوں کا ساتھی بھی ہوتا ہے اور اب تم ایسے موڑ پر آگئی ہو جہاں کسی کا دائمی ساتھ تمہارے لیے نجات کا رستہ ہے۔“

”تو کیا میں اس لیے کچھ بھی نہیں۔ ایک تنگے ارزاں ہے میرا وجود۔“ لفظ جیسے ٹوٹ کر اس لبوں سے ادا ہوئے۔ ”نہیں بیٹا! وقت کا تندو تیز دھارا تو ادھر ہی چٹائیں کر ادیتا ہے تم تو پھر نازک اور کومل احسا رکھنے والی لڑکی ہو۔ ہمارے معاشرے میں عورت تنگے سے بھی زیادہ نازک ہوتی ہے۔ ایک نام اس کا ساتھ ہی اسے نانے کی زہریلی نظر ظالمانہ واروں سے جاسکتا ہے۔ تم سوچ لو۔“

اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے نے گویا اسے آخری حل پیش کر دیا۔ اور اسے اس کے گرد آواز تک ہو جا رہا ہے۔ ”تم سوچ لو اور ایک آدھ دن میں مجھے اس سے مطلع کر دینا۔ اس کے لیے سوچوں کا نیا دروازہ اسے چھوڑ گئے تو اس نے سر ہاتھوں میں تھام

”معلوم تھا مجھے آپ سے کام بنے گا نہیں بگڑے گا۔“ الٹی بی پڑھا آئے ہیں اسے دیکھ بیٹھے ای! انہوں نے کیا کر ڈالا ہے۔“ تائی اماں شوہر کا فیصلہ اور کارنامہ سن کر دوا بیلا جانے لگی تھیں۔ ”چپ کریں بیگم آپ میں نے جو ٹھیک سمجھا دی کیا۔ جو ان بچوں کے ساتھ جبرکس طور مناسب نہیں۔ وہ سمجھ شعور والی بچی ہے قانون مذہب اور معاشرے کی طرف سے اسے یہ حق حاصل ہے کہ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرے۔“

بیوی کو صاف صاف جواب دیتے ہوئے انہوں نے درپردہ سامنے بیٹھی نور جہاں بیگم کو بھی یہ یاد کرانے کی کوشش کی کہ خدائے کار ہے۔ ذکی خون کے گھونٹ پی کر چپ بیٹھا ہوا تھا کہ باپ کے سامنے بولنے کی اسے جرات نہ تھی۔

”ارے وہ چالاک لڑکی تو چاہتی ہی یہ ہے کہ اپنی مرضی سے اپنے بے جا فیصلے بھول کے سروں پر مسلط کرے۔“ بھاگیا ہو گا کوئی اور اسے۔ ”تائی اماں ذرا سی دیر میں اپنی اصلیت پر اتر آئی تھیں۔ بھلا ہوا جو وہاں موجود نہ تھی۔“

”بہت انسوؤں کی بات ہے بیگم کہ آپ کو آج تک انسان کی پہچان نہیں ہوئی اگر اتنی ہی ہری لڑکی ہے وہ تو آپ برائے مہمانی اسے اپنی ہونے کی ذمیت نہ کریں۔ وہ آپ کے لائق سپوت کے لیے کسی طور موزوں نہیں۔“ ان کا لہجہ مددور جے طنزیہ تھا۔ تائی اماں مل کھا کر رہ گئیں۔ دادی جان البتہ چپ بیٹھی تھیں۔

”سن لیجئے امی! اس گز بھر کی لڑکی نے کیا بیٹی پڑھائی ہے بڑے نایا کو۔ کیسی اس کی زبان میں بول رہے ہیں۔“ ان کی دہائیاں شروع ہو گئیں۔

”خاموش رہو۔“ نہیں تو بہت برا ہو گا اور خبردار جو ایک لفظ اس کے خلاف نکالا تم نے۔“

انہیں غصہ بہت کم آتا تھا اور جب آتا تو مقابل کے لیے خاموشی اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا تھا۔ تائی اماں بھی ان کے جلال پر سسم گئیں۔

”اور تم ذکی! کان کھول کر سن لو اب اگر میں نے

عطش کے بارے میں تمہیں ایک بھی غلط بات کہتے سنا تو تمہاری ماں سمیت گھر سے نکال دوں گا۔ یاد رکھنا۔“ ان کا اشتعال ذکی پر سرتو وہ کان دیا کر کمرے سے نکل گیا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے تائی اماں جلد سے بیدار ہوئی نکل گئیں۔

اس اثناء میں نور بیگم جو کہ بالکل خاموش تماشائی بنی سب سن اور دیکھ رہی تھیں اب حرکت میں آئیں۔

”یہ سب تم کیا کر رہے ہو شہزاد! میں نے تمہیں یہ سب کرنے کے لیے تو نہیں کہا تھا۔“ ہوا اور پوتے کے جاتے ہی انہوں نے مخصوص لہجے میں بیٹے کو مخاطب کیا۔

”میں نے وہی کچھ کیا ہے امی! جو آپ کے اس گھر کے اور عطش کے حق میں بہتر ہے خدا اور بے جا بحث سے کسی کا مستقبل باریک تو کیا جاسکتا ہے مگر اسے خوشی نہیں دی جاسکتی۔“ آواز دھم تھی مگر لہجہ اتنا دھمک تھا کہ نور بیگم چپ سی رہ گئیں۔

”عطش آپ کے مرحوم بیٹے کی نشانی ہے۔ امی اسے خوش رکھ کر ہی ہم حمزہ کی روح کو سکون دے سکتے ہیں۔“

نور بیگم کو لا جواب کر کے انہوں نے بات دوہیں ختم کر دی تھی۔ اور جب یہ خیر اسے مریم کے ذریعے ملی تو طمانیت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے بھی اسے یوں بھی مل سکتا ہے کہ گزرا ہوا گاؤں وہ جانتی تھی البتہ فیضان کی بے وفائی نے جو چرکے لگائے تھے انہیں مندرل ہونے کے لیے ایک عرصہ چلا ہیے تھا۔ اسی لیے اس سے تایا جان کی صلاح اور نصیحت پر عمل نہ ہو سکا اور ان کے دوبارہ پوچھنے پر سوائے آنسو ہانکے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

تایا جان بھی اس کی بے بسی کو سمجھ سکتے تھے جیسی اس کا شانہ تھک کر چپ چاپ واپس چلے گئے۔ تاہم یونیورسٹی جانے کے لیے کاشان کی ڈیوٹی مقرر کر دی گئی۔

ایک ہفتے میں اس کی زندگی اتنے عروج و زور سے

وقتاً فوقتاً پوچھتے جانے والے سوالوں کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ اسے دلا سا بھی دے ہی تھی مگر اس کی تسلی ممکن نہ تھی۔ بھلا دل و جان کے لئے پر بھی خاموشی اختیار کی جاسکتی۔

سارے خواب سارے ارمان جیسے راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے وہاں تو اٹھنا ہی تھا۔

اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی زندگی میں ایسا دورا بھی آئے گا جب وہ اپنی ذات سے متعلق فیصلے دوسروں کو سونپنے پر مجبور ہو جائے گی۔ ناصر گیلانی کی محبت اور چاہت یوں دیال جاں بنی تھی کہ سوائے نایا جان کے مرتب کردہ لائحہ عمل پر عمل درآمد کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر وہ شاہ میر کے لیے خود کو کسی طور تیار نہیں کر پارتی تھی وہ موش کو پسند کرتا ہے اس کا اسے شرم دے ہی اندازہ تھا مگر نایا جان نے اس کے نام ہی قریب فال نکالا تھا۔ موش کی بڑی بہن ان ہی دنوں بچہ کی ولادت کے سبب نور منزل آئی ہوئی تھیں اس لیے اس کا زیادہ تر وقت ان ہی کے ساتھ گزرتا۔ لہذا اس سے بھی آتنا سامنا کم ہی ہوتا تھا۔ خود وہ اس کے روبرو جانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ لڑکیوں کے دلوں پر کاری ضرب لگے تو وہ لیسا محسوس کرتی ہیں۔ عطش کا دل اس دکھ کو بہتر طور پر جانتا تھا۔ وہ منتظر تھی کہ شاید شاہ میر خود ہی انکار کر دے مگر شاید نایا جان نے اپنے بڑے پن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے مجبور کر دیا تھا۔

وہ شاید جواب دینے میں یونہی تذبذب کا شکار رہتی مگر یونیورسٹی والے واقعہ کے ٹھیک چار روز بعد نور منزل میں جس قسم کی فون کاگز کا آنا بندھا اسے اپنی بھلا کے لیے ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے تئیں ایک خود غرضانہ فیصلہ کرنا پڑا اور وہ فیصلہ تھا شاہ میر سے شادی کا اقرار۔

نائی اماں اور ذکی کی اسے کچھ خبر نہ تھی نہ تو وہ ہی اس کے پاس آئے نہ ہی اس کا کمرے سے نکلنے کا دل چاہا لہذا وہ کسی سے نہ مل سکی۔ حادثے کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ وہ دن بھر مگر صدم اپنے کمرے میں بیٹھی

جانے کن سوچوں کے تانے بانے بنتی رہتی تھی اسے بھی خوف کے سبب اس سے ملنے نہ آسکی۔

قسمت کی بات تھی اگلے تین ماہ بعد مریم کی طے تھی اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس سے پہلے کے ہاتھوں میں ہندی رچا دی جانے کی مگر ایسا بہت پہلے سے طے تھا اور آسمانوں میں جہاں جب کی تقدیر لکھی ہوئی ہے اس کے لیے بھی یہ مقرر کیا جا چکا تھا۔

وادی جان خلاف توقع اس کار خیر میں شریک تھیں گو کہ پچھلے دنوں ان کے تمام تر حمایت دہی تائی اماں کے حق میں تھی مگر آج وہ شاہ میر اور کے رشتے پر خوش تھیں اس لیے کہ بہر حال وہ ہمیشہ کے لیے ان کی رعیت کا حصہ بننے والی غالباً ان کا دل بچ گیا تھا۔ کچھ بھی تھا وہ ان کی تیار اور جوش و خروش دیکھ کر حیران ہوئی رہی۔

اگلے بیٹے سادی سے اس کا نکاح شاہ میر سے طے پایا تھا۔ نکاح کے فوراً بعد ان دونوں کو شاد فلالی کرنا تھا جہاں شاہ میر کا دوست بمعہ فیملی اس نے ان دونوں کے لیے رہائش وغیرہ کا بندو بشارت نوٹس پر کر دیا تھا۔

چچی بیگم اور مریم کی خوشی کا اندازہ تو اسے ان چمکتے دھتے چروں سے ہی ہو گیا تھا البتہ شاہ میر سے تنگدہ بھی نہ ہوئی تھی اور نہ ہی اس کے تاثرات متعلق اسے کچھ معلوم ہو سکا۔ اور ج تو یہ تھا کہ اس ہمت بھی نہ تھی شاہ کا سامنا کرنے کی وہ اس آنکھوں میں نارسائی کا دھواں دیکھنے کی خواہش رکھتی تھی مگر حالات نے جس موڑ پر اسے لا دیا تھا۔ وہ موش اور شاہ سے ہمدردی رکھتے ہوئے بھی کی کوئی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی مگر یہ کہ اسے حالات بہتر ہوتے ہی پاکستان لوٹنا تھا مگر اس کی محبت دلانے کے لیے اور شاہ کو اس کے دل کی تعبیر بانی میں معاونت کرنے کے لیے اس طے کر لیا تھا۔

تاسف اور ندامت کے باعث وہ مایوں بنا سے پہلے ہی کمرے میں بند ہو گئی تھی صدف اور

صرف ایک بار آئیں اور طنزیہ باتوں سے اس کا دل کر کے چلتی بیٹھ مگر موش اب بھی نہ آئی تو اسے مزید پختہ ہو گیا اور اسی یقین کے ساتھ اس کا دل بچ گیا۔ کسی کے سپنوں کا کل سوتا ڈر کر کے اپنی آرزوؤں کا گھونڈہ بنانے کی اس نے بھی سہی کی تھی۔ مگر اب ایسا ہو گیا تھا۔ مریم کی خوشی کسی مگر اس کی چھیڑ چھاڑ بھی اس کے دل پر چھائی و مٹا نہ سکی۔

شاہ میر جانے کہاں غائب تھا غالباً بہت مصروف تھا اس کا گریز اسے گھر آنے سے روکے ہوئے نکاح میں چار دن رہ گئے تھے لہذا مایوں کی باقاعدہ کردی گئی۔ نئے رشتے دار تو بھی نور منزل کے تھے لہذا کسی کو بلائے کی ضرورت ہی محسوس کی گئی تاہم اس نے مریم سے کہہ کر مایوں جان کو بہت کروا دیا تھا جس میں تمام تفصیل لکھی

کاشان، انعم اور شاہ میر کے چند دوست البتہ اکثر ت کو جمع ہو کر خوب شور مچا کر گئے۔ ایسے میں صدف اور موش بھی شامل ہو جاتی تھیں مگر وہ بھی کمرے سے نہ نکلتی اندر بیٹھے ان سب کی دلوں پر دھیان لگانے کی کوشش کرتی رہتی۔

فیصلوں اور ساروں پرانے رشتوں کی دوز کو محض انکار ایک بے وفائی پر بے دردی سے توڑنا اتنا ان نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے فیضان کی یادیں اس دل میں چنگاریاں بن کر سکتی تھیں اور اس لمحے مریم اسے شاہ کا نام لے کر چھیڑتی تو فیصلے میں دل بکھرنے لگتا۔

دو کیسی قسمت ہے میری جسے چاہا اسے پانیں سکی جسے پار ہی ہوں اس کے لیے ان چاہی ہوں۔

بے بسی سے آنسو ڈھلک کر اس کے رخسار پہلو

جلدی جلدی بھی کی مگر شاپنگ کرنا اتنا آسان بھی تھا چچی بیگم کو دونوں طرف کی ہی تیار کرنا تھی لہذا لی اور جینز کے ملا کر اکیاون جوڑے اور جوئے وغیرہ کے علاوہ زیور کی خریداری میں انہوں نے پورا ہفتہ

صرف کر ڈالا۔ اسے بھی ساتھ چلنے کی آفر کی گئی مگر نایا جان نے اس کا ہا پر رکھنا ممنوع کر دیا تھا ان کے دوست ڈی آئی جی تھے لہذا سیکورٹی کا انتظام گھر اور ہر سب جگہ کر دیا گیا تھا۔ تاہم پھر بھی ہر ممکن احتیاط برتی جا رہی تھی۔

اور پھر انہی دنوں جب وہ شدت سے بختر تھی کہ ایک بار موش یا شاہ میر کو نکاح سے پہلے دیکھ لے نکاح کا وقت بھی آگیا۔ چچی بیگم اور مریم نے مل کر بہترین جوڑا خرید لیا تھا۔

سرخ رنگ کے کام والے عروسی جوڑے میں خوبصورت میک اپ اور زیورات سے لدی خوشبوؤں میں بی بی انی انا سادی کے مقابلے میں بالکل ہی ویش لگ رہی تھی۔ جس نے دکھائے ساختہ وادی۔

صدف کا رنگ بھرا جملہ بھی اس نے سنا تھا۔

”قسمت والیوں کو ہی خدا نوازتا ہے یہ خوب صورت وقت ہر ایک پر تو نہیں آتا۔“

اس کا دکھ، محرومی اس ایک فقرے میں رچی ہوئی تھی، عطش کا دل مزید بوجھل ہو گیا اس نے دل میں سوچا بھلا اسے کیا معلوم تھیں وہ سن بیٹائی تو گھر بے نی علامت نہیں۔ کچھ لوگ رشتے رکھتے ہوئے بھی اکیلے رہتے ہیں۔

بادبوجود منع کرنے کے اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ سادی کا تو صرف نام تھا اس نے جھکی پکلیوں کو رخساروں پر بچھاتے ہوئے بھی محسوس کیا کہ اس کے گرد رنگ و بو کا ایک سیلاب ہے بے پناہ ہنسی شور غل چھپر چھاڑ اور شرج جملوں کی بھرمار بکریوں ایک چپ سا دھ کر بٹھا تھا جیسے بھی نہ بولنے کی قسم کھائی ہو۔ نکاح تک ہو گیا مگر وہ ہنوز چپ تھی یہاں تک کہ اسے مین لاؤنج میں شاہ کے ساتھ لا بٹھا گیا۔

کاشان اور انعم کے علاوہ آج تو ظہیر بھائی بھی خاصے ایکسٹینڈ دکھائی دے رہے تھے سحر بھی صدف اور موش کی آوازیں بھی اسے سنائی دے رہی تھیں جن پر کان دھرتے ہوئے وہ ان سب کے احساسات جاننے کی کوشش کر رہی تھی اور اس فعل میں وہ اس قدر محو تھی کہ قریب بیٹھے شاہ میر کی کوئی

سرگوشی اس کی سماعت کا حصہ بن سکی۔
شاہ میر نے ذرا سا جھک کر دیکھا۔ وہ سیاہ چہرے
اور او اس آنکھوں سمیت بہت بھیجی بھیجی مگر دہانے
کے روپ کی بدولت نظر لگ جانے کی حد تک حسین
لگ رہی تھی۔ اس نے جسے چاہا تھا اسے الیا تھا مگر وہ
بے وقوف لڑکی اس حسین اور اک سے لاکھم کچھ اور
ہی سوچے جا رہی تھی۔ مریم نے اسے یوں ساکت
وصامت پیٹھے دیکھا تو قریب پیٹھ کر سرزنش کی جس
کے جواب میں وہ محض ہونٹ چا کر رہ گئی۔
شاہ میر کا دل اس کے بے اثر انداز پر ٹھٹھک سا
گیا۔ ”کیسے سب زبردستی کا سودا“ مجبوری کا فیصلہ تو
نہیں۔ کیا عیش کو یہ سب جوگ دل سے قبول نہیں۔ یا
میں اس کے معیار اس کے آئینہ دل سے میل نہیں
کھاتا۔ چھوٹوں سوال اور گرد چکرانے لگے۔
بہتے مسکراتے ہوئے شاہ میر کا دل اندھیلوں اور
خوشیوں کی تاجگاہ بن چکا تھا۔ تصویریں سووی سب کا
انتظام کر میں کیا گیا تھا کی غالباً ”غائب تھا یا شاید کسی
کو نے میں چپ سا دھے اپنی ہاں کے ساتھ بیٹھا تھا۔
داوی جان کی خوشنودی کی خاطر کو سب جمع تھے غراپے
دل کی کیفیتوں کے خلاف خوشی کا اظہار کرنا شاید ان
کے بس میں تھا۔

کھانے کے بعد چھوٹی موٹی ساری رسمیں کی
گئیں۔ چچی بیگم جھانپوں کے تیروں کے برعکس حد
درجے خوش تھیں۔ اکلوتے بیٹے کی خوشی وہ بھی اس
قدر اچانک مل جانے والی مسرت نے ان کا چہرہ چکار کھا
تھا، لہذا آرسی مصحف اور گھیر کھلانے جیسی تمام
رسمیں کی گئیں۔ کمرے میں جانے سے پہلے مریم نے
شاہ میر کا راستہ بھی روکا اور وہ خوشی سے چپ بپس کرنا
رہا۔ عیش اس کے پولیس کھڑی رہی سو پتی رہی کہ
یہ شخص غضب کا فنکار ہے جسے اپنے اثرات
چھپانے میں کمال حاصل ہے جبکہ وہ ایسی نہ تھی۔
کھڑی اور شفاف شخصیت کے باعث منافقت نہ کر
سکتی تھی۔

بجائے مریم کا تقاضا کچھ کم ہوا اور شاہ میر اسے نیک
دے کر کمرے میں چلا آیا۔ دونوں طرف کی تمام

رسمیں مریم نے ہی کی تھیں، لہذا منہ اور
حیثیت سے سب نیک اسے ہی ملے تھے۔
نے آگے آنے کی کوشش بھی نہ کی اور نہ ہی شاہ
اس سے زیادہ کوئی عزیز بھی تھا۔
وہ کمزور شاہ میر کی لالہا طبیعت کے باعث
چنگیز خان کی روانگی کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ اس
بہت اچھی طرح سمجھا ہوا تھا۔ اصلی گلاب اور
کی لڑیوں نے کمرے میں فسون خیز خوشبو پھیلا
تھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور ٹھیک دوپہر
ان دونوں کی فلائٹ تھی۔

وہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھی کسی سوچ میں تھی
کہ شاہ میر دروازہ بند کر کے اس کے پاس آیا
استدرا بے دھیانی تھی کہ وہ چونک سی پڑی۔ شاہ
کے لیے اس کا رویہ ناقابل فہمی نہیں ناقابل برداشت
بھی تھا۔ اس کے چہرے پر جو بے زاری اور تاس
درج تھا اسے دیکھتے ہوئے وہ سارے الفاظ جنہیں
تمام وقت سوچتا رہا تھا، اس کے سامنے جیسے
گویائی کی حدوں سے باہر نکل گئے اور جب وہ بولا
صرف یہ کہ۔

”تم پکڑے تبدیل کرنا چاہو تو کرلو عیش! تین
کے بعد فلائٹ ہے۔ ہمیں ڈیڑھ گھنٹے بعد گھر سے
ہے۔“ کس قدر تھکا تھکا سا انداز تھا اس کا۔

عیش نے بے تحاشا چونک کر اسے دیکھا۔
اس کے یقین کے تابوت میں آخری کیل بن کر
تھا۔ شاہ میر کی نظریں اس سے ملیں۔ بلاشبہ اس نے
وہ قیامت خیز حسن سمیت اس کے ضبط کا امتحان لیا
ہوئی تھی۔

دونوں طرف غلط فہمی جنم لے چکی تھی اور دونوں
ہی استفسار کے بغیر اپنے اپنے مفروضوں کے دائرے
میں بند ہو چکے تھے عیش بغیر کچھ کے اچھی اور بھاری
شرارہ سنہاٹی ڈریٹنگ ٹیبل کے پاس آئی۔ آئینے
میں اپنا عکس دیکھ کر کتنی ہی دیر وہ ساکت کھڑی رہ گئی
تھی۔ شاہ میر بے اختیار اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔
دل ان خوبصورت سماعتوں کو یاد گار بنانے کے لیے
چل اٹھا تھا اس نے عیش کو شانوں سے پکڑ کر اپنے

دل کیا تو وہ حیران رہ گئی۔ پل میں تو لہ پل میں ماشہ۔
شاہ میر کی نگاہوں میں حیرت کر دینے والے جذبے
وہ ایک لمحے سے زیادہ ان آنکھوں میں نہ دیکھ سکی
اور پلٹیں جھکا لیں۔ یہ حسین روپ نہ محبوب اندازہ
کے باطن ہونے لگا تھا۔ جب سے قیمتی ٹیکنوں والی
الو تھی نکال کر اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں
لے کر اسے پھرتے ہوئے وہ اپنی تمام محبت اور تمام
کیفیت بیان کر دینا چاہتا تھا کہ دروازے پر بہت تیز اور
اسٹیل ریشم پر دونوں ہی چونک گئے۔

عیش نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور
بے ساختہ اس کا کندھا تھام لیا۔

”جسٹ ریلیکس“ میں دیکھتا ہوں۔“ اسے تسلی
دے کر وہ تیزی سے لپک کر دروازے کی طرف بڑھا
اور دروازہ کھول دیا۔

تایا جان کو سامنے کھڑا دیکھ کر وہ دونوں ہی اسے ممکنہ
خدشوں کی حقیقت کو محسوس کر گئے۔ وہ سوال کرنا
چاہتے تھے کہ تایا جان نے انہیں روک دیا۔

”تم دونوں جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ شاہ! میں
نے ایس بی اکر کو بلا لیا ہے تم دونوں اس کی حفاظت
میں ایئر پورٹ پر پھنسا دینے جاؤ گے اور فلائٹ روانہ
ہوئے تبکہ تمہارے ہی ساتھ رہیں گے۔“

ان کا کچھ حالات کی سنگینی کی چٹکی کھارہ تھا مگر نظارہ
وہ بہت پرسکون لگ رہے تھے۔ شاہ میر سے کہہ کر
انہوں نے عیش کی طرف دیکھا تو وہ جیسے ہوش میں
آئی۔

”بیٹا! آپ جلدی سے کپڑے بدل کر باہر
آجائیں۔“ ان کے جملے کے اختتام پر مریم اور چچی بیگم
بھی حذر درجے ہر اسال اندر چلی آئیں اور پھر صرف
پندرہ منٹ بعد سادہ لباس میں پولیس اپنا تمام تر سامان
لیے وہ دونوں ایس بی اکر م کے ساتھ ایئر پورٹ کی
طرف عازم سفر تھے۔

کتنی دعا میں ان کی حفاظت کے لیے ان کے ساتھ
تھیں لیکن دل دھڑک رہا تھا شاہ میر کا بازو اس کے گرد
حاصل تھا مگر پھر بھی وہ کانپ رہی تھی دل بری طرح بھر
آ رہا تھا۔

”نیک ات ایڑی عیش! میں ہوں نا تمہارے
ساتھ۔“ اس کی تسلیاں بھی اسے پرسکون نہ کر
سکیں۔ حتیٰ کہ وہ دونوں جہاز میں آ بیٹھے اور جس لمحے
جہاز نے نیک آف کیا وہ بے ساختہ رو پڑی۔ جانے یہ
آنسو شکر گزاری کے تھے یا دکھ کے شاہ میر سمجھ نہ سکا
چپ چاپ اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا اور وہ اس
محے اس قدر کمزور پڑی تھی کہ سب کچھ بھلا کر شاہ
میر کے کندھے سے گلی آنسو بہاتی رہی۔

شارجہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی سکون اور تحفظ
کا احساس انہیں مطمئن کر گیا۔ عیش نے شاہ میر کو
پہلی بار مختلف زاوے سے دیکھا اب وہ اس کی زندگی
کا سامھی تھا۔ اس کا شوہر اس کا مجازی خدا اس کی
ساری وفاؤں کا حقدار اور تحفظ دینے کا دعویدار۔

”مگر کیا ان کا دل بھی میرے لیے دھڑکے گا۔ شاید
کبھی نہیں۔ محبت صرف ایک بار ہوتی ہے اور اگر
محبوب بنا کسی خطا کے پھچک جائے یا جبرا“ جدا کر دیا
جائے تو پھر اسے بھلانا ناممکن ہوتا ہے۔ میں فیضان
کے نام سے بھی اکر لکھ ہو گئی ہوں۔ کل رات سے
اب تک جس ذہنی اذیت کو میں نے محسوس کیا، میں
اسے بھلا نہیں سکتی۔ فیضان کی بے وفائی نے یہ دن
دکھایا ہے مگر موش تو بے قصور ہے۔ کیا شاہ میر اسے
بھلا سکتے ہیں؟ کیا وہ انہیں بھول جائے گی شاید
نہیں۔“

”عیش! کہاں گم ہو۔ ان سے ملو میرے دوست
احمر۔“

شاہ کے ساتھ چلتے ہوئے اسے دزیدہ نظروں سے
دیکھتے ہوئے وہ گم تھی کہ اس نے اسے چونکایا۔ تو وہ
جبرا“ مسکرا کر احمر اور اس کی بیوی سے ملی۔ ان کے
ساتھ ان کے بچے بھی تھے۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی اسے
احمر کی پوری فیملی اچھی لگی۔ سزا جہت ملندہ خاتون
تھیں۔ تمام رستہ اسے سہلائی اور سمجھاتی رہیں۔ ان
کے ساتھ جو مسئلہ ہوا تھا اسے مختصراً ”شاہ نے بتا دیا تھا
البتہ وجہ حذف کر دی تھی اس شام وہ دونوں ان کے
گھر ہی رکے۔ رات تک باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ احمر

شاہ میر کے ساتھ جانے کب کب کے قہے سنانے میں لگے ہوئے تھے۔ کبھی وہ بھی بی آئی اسے میں پانکٹ تھے مگر اب شاراجہ کی کسی پراسیوٹ ایئر لائن سے منسلک تھے۔ وہ بھی مسز احمر کے ساتھ بے تکلف ہو گئی۔

وہ یہاں شاہ میر کی بیوی کی حیثیت سے آئی تھی۔ اس لیے بھابھی کہہ کر ہی مخاطب کیا جا رہا تھا۔ بڑا ہی عجیب اور انوکھا تجربہ تھا۔ یہ گزرنے تین چار دن اسے کتنا تبدیل کر گئے تھے۔ اس نے گہری سانس بھر کر سوچا اور بلا ارادہ شاہ میر کے مسکراتے چہرے پر تاسف کی چرچا میں تلاش کرنے لگی جو کہ اس وقت احمر کی کسی بات پر فتنہ لگا رہا تھا۔

”اوسوں“ یوں چوری چوری میرے پار کو نہ دیکھیں بھابھی۔ ابھی کچھ دیر بعد ہی ہم آپ کو تنہائی بھی فراہم کریں گے۔“ احمر نے اس کی چوری اور بے خودی نوٹ کر لی تھی۔ شاہ میر نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ بری طرح چیخنے لگی۔

”تمہاری وائف بہت خوب صورت ہے شاہ۔ اس کا خیال رکھنا۔“ مسز احمر نے بھی کھانا سرو کرتے ہوئے اسے ہدایت دی تو اس نے عیش پر بھرپور نظر ڈالی۔ جانے کیا تھا اس کی نظروں میں وہ نظر چر آئی۔ ”تھوڑی سی نصیحت انہیں بھی کر دیجئے بھابھی! تاکہ مجھ غریب کا بھی کچھ بھلا ہو جائے۔“

جواب میں اس نے ایسی بے بسی سے کہا کہ ان سب کو ہنسی آئی۔

یونہی بیٹے مسکراتے وہ لوگ گھر آگئے جسے احمر نے پہلے سے سیٹ کروا دیا تھا۔ سفر کی محنت اور گزرے دس پارہ دن کی بھاگ دوڑ نے انہیں ادھ مچا کر رکھا تھا۔ عیش جو بھی صوفے پر بیٹھی وہیں لڑھک کر سو گئی جس کے شاہ وادش روم سے باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر شاگرد ساہ گیا ان لمحوں کا اس نے کتنا انتظار کیا تھا کہ عیش کے سامنے اپنے دل کی حکایت کہے گا مگر وہ وقت اور حالات کے تقاضے کو بھلائے اسے نظروں اندر کے صوفے پر ہی سو گئی تھی۔ اس نے گہری سانس بھر کر دل کو آہستگی سے تھپکا۔ آگے بڑھ کر اس کے پیر

سیدھے کیے اور کبل ڈال کر بند روم سے نکل گیا۔ دوسری صبح وہ جلد ہی اٹھ گئی۔ دیکھا تو شاہ میر کمرے میں موجود نہیں تھا۔ ایک لمحے کو وہ خوفزدہ سی ہو گئی مگر جو بھی باہر سے کھڑکی آواز آئی۔ دل پرچھ مطمئن ہوا اور جب وہ واش روم سے فریش ہو کر کچن کی طرف آئی۔ شاہ میر ضروری سامان لاکر ناشتہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”لائے مجھے دیجئے۔“ میں بتاتی ہوں۔“ اس نے آگے بڑھ کر قدرے خفت سے کہا وہ اب تک سوٹی رہی تھی جبکہ شاہ کو اس کا کتنا خیال تھا۔ شاہ میر نے چونک کر اسے دیکھا۔

”صبح بخیر۔“ اس کی طرف پلٹتے ہوئے اس نے اسے گہری نظر سے دیکھا۔ پوری نیند سونے کے باعث وہ اس وقت بے حد فریش لگ رہی تھی۔

”صبح بخیر۔ آپ اتنی جلد اٹھ گئے۔“ قدرے جھنجھٹے ہوئے انداز میں جواب دے کر اس نے نظر اٹھا کر سامنے کھڑے دروازہ شاہ میر کو دیکھا جو اس وقت سینے پر بازو لیٹنے اسے ہی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھوں میں رت جگمگے کی کیفیت ٹہری ہوئی تھی وہ لکھت جیسے ہوش میں آئی۔ ”تو گویا پوری رات شاہ میر سو نہیں سکا۔“ وہی غلط فہمی بدل پر چھائی۔

”لگتا ہے آپ کو ساری رات نیند نہیں آئی۔“ اس کا لہجہ غمگین تھا۔ شاہ میر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پلٹ کر چائے کا پانی رکھنے لگا۔

”چائے پیو گی یا کافی۔“ اطمینان سے سوال کیا۔ عیش نے نظراٹھا کر اسے دیکھا جس کے ہاتھ میں چائے کا ڈبہ تھا۔ موش کا سراپا اس کے تصور میں آگیا۔ ”آپ کو تو غالباً چائے ہی پسند ہے۔ وہ بھی موش کے ہاتھ کی۔“ لہجہ چھٹتا ہوا انہیں تو کھوتا ٹھونٹا ہوا ضرور تھا۔ شاہ میر نے اچھٹے سے اسے دیکھا مگر وہ نظریں جھکائے کلائی میں پڑی چوڑیوں کو چھیڑ رہی تھی۔

کاسنی رنگ کے ہلکے کام والے سوٹ میں ملبوس اس کا کھرا ہوا رنگ اور دلکش سراپا عام دنوں سے کس

دل لگ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے اس کا کما لیا جیسے بھول گیا۔ عیش نے جواب کا انتظار کے بعد نظر اٹھائی تو وہ آنکھوں میں ایک جہان کے اسے دیکھ رہا تھا وہ بے اختیار نگاہیں کرنے پر ہوئی مگر ساتھ ہی الجھن بھی بڑھ گئی۔ کہاں یہ لی اور کہاں وہ موش کے لیے یوں ساری ساری سامان اور نکاح سے پہلے گھر سے غائب رہا۔ ان باتوں کے درمیان بھلا کیا مماثلت تھی۔ اس کی سانس بھر کر سوچا اور پھر تیزی سے بنا کچھ بات کر رہی تھی۔

شاہ میر اس کے رویے پر غور کرتا ہی رہ گیا۔ کچھ دیر اس کے انداز میں خیالت اور اپنی سستی پر تھکی مگر گزری ساعتوں کے ضائع ہوجانے کا مطالعہ اس کی آنکھوں سے نہ جھکا تھا۔ جانے وہ کیا ٹھانے بیٹھی تھی جبکہ اپنے کمرے کی کھڑکی کا ہر جھانکے ہوئی عیش شاہ میر کی ذات کے اچھے سے تلاش کرنے میں مگن تھی اور شاید وہ دونوں اپنی خود میں گم رہے کہ احمر اپنی فیملی سمیت چلا آیا تھا میں ناشتہ بھی تھا۔ دونوں کو ہی بھلنا پڑا۔

* * *

دہلی سے اس بات کی قدر کرتی تھی کہ شاہ میر نے کی خاطر اپنی محبت اپنا گھر مار جی کہ اپنا وہ ملک بھی رو دیا تھا جس کے کوپے کوپے سے اسے محبت تھی۔ اسی لیے وہ لوکل فلائنگ کو پر ہمیشہ زیادہ خوش نظر آتا مگر اب اس دیار غیر میں ایک ان چابی لڑکی کا ہاتھ بھانے کا فرض وہ کس تندہی سے ادا کر رہا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ خود کو کسی طور بھی دل تیار نہ کر رہی تھی۔ نکاح کے لیے آبادی کا اصل ک صرف تحفہ تھا۔ اس لیے اس کی مضبوطی میں کوٹا ہوتے ہی وہ ہر فرض ہر ذمہ داری سے نظریں نہ لگتی تھی جو اس رشتے کی بدولت اس پر عائد ہو رہی تھیں۔

دو تین دن یوں ہی آگے بڑھ گئے۔ احمر نے شاہ میر کے لیے شاراجہ کی ایک دو پراسیوٹ ایرلائزر میں بے لیے بات کر رکھی تھی۔ اپنی جاب سے تو اس

نے ایک مینیج کی چھٹی لے لی تھی۔ عیش کی اس نے پاکستان سب سے بات کرائی، خصوصاً ”موش کو اس نے خود بلا کر اس سے پہلو ہائے کی۔ اس کی مصروفیت میں شاید کچھ کی آگئی تھی۔ آئی۔ بہت اطمینان سے بات کی اور عیش باوجود خواہش کے اس کے لمحے کے لیے نالی تاسف یاد کہ کاشا نہ بھی محسوس نہ کر سکی۔ اور فون شاہ میر کی طرف بڑھا دیا۔ اس کا انداز گفتگو کیسا ہو گا، یہی جاننے کے لیے وہ چین کی طرف بڑھتے بڑھتے نکلی۔

اور شاہ میر جو ہمیشہ کی طرح بے حد بے تکلفی سے موش سے بات کرتے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں لکھی شگ کی واضح تحریر کو کن آنکھوں سے پڑھ کر خاصا متعجب ہوا۔ گویا کہ اسے اتنی فکر ہے۔ ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ لبوں کا حصار کر گئی۔ اور پھر قیہ دس منٹ اس نے اسی احساس سے سرشار ہوتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کر کے ضائع کیے۔ ادھر موش حیران تھی تو ادھر عیش کا پارہ چڑھا ہوا محسوس ہو رہا تھا بالآخر اس سے ضبط نہ ہو سکا تو آگے بڑھ کر مشغول انداز میں لائن کاٹ دی۔

”کیا حرکت تھی۔“

عیش کا غصہ قطعی غیر متوقع نہیں تھا۔ اس لیے اطمینان سے سوال کرتے ہوئے اس نے بھنویں اچکائیں تو ایک لمحے کے لیے وہ ساکت سی رہ گئی۔ کس قدر بے اختیار ہو گئی تھی وہ اپنے فطری جذبے کے آگے۔ اب اسے کیا جواب دے۔ کیا کہے یہی کہ اسے موش کا اس سے بات کرنا سخت برا لگا ہے یا صاف صاف لفظوں میں یہ سوال کرے کہ جب موش ہی اس قدر من چاہی تھی تو مجھے تین دنوں سے پانڈہ کرے سال کیوں لائے ہو؟ مگر اس کی گہری نظروں کے سامنے اس کے ہونٹ جسے سل گئے تھے۔ لب بستہ اپنی بے اختیار پرتام سی کھڑی شاہ میر کو وہ یکدم بہت سا دھ اور بے رہا لگا۔

”کچھ پوچھا ہے میں نے میڈم! اگر خود مجھ سے بات نہیں کر سکتیں نہ کریں۔ کم از کم دوسروں سے تو دل کی بھڑاس نکالنے دیں یا پھر دل کا کمان کر جو راستہ

میں نے منتخب کیا ہے اسے اسی طرح پر خارا اور گنجلک بنانے کی تنگ و دو کرتی رہیں گی آپ۔ صوفے سے اٹھ کر بیٹے پر بازو لیٹے وہ اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ اس کے گونچے گولوں سے لگی سر پر بھی۔

”دل کا کامان کرنا بزرگوں کے جبر اور زبردستی کے نتیجے میں آپ نے قبول کیا ہے میرا ساتھ۔“ طنز غصہ اور بے بسی اس کے لہجے اور آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ اتنا تو وہ بھی چند لمبے چمٹے سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہے مگر یہ جال اس قدر مضبوط ہو گا۔ اسے انداز نہ تھا۔

”کس نے کہا کہ میں نے جبر اپنایا ہے تمہیں۔“

”اس نے اپنی حیرت کو الفاظ دیتے ہوئے اس قدر سنجیدگی سے سوال کیا کہ وہ جو طنز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک ساعت کو چپ رہ گئی مگر وہ استغماہی خاموشی سمیت اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ آنکھوں میں شکوے تھے اور لبوں پر چپ اسے بولنا ہی تھا۔

”کہہ دے عطش جو بھی دل میں ہے۔ ابھی نہیں تو کبھی نہیں یہ کھیل جتنی جلد ختم ہو اچھا ہے کب تک ہم دونوں بھجوتے کی پھٹ تلے جھین گے۔ یہ کمزور سہارا چھوڑ مضبوطی سے اپنے قدم جما۔“ دل نے اسے حوصلہ دیا تو اس نے فیصلہ کن نظروں سے اوپر اٹھائیں اور گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہنے لگی۔

”اب کی دلچسپی تو میں نے بہت پہلے ہی موش میں محسوس کر لی تھی اور غالباً وہ بھی آپ کو پسند کر رہی تھی۔ میں نے بھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں اس طرح آپ دونوں کے بیچ آ جاؤں گی۔ حالات اگر یہ رہا اختیار نہ کرتے تو شاید۔“

انگلیاں ملکتے ہوئے وہ متاسف سی بات ادھوری چھوڑ گئی جبکہ شاہ میر کی حیرت اب غصے میں ڈھل گئی تھی۔

”تو شاید آپ کبھی مجھ پر یہ ظلم نہ کرتیں بلکہ عین ممکن تھا کہ موش کو میری دس بنالائیں خواہ آپ کے اس اقدام پر اہم اور موش بیک وقت خود کشی کر لیتے۔“

اس کا ادھورا فقرہ شاہ نے تیز لہجے میں طنز کی کالپ سے بھر پور انداز میں ادا کیا تو وہ جیسے سمجھ کر بھی نہ گرجا۔ حیرت سے کشادہ آنکھیں مزید کشادہ ہو گئیں۔

”تو کیا موش اور اہم ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔“

اف میں نے تو بھی غور ہی نہیں کیا۔ ”اس نے سوچا۔“

”تک کیا مطلب۔“ اس قدر حیرت تھی کہ زبان ساتھ نہ رہی تھی۔

”بنا کے دلوں کی باتیں جان لینے کا دعوا تو ہے تمہیں مگر جیسے سے عطش شاہ میر کے ٹھول ٹوکیا نگاہوں میں تحریر جذبول کے عنوان تک پہنچانے سے قاصر رہا۔ میرے دل کی اتنی ہی رواہ ہے نا تمہیں تو اس وقت تم کہاں تھیں جب تمہیں پانے کا خواب میری آنکھوں میں سچا تھا اور میں اس کے لیے داؤ دی جا رہی تھی۔“

”کچھ نظر نہ آیا۔“ کتنا کڑا سوال تھا۔

وہ چپ رہ گئی تو شاہ میر دو قدم بڑھا کر اس کے سامنے رکا تھا اور پھر جوان اشاپ بولنا شروع ہوا تھا۔ وہ محض استغاب سے آنکھیں کھولے اسے لب لباب سے گئی شاہ کی آنکھوں میں اس کی چاہ اس کی محبت مشعل بن کر روشنی بکھیر رہی تھی۔ لہجے کی صداقت اور آنکھوں سے بھلکتی سچے جذبول کی دھمک اسے اعتبار دے اعتباری کے درمیان معلق کر رہی تھی۔

”تم مجھتی ہو کہ میں نے مجبوراً تمہیں اپنایا اور ہے۔ تو ہاں سچ ہے کہ میں نے مجبوراً تمہیں اپنایا اور میری مجبوری ہی تھی کہ مجھے شدت سے تمہاری چاہ تھی۔“

اس کے مقابل کھڑا وہ اس کے شانوں کو مضبوط ہاتھوں کی گرفتاری میں لیتے ہوئے اس کی حیران آنکھوں میں دیکھ کر گولا تو اچانک جیسے وہ کسی نیند سے بیدار ہوئی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

بے یقینی سرت اور حیرت نے اسے شادی مرگ رکھا تھا۔ اس کا کارمٹھی میں جکڑتے ہوئے وہ بول رہی تھی جیسے اگر اس نے اقرار نہ کیا تو ساری ہمت ہار دے گی۔

”اُنی سویر جان شاہ میر آئی رکلی لویو۔“ وہ

الغبار کہہ گیا۔

اپنی محبت کا یوں اظہار کرنا اسے کبھی پسند نہ آیا تھا جیسی اسے علماً اپنا بنانے سے پہلے اس نے کسی اشارے کنائے یا الفاظ کی مدد نہیں لی مگر اس وقت سخت مجبوری تھی۔ اس کی محبت بے یقینی کی اسیر تھی اور اسے اپنی زندگی کو اس قید سے نجات دلانا تھی۔ ہر قیمت پر ہر صورت میں عطش اس کی زندگی ہی تو تھی۔

”شاہ میر۔“ وہ سسک بڑی تھی۔ جانے کیوں شاید بے پناہ خوشی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ یقین کے لیے جس ایک لمحے کی ضرورت تھی وہ ان دونوں کے مابین آ گیا تھا۔ شاہ میر نے اپنے اعتراف پر اس کی آنکھوں میں چمکتے ابھرتے نئی مولیٰ دیکھے تو بے چین ہو کر اس کا سر شانے سے لگا لیا۔

”آنسوؤں کا کوئی رنگ نہیں ہوتا عطش اپلیز کو یہ اشک کیوں مجھے تمہاری آنکھوں سے۔“ بے پناہ چاہت میں ڈوبا اس کا لہجہ کئی غدشوں سے بڑھا۔ عطش کا دل اس کی آواز کے آثار پر چڑھا اور مطمئن سا ہو گیا۔ کسی بھی منہی جواب کا خوف شاہ میر کو بے قرار کر گیا تھا اور اس کی یہی بے قراری عطش کے دل کا سکون بن گئی۔ اس نے گہری مسافتی کی بے تحاشا جھلک اس مقام پر اتارنے کا فیصلہ کیا تو بیس براؤ ڈال دیا۔ بلکہ یہ براؤ تو شاید اسی لمحے ڈال دیا تھا جب اس نے تین بولوں کے عوٹ اپنا آپ اس کے پاس کیا تھا۔

”بولونا۔“ اس کی خاموشی شاہ کو ہلا گئی۔ کچھ کہنے کے بجائے اس نے اس کے پیچھے ہوئے کار سے سر اٹھا یا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر گونیاں گول سکون اس کے اندر اتر آ چکا تھا۔

”جو شخص تیری جدائی کے خوف سے ہی اتنا کمزور ہو رہا ہے عطش اس کے اندر گویا تیری محبت ہی کی طاقت ہے۔ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تمام لے عطش! کہ یہی تیری منزل ہے۔ تیرے دکھوں اور زخموں کا مداوا تیرا چارہ ساز۔ تیرے اورد کارہاں تیری آنکھ کا کابل اور تیرے سر کا آئین۔“ اس کا دل اسے منزل کی نوید دے رہا تھا۔ یقین دلا رہا تھا۔

”آنسوؤں کا کوئی رنگ نہیں ہوتا شاہ! اگر محبت

کے یقین کے بھروسے کے رنگ بہت گہرے ہوتے ہیں۔ کیا آپ کو ان آنکھوں میں کچھ نظر نہیں آ رہا۔“

شرمیلین مسکان سمیت اس نے پہلی بار دل کے احساسات کو زبان دی تھی۔

”کیا کہا گیا میں ٹھیک سن رہا ہوں۔“ شاہ میر نے خوشی سے دہانہ ہو کر اسے پکڑ کر گھما ڈالا تو وہ بھی جھکی پکلیں سمیت ہنس بڑی آج کی دنوں بعد کھل کر رہی تھی وہ ایک لمحے کے لیے شاہ میر رک کر اسے دیکھنے لگا اور جب وہ اس کی نگاہوں کی حدت سے سرخ ہو کر رخ موڑنے لگی تو بے ساختہ اپنا بازو اس کے گرد حاصل کر کے گئی ہی فسوں خیز مگویشاں اس کی ساعت کو بخشیں کہ وہ فطری حیا کے باوجود ہنسنے پر مجبور ہو گئی۔

”چلو آؤ دو بار پاکستان بات کریں۔“ اس کا ہاتھ ہوا روپ آنکھوں میں بسائے بسائے وہ فون کی طرف پلٹا۔ ”کیوں؟“ عطش کی آنکھوں میں سوال تھا۔

”شکریہ ادا کرنا ہے موش کا۔“ وہ بے حد خوشی سے کھلکھلا رہا تھا۔ عطش نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔ ”ارے آج اسی کی بدولت تو تمہارا یہ حسین استحقاق سے بھر پور اور محبت سے جو انداز دیکھنے کو ملا ہے۔“ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے ساری بات بتائی تو وہ خفت سے سر جھکا کر ہنس بڑی۔

اس لمحے اس نے دل میں جھانکا۔ فیضان کی خواہش اس کی چاہ اور اس کی بے وفائی کے غم ایک شاہ میر کی ہنسی کے دھندلے میں کہیں غائب ہو چکے تھے۔ اسے لگا جیسے دور کہیں ماما بابا کے شفیق چہرے بھی خوشی سے منور ہیں جیسے اس کے دل کی دنیا میں روشنی کی بارات اتر آئی تھی۔ شاہ میر نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب بٹھایا تو وہ چونکی ہے تحاشا نہتے ہوئے وہ شاید مریم سے جو گفتگو تھا اس کے فقرے اسے خود میں سینے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس نے سکون سے آنکھیں موند کر خود کو آنے والی خوشیوں کے حوالے کرتے ہوئے شاہ میر کے بازو میں چہرہ چھپا لیا۔

~~*

گداو کا

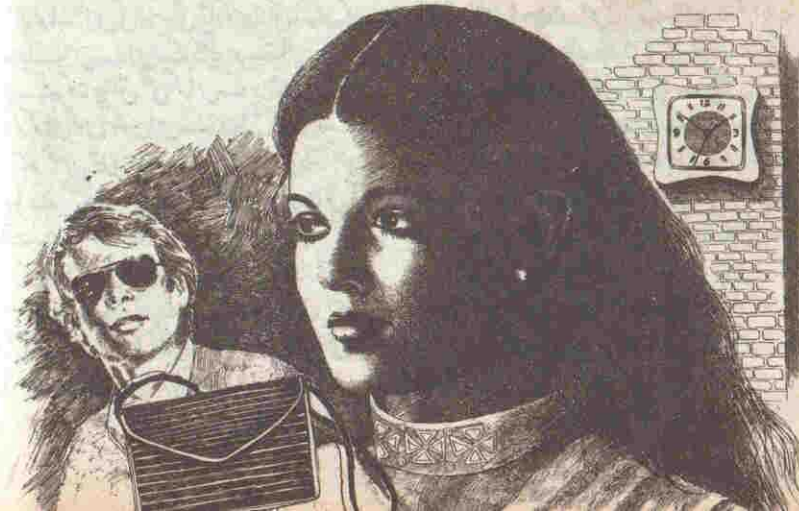
عارث احمد خان کا تعلق اپر کلاس سے تھا۔ وہ اولاد نہیں چاہتے تھے لیکن ان کی بیوی عائشہ خان کو بچوں بہت شوق تھا۔ جب ان کے ان لڑکی پیدا ہوئی۔ عارث احمد خان نے بڑی بے دلی سے اس کا استقبال کیا۔ جو یہ ان حالات میں پل بڑھ کر جان ہوئی۔ اسے اپنے لڑکے کے بغیر کافی حد تک محسوس تھا۔

نہان کا تعلق مڈل کلاس سے تھا۔ اس کی بیوی جیانیہ کو بچے کا بہت شوق تھا۔ وہ بچوں کو اپنے رتے کی راکوٹ سمجھتی تھی۔ نہان کی خواہش پر جیانیہ کو پیدا ہو گئی لیکن جیانیہ نے اپنے مشاغل میں کمی نہ کرنے دی۔ وہ بچی کو پڑوسن کے حوالے کر کے خود اسکول میں بڑھانے چلی جاتی۔ رہا باب اس ماحول سے شدید حساس ہو گئی تھی۔ جیانیہ چاہتی تھی کہ رہا باب اسکول میں نوکری کرے لیکن نہان اس کی نوکری کا شدید مخالف تھا۔

پچھلی جیانیہ جو یہ کہنے لگے رشتہ لائی تھیں۔ جبکہ جو یہ کہنے عدنان سیفی کو چاہتی تھی۔ عدنان سیفی شاعر تھا اور اپنے آپ کو منوانا چاہتا تھا، لیکن نہ تو اس نے فن کو پیچھا تھا اور نہ ہی اسے نوکری ملی تھی۔

نہان کا دوست طارق علی جو باہر سے آیا تھا، وہ نہان کے گھر آیا۔ رہا باب سے ملاقات ہوئی تو جیسے وہ رہا باب کے ذہن سے چپک کر رہ گیا۔

نہان نے جیانیہ سے ہماری دنیا سے نکلنے کو شادی کی تھی۔ وہ اس کے امیر کیمبر ماموں کی بیٹی تھی اور ماموں اپنے غریب رشتہ داروں سے نفرت کرتے تھے۔



تلاویہ کے پاپا کو پتا چلا کہ عدنان ان کے گھر آتا ہے۔ نادیر اس سے ملتی ہے، تو وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور اس بات کو سخت ناپسند کیا۔ نادیر پریشان تھی کہ یہ بات پاپا کو کس نے بتائی۔ آدھر جویریہ بھی نادیر ناراض ہو گئی کہ اس نے اپنے گھر میں اس کا راز کھول دیا۔ بھلا اب سب گھروالے اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔

عدنان سیفی کی ناراضگی سے جویریہ بہت پریشان تھی۔ رباب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی بھوپھی کے گھر چلی جائے۔

نادیر نے جویریہ کو بتایا کہ عدنان کے بارے میں جو اونے بتایا تھا جوادیو جویریہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ حادثہ احمد خان کی سخت مزاحمت کی وجہ یہ تھی کہ باپ کی وفات کے بعد ماں نے دوسری شادی کر لی۔ بہت چھوٹی عمر میں ہی اسے تنہا حقائق کا زہر پینا پڑا۔ اور کادھار بھی اس نے خود ہی سنبھالا اب وہ آہستہ آہستہ عاتش کی گرفت سے رہا تھا۔

نعمان نے رباب سے کہا کہ وہ ملک چھوڑ کر باہر جا رہا ہے اور جانے سے پہلے اس کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ نعمان نے رباب سے اس کی مرضی پوچھی تو اس نے باپ کے انتخاب پر سر جھکا دیا۔ نعمان نے رباب کے لیے طارق علی کا انتخاب کیا تھا۔

شبانہ نے نعمان سے کہا کہ وہ علیحدگی چاہتی ہے۔ نعمان اسے آزاد کر دے۔ شبانہ نے رباب کو ساتھ لے جانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا۔

جویریہ دل کے ہاتھوں بھجور ہو کر عدنان سیفی سے ملنے کے لیے اس کے گھر پہنچی تو سارنہ بھگنے اس کا استقبال تو تھی اور ناخوشی کے متعاقب جذبات کے ساتھ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر جویریہ عدنان کو چاہتی ہے تو اسے کوئی فیصلہ خود کرنا پڑے گا۔ وہ عدنان کو وقتی تفریق نہ سمجھے۔ جویریہ وہاں تھی تو اس کے والد صاحب احمد خان آ گئے۔ انہوں نے جویریہ کو وہاں سے نکلتے دیکھ لیا۔ حادثہ احمد خان نے فیصلہ کیا کہ وہ جویریہ کی شادی فوراً کر دیں گے۔ جوادیو جویریہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

جوادیو باہر چلا گیا تھا۔ اس نے باہر سے کھاکر جویریہ اس کا انتظار نہ کرے۔ وہ یہاں شادی کر چکا ہے جویریہ نے عدنان کو یہ بات نہیں بتائی کیونکہ وہ اس کے گھر ملنے چلی گئی۔ عدنان کو جب پتا چلا کہ جویریہ نے یہ بات اس سے چھپائی ہے تو اس نے جویریہ سے تعلقات منقطع کر لیے۔ طارق علی رباب کو اپنے ساتھ ہو کر لے کر گیا۔ اور واپسی میں اسے چھوڑ کر اکیلا رباب نے گھر پر فون کیا تو اس نے کہا کہ وہ اسے لانا بھول گیا تھا۔

چھٹی سیریں قسط ۳۶

”ایک کیا پروگرام ہوں گے آپ کے چھوٹے بھائی صاحب کے؟“
 فیضان علی کام سے اپنے بستر پر گئے ہوئے فی دی پر نظر میں جملے ہوئے تھے جب ارم کافی لے کر کمرے میں آئی تھی۔

”دیکھو بیٹا ارم! میں قطعی تمہاری فضول باتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ مجھ سے کسی قسم کی بحث پر گزرنے کا نا! اس نے ریوٹ کا بیٹی دہاتے ہوئے فی دی کی آواز اونچی کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ غلامی سے

کافی کی بیانی کی کرپنی دلچسپی میں مشغول رہے۔ مگر میں آج کل یوں بھی اتنی پریشانی پھیلی ہوئی تھی کہ کسی کو بھی بات کرنے کا ہی نہیں جا رہا تھا۔ بابا جان نے تو ناراضگی میں اسے کمرے سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کھانے کے لیے بھی تینوں وقت دیشان علی یا عمران انہیں بلاتے جاتے مگر وہ ٹال دیتے۔ طارق الگ سارا دن گھر سے باہر گزرا کرتا۔ رات گئے واپس آتا اور ہر کسی کے پوچھنے پر اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔
 ”میں کھا نا کھا چکا ہوں!“

اس نے غالباً گھر کے افراد سے چھینا شروع کر دیا تھا کہ ابھی فی الحال اس کے پاس فلاں کراہی راستہ تھا۔ اب صرف ارم دیشان کا شغلہ ڈیر سہ تھا۔ اپنی من مانی کرنا اور کتے جاتے جھلے کتے رہنا۔ جو ہو گیا وہ سب چپ رہ کر بھول جانا چاہتے تھے تو وہ کیسے کسی کو بھول جانے دی۔ اس کی خوشی ایسی ہی تھی کہ لوگوں کا دل جلا کر رہے۔

”آپ لوگوں کے چپ رہ جانے سے مشغول تو نہیں ہو جائے گا۔ یوں بڑوں کی طرح جہر اچھلنے بیٹھے میں طارق صاحب جیسے مجرم چمپا کرتے ہیں۔ اگر کوئی فیصلہ کرے لیسا ہے تو اس کا اعلان کریں۔“ ناخوش سارے گھر کو نیشن میں ڈالا ہوا ہے۔

مقدومی ڈیر چپ رہ کر اس نے اپنی بات کہہ ہی دی۔ اسے صرف اونچی آواز میں ہی بولنا پڑتا تھا۔ مگر کھلا وہ اپنے دل کی بات دل میں ہی رکھ لیتے والوں میں سے تو تھی ہی نہیں۔
 ”دیکھو اس کے کسی فیصلے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ میں تم کو کتنی بار بھیجا چکا ہوں کہ خدا کے پاس معاملے میں تم صرف چپ رہی رہو، کافی کی خالی پیالی واپس رکھتے ہوئے اس نے سختی سے یہودی کو تہنیک کی۔“

”چلیں جی میں چپ رہ جاتی ہوں مگر سارے زمانے کو کیا بتانا چاہیے۔“ طارق کے لیے، نوکر چاکر، کل کلاں کو خاندان اور دوست احباب کو بھی خبر ہو جائے گی۔ آپ تو ہر بات کو نال دینا چاہتے ہیں، جملے اس کے کر بڑے بھائی ہوئے کے ناتے بھائی سے باز نہیں کر سکتا۔ آخر ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔ جتنے تماشے انہوں نے کیے ہیں کم ہی کوئی کرتا ہوگا۔ آپ سمجھتے ہیں کیا دنیا میں چرچا نہ ہوگا۔ آپ نہ یوں گئے تو قصبہ کسی کی زبان پر نہ پڑے گا۔ ارے ان کا کیا ہے۔ اپنے پیچھے داستانیں چھوڑ جاتے ہیں۔ بھگتیا تو نہیں پڑتا ہے۔ ایک جوان اولاد ہے اور اس کا مستقبل ہمارے آگے بڑا ہے۔ مجھے تو خاندان میں لگتا ہے کہ ہمیں بھی عمران کے لیے بات کرنے جیسا نہیں چھوڑیں گے۔ آپ کے بھائی ڈاکٹر طارق علی صاحب۔“
 اس نے عادتاً بولنا شروع کیا تو کچھ اگاہ بھلا حساب چھوڑا ہی نہیں۔ فی دی کی اونچی آواز ہونے کے باوجود دیشان علی کے سر پر یہودی کی باتیں۔ پھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔

”ہمیں کس طرح سمجھاؤں ارم کہ اس بات کے پیچھے دہڑو جس میں تمہارا اختیار نہیں چل سکتا۔ بیکار کے واپس لے کر بیٹھی رہتی ہو۔ ارے ہر ایک کی قسمت اللہ تعالیٰ نے بنا کر رکھی ہوئی ہے۔ تم اللہ پر بھروسہ کیوں نہیں کرتی ہو؟ وہ جتنی بن پاتا کو شش کر لیتا کہ اسے خاموشی کرا سکے۔“

”بیجے اللہ نے یہ کب کہا ہے کہ بندے تم کام بگاڑ کر رہیں سواریا کروں گا۔ واہ بیٹی ہم بچے بیٹھے سبیا ناس کرتے رہیں اور پھر نظریں آسمان کی طرف لگا کر اب بگڑی بنا دو کی صدا لگائیں۔“
 اس کے دل کی بھر اس نکل گئی تو وہ بڑے اٹھا کر بولتی ہوئی نکل گئی۔

”بس ایک ہی بات تمہاری میری سمجھ میں آتی ہے کہ تم مجھے خوش دیکھنا نہیں چاہتے۔“
 سائرہ سیف اللہ بیٹے کی بات سن کر بڑی طرح تپ گئی تھی۔ سارے دھتے ناتے اس نے عمر بھر صرف اسی بیٹے کے لیے بنائے اور بگاڑے اور آج وہی اسے الزام دے رہا تھا کہ اگر میرے والدین نے تمام خاندان

سے ناتانائے رکھا ہوتا تو آج میں بھی سب رشتوں کو ٹھکانا سیکھ جاتا۔
 "بس آپ جو سمجھ سکتی ہیں سمجھ لیں، مگر اب میں نے اس شہر میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ اپنی
 رٹ پر قائم تھا۔

نیک بے بیٹا پھر اپنے فیصلے اپنی خاطر کر دے۔ مجھے خود سے علیحدہ سمجھ لو، وہ بھی اسی طرح غصے
 میں تھی۔

آپ خود ہی تو خواب دیکھا کرتی ہیں ناں کہ میں بڑا آدمی بن جاؤں اور مجھے لگتا ہے کہ میں یہاں
 رہ کر کچھ نہ کر پاؤں گا۔ ماں یوں ناراض ہو گئی یہ بھی اس کی بھلائی نہ تھی۔

"میں تو تمہارے ہی خواب کو چاہتی رہی ہوں بیٹا اسی لیے تمہیں بڑا آدمی بننے کی بھی مگر اب بھائی
 جان جویر میرے لیے اتنے محنت نہ رہے ہوں گے۔ اس کی جوار سے ملنے ختم ہو گئی ہے۔ اب تو تمہارا سب
 کچھ یہیں ہے بیٹا اس سے تمہاری مصلحت سے عدنان کو سمجھانا چاہا۔

"اؤ تو آپ کو بھی خبر ہے۔ آپ بھی اس سازش میں شریک ہیں کہ آپ کے کروڑ پتی بھائی صاحب
 نے ہم سے دوبارہ حرف اسی لیے ناتاناستوار کیا ہے کہ اس میں ان کی اپنی عرض شامل ہے۔ وہ بڑی طرح
 جمل گیا۔

"کیا تم اسے قسمت کی مہربانی نہیں سمجھتے بیٹا اس نے حیرت و مایوسی سے اس سے پوچھا۔
 "اچھا آپ کیا محنت کو بھی خیرات سمجھتی ہیں کہ یہ ایر لوگ جب ان کے جی میں کئے تو ہمازی جھولی میں
 ڈال دیں۔ اور یہ نہ چاہیں تو ہم ساری عمر نامرادی میں گزار دیں۔" وہ تب کہہ رہا تھا۔

"دیکھو یہ حرف اللہ کی مصلحت تھی کہ جو ان کے اس رشتے کو ختم کر دیا۔ بھائی جان کو بھی اپنے غلط فیصلے کا
 احساس ہوا اور تمہارے جذبے کی قدر تھے قدر کی۔ اس میں اپنی قسمت کی پہلو کہاں لگتا ہے جو تمہاری
 کی باتیں کر رہے ہو یہ حرف اللہ کی رحمت ہے، یہ ہے ناں جسے تم ٹھکانے کی بات کر رہے ہو کیا تم نے کبھی
 خدا سے جویر کے مل جانے کی دعا نہیں کی؟" سارا وہ آپ اپنے غصے کو دبا کر میرے گودھیرے دھیرے
 سمجھا رہی تھی۔

"اس طرح ہرگز دعا میں نہیں کی تھیں جیسا ڈراما ماہوں نے ہمارے ساتھ کھیلا ہے۔ آپ کسی طرح بھی
 غفلتوں کے آلٹ پیسے میرے احساس کو دبا نہیں سکتیں۔ ایک بار ماہوں جان نے مجھے ٹھکانا ہے۔ میں
 ان کی عرض کو نہ باریک دیکھتا تھا۔ اور آپ یہ بھی نہ سمجھے گا کہ میں اپنے جذبہ محبت کے آگے کبھی بھی
 شکست کھا جاؤں گا۔"

اس کا لہجہ سنگدلانہ حد تک پہنچتا تھا۔ یقیناً سارا وہ نہیں بھلا سکتی تھی۔ وہ اپنے باپ کی طرح ہی
 جذبوں کے معاملے میں ظالم اور ماں کی طرح اپنا پسند تھا۔

اس نے جب اپنے دل کو نرم کیا اولاد نے سنبھالی گلیہ کھینچ دی۔ وہ کسی طرح رشتوں کے آگے سرخرو نہیں
 ہو سکتی تھی۔ اس کو تو میری کہ عدنان بیٹی اب اپنا فیصلہ کسی طرح نہیں بدلائے گا۔

کوئی اسے منا نہیں سکتا تھا لیکن شاید جویر یہ اپنی محبت سے اس کو سمجھا سکے۔ شاید اپنے جذبے سے
 اس کی ان کی ظالم دیوار کو کھلانگ سکے۔ ہاں جویر یہ ضرور اس کو منالے گی۔

وہ اپنے گودہ دل کو تکی دے رہی تھی۔ وہ خود ساری عمر کی اپنی ضد سے ایسی کمزور ہو گئی تھی کہ اب
 سختیاں اسے بڑی طرح تڑپا کر رہی تھیں۔ خدا کرنے والا خدا چھوڑ بھی خوشی سے محروم رہے تو۔

آج تیسرے دن بھی رضا صبح سے کاج آیا تھا۔ مگر اس نے کوئی کلاس اینڈنگ نہ کر سکی تھی کہ لے لے لے لے
 میں ہی گیا۔ یوں تو وہ اب اکثر ہی کلاسیں چھوڑ دینے کا عادی ہو گیا تھا۔ مگر اب تو انہما ہو گئی تھی کہ کاج

اس کو خود دھونے کے باوجود کلاس کی طرف جانے کی زحمت ہی نہ کیا کرتا۔ امجد، عقیل، ناہرہ، اور جویر یہ سمیت
 سب ہی اس کی حرکت پر کڑھتے اور غصے کی کرہ جاتے مگر کہہ اس لیے کچھ نہیں رہے تھے کہ اس نے کسی سے بھی
 کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب تو اس نے جہاں سے دوست نظر آتے وہاں سے راستہ کاٹ کر چلنا شروع
 کر دیا تھا۔ بات صرف کلاس میں ہی نہیں اب تو پورے کاج میں پھیل رہی تھی۔

اس کے آبا اس کی بیانی کیوں نہ کریں۔ ایک دن لگتا ہے وہ میرے ہاتھوں میں فرسٹ جیلے گا۔
 امجد و نول بھیلیاں رگڑتے ہوئے بڑی طرح پیچ و تاب کھارہا تھا۔ آج بات بھی کچھ ایسی ہی ہو گئی
 تھی۔ ٹینڈا احسان نے کلاس میں اینڈنس (ماہری) لیتے ہوئے باقاعدہ پوچھا تھا۔

"یہ ڈاکٹر رضا عابد مسلسل کلاس سے غائب رہے ہیں؟" اس کی نظر سیدھی امجد ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھی
 تو اس کے کچھ جواب دینے سے پہلے ہی قہقہے سے آواز آئی۔

"بہت خطرناک بیماری لگ چکی ہے انہیں میڈم۔ عقیل یا میں مبتلا ہیں بس ہر وقت صدم ہرجائی کے
 گیت لگاتے رہتے ہیں۔" امجد مڑ کر دیکھ بھی نہ سکا کہ اس کی آواز تھی۔

وہ اے عشق ہیں برباد نہ کر
 ساتھ بیٹھے کسی نہ کرنے کا قاعدہ لگنا کر صورت حال واضح کی اور کلاس میں تمام اسٹوڈنٹس کا ایک
 شکر کہ قہقہہ گونجا۔

ٹینڈا احسان حرف مسکرا کر چپ ہو گئی تھیں مگر ان کی طنز پر ہنسی کا مطلب جویر کی سمجھ میں اچھی طرح
 آ گیا تھا۔ کلاس سے نکلنے ہی ان چاروں کا مزاج بڑی طرح بگڑا ہوا تھا۔

"بھئی اس سے کہہ دو کہ اگر بڑھائی میں دل نہیں لگ رہا تو کاج آ کر تماشا بنوانے کی کیا ضرورت ہے۔
 گھر میں چھپ کر بیٹھا رہے۔" ناہرہ یہ بھی جوڑ کر کہہ رہی تھی۔

"بھلا کچھ میں اس کے آبا اسے بیٹھے دیں گے؟" عقیل کی بات مدد دہش تھی۔ سب چپ رہ گئے۔
 "ایسی بھی کیا نادانی بھلا۔ وہ جلتے تو جیسے اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہے۔ اسے بھی اچھی طرح خبر ہے کہ
 اس کا جذبہ مکمل طور پر ایک طرف ہے۔" عقیل نے بات جاری رکھی۔

"نہیں میرا خیال ہے کہ اسے یہی یقین نہیں ہے کہ اس کا جذبہ ایک طرف ہے۔ بہت جویر یہ بہت سوچ کر
 کہہ رہی تھی۔

"بھئی ہم اس قفسے کے خاموش تماشا بنی ہیں ہمیں پتا ہے کہ اس کا جذبہ ایک طرف ہے تو اس کو خود خبر نہ ہوگی
 کیا؟" عقیل اپنی بات دہرا رہا تھا۔

"ہم اس قفسے میں غیر جانبدار بھی تو ہیں اسی لیے صورت حال سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی سوچ کا محور تو صرف
 اسی کا اپنا جذبہ ہوگا، جویر یہ عقیل کہہ رہی ہے؟" امجد نے تائید کی۔

"اور میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ اسے اگر اس بات کا احساس ہو جائے تو اس کی دیوانگی میں کچھ کمی ضرور آئے
 گی۔"

تم انتہائی خوش فہم جویر یہ بی بی! اسے اس بات کا احساس خود تو ہونے سے رہا۔ احساس دلا ناہرے
 گھا، اور یہ کام کرنے کا کون۔ وہی مشکل ہو گئی کہ بلی کے گلے میں کھنی کون باندھے۔ ارے دوست وہ تو ہم
 میں سے کسی کی بات سننے کا روادار ہی نہیں اور بڑی تو یہ کام آکر کرنے سے رہے؟

عقیل کا کہنا بھی درست تھا مگر جویر یہ کچھ سوچ رہی تھی۔ خوش نہی تھی امید۔ وہ ابھی سے کوئی دعوا
 کرنا نہیں چاہ رہی تھی مگر اسے خود پر بھروسہ تھا۔

"تم کہیں جارہے ہو رضا تو پلینر سمجھو فراہنگ اسٹال تک ڈراپ کر دینا۔
 امجد نے اسے عین اس لمحے دیکھ لیا جب وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے اسے بھگالے جانے والا ہی تھا۔

”مجھے ذرا جلدی تھی۔ مگر چلو اگر تم کہتے ہو تو بیٹھ جاؤ“

وہ صاف طور پر احسان کر رہا تھا۔ اچھا بڑا سامنے کے بجائے ذرا اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

کہاں آتو گے بتاؤ؟ وہ مسلسل بے زار تھا۔ صدر کے پرجوم علاقے میں کنارے کی طرف کئی تنگ اسٹال تھے۔ رضوانے بائیک اسی اسٹال کے سامنے دو کی جہاں سے اکثر وہ دوست کتابیں اور اسٹیشنری وغیرہ خرید کرتے تھے۔

”ارے بس فائل کے لیے بیسیر خریدتے ہیں۔ کوئی زیادہ لمبی جوڑی خریداری تھوڑی سی کرتی ہے۔ تم ایک منٹ رکو میں ابھی آتا ہوں پھر گھر ساتھ ہی چلتے ہیں“

اس نے اترتے ہوئے اسے روکنا چاہا۔ وہ اکثر لڑ رہی رضا کے ساتھ ساتھ راکر تھا کہ اس کی تہائی سے سب دوست خوف کھانے لگتے تھے۔

”نہیں میں ابھی گھر نہیں جاؤں گا۔ مجھے کچھ کام ہے۔ تم بس سے چلے جانا“

سامنے سٹپ کھٹے والا تھا اسی لیے وہ کوئی جواب نہ لے لیا۔ پھر میں وہاں سے نکل گیا۔ اچھا کو غصہ تو بہت آیا مگر اپنے غصے کو دبا کر رہ گیا۔ یہ مزدوری ہی تھا۔ رضا تو اب اکثر دوستوں کے ساتھ لڑ رہی بے زاری و بے نیازی پرست لگا تھا۔

اور رضا عابد کو آج کچھ اور ہی ذہن سوار تھی۔ وہ جانتا تھا وہ کھوئے راستے پر جا رہا ہے مگر پھر بھی اس کی بائیک کی رفتار تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔ راستے میں آگے تمام سگنلز سے وہ آگے آگے چلا۔ اپنی سواری کی رفتار عمدتاً حد تک تیز رکھی اور آگے پیچھے دلائش بائیں بھائی دوڑتی بڑھنے کو مسلسل کوستا رہا۔ اس کا رخ رہا بائیں طرف تھا۔ جتنے کون ساخوں دن تھا کہ اس کے قدم اس کو کھڑی راہ پر پارک گئے تھے۔ اب تو خود اس نے بھی اس احساس سے اٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ سیدھی لمبی سڑک پر تیز رفتاری سے بائیک چلاتے ہوئے ایک پار بھی احساس گناہ اس کے راستے میں نہ ٹھہر رہا تھا۔

اور آخر کار وہ رہا ب کے گھر کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ بس ایک گھنٹی بھانے کی دیر تھی اور وہ اندر جا کر ایک نظر اسے دیکھ سکتا تھا۔

بس وہ اپنے کاحضوب پر گیٹ ان کے درمیان دیوار بنا کھڑا تھا۔ دروازہ محبوب نظر کہاں دور رہ گیا تھا۔ اور بس یہ اس کی جرات دکھانے کی گھڑی تھی کہ وہ کسی بھی راستہ روکنے والے سے صاف کہہ سکے کہ

مجھے رہا ب سے ملنا ہے اور ہمیں اس کی حکمت کی کہانی شروع ہوتی تھی۔ بس اس کے جذبے میں ایک جرأت ہی کی تھی اور وہ اب تک اسے اڑا ہوتا کہ نہیں۔

پورا کھنڈ گزر گیا اسے اس گھر کی دیوار سے لگے کھڑے ہوئے نہ ایک بار یہ در کھلا اس کے کان میں کوئی آہٹ ہی پڑی اب وہ کھڑے کھڑے خواب دیکھنے لگا تھا کہ ابھی یہ دروازہ کھلے گا۔ ابھی وہ کمر سے باہر نکل کر آنے کی اور ابھی کہے گی۔

”یہ تم ہی ہونا رضا۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ میرے دل نے صدای تم کی آواز دے“

اور پھر وہ اسے لے کر کہیں بہت دور کسی دوسری دنیا میں چلا جائے گا۔ یہ دوری دنیا کا خواب جانے سارے محبت کرنے والے کیوں دیکھتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کو بسنے کے لیے یہ جگہ یہ دنیا ہمیشہ ناموزوں لگتی ہے۔ تو کیا جو یہاں بستے ہیں وہ محبت کرنے والے نہیں۔ ارے بڑے بڑے محبت کرنے

والے نہیں سے ہو کر گئے ہیں۔ بس یہ جذبہ کو انہوں نے رہنے کا بہانہ ہے۔ دوسری دنیا۔ اسی لمحے گیٹ کھلا جب اس کی آنکھیں پتھر کی سنگ ہوئے والی تھیں۔ جب اس کا جذبہ مایوس ہونے لگا تھا۔ چونکہ بار نکل کر اس کے آس پاس دیکھنے لگا تھا۔

”کیا بات ہے جوان! کیوں کھڑے ہو یہاں؟“ اس کا اچھ سخت تھا۔

”جی مجھے رنجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔ اس سے کوئی بات ہی نہیں پڑی تھی۔ اچھا ہوا زبان سے وہ پھسل گیا۔ یعنی ابھی احساس اس کا ایسا ختم بھی نہ ہوا تھا۔

”تو اندر آ کر بیٹھ جاؤ پر خود لاگنے پھر کے یہاں کھڑے ہوئے خود کی طرح جھانکا تا کی کیا کر رہے ہو؟ یعنی وہ شخص مسلسل اس کو نظروں سے نہ ہونے تھا۔

”نہیں میں اب میں چلتا ہوں۔ وہ ابھی تنگ آئے نہیں ہیں ناں کاٹے؟“ وہ بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔

”خیر وارنس ریت سے آگے تھے۔ صاف صاف بتا دو۔ میں پورے ایک گھنٹے سے تمہارا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ شکل سے دیکھو شریف لگ رہا ہے صاحبزادہ اور انداز کیسی لڑکیوں جیسا ہے“

چونکہ آج اسے بخش دینے والا نہیں لگ رہا تھا۔ اور اسی وقت اس نے دیکھا۔ سامنے سڑک سے طارق علی کی گاڑی اپنے گھر کے گیٹ کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے فوراً بجن اسٹارٹ کر کے سواری بھاگا لے جاتی چاہی۔

”ارے بڑول بھاگ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے ملنے آیا تھا اور انہیں دیکھ کر بھاگ رہا ہے۔ اتنی پٹائی لگاؤں کا کہ آئندہ ایسی حرکت کرنا قبول جانے گا“

اس نے واقعی اس کا گریبان پکڑ لیا تھا اور طارق علی گیٹ پر کھڑا ہوا اسے کامنظر صاف دیکھ رہا تھا۔ احساس شرمندگی سے وہ پانی پانی ہو گیا مگر غشی کی لگن ابھی چھوٹی نہیں تھی۔

”ارے پھر دو میرا گریبان کیوں پکڑ رہا ہے۔ گھر کے دروازے کے باہر سڑک پر کھڑا ہونا کون سا جرم ہے کہ تم اڑی دکھا رہے ہو۔ پھر ڈوب گئے“

اس نے بھی جھکاؤ سے کرنا کر بیان چھڑا لیا مگر چونکہ بہت تگڑا آدمی تھا۔ اس نے مضبوطی سے پیچھے سے اس کی بائیک کا ہینڈل پکڑ لیا کہ وہ گاڑی بھگا نہ سکے۔

”رجھو علی! کون ہے یہ! کیوں پکڑا ہوا ہے اس لڑکے کو؟“ ڈاکٹر صاحب گاڑی سے اتر کر اس کے سامنے آئی گئے تھے۔ وہ بچ کر اس کے سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔

”نہ جانے کون چور آچکا ہے صاحب۔ لا حول ولا گھنے پھر سے دروازے پر کھڑے اور کتابے میں تو سڑک پر کھڑا ہوں؟“ بس وہ حرف جواب دینے کے لیے مڑا تھا کہ اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور رضا اس کو گر بھگا کر لے گیا۔

طارق علی کھڑا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی جرات کی اسے داد دینی چاہیے۔

اس کے جذبہ کو سراہنا چاہیے۔ اس کی قیامت پر اعتبار کر لینا چاہیے۔

یا اسے بے حساب گالیاں دینی چاہئیں۔ وہ سر جھکائے اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

”تم سے کتنی بار کہہ رہے ہیں نہ! اچھا کرو۔ کچھ لوگ بہتے ہیں کہ جن سے آگے کرنا ہی دامن کانٹوں میں لک جاتا ہے۔ دنیا دین کی خاطر اپنا آپ بچانے کے لیے دامن سفال کر چلنا سیکھو۔ بہت سی باتوں کا خاموشی بہترین جواب ہے۔

وہ سر جھکائے عائشہ کی نصیحت بھری ڈانٹ میں رہی تھی۔ جیسے قصور اس کا اپنا ہی تھا۔ اپنی داوی جان اور پھوپھیوں سے بچ کر رہنے کا سبق تو مال نے بچپن سے ہی ان دونوں بھائی بہنوں

کو سکھایا تھا۔ اگر وہ ہی معمول کئی تو اس کی اپنی نادانی تھی۔ لیکن انہی لوگ اس طرح نڈر اور بے باک ہو کر انعام تراشی کیسے کر لیتے ہیں۔ خدا خوفی کہاں ملتی ملی جا رہی ہے؟

اس کا جی چاہ رہا تھا اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر بڑ جانے اور ہر چیز سے بے نیاز و بے پروا ہو جانے۔

لوگ نہیں دُرتے ناں بیٹا۔ یہی تو مسئلہ ہے کہ لوگوں نے ڈرنا چھوڑ دیا ہے، عائلہ تے خود ہی جویرے کے سر پہ ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا تو اس نے ماں کی گود میں سر رکھ لیا۔

وہ لوگ جن کے دل میں یہ خدا کا خوف چمکا بیٹھا ہوتا ہے۔ جیسے کڑے امتحان سے گزرتے ہیں مگر ہوتے بہت مضبوط ہیں۔

ہاں اپنی بار بار لوٹ کر چوڑ کے عادی ہو جاتے ہیں، وہ بہت دلبرداشتہ ہو رہی تھی۔ گری کل کی باتیں اسے رات بھر دلا کر بھی چین نہ لینے دے رہی تھیں۔

ایسی ناشکری کے الفاظ ملنے کہاں سے سیکھ لیے ہیں۔ حق کے ساتھ حقے کو نہ ملاؤ پھر دیکھو میر ہی مبرا جانے گا تھارے دل کو۔ دیکھو یہ ہیرا پھیری اور جالاجالی کی باتیں نہ تھاری فطرت میں ہیں نہ نہیں سکھائی گئی ہیں۔ اس سے لوگ وقتی کسی کی ہنسی اڑا لیتے ہیں مگر یہ بہت سطحی کامیابی ہے۔ گناہ کو گناہ سمجھنے کی عادت نہ ہو جانے تو اس میں لذت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور یہ گناہ کی بدترین علامت ہے کہ بندہ گناہ بھی کرے اور مسرت و بے نیاز ہو کر کرے۔ یہیں تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسی فطرت اور مسرت سے ڈھونڈا ہے۔ گناہ کرنا اور ڈرنا، اس کیفیت سے بس توبہ ہی توبہ کرنی رہنا جویرے بیٹی۔

وہ جانتی تھی کہ جویرے بہت جلدی کرتے، افسوس یہ ہے۔ اس کی بیٹی جتنی حشاش تھی، اس پر حالات اتنے ہی سخت پڑے تھے مگر ضبط اور حوصلے کا بہت خزانہ خدا سے دیا تھا۔ عائشہ تو بس اسے باور دلا رہی تھی کہ اس خزانے کو بس رکھ کر وہ کبھی بھول نہ جائے۔ اور وہ بھول جانے والوں میں سے تھی بھی نہیں۔

اے جویرے بیٹی! آج ہماری آمد سے پہلے ہی ہمارے استقبال کے لیے یہاں موجود ہے؟

وہ خود آٹھ گھنٹے سے بیٹھی۔ اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ ابو جی کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

حارث احمد خان نے اپنا بیگ چھوٹی میز پر کندھے کی طرف رکھا اور صوف پر اطمینان سے بیٹھے ہوئے پہلا اشارہ حسب عادت جانے کے لیے دیا۔ عمو! اس وقت جویرے اپنے کمرے میں پڑھائی کر رہی تھی۔ آج شام بے ماں کے پاس آکر بیٹھی تھی تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہ ملا۔

وہ اصل ابو جی! آج آپ کچھ جلدی لگے ہیں؟ اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

نہیں بیٹا! آج آپ نے دیر کر دی ہے پڑھائی میں۔ میرا حساب تو ٹھیک جا رہا ہے۔ انہوں نے اسے ٹوکا تو وہ مسکرا دی۔

آج شاید بڑھنے کا جی نہیں چاہ رہا ہمارا بیٹی کا۔ کوئی بات نہیں کبھی کبھار اس طرح وقت پرانی گرفت وسیلی بھی کر دیتی چاہیے۔ تناؤ کم ہو جاتا ہے ناں۔

ہاں مگر پھر اسی وقت کو روٹنا بھی پڑتا ہے ناں۔ آپ جانتے ہیں وقت کا تو لمحہ ہماری کمزوری ہے پھر اب تو امتحانات بھی نزدیک آ رہے ہیں۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

اس نے آج کھانا جلدی تیار کروا لیا تھا۔ اور کروا بھی کیا تھا۔ کچھ کام نوکر سے کروا کر باقی تمام تیار دیاں خود ہی کر لیں اور پھر سارا کھانا بھی پکا کر خود ہی رکھ دیا۔ یوں بھی جس دن اس کی مندریں بوجاہل و قبائل

گھر پر آ کر کئی تھیں اسے صبح اٹھنے کے ساتھ ہی پریشانی لگ جاتی۔ ایک کام ہاتھ میں ہوتا اور ذہن میں لگنے کی پلاننگ شروع ہو جاتی۔ بس اس کی سانس لگتی رہتی کہ ہر کام خیریت سے منٹ جائے۔ وہ کمر کوئی نہ چھوڑا کرتی تھی مگر پھر بھی کمر نکال لی جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ہر اچھائی میں بھی بڑائی و عزت نکالنے کی عادی اس کی مندریں اسے کبھی غصے کی نہیں مگر پھر بھی وہ انہیں میں بڑی رہتی کہ خود اپنی ہی تسلی کے سامان کر کے حالانکہ اس کی اپنی طبیعت میں بھی بے انتہا بے چینی شامل تھی۔ ملہن ہو کر بیٹھ جانا تو اس کی خواہش نہیں تھی۔

کھانا پانے خیال سے بہت دھیان اور خلوص سے ہی بنایا تھا۔ اسے معلوم تھا روٹی بھی چلبے ہوگی اور چینی بھی اچھا اور سلاو بھی ضروری سمجھا جائے گا۔ میٹھا نہ بنایا گیا تو بد شکوئی ہو جائے گی اور کیا اب کی کوئی قسم وہ پھر کے کھانے میں شامل نہ کی گئی تو اسے سستی اور لا پرواہی کا نام دیا جائے گا اور اگر دیکھا جائے تو چاول قدر اور دان سے بہت تو بھر جانا چاہیے مگر بیٹوں کو کس طرح بھرا جائے۔ بہت تنگ و تنگی کا تعین بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بس اپنی جان انسان لڑا سکتا ہے۔ سو تو وہ لڑا دیا کرتی تھی۔ ہر دو تین ہفتوں میں ایک دن اس کا یونہی فیشن بڑھ کر رہتا۔ بچن سے سرگھٹائی تو کھر کی صفائی میں ذہن بٹ جاتا۔ وہ ہر چیز طریقے اور سلیقے سے رکھ دیتی مگر اس کی نندوں کی تمام اولادیں جو ان ہو جانے کے باوجود ہر چیز کو ترتیب سے بٹا دینے کا ہنر مگر نہ معمولی تھیں اور آخر کار جاتے جاتے کوئی نہ کوئی یہ جگہ کہہ جاتا کہ۔

”اسنی عائشہ کے گھر کبھی کوئی چیز اپنی جگہ پر موجود نہیں ملتی۔“

عقل مند لوگ ایسے طنز و طعن کو گنڈھے چکا کر بے نیازی سے نظر انداز کر دیا کرتے ہیں مگر بیٹی عائشہ کی عقل بھی جائز طریقے سے بھی استعمال نہ ہوتی تھی اسی لیے وہ جان لگا دینے کے باوجود انہیں ہر جگہ کڑی ہی بیٹی رہ جاتی۔ یہ بڑی حقیقت ہے کہ یوں جتنے والے لوگ جیتنا ہاتھ ملتے ہی رہ جاتے ہیں۔

”اچھا ام۔“ تو بیٹھی بیٹھی باتوں کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور لوگ بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں۔

جویرے فیرنے کے ڈونکوں کی سجاوٹ دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

میں نے تم سے کہا تھا کپڑے تبدیل کر لینا مگر تم ابھی تنگ روٹی ٹپل رہی ہو!

عائشہ کام میں اس طرح ٹھوٹی ہوئی تھی کہ اسے جویرے سے بحث کرنے کی فرصت نہیں تھی اسی لیے اس نے بات کر یوں نظر انداز کیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ بھی آج کان بے بارہ تنگ ہی واپس آگئی تھی۔ جتنا چلا تھا آج ڈاکٹر طارق علی نہیں آئے۔ ان کی دونوں کلاسیں خالی جانی تھیں اور پھر پریکٹیکل کے لیے لڑنے کا ارادہ اس نے خود ہی ملتی کر دیا کہ اپنی بھی خوش ہو جائیں گی کہ ان کی ہدایت کے مطابق پہلی بار وہ گھر جلدی لوٹ کر آگئی تھی۔ ورنہ جب بھی وہ چھو پھیول کے آنے کی خوشی میں اسے جلدی گھر آنے کا کہتیں وہ جان بوجھ کر در سے کھڑا کرتی۔

”میرے کپڑے کیا برسے ہیں۔ اتنا اچھا کان کا سوٹ صبح ہی کان پہن کر گئی ہوں۔ چند گھنٹوں میں کیا خراب ہو گیا ہے کراب دوسرا سوٹ نکالوں۔ اچھا آپ بھی اس موقع پر کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو جاتی ہیں؟“ اس نے تمام دیکھیاں اور فرخ کھول کر دیکھ لیا کہ کیا کیا بیکلے۔

”اتنا سیلا اور بغیر استری شدہ سوٹ تنگ رہا ہے۔ کاشی کا ہے اسی لیے کہہ رہی ہوں دیکھو کتنی سولیں پڑ گئی ہیں اس میں۔ تم میرا کہا ماننا پسند کرو گی یا نہیں؟“ اس نے جھڑکتے ہوئے جویرے کو کہا۔

”میرے جو غصہ کر رہی ہیں آپ۔ اتنا کام کر میں گی تو تنگ کی وجہ سے طبیعت میں چڑخاڑا ہٹ تو شامل ہو جانے کی ناں۔ جیکاب کو صاف بتا ہے کہ بڈٹ کوئی نہیں ملنے والا۔ آخر کیوں انہی محنت کرتی ہیں آپ۔ فضول لوگوں پر اپنا ہنر ضائع کرتی رہتی ہیں؟“ اس نے اپنی چڑ کو ظاہر کرنے میں ذرا بھی

والی تمام باتیں سننا ان کا پہلا فریضہ تھا۔ وہی عورت کی کمزوری جنس اور اپنے گھر کو چھوڑ کر کے یا رخصت ہونے کے گھر کی جاسوسی۔ یہ ان ماں بیٹیوں کا چہیتہ کا طور تھا۔ کھانا بیدیں کھائیں، باؤں سے پہلے پیٹ بھر لیں۔ اس نے بھی بونٹی کے لئے کسی کے سوال کو اطمینان سے نظر انداز کر دیا اور اپنے کام میں مصروف رہی۔ اب عادت احمد خان، اس کا شوہر کوئی ایسی معمولی شخصیت بھی نہیں کہ کوئی بونٹی سرسری سا اس کا احوال پوچھنے اور پھر کندھے اچکاتے ہوئے جان چھڑالے کہ کہی ہم نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔ اتنی نڈر بھی عائشہ خان اب ہوتی تھی۔

”لامیں جانی، میں کچھ باتیں شادوں“ جب کام اختتام پذیر ہوتا تو حسب عادت کوئی نہ کوئی بہن بیٹی کو اشارہ کرتی کہ وہ آئی عائشہ کو ایسی پیشکش کریں۔ وہ ان کی اولاد بھی ماؤں کی سکھائی پڑھائی اور اپنی کے اشاروں پر چلتے دل۔ جویریہ کو یہ باتیں ہی جلا کر پختی تھیں۔

”ہاں ابھی لوکی کا جلہ بنانا باقی ہے۔ اگر تم چاہو تو یونین میں آ جاؤ، ہم دونوں مل کر یہ کام کر لیتے ہیں۔ اتنی صبح سے ہی یونین میں لگی ہوئی ہیں۔ اب تنگ لگی ہوں گی۔“

اس سے پہلے کہ عائشہ کچھ جواب دیتی، جویریہ نے فوراً کام بتا دیا۔ عائشہ نے اس کے جھوٹ پر اسے بری طرح گھبرا کر کہہ دیا کہ تم نے اس کی بات سب کئے تے تے رکھنا بھی لازمی تھا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ میں تو ہر قسم کی کھانا آسانی سے بنا لیتی ہوں۔ تانے کو کنگ ایسی طرح تھے لکھا جو دنی ہے۔“ عائشہ نے فوراً ڈینگ ماری، جویریہ نے بھی آج اسے نہ بچنے کی قسم کھا لی تھی جیسے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے یونین میں لے گئی۔

”کھانا تو تم منہ پلوں جن رہی ہو جیسے سب کچھ تیار پڑا ہو، ابھی اتنا بڑا کام تو بیچے باقی ہے، اب یہ دونوں بچیاں ہی تو ہیں۔ کیا خاک حلوہ بنائیں گی۔ کھڑی منڈیا دیکھ دی ہو، جاؤ انہیں دیکھو تو سہی؟“

اماں جان نے حسب حادث بلا لحاظ عائشہ کو لوک دیا۔

”نہیں اماں جان! آپ کو تو بتا ہے جویریہ ایسے کاموں میں ماہر ہے۔ مٹھائیاں جتنے شوق سے کھاتی ہے، اتنی ہی لکھن سے بنا بھی لیتی ہے۔ اور مٹھائی بھی آپ نے سن لی، ہر قسم کی کھانا بنانا اسے بھی آتا ہے۔ پھر لکھا ان کے سر پر کھڑا ہونا۔ اچھا ہے ناں اس طرح دونوں کا امتحان بھی ہو جائے گا۔ بچیاں ہجاری اب جوان ہو گئی ہیں۔“

اماں جان کی بات پر اسے بھی قصہ آگیا، مگر اس نے بہت ہوشیاری سے بات کہتے ہوئے ایک کرسی گھسیٹی اور ان ماں بیٹیوں کے پاس آکر ہی بیٹھ گئی۔ ہوشیاری کی باتیں وہ بھی اب بول کر نہ لگی تھی۔ زمانہ اسی چال پر چل رہا تھا۔

”تم ایسا کرو۔ لوکی کو چیل کر شین میں کرکوش کرو، میں دیکھی میں لگی وغیرہ گرم کرتی ہوں۔“ اس نے فریخ میں سے ہنری کی پوری بیٹے نکال کر اس کے آگے رکھ دی۔ اندازاً دو کلو کے قریب لوکی اس میں موجود ہی اس کی ماں کو بھی عادت تھی۔ موسم کا ہر چیل اور ہنری گھر میں موجود رکھنے کی اس کی یہی عادت آج جویریہ کے کام آتی تھی۔ لوکی کے حلوے کا بکا مار کر درودہ چھس سکتی تھی مگر اسے اندازہ تھا کہ ضرورت کی سادی چیمڑی گھر میں نکل آئیں گی۔

”ارے تم لوکی چیل رہی ہو یا تریلوڑہ اتنا موٹا اھلکا نکال دو گی تو اندر گودا کیا رہ جائے گا۔ کیا خالی خالی بیچ چو پھر چڑھاؤں گے۔ ذرا سلیقے سے چھلکا اتار دو مجھے تمہارے ماموں بڑی خشت سے پیسہ گاتے ہیں۔“

”جی میرے ناخن غراب ہو جائیں گے جویریہ! میں نے لکھن لگا لگا کر بہت مشکل سے برف سے کیے ہیں۔ ایسا کرو یہ کام تم کرو، میں کچھ اندر کر لوں گی۔“ اس نے چھری پھینکی اور فوراً زمین پر جا کر ہاتھ دھونے لگی۔

”ذرا سی لوکی تم سے نہیں چیل جا رہی۔ باقی کیا کام کر سکتی؟“ اس نے فٹانٹ نہایت سلیقے سے چھلکا اتارتے

رودادری نہیں برتی۔

”تم صرف بونٹی ہی رہو گی۔ کرنا کچھ نہیں اچھا۔ ہنا دھو کر آئیں کرماں کو دو جا رکام ہی کرادوں۔ دیکھی نہیں ہوتا نا کام پھیلا پڑا ہے بجائے اس کے کہ بھٹ کرے بیٹھ لیں۔ آخر بھمان ہی آ رہی ہیں ناں گھر میں تو تم چاہتی کیا ہو۔ میں سرمہ لپیٹ کر بڑ جاؤں گا کہ خود ہی لکھائیں گی۔ اور خود ہی کھائیں گی۔“

”ہاں۔ اچھا آئیڈیال ہے اتنی جان آپ کیل تان کر بستر میں پڑ جائیں۔ میں اعلان کر دیتی ہوں کہ اتنی کو سخت بخارا لگا رہے۔ پھر دیکھتے ہیں آپ کی نندیں کیا کرتی ہیں۔ اسے اتنی! ساری عمر خودی آزمائش میں پڑی رہتی ہیں۔ کبھی دوسروں کو بھی آزمایا کریں۔“ اس نے چلی بجا کر ترکیب بتا ڈالی۔

”آزمائے ہوئی کر کیا آزمائے گا؟ وہ منہ ہی منہ میں بڑ کر رہ گئی۔ پھر جویریہ کو بالکل ہی نظر انداز کرتے ہوئے اس نے تلوے پہ پڑ گیا اور وہاں بنانا شروع کر دیں۔ جو کچھ وہ سوچ سوچ کر کرکھارکی بھی وہی جویریہ زبان سے کہہ کر اپنے دل کی تمیز اس نکال کر کرتی تھی۔ زیادہ روک روک کی تو وہ بھی ماں کی طرح اندر ہی اندر گھونٹتی جا جا کر رہے گی۔ وہ ماں تو بھی اولاد کے دل کی نہ سننے کی تو کس کی سننے کی۔ ارے اتنی! آپ نا راض ہوئیں کیا؟ عائشہ کو بالکل خاموشی سے ہاتھ چلاتے دیکھ کر جویریہ ان کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

”نہیں بھئی میں تو جلدی کام نہ ملنے کے چکر میں ہوں۔ دیکھو تلہ کی اذان بھی ہونے لگی ہے۔ ہنا کر نماز بھی پڑھ لوں پھر سب لوگ آگئے تو شاید فرصت نہ ملے۔“ وہی تو بے پروا ل کر اس نے دوسرا پیرا اٹھالیا۔

”ہاں سب لوگ آگئے تو پھر تو آپ کو نہ خطا ہی یاد رہے گا نہ صغمت و صیان میں رہے گا۔“ بات کہہ کر یکدم وہ چپ ہو گئی۔

”سو رہی اتنی! پھر زبان پھسل گئی عائشہ کے کچھ کہنے سے پہلے اس نے معافی مانگ لی۔

”کبھی رہو جو تمہارے دل میں بات آ رہی ہے۔ میں بول نہیں سکتی۔ ضرور رہی ہوں۔ مائیں اولاد کی انھیں بڑھ لیا کرتی ہیں۔ میں بھلا تمہاری زبان سے کہی بائیں تو کبھی جھٹلاؤں۔“

”ای! جس آپ میں یہی تو خرابی ہے کہ آپ بہت ہی زیادہ اچھی ہیں۔“ اس نے ماں کے ہاتھ کو پتہ لیا۔

”پلیس! اب آپ ایسا کریں کہ ہنا کر نماز پڑھ لیں۔ باقی روٹیاں میں ڈال لیتی ہوں۔“ اس نے عائشہ کے ہاتھ سے پیسن لے لیا۔ اور خود روٹی بنانا شروع کر دی۔

”مگر تم خود کب نہاؤ گی؟ ان کی اپنی ہی بات تھی۔

”آپ بے فکر رہیں میں نہا بھی لوں گی، دوسرا اچھا سا کٹن کا سوٹ بھی پہن لوں گی اور آپ کے فارغ ہونے سے پہلے فارغ ہو جاؤں گی۔“ اس نے جلدی جلدی ہاتھ چلا کر شروع کر دیا۔

پھر اس نے واقعی سب کام جلد ہی منہ کر نماز بھی پڑھ لی جب تک صرف بڑی چھوٹی تھیں۔ ان کو اماں جان کے ساتھ باتوں میں لگا کر عائشہ پھر یونین میں ایک چکر لگانے چلی گئی تھی۔

”بھائی جان کب تک آجائیں گے بھائی؟“

وہ کھانا لگا رہی تھی تو کہیں سے صدائی۔ اس نے دیکھا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ سوال شاید چھوٹی والی نے پوچھا تھا مگر جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور پھر اپنے فضل میں مگن ہو گئیں۔

فی الحال انہیں ان پندرہ بیس دنوں میں ہونے والی روداد سے زیادہ دلچسپی تھی بہ نسبت بھائی کی پروا کرنے کے یہ تو یونین چلتے پھرتے بھائی کو دیکھ کر سوال اچھا ل دیا ورنہ اپنی ماں سے اس گھر میں رہتے

ہوتے کیا۔
 "اچھا بھویرہ دیکھی میں دودھ پڑا ہے۔ اس کو جویش دے کر اس میں چینی ملاؤ۔ اگر کھڑی تھے دھجی
 گی تو کام کیے آگے بڑھے گا۔ ویسے حلوہ بنانا آسان ہوگا نہیں؟ اس کی جان نہ چھوڑنے کا عہد جویریہ کا بھی
 تھا۔"

"ہاں مگر اس کو پکنے میں تو گھنٹوں لگیں گے، دوپہر کے کھانے کے لیے تو تیار ہونے سے رہا۔ دودھ
 چولہے پر رکھ کر وہ باتوں میں لگ گئی۔
 "گھنٹوں کیوں لگیں گے، ایک گھنٹہ میں حلوہ تیار ہو جائے گا۔ یوں بھی ساری خواتین باتوں میں لگ جاتی
 تو انہیں گھنٹے گزرنے کا کیا احساس ہوگا بھلا۔ تم اپنی نیت کی بات کرو؟
 جویریہ کو اس کا انداز مشکوک لگ رہا تھا۔ یوں بھی اسے خبر تھی چھوٹی اماں نے بیٹیوں کو بیٹے سنوڑنے اور
 باتیں کرنے کے علاوہ کوئی تیسرا ہنر عمل نہیں سکھایا۔ کہ دشمن میں تو دلکش بھی ہو چکا تھا۔ جویریہ کے کام کی رفتار
 ویسے بھی تیز تھی۔
 "نہیں، میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ حلوہ کھا کر کیا کریں گے، اتنے دنوں کے بعد ہی تو مٹلی ہیں بیٹھ کر باتیں
 کریں گے؟"

"اس نے قطعی دھیان نہ دیا کہ دودھ ابل کر دھجی سے باہر آ چکا تھا۔
 "اودھ مانا گاڈا، تم اتنا ذرا سلام بھی دھیان سے نہ کر سکتیں؟"

جویریہ بڑی طرح چڑکھی مگر اسے تو خبر ہوئی چاہے تھی کہ ان چھوٹی زادے کوئی ابھی توقع عیش ہو
 گی۔ کہ وہ چھاتی میں ڈال کر اسے دھوئے کے لیے دھو دھو مگر پھر بھی اس نے آدھا پین میں گرا دیا۔ تھی گرم کر
 کے الائی کو کھڑے ہوئے اس نے خود ہی بڑی دھجی میں ڈال، اسے صرف تھوچ ملانے کے لیے دیا کہ اتنی دیر
 میں وہ بادام اور لپٹے بال سے مگر اس نے دس منٹ تک کھٹ کھٹ کا الپاٹے سڑا میوزک بجایا اور
 ساتھ چولہے کے ارد گرد آتنا گئی اور بولی گرائی کہ اس کی اپنی ماں یہ سڑو دیکھ لیتی تو اسے سیدھا کانٹا سے پڑ
 کر پکنے سے نکال باہر کرنی۔ سچ بات یہ ہے کہ باورچی خانے سے صرف اشتہا انگیز کھانوں کی ہوس نہیں بیٹیوں
 کو اچھا پکانے کی لگن اور تڑپ دینا ماؤں کا کام ہے۔

حلوہ بن گیا مگر کار گزار جویریہ کی تھی۔ اس نے قطعی ادھار نہ رکھا۔ بلکہ ساری رو دو امیز پوری کھانے
 کے دوران سب کے سامنے یوں بیان کی کہ اور تڑپ چڑھ رہی تھی چھوٹی اماں کی آنکھیں نکل آئیں۔
 "رہنے دو بیٹی، اسے منہ سے اتنی بڑائی اچھی نہیں ہوتی۔ ارے اب بتا رہی ماں کو تمہیں یہ ہنر تو سکھائے
 ہی پڑیں گے، یہ بھی نہ سکھا تو ایک روٹی پون روٹی کو کون اپنالے گا۔ اور پرے سوئے پھر کب یہ غلط کالج
 کی تعلیم، لی بی جویریہ! میری بیٹی کسے عیب گوانے سے پہلے اپنے گرجان میں جھانک کر دیکھ لو۔ ادھار تم نے
 نہ رکھا تو میں بھی تو کھا کر نہ چھوڑنے کی عادی نہیں ہوں؟"

دو منٹ میں چھوٹی اماں نے اسے ایسی کھڑی تھی سنائیں کہ اس کی زبان ہی بند ہو گئی۔ اور کسی دوسرے
 کو بھی تو یقین نہ ہونے کہ دو لفظ اس کی صفائی میں ہی کہہ جاتا۔ وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی۔ صرف عائشہ اسے
 پکارتی رہی۔

"چھوڑ دو جی، ٹھیک ہے۔ ہاں اس کا قصور ہے۔ یوں گھر آنے بہان کی بجائے کوئی بے عزتی کرتا ہے اور
 ابھی ثنا تو بچی ہے، کھانا پکانے کا کیا ہے ذمہ داری پڑی تو چار دن میں سیکھ لے گی۔ اماں جان نے اسے لوگ
 کر والیں بٹھا دیا۔"

رباب نے روٹی تو بے پر سے اُٹادی اور چائے کی تلی میں چھان کر ڈالتے ہوئے دونوں چولہے بند کر

ویسے۔ لغمان حیران نہ تھا کہ شادی کے بعد رباب نے کیا کیا سیکھ لیا ہے۔ یوں باورچی خانے میں ترتیب،
 ترکیب اور ترتیب کے ساتھ کھانا بنانا اور کام میں لگن شامل کرنا اس نے کہاں سے سیکھا تھا۔ وہ سارے
 ہنر جو عورت بننے کے لیے عین کوماں سکھا کر گئی ہے۔ اسے شاید زمانے کی بے رحمی نے سکھائے تھے۔

"کھانا ابھی کھا لیں گے، البتہ یاسین غنا پڑھ لوں۔" لغمان کے سامنے آکر اس نے پوچھا اتنا بھال اسے
 طاق علی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے اس کی بے ترتیب سی بچی کو ترتیب کا مطلب سمجھا دیا تھا۔
 "تم اپنی مرضی چلاؤ بیٹی، میں تو دن رات کو عود پچی سے گزار لیا کرتی ہوں یا وہ حسبِ عادت اجاڑا لیتے
 پھیلانے ہوتے تھا۔ مگر اس کا دھیان اخبار کی طرف نہ تھا۔

"کیوں اتنا بے مقصد کر لیا ہے آپ نے زندگی کو البتہ؟ یہ اس طرح ضائع کر دیتے والی چیز تو نہیں
 ہے؟ چند ہی دنوں میں اسے احساس ہوگا رباب بہت بدل گئی ہے، بھلا بھی وہ ایسی یاسین کیا کرتی تھی۔
 بار بار نہ جانتے ہوئے اس کا دل طاق علی کا شکر ادا کرنا چاہتا تھا۔
 "یہی سوال میں تم سے کر رہا ہوں رباب کہ تم تو اپنی زندگی ضائع کر رہی ہو۔ کچھ سوچا بھی ہے یا سوچنا چھوڑ
 دیلے ہے؟"

"اگر آپ میرا نہ مانتیں تو میں پہلے نماز پڑھ لوں۔ البتہ، ظہر کی نماز عروج آفتاب کے وقت پڑھ لیتی بہتر
 ہے پھر عجم ابھی باتوں میں بیٹھ گئے تو کھانا بھی بہت لیٹ ہو جائے گا۔ پابندی اوقات و صلوات یہ تمیز اسے
 لکھی اچھی لگ رہی تھی۔
 "مگر کوئی نہیں مانوں گا۔ میں بلکہ تمہاری پابندی وقت مجھے تو بہت مٹلی لگ رہی ہے؟" اس نے اٹھار
 بھی کر دیا۔

"ایک بات یہ بتا کر جاؤ کہ چائے بنال ہے یا بنانا؟ چائے کی بہت زیادہ علوت پڑی تھی۔
 "نا توئی ہے میں نے مگر آپ کھانے سے پہلے چائے کو قطعی ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ بھلا یوں خالی
 پیٹ چائے پی لیں گے تو کھانا کیا کھا سکیں گے؟ یہ وہ سختی سے باپ کو بتیہہ کرتے ہوئے اندر گھرے کی
 طرف گئی۔

"وہ اس وقت گھر میں موجود نہیں ہے؟
 وہ نماز پڑھ ہی چلی تھی جب فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اور باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے اس نے
 سنا البتہ کسی سے ربات کہہ رہے تھے۔ کون ہو سکتا ہے۔ اس کا دل جلنے لگا اس میں دھڑکا تھا۔
 "تم جو کھنا چاہو مجھ کو یہی کہہ دو تم سے بات نہیں کرے گی اور آئندہ فون بھی نہ کرنا یا
 سختی سے کہہ کر وہ فون بند کر چکا تھے۔

"کون تھا البتہ؟" وہ سالن کا پیالہ ہاتھ میں اٹھاتی ہوئی مین کی طرف آئی تھی۔ اور صبر نہ ہوا تو لغمان سے
 پوچھ بھی لیا۔

"تمہاری ماں تھی شبانہ، میں نے کہہ دیا کہ تم اس سے بات نہیں کرو گی۔ کچھ غلط تو نہیں کہا ناں میں نے؟"
 بالکل غیر متوقع سا تھا یہ جواب اس کے لیے۔
 "اودھ! ان کا رابطہ ہے آپ سے؟" اس نے جواب دینے کے بجائے خود سوال پوچھ لیا۔

"ہاں ظاہر ہے جب اس کے اپنے اختیاری سارے رابطے ٹوٹ چکے ہیں تو اس نے مجھ سے غیر اختیاری
 رابطہ قائم کیا ہوا ہے؟
 "کیا اُمی والیں آپ کے پاس آنا چاہتی ہیں؟ وہ بہت حوصلے سے اس منموہ پر بات کر رہی تھی۔ یہ
 بہادری بھی اس کی شخصیت میں اضافتی تھی۔

”السلام علیکم دیکھے جو رمضان! اخلاق اور مروت اسے بھی رضا کو سلام کرنا لازم تھا۔ اس نے پہلے تو اسی دُشمن میں سر ملادیا اور پھر اچانک ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اودہ رباب: یہ تم ہو، تم یہاں کا کون کی ہو، مجھ سے ملنے آئی ہو ناں۔ اودہ کاٹھ لکھے یقین نہیں آ رہا۔
 وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس لمحے کی زد سے بچنے کی اس نے زکوٰۃ کی ترکیب سوچ لی تھی نہ تدریس۔
 کچھ اس کی دیوانگی سے اسے خوف آنے لگا۔

”تم کلاس میں نہیں گئے تھے رضا! اسے کہیں نہیں آ رہا تھا کروہ اسے کیا جواب دے۔
 ”چھوڑو بھی، تمہیں کلاس کی بڑی ہے“ بڑی طرح اس نے اس کے سوال کو جھٹک دیا۔
 ”رباب! تم کہاں تھو گئی تھیں، مجھے تمہیں دیکھنے کا بے پناہ جی چاہ رہا تھا میں اپنے جذبے کی شدت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔
 کچھ دیر پہلے کی اس کی خالی نظروں میں ستارے چمکنے لگے تھے۔ اس کے چہرے پر مددِ خلقِ انتہائی آگئی تھی۔ اور اس کے لیے کی بے قدری قابلِ دید تھی۔

”اچھا بھی رضا عابد صاحب! آپ کو شامِ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رباب نے کالج دوبارہ جوائن کر لیا ہے، اطمینان سے جی بھر کر اس سے باتیں کر لیجیے گا۔ فی الحال گرم گرم چائے پی لیجیے۔
 اس سے پہلے کہ وہ صحنے زیادہ جذباتی ہو جاتا۔ اچھا! اسے بھی پکڑا اور پھر گرم چائے کی پیالہ اس کے ہاتھ میں دے کر وہ اسی وقت تخیل اٹھانے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ خاموشی سے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔
 ”رباب! تمہارے ساتھ پکڑے اور چائے بھی منگوان تھی مگر کچھ عجیب کھانا ہوا سامانِ بول بن گیا تھا۔ رضائی نظر مسلسل رباب پر پڑی تھی۔ اودہ ایک کھوت میں انتہائی گرم چائے کی زخالی پیالہ واپس رکھ چکا تھا۔
 ”بھئی رباب! یہ پکڑے پکڑے ہیں روپے گئے آئے ہیں۔ اور چائے کی صرف ایک پلیٹ دس روپے کی ہے اگر آپ صاحب کتاب بھول چکی ہوں تو تیار دوں کہ پورے ساٹھ روپے اس پر خرچ ہو گئے ہیں۔ یعنی ایک سو کا نوٹ صرف آج آپ کے کالج آنے کی خوشی میں، میں نے قربان کیا ہے۔ اور آپ ہیں کہ کسی معذور شخصیت کی طرح صرف چائے کی چمکیاں لیتے ہوئے دوسری کسی پتھر پر ایک نظر غنایت ہی نہیں ڈال رہیں یا حسبِ عادت پہلے تخیل نے ہی ماحول میں پھیلے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی۔

”اور کیا بھی تم ایک پکڑا اٹھا کر ابتدا لو کر دیناں سب اکے منہ میں پانی آ رہا ہے۔ ایک نہیں یہی یہاں پانچ دریا ایک ساتھ بہہ جا رہے گے تو سارا کالج اس میں ڈوب جائے گا۔ تم جانتی نہیں کہ میری کون سی پکڑ پکڑ کر تم سب نہ بڑے ہو چکے ہیں۔ نادیدہ بھی اپنی طبیعت کا رنگ دکھایا تو مسکرا کر رباب نے پکڑا اٹھا ہی لیا۔
 ”دیکھیے یاد آتے دفن سے بچن میں جھک مار رہی ہوں مگر ایسے پکڑے بنائے نہ آئے یہ اسے عبداللہ بھٹاؤ جانے اس کے آئینے میں کیا ملائے ہیں کہ لطف و لذت بھونچ رہیں۔ میں روزِ شام کو اس کے پکڑے یاد کیا کرتی تھی! اس نے بھی اپنے آپ کو تینشن سے نکالنے کی کوشش کی۔

”لیجیے میں نہ یاد کیا یا دھمی کیا تو عبداللہ بھٹاؤ کے پکڑوں کو، ہمیں تو پہلے ہی تمہاری وفادار شک تھا۔
 جو یہ میرے سب کو نہ سنا۔

اور تخیل نے سب کو قہرِ نگاہ پر مجبور کر دیا۔
 ”اٹھو رباب! آؤ میرے ساتھ میں صرف تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بہت اچانک رضائے اٹھ کر رباب کا ہاتھ پکڑ کر انتہائی تیزی سے اسے کھڑا کر دیا۔ اور اسی رفتار سے رباب کا ہاتھ اٹھ گیا۔ اس نے بڑی طرح ٹھہا کر ایک پتھر اس کے منہ پر رسید کیا تھا۔

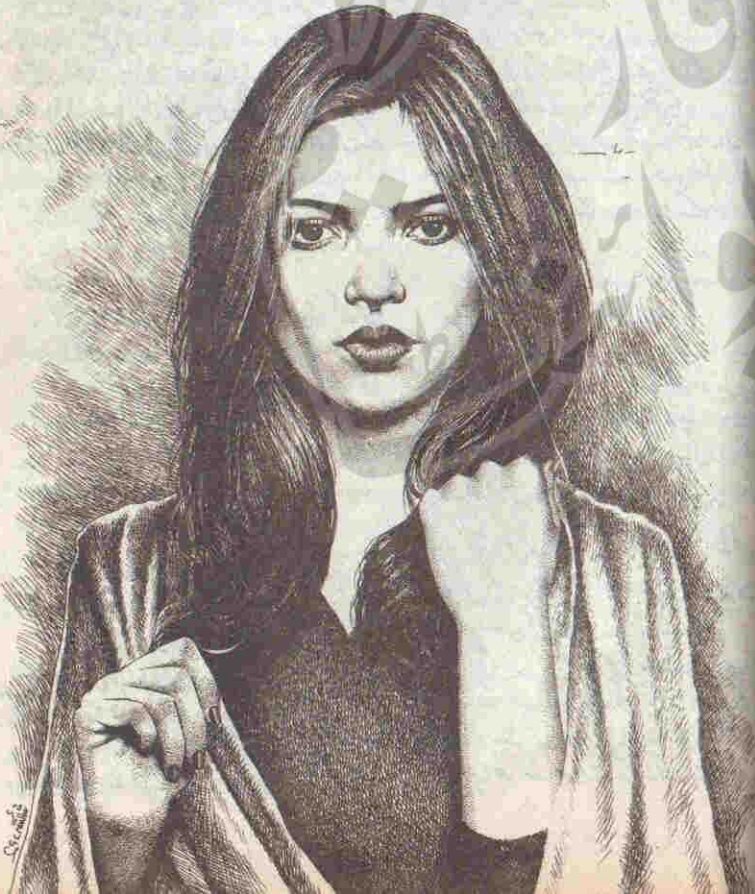
(باقی النشاء اللہ آئندہ شمارے میں)

شادی کا شوق چرا یا تھا تب سے ایک بے انتہا حسد و ہنس لانے کی چاہ میں ان کی ملاقات کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔

باقی سب جہاں کی دل غراہش تھی کہ اپنے اکوڑے مسودے کے لیے چاندی و ہنس لائیں جب سے مسودے لکھ کے آخری سال میں گیا تھا اور انہیں بیٹے کی

شمیم فضل خاں

میرزا محمد علی شاہ



وہ چاہتی تھی کہ ان کے ذہن اور فطرت میں کی
ایسی بیوی ہو جو سب لوگوں سے مختلف اور منفرد ہو۔
یہ نہیں تھا کہ ان کی فطرت میں لوگوں کی کوئی کمی بلکہ فطرت
پر کیا موقوف تھا۔ لوگوں کے گھر میں ہی رہتی
تھیں۔ اس لیے کہ ان کا جوشت فطرتی سیسہ تھا۔ اور
میتوں جہاں ایک عویلی نما گھر میں رہتے تھے جن میں
سب کے پورے ترن لڑا لنگ الگ تھے لیکن سب مل کر
رہتے تھے۔

بڑے ناما کی دیشیاں اور ایک بیٹا تھا دوسرا
میں مسعود کے والد تھے جن کا ایک بیٹا مسعود تھا۔
چھوٹے چھوٹے چھوٹے بیٹیاں تھیں بیٹا تو نہ تھا۔ یہ تو
گھر کی لڑکیاں تھیں گھر سے باہر پھول لانی خانی بیٹی
زین تھی خالہ کی دیشیاں تھیں۔ ساموں کی بھی ایک
بیٹی تھی اور قدرتی بات تھی کہ مسعود چونکہ گھرا کا بچا تھا
لڑکا تھا مستقبل میں ڈاکٹر بننے والا تھا۔ اپنے والدین کی
وسیع جائیداد کا متنا وراثت تھا۔ اس لیے سب لڑکی
والوں کی نظر میں اس کی طرف تھیں لیکن بلیٹس جہاں کی
نظر میں تو لڑکی نہیں تھی تھی۔ خود مسعود اور اس کے
والد نے ساری عمر وہی کیا جو بلیٹس جہاں نے کیا تھا۔
مواظبت سے اس میں بھی وہ خاموش تھے۔ لیکن بلیٹس جہاں
کو لڑکیاں ڈھونڈتے دیکھ کر تال اور تھی دونوں کے
میتوں پر سناٹ لگتے تھے۔

تانی زیادہ تر خاموش رہتی تھیں لیکن بیٹی اکیلے میں
خوب بولتیں۔
"یہ سراسر زیادتی ہے ہماری بیٹیوں کے ساتھ۔
ناقدری ہے ہماری بیٹیوں کی۔ کیا ہی ہے ہماری بیٹیوں
میں بس بات میں وہ کسی سے کم نہیں جن میں تعلیم
اور پھر ان کا کیا کوئی شہنشاہ ہے جس کے لیے
وہ کوئی مختصر ادبی ڈھونڈ رہی ہیں؟"

تانی بھی ہوں، ماں کے ذریعے ان کی باتوں کی تائید
کرتی لیکن بلیٹس جہاں کے سامنے دونوں چپ تھیں۔
اس دن بھی گھانڈن تھا۔ تمام لڑکیاں جمع ہو کر۔
بلیٹس جہاں کی طرف آگئی تھیں۔ سب مل کر منہ مذاق
کر رہی تھیں مسعود بھی سب کے ساتھ بیٹھ کر لڑکیوں ایک
رہا تھا۔ سب نے مل کر لڑکیاں کا کیا کیا تو لڑکیاں ایک
ایک کر کے اپنے اپنے گھر صاف کر گئیں۔ کام کرنے والے

تو سب تھے پھر بھی جب مہمان زیادہ ہو جاتے
بلیٹس جہاں کو بھی پھر نہ کرنا پڑتا۔ اس وقت بھی
بیٹے کے ساتھ مسوے پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔
"خدا کرے جلد ہی سے اس گھر کی اصل مال
آجائے اور مجھے فراغت نصیب ہو۔ مسودہ پیش
بولو۔"

"ای۔ ای۔ اس گھر کی اصل مالکن تو آپ ہیں۔ آپ
کسی دوسری کو مالکن بنا کر کیوں لانا چاہتی ہیں؟
"بیٹا، یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ پرستے لوگ
جگہ سے لوگ لیتے ہیں۔ ماری عمر کوئی ایک سہ ماہ
بن کر نہیں رہ سکتا۔
مسعود کے والد شجاع صاحب نے اخبار سے
شکار کر لیا۔ "تو آج ان لڑکیوں میں سے کوئی جن لڑکیوں
گھر پر آئی تھیں سب
"لو اور مسوے بلیٹس جہاں کو میاں کا یہ مستی
لے حد ناؤ اور گزرا تان میں سے کوئی ایسی لڑکی
جو میرے بیٹے کے ساتھ بچی تھی۔"

"سب بھی بھائی اور اپنے خاندان کی لڑکیاں
ہیں۔ شجاع صاحب نے رشتہ سے کہا کہ اس کی
منتخب کرو۔ خود بخود تمہارے بیٹے کے ساتھ بیچ
گئی۔"

"اور پھر مجھ میں کون سے شراب کے پرست
ہیں ای۔؟ مسعود ہنس کر بولا۔

"تم دونوں باب بیٹا رہتے دو میں اسے جان
لیے ایک ناباب ذہن لاؤں گی جسے دنیا دیکھے
بھیش کی طرح۔ باب بیٹا چپ ہو گئے۔
لگتا تو ایسا تھا کہ بلیٹس جہاں کی اس تلاش
کبھی خاتمہ نہیں ہوگا کیونکہ جس نایاب ہیرے کی تلاش

انہیں تھی اس کا اس روئے زمین پر پانا مشکل تھا
ہو اس کے برعکس کہ بالکل اچانک اور غیر متوقع
پر گوہر معقود ان کے سامنے آگیا۔

ہو لڑکیوں کی پرورش میں بیک رحمت کے ہاں
خوالی کی تقریب تھی۔ ہمیشہ کی طرح بلا والوں کے
آیا تھا۔ ہمیشہ اس منہ کی تقریبات تھی البتہ کہ
کہ انہیں بیجا منت جانتے تھے تو ان سے ملنے کا

بھی تھا۔ لیکن اس دن ان کے میکے میں کوئی تقریب
نہی اور وہ وہاں جانے کی تیاریوں میں مگنی تھیں۔ بلیٹس
کا معاملہ تھا تو بلیٹس جہاں جاتے کے لیے تیار ہو گئیں
اور وہیں قرآن خوان میں مصروف انہیں وہ لڑکی نظر آئی
جو سبھی ان کے دل میں اتر گئی۔ انہیں یوں لگا جیسے
ان کی تلاش کا خاتمہ ہو گیا ہو۔

وہ لڑکی اس قدر حسین تھی کہ لگتا تھا جیسے کوئی خود
راستہ بھول کر دنیا میں آگئی ہو۔ اس کا رنگ کدنی
تھا۔ چیل جیسی خوبصورت آنکھوں میں دوب جانے
کو دل چاہتا تھا۔ وہ بالکل سادہ لباس میں تھی لیکن
اس سادگی میں بلا کا حسن تھا۔ دوپٹے سے سر ڈھکا
ہوا تھا۔ لیکن سنہرے بالوں کی لمبی چوڑی دوپٹے کے نیچے
کسی سانپ کی طرح لہرا رہی تھی۔ دو دو دپٹے گھڑی ہوئی
تو بلیٹس جہاں نے دیکھا کہ لڑکی کا چہرہ جتنا پیارا تھا
جسم اور قد اس سے بھی زیادہ متناسب اور خوبصورت۔
غزل لڑکی میں کوئی کمی کوئی خامی ڈھونڈنے سے بھی
نہیں مل رہی تھی۔ بلیٹس جہاں کا دل تیزی سے دھڑکنے
لگا۔ اور ان کی نظر میں بے ثباتی سے شریا کو ڈھونڈنے میں
لگ گئیں۔ شریا ان کی دور کی رشتہ دار تھیں اور اس کام میں
ان کی شریک کار تھی۔ شریا نے ہی لڑکیاں بلیٹس جہاں
کو دکھائی تھیں۔ وہ اس لحاظ سے بھی اچھی تھیں کہ بلیٹس جہاں
کی جھٹائی اور دیوانی سے پوری راز داری رکھتی تھیں چونکہ
ان لوگوں سے شریا کی رشتہ داری تھی۔ اس لیے بلیٹس جہاں
کو بلیٹس جہاں کا وہ اس تقریب میں مزور آنی ہوں گی۔

مختصر سی تلاش کے بعد بلیٹس جہاں کو شریا ایک
کونے میں نظر آئیں قرآن خوان ختم ہوئی دعا پڑھائی
گئی تمام حاضریں نے ہاتھ اٹھا کر خدا کے حضور اپنے
اپنے مسائل کے حل کے لیے دعائیں مانگیں اہل خانہ
پیش پر جا کر فکر کرنے آگے گئیں اور تمام مہمان خواہین
ایک دوسرے سے باتوں میں لگ گئیں۔ بلیٹس جہاں
فوزا شریا کے پاس پہنچ گئیں۔
"اے شریا جانی آپ میں تو سبھی تھی شالستہ آئی ہو
گی۔ بڑا کا شاندار چھوٹی چچی کی طرف تھا۔
"اس کے میکے میں کوئی تقریب تھی اس لیے مجھے آنا
پڑا۔ خیر چھوڑو۔"

ایک دوسرے سے باتوں میں لگ گئیں۔ بلیٹس جہاں
فوزا شریا کے پاس پہنچ گئیں۔
"اے شریا جانی آپ میں تو سبھی تھی شالستہ آئی ہو
گی۔ بڑا کا شاندار چھوٹی چچی کی طرف تھا۔
"اس کے میکے میں کوئی تقریب تھی اس لیے مجھے آنا
پڑا۔ خیر چھوڑو۔"

بلیٹس جہاں نے اپنی آواز صبی کرتے ہوئے
اس سے پوچھا۔ "یہ بتاؤ۔ یہ سرسری بیٹیوں والی لڑکی کون ہے؟
شریائے شریا کی طرف دیکھا اور بلیٹس۔
"اس کا خیال چھوڑ دو جانی۔"

"کیوں؟" بلیٹس جہاں کو دیکھا کہ اس کا لنگ
رہا تھا جیسے اب اس لڑکی کو چھوڑنا ان کے لیے آسان
نہ رہا ہو۔
"کیا اس کی کہیں منگنی ہو چکی ہے؟" بڑے دکھ سے
انہوں نے پوچھا۔

"نہیں۔ شریا کے جواب پر بلیٹس جہاں کو ایسے
لگا جیسے ان کی منگنی جان واپس لوٹ آئی ہو۔
"بھیر۔ بھیر کیا بات ہے؟" دھڑکنے والے
انہوں نے پوچھا۔

"ان لوگوں کی کلاس اور آپ کی کلاس میں بہت فرق
ہے۔ شریا نے اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ یہ
لوگ آپ لوگوں کے مقابلے میں بہت کم تر ہیں۔
"اوہ؟" بلیٹس جہاں نے ایک لمبی سانس لی۔ کوئی
بات نہیں۔ اگر مزہ پکڑنے کی دوکان بیکر کر لیتے جاتا
ہے تو دوکان نہیں خریدتا۔ پکڑا کر بیکر کر لیتا ہے۔
پھر لڑکی کے گھر بار سے کیا لینا دینا۔ گھر لڑکی گھر
لائی ہے۔ اس کی حیثیت نہیں ہے۔
"اگر ایسی بات ہے تو لڑکی تو اسے دن ہے۔
یونہی ہی میںا پڑھ رہی ہے۔ شریف لوگ ہیں۔ باپ
فوت ہو چکا ہے، ایک ماں ہے ایک بھائی ہے۔
جو کسی پرائیویٹ کمپنی میں سرورس کرتا ہے۔
شریائے اپنی عادت کے مطابق ساری تفصیلات
انہیں فراہم کر دیں۔
"تو پھر کب لے کر چل رہی ہو مجھے؟" بلیٹس جہاں
کا شوق اور غشی کے مارے بڑا حال تھا۔
"جب آپ کہیں؟" شریا نے فوزا کو کہا۔
"تو پھر کل ہی آجاؤ۔ میں اب مزید انتظار نہیں کر
سکتی۔"

بلیٹس جہاں گھوٹیں تو بے انتہا خوش تھیں، اور
تو سب سے انہوں نے بات چیلنے لگی۔ لیکن انہوں
میاں اور بیٹے کو کفیل نے ساری بات بتادی۔ لڑکی
کا اس قدر تقریب نہیں کہ مسعود میاں تو بن دیکھے

بلیٹس جہاں گھوٹیں تو بے انتہا خوش تھیں، اور
تو سب سے انہوں نے بات چیلنے لگی۔ لیکن انہوں
میاں اور بیٹے کو کفیل نے ساری بات بتادی۔ لڑکی
کا اس قدر تقریب نہیں کہ مسعود میاں تو بن دیکھے

ہی اس کے عاشق ہوئے۔ شجاع صاحب نے بھی اپنے دلچسپ بیگم کی پسند کی داد دی اور ان کی کامیابی کے لیے دعا کی۔

لگے دن صبح صبح شریا آگئیں اور دونوں خدا کا نام لے کر لوگ کے گھر چل دیں۔ ڈراؤر کو شریا راستہ دکھائی دیں۔ گارامک کو ان کے سامنے دگ کی مٹریا آگے آگے اور بلقیس جہاں ان کے پیچھے تھیں۔ دونوں اندر گھس گئیں۔ یہ ایک چھوٹا مگر صاف سترا دروازہ تھا۔ گوار پر تھا۔ پیرا گھر کے طور پر استیصال ہوتا تھا۔ اس لڑکی کی ماں کے عزت سے دونوں کو بیٹھک میں بٹھایا۔ وہ شریا سے واقف تھیں۔

شریا نے لڑکی کی ماں سے پوچھا۔

”بیلا کہاں ہے؟“

”اندر پر پڑھ رہی ہے۔ میں بلاتی ہوں۔ بلقیس جہاں کو لیں لگا جسے بیلا کے نام کے ساتھ تھیں۔ بیٹھک میں گھل گئی۔ جو اتنی حسین لڑکی کا نام بھی اتنی ہی حسین ہونا چاہیے تھا۔ موزوں ویر بعد بیلا نے اگر سلام کیا۔ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر اٹھ کر چل گئی۔ آج وہ کل سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ بلقیس جہاں کی نظریں اسے دیکھ دیکھ کر سیر نہیں ہو پا رہی تھیں۔ انہوں نے زیادہ انتظار نہیں کیا۔ اور بیلا کی ماں سے جھٹ پٹ اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ وہ تو سن کر حیران رہ گئیں۔ شریا نے ان کا تقاروف پہلے سے کر رکھا تھا۔ وہ فوراً بولیں۔

”آپ بڑا نرمالہ ہیں لیکن میں یہ رشتہ قبول نہیں کر سکتی۔“

”وہ کیوں؟“ بلقیس جہاں دھک سے رہ گئیں۔ شریا بھی حیرت سے بیلا کی ماں کا منہ لگنے لگیں۔

”بھتیجیوں کا فرق بعض اوقات بہت سے مسائل کو جنم دیتا ہے۔ میری بیلا میری اکلونی بیٹی ہے۔ میں اس کے لیے پورے زندگی کی خواہش مند ہوں۔“

”دیکھو بہن، بلقیس جہاں نے رسالت سے اُسے کھیلے ہوئے کہا: جب اس فرق کو ہم نے محسوس نہیں کیا تو آپ کیوں اسے محسوس کرتی ہیں۔ ہم نے آپ کی بیٹی کو لے جانے دو اپنی ذات میں مکمل ہے۔ حیثیت کا فرق ہمارے نزدیک کوئی اہمیت

نہیں رکھتا۔“

”آپ حویلی والے اور ہم کو اردو میں رہتے والے لوگ۔ کوئی بھی حیرت لگا کر یہ فاصلہ چھلانگ نہیں سکتا۔ شادی بیاہ تو اپنے برابر والوں میں کیا جاتا ہے۔ مسز شجاع آپ اپنی حیثیت سے اس قدر شیعہ اتر کر کیوں یہ رشتہ جوڑ رہی ہیں؟“

”یہ آپ ہم پر چھوڑ دیجئے کہ ہم یہ رشتہ کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ہاں کر دیجئے، ہمارا منہ بیٹھا ہے۔ اور اللہ اللہ آپ کی بیٹی کو بھی جوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ آپ خود دیکھ لیں گی۔“

”آپ بضد ہیں تو۔“ بیلا کی ماں کچھ اٹھے لیجے میں بولیں۔ میں بیٹے سے بھی مشورہ کروں گی اور بیلا سے بھی پوچھ لوں گی۔ لیکن میں ایک بار پھر۔“

”بس اب کچھ مدت کہیں بلقیس جہاں ان کی بات کاٹ کر بولیں۔ ان کے لیے بیلا کی ماں کی یہ نیم رماندی بھی بہت سی۔“

”آپ لگ اچھی طرح سمجھ لیں ہم چند دن بعد آئیں گے۔“

”آپ کیوں دوبارہ آنے کی تکلیف کرتی ہیں۔ شریا آیا کر بھیج دیجئے ہم انہیں جواب دے دیں گے۔“

”شک ہے۔ شریا ہی آجئے گی۔ لیکن جواب ہماری مرضی کے مطابق دیجئے گا۔“

”جائے وائے بی کروہ دونوں کچھ اٹھیا اور کچھ اٹھیا کے ساتھ ان کے گھر سے لوٹ آئیں۔“

بیلا کی ماں کے دل میں سوطر کی اُلجھیں تھیں جس کی وجہ سے وہ یہ رشتہ قبول کرنے سے بھیکاری تھیں۔ لیکن بلا جانا تو دونوں اس رشتے کے بارے میں سننے ہی سے ہچک اٹھتا۔

”اماں! بیلا کی قسمت کھل گئی ہے۔ اور آپ حیل و حجت سے کام لے رہی ہیں۔ جانتی ہی ہیں کتنے بڑے لوگ ہیں وہ۔“

”اسی لیے تو ڈر رہی ہوں۔“ بھیم ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔

”اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے۔ بیلا کے لیے کتنے اچھے رشتے آئے لیکن ہم باں کرتے

ہیں۔“

”اسی لیے تو ڈر رہی ہوں۔“ بھیم ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔

”اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے۔ بیلا کے لیے کتنے اچھے رشتے آئے لیکن ہم باں کرتے

ہیں۔“

”اسی لیے تو ڈر رہی ہوں۔“ بھیم ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔

”اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے۔ بیلا کے لیے کتنے اچھے رشتے آئے لیکن ہم باں کرتے

ہیں۔“

”اسی لیے تو ڈر رہی ہوں۔“ بھیم ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔

”اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے۔ بیلا کے لیے کتنے اچھے رشتے آئے لیکن ہم باں کرتے

ہیں۔“

”اسی لیے تو ڈر رہی ہوں۔“ بھیم ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔

”اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے۔ بیلا کے لیے کتنے اچھے رشتے آئے لیکن ہم باں کرتے

کبھی ہی تھیں۔ نند اور ہیں کارو یہ بھی چھکا چھکا سا تھا۔ لیکن بعد میں سب ٹھیک ہو گیا۔ اب تو تنگی کی تیار ماں زوروں پر تھیں۔ لڑکیاں بازاروں پر لڑتی پڑتی تھیں۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ اس تقریب میں منفرد نظر آئے۔ اس جیسا لباس کسی اور کا نہ ہو۔ بلقیس جہاں کے بھی بازار کے کسی کوئی پھیرے لگے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی چاندی ہونے کے لیے منگنی کا الیبا لباس تیار ہو جو اس کے حشر کو دو آنکھ بنا دے۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ لیکن بلقیس جہاں کے دل میں ایک دھڑکا سا لگا تھا۔ اور اسی کانٹے کو نکلنے کے لیے وہ ایک دن بھیم کے باں پہنچ گئیں۔ رادھر اگھر کی بالائی کے بعد بلقیس جہاں مطلب کی بات پر آگئیں۔

”بہن! منگنی کا انتظام کہاں پر کروں گی آپ؟“

”گھر تو جارا بہت چھٹا ہے۔ اس لیے سوچا ہے کہ گھر کے سامنے والی شریک پر قاضی وغیرہ لگا لیں گے۔“

”شریک پر؟“ بلقیس جہاں کا سانس سینے میں اٹکنے لگا۔ لیکن یہ یہ تو چھٹا نہیں لگے گا تو وہ تو کنگل کر بولیں۔

”لیکن مجھ پر ہی ہے۔“ بھیم بگم اداسی سے بولیں۔

”اس کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے۔“

”میرا مطلب ہے۔ ہم یہ تقریب کسی کلب یا ہوٹل میں بھی منعقد کر سکتے ہیں۔“

”کلب؟ یا ہوٹل میں؟“ بھیم بگم لڑکھائی آواز میں بولیں۔ لیکن آپ تو علم سے کہیں۔

”ہاں ہاں مجھے سب علم ہے۔ بلقیس جہاں نے محبت سے بھیم بگم کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کی بات کاٹی: ”بھئی آپ اور ہم الگ الگ نہیں ہیں۔“

”چھرا نہ ہوں نے اپنا پرس کھول کر ایک بھاری لفافہ نکالا اور بھیم بگم کے ہاتھ میں تھاتے ہوئے بولیں۔

”اپنے بیٹے کے کپڑے لگا کر سارا انتظام اس رقم سے کرے اگر رقم کم پڑ جائے تو ہم مزید بھجوا دیں گے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مسز شجاع؟“ بھیم بگم کو

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مسز شجاع؟“ بھیم بگم کو

جیسے کرٹ سا سادہ وہ بھڑائی آواز میں بولیں: "آپ ہماری
نو بین کر رہی ہیں۔ ہم نے تو پہلی ہی آپ پر واضح کر دیا تھا
کہ ہماری اور آپ کی حیثیت میں بہت فرق ہے۔"
میں اس فرق کو تب بھی نہیں مان رہی تھی، اور
اب بھی میرے نزدیک یہ فرق کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن
خاندان والوں، سنیے والوں اور دوست راجا کا خیال
رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے یہ آپ جانتی تو ہوں گی کہ ہمارے
بیٹے پر ہر بڑی دانے کی نظریں تھیں۔ اب وہ سب اس
تاک میں بیٹھے ہیں کہ ہماری کوئی کمزوری ان کے ہاتھ لگائے
اور وہ ہمیں ذلیل کر لیں۔ ہم انہیں ایسا کوئی موقع نہیں
دینا چاہتے یہ آپ کی اور ہماری دونوں کی عزت کے
لیے ضروری ہے۔

"تو شک ہے۔" مجھے یہ کہنے پر قابو پالے
ہوئے کمزوری آواز میں بولیں: "ہم آپ کے شاہان شان
کسی کلب میں ملنے کا انتظام کر لیں گے لیکن یہ رقم ہم
وصل نہیں کر سکتے۔"

"دیکھیے، آپ ہمیں غیر بھر پوری شہ بلیس جہاں نے
رقم دینے پر اصرار کیا، اس رقم کا علم کسی کو بھی نہیں
ہے۔ سچی کہ ہم نے اپنے خاں اور بیٹے سے بھی یہ
بات چھپائی ہے۔"

"ہیں اس طرح مجبور کر کے ذلیل نہ کیجئے۔" مجھے یہ
بے اختیار رو پڑیں: "ہم آپ کے شاہان شان سارا
انتظام کریں گے، لیکن یہ رقم کے کر خود اپنی نظروں میں
نہیں کر سکتے۔"

بلیس جہاں کے بے انتہا اصرار کے باوجود
مجھے یہ رقم نہ دے رہی لیکن بلیس جہاں کے خطے جانے
کے بعد وہ اسی سوچ میں پھری رہیں کہ ان کے شاہان شان
انتظام کرنے کا جو وعدہ کیا ہے وہ کیسے پورا کر دیں گی۔
منگنی کی تیار دیاں ذروں پر بلیس، بلیس جہاں
کا ایک پاؤں گھر میں تو دوسرا بازار میں ہوتا تھا۔ اس
دن کے بعد مجھے یہ کہہ بھی نہیں جاسکی تھیں۔

ہاں اتنا انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ منگنی کی تعریف کلب
میں ہوگی، ان کے لیے یہی بات اطمینان کا باعث تھی۔
واپس کا کوئی میں ان کی دوست مسز ریاض رہی تھیں۔
مسز ریاض کی سیال واٹر میں چیف ایجنٹ تھے وہ پلاکاوٹی
میں ان کی سرکاری کوئی تمام کوئیوں میں بے حد نمایاں

تھی۔ مسز ریاض کو یاد تھا کہ ان کے بچپن میں
دن بعد ان کے گھر ایک پارٹی ہوتی تھی۔ بلیس
سے ان کی خاص بنی تھی۔ ہر پارٹی میں وہ بلیس
کو بلانا نہیں بھولی تھیں یہ اور بات تھی کہ بلیس
کبھی چلی جاتی بھی کوئی بیانا نہ کرتیں۔ اس دن
کا فن آ یا تو چھوٹے ہی انہوں نے گلہ کیا۔
"آپ پچھلی دو بار میں نہیں آئیں بلیس
اس بار بھی آپ نہ آئیں تو مجھے آپ سے بے حد
گلا۔"

"ارے نہیں مسز ریاض،" بلیس جہاں ہنس کر
"نادان ہیں آپ کے دماغ اس بار ضرور آؤں
ہے پارٹی؟ اور کس کے اعزاز میں دے رہی
ہی؟" کل شام جارنجے پارٹی ہے۔ وہ مسز ریاض
نا۔ وہ دو ماہ امریکہ میں گزار کر آئی ہیں۔ بلیس
ہی کے اعزاز میں پارٹی دے رہی ہیں۔

"ارے،" وہ ہنس کر بولیں: "میں تو پارٹی
کے لیے ہانا جا رہی ہوں۔ ہر حال میں ضرور آؤں گی
"ہاں بس گٹ نوٹ کر لیں۔" کے لیے بیانا
ہوتا ہے۔ اچھا میں انتظار کروں گی۔

بلیس جہاں نے فون بند کرتے ہوئے
کہا کہ یہ منگنی کے مسئلے میں کام تو بہت ہیں لیکن
ابھی دوست کو بھی نادان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ
پیر یاد کرتی ہے وہ بلیس جہاں نے دل میں فیصلہ
کہ ضرور اس وقت نکال کر مسز ریاض کے ہاں

گی۔
مسز ریاض کے ڈرائنگ روم سے قہقہوں
باتوں کی آواز بہت آ رہی تھی۔ بلیس جہاں
جوئی ہی اندر قدم رکھا تمام خامنہ سے خوش
نعرے لگائے، اور کھڑے ہو کر ان کا استقبال
خاص کر مسز ریاض کو اس کے آنے پر خوشی سے

نہیں سادہ تھیں۔ باتیں شروع ہوئیں تو مسز ریاض
کا تذکرہ بھی زیر بحث آیا۔ ساری حوا میں کوئی
کہ بلیس جہاں جو ہر لڑکی میں میں بیچ نکالتی تھیں
ایسی بے عیب لڑکی کہاں سے مل گئی بلیس جہاں
ہنس کر جواب دیا کہ منگنی کی تعریف میں آپ
کو دیکھ لیں، پھر بعد میں باتیں کریں گے۔

اور صرف دلی کا حسن دیکھا ہے۔ کچھ دیر ایسی موضوع پر
لگنکو جاری رہی پھر باتوں کا رخ دوسری طرف مڑ گیا۔
اب مسز ریاض اپنے امریکہ کے سفر کی روداد سن رہی
تھیں، سب انہوں سے سن رہی تھیں کوئی کوئی بھی
باہر جانے کا تجربہ نہ تھا۔ وہ بھی بیچ میں ایک آدھ بات
کہہ ڈالتی۔ غرض فعل ذروں پر بھی مسز ریاض نے
آواز دی۔

"سنو۔ چائے پیس لے آؤ۔ ڈرائنگ روم کا
اسے سی خراب ہے، وہاں گرمی ہوگی۔"

مٹھوڑی ویر بعد الاؤح والے تمام اشتیاق سے لڑی
بچندی ٹرائی و حقیقتی ہوئی وہ عورت اندر آگئی۔ عورت
نے اپنے چہرے پر دو بار اس طرح ڈالا تھا کہ اس کا
آدھا منہ چھپ گیا تھا۔ لیکن وہ بلیس جہاں کی عقلی
نظروں سے چھپ نہ سکی۔ اور بلیس جہاں کو لیں
لگا جیسے کسی نے تیرہ ہزار خیر ان کے دل میں پیوست
کر دیا ہو جیسے اس گھر کے کی چھت اور تمام چیزیں اس
پر آن لگی ہوں۔ اور وہ اس بوجھ کے دب کر رہ گئی
ہوں۔

وہ مجھے یہ کہتیں، ان کی بے مثال ہوئی ماں مجھے یہ
نے بھی انہیں بیان کیا تھا سچی تو چائے بناتے ہوئے
ان کے ہاتھ کاٹ رہے تھے۔ اور قدوں کی ڈھکڑاٹ
صاف محسوس ہوتی تھی۔ باقی وقت تو مجھے بلیس جہاں
نے کانٹوں پر گزارا۔ نہ کسی کی کوئی بات ان کی پیچیں
آ رہی تھی نہ خود کچھ بول پارہی تھیں۔ الفاظ گول بول
کر حلق میں اٹک رہے تھے۔ جیسے تیسے گھر لوٹ آئیں۔

شوہر اور بیٹے سے کیا گئیں، جو کچھ کہا تھا خود ان ہی نے
کہا تھا۔ ساری رات بے قرار رہیں۔ بھی اندھا بھی
باہر بولی نہ تھی۔ ٹی وی کے سامنے بھی بیٹھ گئیں۔
وزیر اعظم کی تقریر بھی پہلے تو حلقی الذہنی کے عالم
میں تقریر سن رہی تھیں پھر بلوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو

گئیں۔ اور ساری تقریر سن کر وہاں سے اٹھ گئیں۔
صبح صبح وہ مجھے یہ کہہ پہنچ گئیں ابھی اندر جانے
والی تھیں کہ باتوں کی آواز نے ان کے قدم روک لیے۔
یہ دردناک اور بھاری آواز بلاشبہ مجھے یہ کہتی تھی۔
"میں کیا کرتی بیٹی مسز ریاض نے فرما اس شرط
پر دیا تھا کہ جب تک ان کی والدہ ماسی نہیں آجاتی

میں اس کی جگہ پر کام کروں گی۔ اب مجھے کیا علم تھا کہ ہماری
ماس مجھے وہاں اس روپ میں دیکھ لیں گی؟
"انہیں اب میری ماس نہ بھوئی، دوسری آواز
غالب سیلائی تھی۔ اس واقعے کے بعد میرا رشتہ ختم ہی
کھینچے آئی۔"

"ہاں بیٹی،" ایک ٹھنڈی آہ بھر کر مجھے یہ بولیں۔
"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے لیکن میں کیا کر سکتی ہوں۔ مسز
شجاع کلب میں منگنی کی تعریف کرنا چاہ رہی تھیں، اور
ہماری سے بھائی کے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ اگر میں مسز
ریاض کی شرط مان کر ان سے فرما دیتی تو کلب میں
تقریب۔ کیسے کرتے؟"

دروازے کو دھکا لگا دو نوں ماں بیٹی نے چونک
کر دیکھا۔ ان کے سامنے بلیس جہاں کھڑی تھیں، کچھ
دیر ماحول پر عجیب سا غریبی سناتا طاری رہا۔ پھر
بلیس جہاں نے آگے بڑھ کر مجھے یہ کہہ۔
"رات کو وزیر اعظم کی تقریر سنیں، آپ نے سنی تھی؟"
عجیب بات کر رہی تھیں وہ۔ ماں بیٹی نے حیرت سے
انہیں دیکھا۔ بلیس جہاں ہنس پڑیں۔

"سب کچھ خیر کر دیا انہوں نے۔ فضول قسم کے
رسم و رواجوں کا خاتمہ ہو گیا۔ گلیوں اور ہوٹلوں میں
ایک دھڑ دھن دینے کی اجازت بھی نہیں رہی۔ جو کوئی
خلاف ورزی کرے گا تین لاکھ کا جرمانہ ادا کرنا پڑے
گا۔"

بلیس جہاں نے گم گم کھڑی مجھے یہ کہہ کہہ
پڑی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اب کچھ نہیں ہوگا۔ نہ نہیں کسی مسز ریاض سے
قسم لینے کی ضرورت ہے۔ نہ ہم کسی کلب میں مہاؤں
کو انوائٹ کر سکیں گے۔ یہاں اپنے گھر کے سامنے شکر
پر قیاسی لگو اور مہاؤں کی تواضع چائے اور موسوں
سے کر دو ٹھیک ہے نا۔"

وہ محبت سے حیران کھڑی سیلا اور مجھے یہ کہہ کر دیکھتے
ہوئے کہہ رہی تھیں۔ اور مجھے یہ کہہ دل میں دل میں وزیر اعظم
کو دعا دیں دیتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ وزیر اعظم کے
اس اعلان نے کتنے مجبور لوگوں کی دعا میں کمی لیں گی۔
کتنے گھر بگڑتے بگڑتے رہ گئے تھے۔ جیسے جیسے ان
کا پنا گھر:



گولہ چلا دیا

نبیل ایک سمجھدار، باشعور لڑکی تھی، ماں — کی بیماری کی وجہ سے گھر کی خدمت داری اس کے سر پر اپڑی تھی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی پڑھائی پر بھی پوری توجہ دیتی تھی۔ محلے میں اس کی عزتیں سے وہی تھی۔ جب وہ عزیزین کے گھر جاتی تو سامنے والے مکان میں ایک لڑکا اسے دیکھتا تھا۔ نبیلی اس سے خوفزدہ تھی۔

عزیزین کو دیکھتے پھر لگے تھے۔ نبیلی بھی عزیزین کے گھر میں تھی۔ کتنے والی خواتین نے نبیلی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا تو عزیزین کی امی نے جھٹ بہانہ کر دیا کہ اس کی تو سنگینی ہوگئی ہے۔ نبیلی کو اس جھوٹ بہت افسوس ہوا۔

صبا کو اپنے گھر کے سامنے رہنے والا لڑکا بہت پسند تھا۔ وہ تیس برس پر ہٹھا کتاب پڑھتا رہتا تھا۔ ایک دن وہ اس کے گھر کو وہ دینے لگی تو پتا چلا کہ اس کا نام فیروز ہے۔ شہر و زرا فیروز کا چھوٹا بھائی تھا جو بہت شوق طبیعت کا مالک تھا۔

عزیزین نے نبیل کو بلایا تھا۔ وہ اس کے گھر گئی تو اس لڑکے سے حواسے دیکھتا رہتا تھا۔ ایک سید لہذا اس کی طرف بڑھایا۔

نبیل جلدی سے عزیزین کے گھر میں گھس گئی۔ عزیزین نے اپنی منگنی ہونے کی خوشخبری سنائی۔ عزیزین کی ماں زاد سعید اسے اپنے بھائی کے لیے بہت پسند آئی۔ وقت گزرنے باپ کے مرنے کے بعد محنت و مشقت کے گھر بنایا تھا۔

الماس کے بھانجرو بھانجریاں سر جن بن کر پاکستان آ گئے۔ الماس کو انہوں نے پہلی نظر میں پسند کر لیا۔ شہر و زرا صبا کی فیروز میں دلچسپی بھانجریاں کا تھا۔ صبا کی فیروز سے پہلی ملاقات کتابوں کی دکان پر ہوئی تھی۔ وہ غلطی سے فیروز کی خریدی ہوئی کتابوں کا شائبہ غلطی تھی۔ لیکن فیروز نے اسے سوجھ بوجھ تھا۔ صبا سے بھول نہ پائی تھی۔ اتفاق سے ایک روز اس نے بڑوس کے لان میں فیروز کو بیٹھے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ اسے چپ چپ کر دیکھتی تھی۔ ایک دن فیروز اس کے گھر آ گیا۔

فیروز فون کرنے آیا تھا۔ صبا نے اسے چلے کے لیے روکنا چاہا لیکن وہ نہیں رکا۔ فون کر کے چلا گیا۔ الماس اور عثمان کی منگنی ہوگئی تھی۔

نبیل کی یوسف سے منگنی پر ان کی والدہ خوش نہیں تھیں۔ جب یوسف نے بات بتائی تو نبیل کو بہت دکھا۔ شہر و زرا صبا اور ان کی والدہ کو امی سے اصرار کر کے مدعو کیا اور صبا کو فیروز کے گھرے میں لے آیا۔ شہر و زرا کافی لیسے چلا گیا۔ صبا، فیروز کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ کہ فیروز آ گیا۔ اس نے صبا کو برا بھلا کہہ کر اپنے گھر سے نکال دیا۔ صبا بری طرح روتی ہوئی بھاگی تو شہر و زرا لگا لگی۔

شہر وڑنے اسے تسلی دی۔ دراصل فیروز پر اپنے والد کی سخت گیری اور تمدن مزاجی نے بہت بڑے اثرات مرتب کیے تھے۔ اور انہیں نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔

الماس کی ملکی عثمان سے ہو گئی تھی لیکن الماس ذہنی طور پر عثمان سے کوسوں دور تھی۔ عثمان الماس کے بے پناہ حسن کے امیر تھے۔ وہ ذہنی دوری کے باوجود اسے چاہے چاہے تھے۔

شہر وڑی والدہ لاہور گئی، ہوئی تھیں۔ صبا اکیلے گھر میں جانے سے کترات تھی لیکن شہر وڑ کہاں ہیں لینے دیتا تھا وہ صبا کو زبردستی بلا کر لے آتا تھا۔ فیروز کو یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ صبا اور شہر وڑ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے صبا کو لوکا تو صبا نے فون کر کے ان کی غلط فہمی دور کر دی۔

نیل کی شادی طے ہو چکی تھی۔ ایک ایک ایکسڈنٹ میں وفات نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ انتقال کو دس دن گزرے آئے، اگرچی جان نے شادی کا تقاضا شروع کر دیا۔ فلم اس منجر حار میں اپنے بہن بھائیوں کو نہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے یوسف سے بات کی کہ وہ ابھی دو سال تک شادی نہیں کر سکتی۔ یوسف کو یہ بات بہت ناگوار لگ کر اور ایک دن وحیدہ چچی نے اگر دھماکا کر دیا کہ وہ تنہا کارشتہ یوسف کے لیے مانگنے آئی ہیں۔

الماس ایک گلوکار صبا سے ایک محفل میں ملی تو اس نے فون کا سلسلہ شروع کر دیا۔

چودھویں قسط

شام اپنے سر پر سمیٹ کر افق کے پار روانہ ہونے کی جیتوں مٹی اور رات کا اندھیرا دیر سے دیر سے اس کی جگہ بڑھ کر رہا تھا۔

ڈرائنگ روم کی گلاس وال سے باہر بھاگتی صبا کے کاندھے پر کسی نے دیر سے سے ہاتھ رکھا تھا۔ وہ چونک کر مڑی۔ نجمہ خاتون مسکادی تھیں۔

”کیا بات ہے؟ ہمیں کا انتظار ہے میری بیٹی؟“

”الماس کا“ اس نے رکھا ہوا سانس خارج کیا۔

”تم نے فون کو کر دیا تھا نا؟“

”ہی۔ کل سے جا رہا تھا مگر تمہیں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ہر بار میری جواب ملتا ہے کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔ بجائے کھانا کھا چکی ہوئی تھی۔ پھر میں نے پیسج چھوڑ دیا۔ پتا نہیں اسے ملا بھی یا نہیں؟“

”ایک بار اور رنگ کر لو۔“

”تین آئی؛ بس شک ہے۔“

اس نے پردے کا ٹوٹا ہوا ایک بار بھر باہر جھانکا۔

”اسے آنا ہوگا تو پیسج ملنے پر بھی آجائے گی۔ ابونے کہتے لوگ بلا لیے ہیں؟“

”اس گھر کی پہلی خوشی ہے۔ جتنا انتہام کیا جائے کم ہے۔ وہ مسکرائیں۔“

”برابر ہے۔ وہ بولتے بولتے رگ گئی۔ چونٹ بیٹھنے لگے۔“

”بال غصت خانم تو آگئی ہیں۔ نجمہ خاتون اس کا مطلب سمجھ کر بولی تھیں۔“ وہ اندر نماز پڑھ رہی ہیں۔

شہر وڑ لقمہ جاتی ہو، لاہور سے تو ہٹا نہیں۔ اچھا۔ میں ذرا باہر مہلوں کو دیکھوں۔ تمہارے ابو کہاں دھیان رکھتے ہیں کسی بات کا؟“

”میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں امی۔“

اس نے باہر جاتی نجمہ خاتون کو مطلع کیا تھا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھائی ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔

باہر لان میں برقی بجلی چلا آئے تھے۔ اور سینے میں دھڑکتا اس کا دل آہستہ آہستہ بجھ رہا تھا اور اس کا دھواں باہر اس کی آنکھوں کو دھندلا دیتا تھا۔

وہ قد آدم آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اسکی اور میرون کلر کے امتزاج کے انگر کے اور بڑے سے کامدار دوپٹے میں چھپا اس کا نازک وجود آج عیش سے بے حد مختلف لگ رہا تھا۔ مناسب نفوذ کو حلیقے سے کیے گئے ٹیک اب نے گویا زبان عطا کر دی تھی۔ اس کی آنکھیں قید نظر میں آتی ہر شے سے غائب تھیں۔ لب آپس میں جڑے سرگوشتاں کر رہے تھے۔ کھڑی ناک میں ہیرے کی ٹونگ اس کے چہرے پر روشنیاں بکھیر رہی تھی۔ اور مانتے پر سجا چھوٹا سا لٹکا اس کے وجود کی خوبصورتی کو دوگنا کیے دے رہا تھا۔

آنکھوں میں بھر آنے والے پانی کو اس نے پلکیں جھپک جھپک کر باہر نکلنے سے روکا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

زندگی میں آنے والا یہ غالب پہلا ایہ دن تھا اور اس کا دل کسی چھوڑے کی طرح ڈکھ رہا تھا۔ وہ جیسے کسی اندھے کو نہیں میں مجوس تھی۔ باہر سے خوشیوں کی چمکیں، چمکیں آوازیں تو سنانی دیتی تھیں۔ لیکن اندر وہ سناٹا تھا۔ وہ دیواروں سے سر چھوڑتی تھی اور کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔

فیروز احمد جیسے سنگ دل شخص سے محبت کرنے کی سلیکین ترین غلطی وہ کر چکی تھی۔ اور اب اسے لگتا تھا کہ اس غلطی کا تھکا وہ اسے عمر بھر بھگتنا ہے۔

پچھلے کئی دنوں کی کاوش مسلسل کے باوجود وہ ایک لمحے کے لیے اس کا خیال اپنے دل سے نہ نکال سکی تھی۔

ایک نام تھا جس کی گھنٹی دل کے مندر میں بجانے کب سے بج رہی تھی۔ ایک جہاں تصور تھا کہ عرصے سے آباد تھا۔ اس نے کب اس شخص کو سوجنا شروع کیا تھا، اسے خود بھی یاد نہ تھا پھر بھلا وہ اسے بھلا دیتے کا امتزاج کہاں سے لائی؟ اسے یاد تھا۔ اس نے بار بار الماس سے کہا تھا کہ اس کے لیے ملاپ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ نہ اس کے اقربا کی خواہاں ہے اور نہ شادی کی خواہش مند اسے تو اس سے دیکھتا، اسے سوجنا اسے پسند کرنا اچھا لگتا ہے اور بس۔

لیکن اسے علم ہو کر قسمت تو ایک منہ زور چڑھتا ہوا دریا ہے۔ جو ایک بار رنگ دل سے ٹھوٹ نکلے تو صرف آگے بڑھنا چاہیے۔ یہ رنگا ہوا جو پر نہیں ہیں میں خواہشوں کا جوار جھاننا نہ سکتے۔ یہ چاند کو جانے لگے تو اس تک پہنچنے کی تلک و دو میں سر پتھروں پر پہنچ کر بے حال ہو جاتا ہے۔ لیکن چاند کی خواہش کرنا نہیں چھوڑتا۔

فیروز احمد کو جانے کے بعد جانے کی تنہا کب اس کے دل میں چھوٹی، اسے خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ اسے تو اب اتنا علم تھا کہ اس کی بے رحمی اور گریز کے پتھروں پر سر پہنچ کر اس کی تنہا میں زخمی ہو چکی تھیں۔ امیدیں دم توڑ رہی تھیں، خواہشیں بین کر رہی تھیں۔

”تمہارا گریز میری محبت سے جیت گیا فیروز احمد! اور میں۔ میری محبت بارگئی۔“

اس کے اندر سے ایک سسکی آئی۔ اس نے اپنا چہرہ دووں ہاتھوں سے ڈھایا لیا۔

”صبا۔“ مانوس آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ دروازے پر الماس کھڑی تھی۔ صبا سب کچھ بھول بھال کر چند لمحے حیرانی سے اسے دیکھ رہی۔ نفاس سے سبکی سوزی الماس اسے بالکل اجنبی لگی جیسے وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

حیدر آبادی کرتے اور تنگ پاگلے میں ملبوس مقل شہزادیوں کی سی آن بان لیسوہ دروازے کے بیچ

میں کھڑی تھی۔ تلے کے کام والے کھسپے میں اس کے پیر سفید توبڑوں کی مانند لگ رہے تھے۔ وہ اتنی خوبصورت نظر آ رہی تھی کہ صبا کو اجنبی لگنے لگی۔
 "صبا! الماس نے مسکرا کر ہانپیں بھیلانی تھیں۔ وہ اٹھی اور جا کر اس سے لیٹ گئی۔
 "اوہ صبا! کتنا سر براثر لگ ہے یہ سب کچھ! اس نے صبا کے گال پر بپا کیا۔ تم تے مجھے کہی کچھ بتا یا نہیں؟
 "کیسے بتاؤں؟" وہ اُداس سے مسکرائی تھی۔ "تم نے تو عرصہ ہوا پلٹ کر لوچھا ہی نہیں۔ جملے کس دنیا میں جیتی ہو۔ ملتی ہی نہیں؟
 الماس کے توبڑوں پر عجیب سی مسکراہٹ ناٹھ اٹھی۔
 "کتنی باری لگ رہی ہو صبا! الماس نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر دیکھا۔ پہلی مرتبہ تھیں اس طرح بجا بنا دیکھا ہے؟
 "اور تم؟" وہ اُداسی سے مسکرائی۔ یہ اتنا سارا روپ کہاں سے چڑھائی ہو کر پہچانی نہیں جاتی۔ صین تو تم خیر تھیں ہی لیکن یہ خیر اذیوں کا سا حسن؟ کہیں تم نے مجھے بٹائے بغیر بنادی تو نہیں گئی؟
 الماس کی آنکھوں میں حیرانی چکی تھی۔ وہ چند لمحوں صبا کو دیکھتی رہیں۔ پھر دھنسا اس نے سر جھٹکا اور اسے لے کر میڈ کی جانب بڑھی۔
 "تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ دانیال ہاشمی صاحب ہیں کون؟ اچانک کہاں سے آپ لگے اور وہ فیروز احمد؟ کتنی

ڈھیر ساری جواب طلب باتیں ہیں میرے ذہن میں؟
 "نہیں الماس! ابھی نہیں؟" صبا نے التجا لے کر "میں ذہنی طور پر پہلے ہی بہت زیادہ الجھی ہوئی ہوں۔ مزید اُلجھنا نہیں چاہتی۔ یہ ساری باتیں کسی اور وقت کے لیے بٹھا رکھو؟
 الماس نے چند لمحوں سوچا تھا۔
 "جیسی تمہاری مرضی؟" پھر اس نے کہا۔ "ولیسے میرے پاس بھی تم سے کہتے کو بہت کچھ ہے۔ میرے دماغ پر بھی اتنا بوجھ ہے صبا کہ کسی بھی دم کھٹکتا ہوا محسوس ہوتا ہے؟
 صبا نے کچھ کہنے کے لیے لب والیکے ہی تھے کہ خاموش ہو گئی۔ مجھ خاتون تیزی سے اندر آئی تھیں۔
 "الماس! صبا! وہ لوگ آگئے ہیں؟
 "میں صبا کو ڈرا دیں نیچے لے آؤں گی آنٹی۔ آپ فکرت کریں؟ الماس شوقی سے مسکرائی؟
 حضرت ہیں کیسے۔ میں تو دیکھ لوں؟
 وہ آٹھ کر گھر کی جانب بڑھ گئی۔
 مجھ خاتون نے ایک نظر، سر جھٹکے، ہاتھ ملتی صبا پر ڈال پھر مسکرا کر باہر نکل گئیں۔
 "واؤ! صبا! الماس مسکرائی ہوئی پلٹ کر آئی تھی۔ اتنا بینڈسم ہے تمہارا شیکر اور تم لوں منہ دکھا بیٹھی ہو۔ چلو مسکراؤ؟
 اس نے صبا کو جھڑپا تھا۔
 وہ ہونے سے مسکراتی۔ پھر اس نے غور سے الماس کو دیکھا۔

اس کا دلوتہ حیرت سے بڑا غلط تھا۔ الماس کبھی بھی شوقی سے، جھک کر باتیں کرنے کی عادی نہ رہی تھی۔ چہرہ جھڑپا کر، سنبھل سنبھل کر گفتگو کرتی تھی۔ اس کے انداز کا گناہان ترین وصف اس کا وقار تھا۔ اس کی برسات میں ایک عطر اوسما محسوس ہوتا تھا۔ لیکن آج وہ بڑے مختلف رویے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ جیسے کوئی ایسی بات اس کے اندر چھی ہو کہ اس سے سنبھلتی نہ ہو۔ بار بار باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہو۔

شوقی ضرورت نہیں بھیجی اس کی ادا نہ رہی تھی اور آج وہ بار بار شوقی پیر آمادہ نظر آتی تھی۔
 "ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" الماس نے پوچھا تھا۔
 "کچھ بھی نہیں؟" اس نے سر جھٹکا۔
 "جلو بیٹھے جلیں۔ ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا؟" الماس کھڑی ہو گئی۔
 "لان میں بیٹھ سے لوگ تھے۔ الماس کی ہر اہی میں باہر نکلتی صبا نروس ہونے لگی۔
 "الماس بیٹھے! میں، میں نہیں جاؤں گی؟" وہ واپس بیٹھنے لگی تھی۔
 "کہہ! آن صبا! الماس نے اس کا بازو پکڑا۔ "ڈنٹ ایکٹ لائٹ دس۔ کیا احمقوں کا سا رویہ ہے تمہارا فنانسی کنگن دلچسپی سے تھیں دیکھ رہا ہے؟
 صبا لب بھینے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سب کے درمیان آگئی۔ جھکی جھکی نظروں سے اس نے دانیال کی والدہ اور والد کو سلام کیا۔
 الماس نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا تھا۔
 "کوئی اور غریب بھی آپ کی توجہ کا طالب ہے اور غالباً مستحق بھی؟
 وہ مسکراتا ہوا، بڑے اعتماد سے آکر اس کے برابر بیٹھا تھا۔
 "ماہیں سلام کرنا اگر آپ کے خایان شان نہیں تو چلیں پہلے ہم کر لیتے ہیں۔ السلام علیکم؟
 "دانیال بیٹا! تنگ نہیں کرنا ہے؟" قریب ہی سے تنبیہی آواز ابھری تھی۔
 "سرگز نہیں امی؟" وہ مسکرایا۔ صرف ان کی بھگلیاہٹ دور کرنے ہے؟
 "صبا! الماس اس کے دوسری طرف آ بیٹھی؟ اس طرح سے کیوں کر رہی ہو؟ ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارا پورا جسم کانپ رہا ہو؟

صبا نے محسوس کیا۔ واقعی اس کا جسم ہلے ہوئے لرز رہا تھا۔ اسے غماں کیا ہو رہا تھا۔ اس کے وجود میں طوفان سا برپا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پچھتی چلائی کسی سمت بھاگ نکلے۔ اور اگر یہ نہیں کر سکتی تو کم از کم چھوٹ چھوٹ کر دوڑے۔ اسے لگا۔ وہ اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہی تھی۔
 "السلام علیکم؟" اس نے اپنے بالکل قریب ایک ماٹوس آواز سے کہی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر براعتار آیا نہ نظر اٹھانے پر نظروں پر۔
 سیاہ پینٹ سوٹ اور سیاہ لائنوں والی گرے شرٹ میں ملیوں فیروز احمد اس کے سامنے تھا۔
 اس نے صبا کو سلام کیا تھا یا کسی اور کو۔ اسے علم نہ ہو سکا۔ اسے تو یوں اتنا علم تھا کہ فیروز احمد نے نگاہ مہر کر اسے دیکھا تھا۔ اور اس کے اندر عجیبی بے قراروں کو اس ایک نگاہ نے دھیرے دھیرے چپک کر قرار بخش دیا تھا۔ اس کے اندر جتنی آگ پر خند پائی ہوئی تھی۔ ریزہ ریزہ ہو کر تکتے وجود کو بیٹھنے کے لیے وہ ایک نگاہ کا فی تھی۔ وہ سامنے بڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر سر جھٹکا کر بیٹھ گیا تھا۔ اور بہت سے لوگوں میں بیٹھا محض ایک عام شخص تھا۔
 لیکن اس شخص کی ایک نگاہ کے ہمارے اس نے دانیال ہاشمی کے ہاتھ سے انگوٹھی بھی ہین لی تھی اور اس کے کئی سوالوں کے جواب میں بڑے حوصلے سے دیے تھے۔

"یہ کون سی ڈوس ہے فیروز احمد جو تمہارے دل سے میرے دل تک آتی ہے۔ جو تمہارے ہر انکار کے باوجود تھیں کیونکہ کوہاں تک لاتی ہے۔ اور جس کے ذریعے تم نے اتنا حوصلہ مجھے بخشا ہے کہ اب میں ہر طوفان کا مقابلہ بڑی محنت سے کر سکتی ہوں۔ اور یہ درست ہے کہ میری تمنائیں رخصتی ہیں، امیدیں دم توڑ چکی ہیں اور خواہشیں بین کر دی ہیں۔ لیکن میری محبت کا مندر آج بھی انجانی منہ نہ دوس ہے۔ اور اعتباری کشش اپنی جگہ لیکن یہ میری محبت کی کشش ہے جو آج تمہیں یہاں لے کر آئی ہے۔ اس محفل میں میری

ہار کے باوجود ہمتیار دھندلا رہا تھا اور چہرہ اکہر رہا ہے کہ جیسے تم بھی نہیں۔ تم بھی نہیں۔
چپکے، لڑتے لوگوں کے بیچ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش سر جھکا کر جیسے ایک دوسرے سے غائب
تھے۔

”مس علی! میرا خیال ہے کہ آپ کا انتخاب کرتے وقت میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ عرفان عباسی اس
کے ٹائٹ کیسے ہوئے لیڈر دیکھ کر سکا رہے تھے۔
”آپ میں جو گھٹس پیچھے ہوئے ہیں انہیں میں پوری طرح سے پہچان چکا ہوں۔
”جتنا نہیں سر۔ آپ میرا حوصلہ بڑھا رہے ہیں یا۔ وہ شرمندگی تھی انگلیاں چبھ رہی تھی۔ وہ نہ مجھے
بجونی علم ہے کہ میں کتنی عرصہ صلاحیتوں کی مالک ہوں۔ مجھ میں کسی طرح کے کوئی گھٹس نہیں ہیں۔ بس یہ
آپ کی اعلاظرفی ہے کہ آپ نے اتنے دن مجھے برداشت کیا ہے۔
عرفان عباسی کے ساتھ کام کرتے ہوئے آج اس کا دسواں دن تھا۔ اور ان دس دنوں میں انہوں نے
اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔
”محض چند دن کی بات ہے۔ آپ کی ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ بہترین ہو جائے گی۔ ڈکٹیشن بھی آپ
اچھا لیتی ہیں۔“

وہ احسان مندی کے جذبات سے غلبہ، سر جھکا کر میز پر آڈی ترجی لائیں کہیں رہی تھی۔
”سر! یہ سب آپ کی مہربانی ہے۔ اتنا کچھ تو میں تین چار ماہ میں بھی نہ سیکھ پاتی جتنا کہ ان دس دنوں
میں سیکھ گئی ہوں۔“
”میری مہربانی ہے۔ وہ دھڑکنے سے بھرنے۔“ مس علی! انسان کا اپنا حوصلہ اور ذاتی محنت شامل حال نہ ہو
تو کسی کی مہربانی کو کچھ کام نہیں آتی۔ جس انجک محنت کے ساتھ آپ نے سب کچھ سیکھنے کی کوشش کی وہ
ریا دگ نہیں ہے۔“
نیل نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر، کرسی کو دائیں بائیں ہلاتے نرم مزاج،
مہربان صفت عباسی صاحب اسے بہت اچھے لگے۔
”زندگی میں بھی کسی نے اس کی اور اس کی صلاحیتوں کی اتنے اچھے انداز میں تعریف نہ کی تھی۔ کچھ دیر کو
اسے اپنا آپ کو متاثر کرتے لگا تھا۔
”کل سے آپ کے بی۔ اے آ رہے ہیں سر؟“ اسے ایک لحظہ خیال آیا۔
”آپ کیا چاہتی ہیں؟“ وہ مبہم سے انداز میں مسکرائے۔
”میں چھٹا کچھ تعلیمی ہوں سر۔ آپ نے کہا تھا کہ وہ دس دن کی رخصت ہو گئے ہیں۔ میں اسی لیے
یوچر بھیجی تھی۔ آج دس روز پورے ہو چکے ہیں۔“
”وہ رخصت ہو نہیں گئے تھے مس علی!“ عرفان عباسی کھل کر مسکرا دیے۔ ”انہوں نے ریزائن کر دیا
تھا۔“

”جی۔“ اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔
”جی ہاں۔ اگر میں آپ کو یہ بات بتا دیتا تو شاید آپ اس کام کو اپنے لیے بہت مشکل سمجھتے ہوئے
اسی وقت انکار کر دیتیں۔ اس لیے میں نے آپ سے صرف دس دن کی بات کی تاکہ آپ بھی کام کو سمجھ لیں
اور مجھے بھی اندازہ ہو جائے کہ آپ یہ کام کر سکتی ہیں یا نہیں۔ اب بتائیے۔ یہ پوسٹ مستقل آپ
کے حوالے کر دی جائے تو کیسا ہے؟“

”سر! احساس شکرت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں تو ابھی بھی بے حد ناچیز ہر کار ہوں۔
”آپ کے صبح کام لینا میرا مسئلہ ہے مس علی!“ انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بات صرف
آپ کی رضامندی کی ہے۔“
”میرے لیے تو انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے۔“ وہ مسکرا دی۔
”گڈ۔ پھر ایسا ہیجے کہ سب سے پہلے اپنے لیے پائمنٹ لیٹر ٹائپ کیجیے اس کے بعد ابھی سی چلے
پلاؤ میں۔“

”بہتر سر!“ وہ کھڑی ہونے لگی۔
”فی الحال آپ کی سلیبری سارٹے یا پنج ہزار روپے معزرت کی گئی ہے۔“
نیل نے میز کا گونا گونا اٹھا۔ اتنی جلدی اتنا اضافہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ مارے خوشی
کے اس کی سانس روکنے لگی۔
عباسی صاحب اس کے تاثرات بغیر دیکھ رہے تھے۔
”اس کے علاوہ میں آپ کو جب بھی کوئی پیرا بلم ہو آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے ڈسکس کر سکتے ہیں۔“
وہ دھڑکنے سے لڑتے تھے۔ ”مسکرا کر اس مس علی، مسکرائے سے انسان کا حوصلہ اور اعتماد بڑھتا ہے۔“
وہ اپنی میز کی طرف جاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکی تھی۔ چھ خاموش سے آگے بڑھ گئی۔

اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ دونوں ہاتھوں میں ہین تھامے وہ ابھی
تک اس کی جانب متوجہ تھے۔
نیل گھر کا ٹائپ رائٹر میں پیرنگ لگنے لگی۔

مجھٹی کا دن تھا۔ چچی کی ہدایت کے مطابق وہ اور شریا کریم پکڑوں کو دھوپ لگا رہی تھیں۔
”کتنی خوبصورت خال ہے۔“
”نریا کشتی کوٹھان کی سیاہ گرم خال کو دیکھنے لگی۔
”یہ تو چچی جان سے میں مانگ لوں گی۔“
”تم پر کتنی بھی لگے گی۔“ شبنم مسکرائی۔ ”اب چچی جان کی عمر ایسی خالیں پسینے کی نہیں ہے۔ کیسے شرف نگین
کی کوٹھان ہے اس پر۔“

”اچھا! ذرا اور کھڑ کر تو دکھاؤ۔“
”نریا نے مثال اس کے اور بڑا دل دی۔ شبنم مسکرا دی۔
”ماشاء اللہ! شبنم بد دور ہے۔ نریا نے غالباً چچی کی نقل اٹاری تھی۔
”شبنم ہنس ہنس کر ڈوبی ہوئی۔
”شکر ہے، ہنسی کی قسم کوئی۔“ نریا نے گہری سانس بھری۔ ”وہ نہ ہنسنا تو ہمارے نزدیک کوئی ناقابل
معافی جرم ہے گویا۔“

”شبنم! اب تک ہنس رہی تھی۔ پھر ایک لحظہ اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ یوسف سیڑھیاں چڑھتے اوپر
آگئے تھے۔
”انہوں نے آخری سٹیج پر قدم رکھتے ہوئے شبنم پر نگاہ ڈالی تھی۔ کچھ سورج کی تہاڑت تھی اور کچھ سینے
کا اثر۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سیاہ کوٹھان کی مثال میں وہ دل میں اتر جانے کی حد تک اچھی لگ رہی
تھی۔“

وہ چند لمحوں کے لیے اسے دیکھتے رہنے پر مجبور ہوئے۔ اور بنانے ان کی نظروں میں وہ کون سا احساس تھا کہ جس شے غصہ بھری ہوئی۔ دل میں آہستگی سے کوئی کھلی چٹکی تھی۔ اس کی نظروں جھک گئیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنے اور ان کے درمیان قائم رشتے کا شدت سے احساس ہوا۔ نیچے اتری ناشتے کے لیے بلا رہی ہیں۔ وہ اچانک ہی اکٹھی سے بولے، تم دونوں کان بند کیے بیٹھی ہو۔ شاید ان چند لمحوں میں اپنے کمزور پر جانے پر وعدہ کیا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکتے بغیر واپس بیڑیاں اترنے لگے۔

غیتہ اور شریا نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کھڑی ہو گئیں۔ پھر شریا نے جیسے ہی قدم اٹھایا۔ اسے بھانپ لیا ہوا۔ وہ پوری کی پوری غیتہ پر آگری۔
”اسے شریا۔ کیا ہوا؟“ غیتہ سخت بدحواس ہو گئی۔ ”یوسف۔ یوسف جلدی آئیں؟“ وہ گھبراہٹ میں چیخنے لگی۔

یوسف اس کی چیخ سن کر بیڑیاں پھلانگتے اوپر آئے۔ یونس بھائی بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔
”شریا۔ شریا۔ یونس بھائی نے بے تابی سے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔
”نیچے لے چکیں بھائی۔ شاید دوپہر میں دیر تک بیٹھے گا۔“ یوسف پریشانی سے بولے۔
”اتنی دیر میں شریا اپنے عاقلوں میں آچکی تھی۔

”یونس؟“ وہ نقاب سے بول۔

”ہاں گڑیا۔ بولو۔ کیا ہوا؟“
وہ کہتی محبت سے اس سے مخاطب تھے۔ غیتہ کو اس وقت شریا دنیا کی خوش قسمت ترین بڑی نظر آئی۔ اس کا شوہر پورے کا پورا اس کا تھا۔ دل دھان کی تمام تر بچائیوں کے ساتھ۔ اسے شریا کی قیمت پر لوٹ کر رشک آیا۔

”اسے کیا بھائی شریا کو؟“
وجہ یہ تھی اس نے اپنے بھائی کے وجود کو سنبھالنے اور پرچلی آئیں۔

”یونس؟“
”یونس نے یونس بھائی کے ساتھ ناگواری سے پردے کیے۔

”کیا ہوا ہے بڑی؟“
”بڑے دور سے جبر آتا تھا جی جان؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”بنانے کیا ہوا؟“
”جولوہر سے خدا کا۔ اس نے فحش بھی یہ دن دکھایا۔ بڑا ارمان تھا مجھے پوتے پوتیوں کو کھلانے کا۔“
جی جان مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

وہ چادروں پہلے بولتی ہیں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر یونس بھائی مسکراتے ہوئے واپس کمرے میں چلے گئے اور یوسف سر جھکا کر بیڑیاں اتر گئے۔
غیتہ کسی گہری سوچ میں غم شریا کے چہرے پر بکھرتے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔

وہ کسی کتاب پر نظر میں جمائے بیٹھے تھے۔ لیکن درحقیقت ان کا دھیان کہیں اور تھا۔ اور ان کو عرصے سے یہ مسئلہ درپیش تھا۔ دماغی رویہ بار بار پہلی تھی۔ لیکن پہلے یہ کیفیت کچھ لوں مختلف تھی کہ وہ الماس کے من اور اس کے قریب میں کھونٹے دبا کر لے تھے۔ بیٹھے بیٹھے مسکرا دیتے تھے اور اب جس کیفیت میں وہ مبتلا تھے وہ انہیں بالکل کیے دے رہی تھی۔ دماغ سوچ سوچ کر پھٹا جاتا تھا۔
”میں نے رشتائے نکاح کر لیا ہے“

الفاظ تھے کہ بارود اندر تباہیاں مچاتے چلے جاتے تھے۔ سب کچھ ختم ہونے لگتا تھا۔ انہیں تو یہ بھی علم نہ تھا کہ اب انہیں کیا کرنا ہے؟ کس سے کیا کہنا ہے؟ الماس نے تو انہیں یہ اطلاع دی تھی جیسے وہ اس کے پریشانیوں یا دورے کوئی عزیز! جنہیں راہ میں مل جائے پر بڑی سے بڑی تبرہ بھی عام سے انداز میں سدا دی جاتی ہے۔ دروازہ بجائو وہ اپنے خیالوں سے چونکے۔
”کون ہے؟“ ان کی تھکی آواز برآمد ہوئی۔

دروازہ کھلا تو کوئی شکلیں ایک ساتھ نظر آئیں۔
عاصمہ بی، راشدہ بیگم، منار، سیاب ایک ساتھ اندر گھس آئیں۔

”خیریت؟“ انہوں نے استغاثہ سے ان سب کی سمت دیکھا۔
”ہاں، ہاں خیریت ہی ہے؟“ عاصمہ بی ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ”یونہی ایک بات کرنی تھی تم سے؟“
وہ جانتے تھے کہ بات ”یونہی“ نہیں تھی۔ یقیناً کوئی اہم مسئلہ تھا۔ جس کے لیے وہ سب کی سب ایک ساتھ آئی تھیں۔

”جی۔“ وہ متعلک کر بیٹھ گئے۔ ”ذمہ داری؟“
”غٹان بیٹے، شادی کے متعلق تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ راشدہ بیگم نے بالکل سیدھی سیدھی بات کی۔
”کس کی شادی؟ جی جان؟“ انہوں نے انجان بننے کی حد کر دی۔

”تمہاری اور الماس کی بیٹی؟“ دراصل منار کے سسرال والے تازہ منگ رہے ہیں اور میں دونوں بیٹیوں کی شادی ساتھ کرنا چاہتی ہوں، ہم نے سوچا تم سے تمہاری رائے بھی معلوم کر لی جائے۔“
”میری رائے؟“ وہ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گئے۔ ”میری رائے اب کیا اہمیت رکھتی ہے جی جان؟“

”جہ جانتے ہیں بیٹے کہ تمہیں اس مسئلے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بات الماس کی ہے؟“ عاصمہ بی نے سب کشافی کی۔ ”یونہی اس ضد پر قائم ہے کہ اس کو ابھی شادی کی جلدی نہیں۔ اسی لیے ہم سب نے شل کر لی پر زور ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے اور تمہیں بھی ہمارا ساتھ دینا ہو گا۔ جانتے کیوں تم اب تک اس کا ساتھ دیتے آئے ہو؟“

”مجھ سے آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟“ وہ پریشان ہو اٹھے۔
”یونہی کہ ہمارے ساتھ چلو۔ وہ اپنے کمرے میں ہے۔ سب مل کر اس سے بات کرتے ہیں۔ بلکہ اسے شخص اکا کر دیتے ہیں کہ ہمارے کیا ارادے ہیں۔ منار کے سسرال والے تو آگے پیچھے کوئی تازہ منگ رہے ہیں؟“

راشدہ بیگم غصے اور خالت کے ملے جلے جذبات کا شکار تھیں۔
عثمان نے ایک نظر ان سب کے چہروں پر ڈالا۔ اب پانی سر سے اوجھا ہو چکا تھا۔ اب وہ الماس کی کسی بھی قسم کی حمایت کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔

”کیا سوچ رہے ہو بیٹے؟“ عاصمہ بی نے بیٹے کی صورت پر رقم پریشانی دیکھی۔
”مجھے علم نہیں ہے کہ الماس اب تک خاموش کیوں ہیں؟“ بلا توجہ بولے۔ ”اور مجھے انہوں بھی ہے کہ یہ خبر مجھے آپ لوگوں تک پہنچانی پڑ رہی ہے؟“
انہوں نے راشدہ بیگم کا خوف زدہ چہرہ دیکھا اور سر جھکا لیا۔

”بات یہ ہے کہ الماس صاحبہ نے اپنے ایک گلوکار دوست سے نکاح کر لیا ہے“

”کیا؟“ مناز اور سیاح جلدی تھیں۔

جب کہ خاصہ چی اور شہو بیگم کے سے عالم میں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

”نکاح؟ نکاح کر لیا ہے؟ پھر راشدہ بیگم بڑ بڑائیں! نکاح۔ الماس نے نکاح کر لیا ہے۔ ایک لحظہ وہ اپنی دایں جانب لوٹ گئیں۔

”امی۔ امی۔“

”چی جان!“

مناز، سیاح، عثمان ایک ساتھ ان کی جانب لپکے تھے۔

عاصمہ چی منور سکتے کے عالم میں اپنی جگہ بیٹھی تھیں۔ جیسے گرد و پیش سے بے نیاز ہوں۔

”میں ابھی ہاسٹیل بے جاتا ہوں؟“ عثمان انہیں بازوؤں میں اٹھا کر باہر لے گئے۔ سیاح روتی ہوئی ماں سے لپٹ گئی جب کہ مناز عثمان کے پیچھے پیچھے باہر جھاکی تھی۔

ہاسٹیل کے کمرے میں سب جمع تھے۔

مناز، ہوش اور کاشف راشدہ بیگم کے پاؤں تھامے۔ بیٹھے تھے جب کہ دلاور، چچا، عاصمہ چی اور عثمان کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

عثمان باہر کا ریڈور میں ڈاکٹر سے بات کر رہے تھے۔

راشدہ بیگم کی سسکی کمرے میں ابھی توصیف چونک اٹھے۔

”امی۔ امی۔ پلیز۔ آپ بالکل نہ روئیں۔ سوچیں ہی منت اس کے بارے میں؟“ مناز ان سے لپٹ گئی۔ ”کیسے نہ سوچوں؟“ بکھرے دامن میں منچاروں کے سوا اور کیا ہے۔ اس بد بخت نے دکھ دینے سے پہلے یہ بھی نہ سوچا کہ ماں پہلے ہی کتنی تہی دامان ہے۔ ایک بار باپ نے سر سے چادر کھینچ کر چپتے محراب میں لا چھوڑا تھا۔ اب اس نے رہی ہی عزت؟

ان سے مزید نہ بولا گیا۔

”چی جان!“ عثمان اندر داخل ہوتے ہی ان کی سمت آئے۔ ”پلیز! خود کو پریشان نہ کریں۔ دیکھیں۔ یہ تینوں لکھنے پریشان ہو رہے ہیں۔“

”اس بد بخت کو بھی تو میں نے ہی جنا تھا۔ پھر اس کا دل اتنا بھر کیسے ہو گیا۔ ماں سے قریب رہ کر بھی باپ پر۔ کئی۔ کئی طرح سب کی خوشیاں غارت کر دیں اس نے۔ کیسے خوش رہ پائے گی وہ؟“

”اکیسے منت کہیں امی!“ مناز تڑپ گئی۔ ”میرے کہنے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے؟“ دیکھے دل کی آواز ہونٹوں سے نہ نکلے تب بھی اوپر جاتی ہے۔“

وہ اپنے حواسوں میں نہ تھیں۔ ڈاکٹر انہیں سکون آدرا نگلشن دینے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ پھر ہوش سے بے گانہ ہو گئیں۔

انہی کس اٹھائے اور کا ندھے پر بیگ لٹکانے وہ سر جھانک رہی تھی۔ ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ حالات جس طرح سے تبدیل ہوئے تھے اس کا اسے اتنا اندازہ ہو کر نہ تھا۔ اس نے تو سب کچھ بے حد سہل جانا تھا۔

رضانے اسے پورا یقین دلایا تھا کہ بعض چند روز کی بات ہے، اسے جاب مل جائے گی تو وہ لمحہ بھر

ان کے بغیر اس کے گھر والوں سے مل لے گا۔ اور ساری بات کلیئر کر دے گا۔ لیکن اسے جاب ملنے میں

بڑی جلدی جاتی تھی۔ اور گھر والوں کا پریشانی اس پر بڑھنے لگا تھا۔

سب اس سے پوچھنے لگے تھے کہ وہ فون پر کس سے باتیں کرتی ہے اور کس سے ملنے جاتی ہے۔ حتیٰ کہ

ان کا بھی یہ سب کچھ دریافت کیے بنا نہ رہ سکتے تھے اور اس نے کسی جذباتی لمحے سے غلوب ہو کر انہیں

سنا دیا تھا کہ وہ رضانے نکاح کر چکی ہے۔ ہر چند کہ رضانے اسے نہایت سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کسی

رہی کسی بھی نکاح کے متعلق کچھ نہیں بتائے گی۔

پھر بھی الماس کو بخانے کیوں یقین تھا کہ عثمان اس کے راز کو راز ہی رکھیں گے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔

ہوں نے یہ بات راشدہ بیگم سمیت سب پر منکشف کر دی اور راشدہ بیگم موت کے دہانے تک جا

اپنے قلب کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دل سے دعا مانگی تھی کہ رضا گھر پر ہی ہو۔ اس سے کال ہل

اٹیں پیش کیا اور اپنے دل کی دھڑکیں سنی نہ رہی۔

”کون؟“ ایک آواز ابھری جو رضا کی ہی تھی۔

پھر دروازہ کھل گیا۔ وہ شوینک کریم کا جھگ منہ پر بنا ہے، تولیہ کا ندھے پر ڈالے، ہاتھ میں برش لیے

”الماس؟“ اس کی باغیس کھل گئیں۔ ”اچانک! بنا کسی پیشگی اطلاع کے؟ آؤ نا۔ باہر کیوں کھڑی ہو؟“

اس نے ہٹ کر اسے اتار آئے کا رستہ دیا۔

”کیسے جا رہی ہو؟ یہ ساری کہاں کی ہے؟“

اس کا سانس سامان دیکھ کر وہ استفادہ کر رہا تھا۔

الماس ابھی کس زمین پر رکھ کر پوچھی۔

”جانیں رہی۔ آئی ہوں۔ میں ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آگئی ہوں رضا!“

”وباٹ؟“ وہ سوچا کہ وہ کیا۔ یہ نہ یہ کیا کہہ رہی ہو امی۔“

”ہاں رضا!“ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”گھر والوں کو علم ہو چکا ہے کہ میں نے تم سے نکاح کر لیا ہے۔ امی

ہاسٹیل میں ہیں اور میری صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں ہیں۔ اور مجھے اس طرح سب کو فیس کرنا اتنا مشکل

نہ رہا ہے کہ میں سوچے مجھے بغیر اپنا سامان باندھ کر یہاں چلی آئی۔ آفسٹر! اب میں تمہاری ذمہ داری

اٹوں۔“

”یقیناً! لیکن حال تو اس طرح تو ہمارے لیے بہت ہی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی، تمہیں ابھی وہیں رہنا

ہے سب کے ساتھ میں نہیں عزت سے رخصت کروا کے لانا چاہتا ہوں۔ ساری دنیا کو یہ علم نہ ہو

کہ تم نے چھپ کر نکاح کر لیا تھا۔“

”آئی ایم سوری رضا!“ وہ اپنے ناخن دیکھنے لگی۔ ”یہ بات اوہن ہو چکی ہے اور میری وجہ سے ہی ہوئی

ہے۔ لیکن اب میں وہاں کیسے رہ سکتی ہوں؟ وہاں سب مجھے تعزیر بھیج رہا ہے۔ دیکھیں گے جو برداشت

ان میرے لیے ناممکن ہے۔ یہ طے ہے کہ میں رخصت ہو کر وہاں سے آچکی ہوں۔“

”نہ نہ!“ وہ جلدی جلدی تولیہ سے منہ صاف کرنے لگا۔ ”میں نہیں ابھی چھوڑ کر آتا ہوں۔“

”رضا!“ الماس نے حیرت اور قدرے غصے سے اسے دیکھا۔ ”جو کچھ میں کہہ رہی ہوں کیا تمہیں سنائی

نہیں دیتا۔ یا مجھ نہیں آتا۔“

”امی۔ تم سمجھ نہیں رہیں۔ اس طرح ہمارے لیے کتنی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔“

”میں جانتی ہوں۔ اور تم سے رشتہ جوڑنے سے قبل یہ طے تھا کہ مجھے مشکلات کا سامنا تو ہر حال کرنا ہی ہے۔“
 ”دیکھو جالو! وہ کرسی گھٹ کر اس کے پاس آ بیٹھا۔ میں چند دن بعد ایک کانفرنس کے سلسلے میں دہلی جا رہا ہوں۔ تقریباً پندرہ دن کے لیے تم یہاں اکیلی کیسے رہو گی؟“
 ”الماس چند لمحے اس کی صورت دیکھتی رہی۔“
 ”رضا! پھر وہ پھر سے ہونے لگے میں بولی: ”تم سے شادی کے بعد بھی تو مجھے کہیں نہ کہیں اکیلے رہنا ہی ہو گا نا؟ کیا تم ہر وقت میرے ساتھ رہا کرو گے؟“
 ”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن تم تک میں تمہارے رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی پراپر بندوبست بھی تو کروں گا۔ یہ فلیٹ ایک اکیلی لڑکی کے رہنے کے لیے نہایت ناموزوں ہے۔“
 ”میری فکر مت کرو۔“ وہ لاپرواہی سے سر جھٹک کر بولی: ”میں کسی بھی بات سے گھبرا جانے والی لڑکی نہیں ہوں۔ میں یہاں سکون سے رہوں گی۔“

”الماس! وہ زہج ہو کر لولا۔ ٹرائل ٹرانڈر اسٹینڈ بار۔ ہم دونوں اس طرح سروائیو نہیں کر پائیں گے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟“
 ”میں چند روز کی بات ہے، میں خود اگر تمہارے بچا سے بات کروں گا۔“
 ”رضا! میں وہاں واپس کیسے جا سکتی ہوں؟“
 ”الماس نے غصے سے بھونک کر کہا۔“
 ”ابھی کہہ جس عورت کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ تم چلو میں نہیں شکیں میں پھر دیکھ کر آتا ہوں۔“
 ”اپنی بات مکمل کر کے اس نے پلٹ بھینکے۔ میں اس کا سامنا اٹھایا تھا۔ ”الماس! میں بھی لکھا، جھٹلائی اٹھ کھڑی ہوئی۔“
 ”رضانے اسے گٹ پر پھینک دیا تھا۔“
 ”وہ سامان اٹھا کر مڑ کر دیکھے بغیر اندر کی سمت بڑھ گئی۔“
 ”خدا حافظ الماس!“
 ”اس نے پیچھے رہنا ہی آواز سنی مگر مڑ کر پھر بھی نہیں دیکھا۔“
 ”مرکزی دروازے پر کھڑی نرسوں نے اسے حیرت سے دیکھا تھا مگر کچھ بول نہ پائی۔ وہ جلدی جلدی بیڑھیاں پھرتے لگی پھر بیچ میں ہی رگ گئی۔“
 ”عثمان ادیب سے بیڑھیاں اترتے آ رہے تھے۔ وہ بھی چند لمحوں کے لیے اپنی جگہ پر قہم گئے۔ اس کی تیاری بزم بان خود بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ ”انہوں نے اس کا جائزہ ذرا سی دیر میں لے لیا۔“
 ”فیصلوں میں اتنی جلد بازی ایچی نہیں ہوتی الماس!“
 ”مٹھانے لگے میں وہ بولے تھے: ”سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی عادت ڈالیں۔ میں آپ ہی کو تلاش کر رہا تھا۔ جائیں، سامان رکھیں اور آرام کریں۔ سب لوگ ہاسپٹل گئے ہیں، کسی کو علم نہیں ہوا۔“
 ”جب آپ کو علم ہو رہی کیا ہے تو مجھے بھیجیے کہ سب کو ہو گیا۔ اب کیا بات چچی رہ سکتی ہے؟“ اس نے ان پر جھوٹ کی اور اسے گٹھ گھٹائی۔
 ”وہ وہیں کھڑے کچھ سوچ رہے تھے۔“

”مبارک ہو بہن۔ منہ بیٹھا کیجیے۔“
 ”غزالہ کی والدہ نے مٹھائی کا ڈنہ عفت خانم کے سامنے کیا۔“
 ”آپ کو بھی مبارک ہو۔“ وہ مسکرائیں۔ ”میری بیٹی کہاں ہے۔ ذرا اسے بھی لڑ بھائی!“

”جی، میں ابھی ملاتی ہوں۔“
 ”وہ اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ عفت خانم آج بہروز احمد کی شادی کی تاریخ رکھنے کے لیے آئی تھیں۔ بہروز احمد اور فریڈ احمد بھی موجود تھے۔“
 ”خدا نے ہماری بھی سنی۔ ہم تو بس پھر مٹھائی بائیں گے۔“
 ”ہنا کے دانت نکلے جا رہے تھے۔“
 ”ہاں جی! منکر ہے اس رب کا۔“ عفت خانم نے سانس بھری۔ ”یہ خوشیاں دیکھنے کو تو عمر سے آتے ہیں۔“
 ”رس رہی تھیں۔ خدا نے ہمیں بھی یہ دن دکھائے۔ میرے بہروز کے سر پر سہرا سجے گا۔ گھر میں خوشیاں بولیں۔“
 ”اے سارا سونا بن ختم ہو جائے گا۔“
 ”ہمیں تو شہر و میاں ہی یاد آنے چلے جاتے ہیں۔“
 ”ہنا افسردہ ہوئی۔“
 ”اے سنی بھی توں کرس گئے گھر چل کر دیکھنا کیسا دوڑا چلا آتا ہے۔“ وہ ہنسیں۔
 ”اسی لمحے غزالہ، ماں کی ہر پی میں سر جھکا کر اندر داخل ہوئی۔“
 ”ماشاء اللہ۔ آؤ بیٹی۔ یہاں آؤ۔“

”وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان تک آئی۔“
 ”عفت خانم نے اٹھ کر اس کی پیشانی چومی۔“
 ”خدا تعالیٰ جگہ گائے۔ خوب پیو لو پیو۔ بس اب جلدی سے میرے گھر کی رونق بن کر آ جاؤ۔ میری بھی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔“
 ”انہوں نے اس کے تنے تنے چہرے پر نظر کی۔“
 ”کیا بات ہے؟ ہم سے ناراض کیوں رہتی ہو؟“
 ”پھر بولی ہی نہیں۔“ وہ لب کاٹنے لگی۔
 ”جھپوٹی ہے نا۔ گھبرا جاتی ہے ایسی باتوں سے۔“ اس کی والدہ جلدی سے بولیں۔ ”جاؤ بیٹی! ارم سے کہو جائے بنا کر آئے۔“
 ”نہیں بہن! بس اب ہم چلیں گے۔ چائے تو پی لی ہے۔“
 ”عفت خانم نے اپنا برس اٹھایا۔“
 ”اور آپ لوگوں کو کسی بھی قسم کا تردد کرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“
 ”آپ جیسے اچھے لوگ تو قسمت والوں کو مہلتے ہیں۔“ وہ ہاتھ مسلتے لگیں۔
 ”بس خدا تعالیٰ اچھے کرے۔“ عفت خانم مسکرائیں۔“
 ”آمین۔“

”پیو۔ شہروز کیسے ہو۔“ عفت خانم مارے خوشی کے زور سے بول رہی تھیں۔
 ”السلام علیکم امی حضور۔“ وہ خوشی سے بولا تھا۔ ”بالکل ٹھیک ہوں۔ بہرا بالکل نہیں ہوا۔“
 ”وعلیکم السلام۔“
 ”بائیں کیا ہانک رہے ہو؟“ وہ اس کی بات نہ سمجھی تھیں۔ ”خدا نہ کرے۔“
 ”آپ کیسی ہیں امی حضور۔ باقی لوگ کیسے ہیں؟“ وہ ہنس رہا تھا۔
 ”سب بالکل خیریت سے ہیں۔ ہاں، ایک خوشخبری ہے تمہارے لیے۔“
 ”میرے لیے؟“
 ”لوگوں دھوٹ لی آپ نے؟“
 ”ہاں دھوٹ لی۔“ وہ ہنس دیں۔ ”مگر تمہارے لیے نہیں، بہروز کے لیے۔ بہت بیماری بھی ہے۔“
 ”چلیں ضرور ہے۔“ اب میری باری بھی زیادہ دور نہیں۔ یہاں جان کو میری طرف سے مبارکباد دیکھے گا۔“
 ”آپ تم بہروز کی مبارکبادیاں دو، جس جس کو بھی دینا چاہو۔ میں تاریخ کے کرائی ہوں رجب کی پچیس تاریخ بھڑائی ہے۔“

”ہائیں“ وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ ”آپ سچ کہہ رہی ہیں والدہ حضور! یعنی اتنی جلدی نہ ہزار۔“
 ”بس اب جلد لوٹ آؤ ساری تیاریاں کرنی ہیں۔“
 ”امی حضور! ہم دو دن میں آپ سے ہیں اس سے خوشی سمجھنا مشکل تھی! اور صبا کیسی ہیں؟“
 ”ماں صبا! ماشاء اللہ بڑے اچھے لڑکے سے ملگنی ہوئی ہے اس کی؟“
 ”ملگنی!“ لائن پر خاموشی چھا گئی تھی۔
 ”سیلو بٹھروڑ نہ ہو۔“
 وہ آوازیں دیتی رہیں پھر لائن ڈس کنکٹ کر دی۔
 ”بس اب دوڑا آئے گا۔“
 وہ مڑ کر مناسے کہہ رہی تھیں

”السلام علیکم۔“
 اس نے آواز برہنہ کر کر سناٹا دیا تھا پھر چند لمحوں کے لیے اپنی جگہ جم سی گئی۔ ملنے یوسف کھڑے تھے۔
 ”وعلیکم السلام۔“ پھر وہ کچھ پریشانی سے بولی۔ ”اماں! برابر وائے کمرے میں ہیں۔“
 ”اور تم؟“
 وہ تھکے تھکے انداز میں کہتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئے۔
 وہ ابھی ابھی فیکری سے لٹی ہوئی تھی۔ سبزی کی بوکری سامنے رکھے سبزی صاف کر رہی تھی۔ ریشم اور مریم باورچی خانے میں تھیں۔ انیم، اماں کے پاس تھی۔
 اسے سخت آگے غصوں ہوئی۔
 ”کیا بات ہے؟“ وہ اسے بغور دیکھتے لگے۔ ”میں کوئی جن یا بھوت تو نہیں جس پر نگاہ پڑے ہے تم اتنی پریشان ہواؤ ہو۔“
 ”یوسف میاں تو آتے ہی رہتے ہوں گے تمہاری طرف!“
 اس کے کانوں میں وحیدہ بیچی کے الفاظ گونج رہے تھے۔
 ”دیکھیں یوسف۔ بلکہ آپ اماں کے پاس جا کر بیٹھیں۔“ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”آپ کو معاملات کی نزاکت کا یا تو اندازہ نہیں ہے یا آپ کچھ بھی سمجھنا نہیں جانتے۔“
 ”ہاں! مشکل کہتی ہوں میں کچھ سمجھنا نہیں جانتا۔“ انہوں نے سر کرسی کی لپٹ سے ٹکا کر انھیں ہر لیں۔ ”جانتا ہوں میں نے رات کو خواب میں دیکھا ہے۔“ آنکھ کھلنے سے لے کر اب تک کا وقت کس طرح گزرا ہے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں کچھ سمجھنا چاہوں بھی تو نہیں سمجھ سکتا میں خود اپنے بس نہیں ہوں۔“
 ”مدت کیجیے ایسی باتیں!“ وہ خوف زدہ ہوا تھا۔
 ”کیسے نہ کروں۔ نہ کروں تو جیوں کیسے۔ نیلی نہیں بھر برہم نہیں آتا۔“
 ”انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ان کی نظروں میں وہ حیزبے عیاں تھے جنہوں نے نیلم کو دھوکے کے ساتھ نظر میں جھکانے پر مجبور کر دیا۔“
 ”یوسف میاں! کب آئے؟“
 ”اماں کی آواز پر دو دنوں بڑی طرح سے چونکے تھے۔“
 ”السلام علیکم! کبھی میں آپ!“ یوسف کھڑے ہو گئے۔

نیلم اپنی جگہ بیٹھی رہ کر ابھی ابھی جو لمحہ ان دونوں کے درمیان آکر گزر گیا تھا۔ اس سے کی شاید اماں تھیں۔
 ”اماں نے اسے سر سے پاؤں تک پتھر کی بنا دیا تھا۔“
 ”نیلم!“ اماں اس سے غلبہ تھیں۔ ”جداؤ! باورچی خانے میں جا کر بہن کا ہاتھ بناؤ۔“ وہ ہنسنے لگی
 سے اٹھی اور باہر آ گئی۔
 اس کا اپنی حالت پر ماتم کرنے کا بی چاہ رہا تھا۔
 ”بھگو۔“
 ریشم اور مریم اس کے چہرے پر رقم جذبات دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔
 ”کیا ہوا ہے؟“
 اور وہ منہ پر ضبط نہ کر پائی۔ بڑی طرح سے رو دی۔ اماں کی بدگمانی، اپنی بے بسی، یوسف کی ذہنیت

کتنے ہی احساسات تھے جو اسے زلزلے جیسے جا رہے تھے۔
 ریشم نے اسے پانی کا گلاس دیا تھا۔ ”مریم! اس کے آلتو پوٹو نہ لگی۔ لیکن وہ روئے جلی جا رہی تھی۔“
 ”کیا ہوا ہے بھو! خدا کا کچھ تو بتائیں یا دونوں از حد پریشان تھیں۔ اسی لمحے اماں دروازے پر نمودار ہوئیں۔“
 ”اماں! اماں! بھو کو کیا ہوا ہے؟“ مریم نے جلدی سے پوچھا تھا۔
 ”کچھ نہیں۔“ وہ مردہ جیسے میں بولیں، ”انہیں پچھتاوے زلزلے ہیں۔ اپنی بے وقوفی پر ہاتھ ملتی ہیں۔“
 ”مریم! کھانا تیار ہے تو نکالو۔ یوسف میاں بیٹھے ہیں۔“
 نیلم رو تا بھول کر دم بخود بیٹھی تھی۔ چھوٹی بہنوں کے سامنے ادا ہونے والے اماں کے الفاظ نے اس پر سے سات سمندروں کا بانی گھرا دیا تھا۔
 ”اماں! اس سے اس حد تک بدگمان تھیں۔ اس نے عزاب میں بھی نہ سوچا تھا۔ مریم اور ریشم کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے والی کیفیت میں مبتلا کھانا نکالنے لگی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ ان سوالوں سے نظر بچا رہے، سر جھکانے بیٹھی تھی۔“
 گھر سے نکلی تو دماغ عجیب سن زدہ کیفیت کا شکار تھا۔



شخصیت محمود کی خنثی کے خوف
 کھانا پکانے کی مزیدار
 ترکیبوں کی
 رنگارنگ کتاب

محمود کا کہ: ۳۷۔ مسعودی لکھنا

شائع ہوئی

ساری رات وہ کھلی آنکھوں سے جاگتی تھی۔ وحشت زدہ کر ڈالنے والے حالات کے سامنے وہ اس قدر تنہا تھی، یہ احساس ہر طرح کے احساسات سے اسے عاری کیے دے رہا تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کس قدر بڑھ کر اور لڑکھٹا کا شکار ہے۔ کسی کو پروا نہ تھی کہ وہ کیا سوچتی ہے، کیوں پریشان رہتی ہے۔ کوئی اس کا ہمراز نہ تھا۔ ذمہ سارے کوئی پرسان حال نہ تھا۔

سر جھکانے، مشتاقی انداز میں وہ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ کسی نے بری طرح سے ٹکرائی۔ ٹکرائی سی بیچ اس کے لبوں سے نکلی تھی۔

سامنے راجہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔
 نیلم اپنے حواس میں آئی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ تو جس کیفیت کا شکار تھی اس میں اسے کچھ سمجھائی نہ آیا تھا۔ لیکن وہ تو پش و حواس میں تھا۔ جان بوجھ کر اس سے ٹکرایا تھا۔ دلشتہ اسے چھوڑا تھا۔
 ”کھینے، ذلیل، کتنے۔“

اسے اچانک خود پر اختیار نہ آیا۔ اس کا گریبان تھام کر وہ اس پر طمانچے برسانے لگی۔
 ”اتنا ارزاں مجھے ہو دوسروں کو، اتنا مستی۔ جس کا چاہے ہاتھ پکڑا، جسے چاہا چھو لیا۔ خود تبارے لیے اتنی گھٹیا ہے، اتنی بے سول۔“

لوگ جمع ہونے لگے تو اس نے راجہ کا گریبان چھوڑا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ اتنا کمزور نہ تھا کہ اس جیسی لڑکی کے ہاتھوں طمانچے کھالیتا۔ وہ تو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں کسی انجانی فوج کا حمار لیے۔
 سرشار جیسے اس کے نرم ہاتھوں کو اپنے چہرے پر چھو کر اس کے نزدیک بڑا خوشگوار عمل تھا۔ اس نے چادری اور سر جھکانے سب کچھ کے درمیان سے نکلی چلی گئی۔

سامنے بہت سے کاغذات بکھرائے وہ سر تھامے بیٹھی تھی۔
 کچھ کام کرتا چائی تو نظروں میں ایک فزیز برسر کار تھا۔ اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتا، اس کے غصے کی کمزوری سے خطا اٹھاتا ہوا۔ اس کی قربت کتنے احساس سے سرشار ہوتا ہوا۔

ایک کراہ سی اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ کتنی مجبور تھی وہ۔ کتنی بے بس۔ اس کا گریبان پکڑ کر اسے طمانچے دینے بھی تو کیا حاصل ہوا؟ یہ احساس کہ اس کا گریبان پکڑنے سے وہ اس کے کتنے نزدیک ہو گئی تھی۔ یا طمانچے برسانے کے دوران وہ اس سے کتنا مس ہوئی تھی۔ ناہیہ ترین ہستی کی آنکھوں میں اس قدر چمک کا لہجہ اسے بے حال کیے دے رہا تھا۔ اپنے اس قدر بے سول ہوجانے کا خیال لوگوں میں پھیل رہا تھا۔

وہ ایسا تھا کہ ہوا پر زندہ تھی جو کسی بھی وقت کہیں بھی گر سکتا تھا۔ کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔
 ”مس علی۔“

وہ چونک کر سیدی ہوئی۔
 عیسیٰ صاحب دونوں ہاتھوں کو میز پر رکھنے اس سے مخاطب تھے۔
 ”مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“

”جی؟“
 بہت دیر تک اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

”جی سر؟“
 ”کیا بات ہے؟“ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”اس قدر کوئی ہوتی ہیں کہ واپس آنا محال ہے۔ کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی پریشانی؟ طبیعت خراب ہے آپ کی؟“

وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہی۔
 سفیدہ چہرہ، گہنیوں پر سفید بال، سیاہ فریم کا چشمہ، ایک مہربان سراپا نظر آئے وہ اسے۔ اس پر ناظم انجمن کے ہاتھوں سے زخم پھرنے لگیں۔ دیکھ کر پریمیہ کوئی ہاتھ نہ رکھ دے۔

اس کی آنکھوں سے جھجھک آنسو بہنے لگے۔
 ”اے۔۔۔ بھی یہ کیا ہے؟“ وہ کہہ رہی تھی۔ جب سے رومال نکال کر آگے بڑھایا۔

”پلیز، بس علی، آنسو تو نہیں۔“
 اس نے رومال ان سے لے لیا۔ لیکن آنسو تھکتے ہی نہ تھے۔

”دیکھیں کوئی آگیا تو کیا کہے گا؟“ وہ سخت پریشانی کے عالم میں تھی۔ نیلم ان کی بات سمجھ گئی۔ آنسو نہ گئے۔ سر جھکانے وہ سوس سوس کر رہی۔

”اب کھینے، کیا مسئلہ ہے؟“
 ”میں سر۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”یونیورسٹی میں دو سہ ماہی۔“

”سر کا درو ایسے نہیں لڑاتا؟“ وہ مسکرائے۔ ”ایسے تو دل کا درد لڑاتا ہے۔“ نیلم شرمندگی سے مسکرا دی۔
 ”یونیورسٹی تو جیسی لائیں بنانے لگی۔“

”چلیں ٹھیک ہے یا وہ کھڑے ہو گئے؟“ اب مطلع صاف ہو گیا ہے تو ابھی ہی چائے پلائیں۔
 ”جی سر،“ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

چائے بنا کر سر و سر دینے کے بعد بھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بڑی گہری نظروں کی زد میں ہے۔

”یہ لو۔ اور اب یہ پریشانی دور کرو۔ کیسی چٹکار بکھری ہے چہرے پر؟“ ریشتم نے چائے کا کپ اسے

تھمایا۔
 ”تم میری پریشانی نہیں سمجھ سکتی ریشتم؟“ غزالہ نے سر ہلایا۔ ”تم کیا ہونیویرے احساسات کو؟“

”دیکھو غزالہ، وہ لڑکا تم سے یہ لیں ہوتا تو ضرور تمہارا رشتہ لے کر تمہارے گھر آتا۔ تم یہ بات کیوں نہیں

سمجھتی؟“
 ”نہیں کیا خبر وہ کتنا سیریس ہے؟“ وہ سر جھٹک کر بولی۔ ”تم نے کون سا کسی سے محبت کی ہے جو تم

اس کی مجبوریاں اور لگائے سمجھ سکو؟“
 ”جولو ٹھیک ہے۔“ ریشتم نے سانس بھرا۔ ”لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟ تمہاری توشا دی کی تاریخ تک

ملے ہو گئی ہے۔ اب اسے بھول جاؤ اور بسیم اللہ کر کے نئی زندگی کی ابتدا کرو۔“
 ”بس میرا ایک کام کرو ریشتم۔“ غزالہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر انہی کی ”یہ خط اس تک پہنچا دو۔“

”میں؟“ وہ بری طرح سے گھبرا گئی۔ ”میں بھلا کیسے؟“
 ”دیکھو۔ میں تو بڑی مشکل سے یہاں تم سے ملنے آئی ہوں۔ وہ بھی جھانک کے بہرے میں۔ میں تو کالج جا نہیں

سکتی۔ لیکن تم میری کوئی پابندی نہیں ہے نا۔ پلیز، اسے یہ خط دے دینا۔ ریشتم، تمہیں میری قسم۔“
 اس کے چہرے پر اتنی مظلومیت تھی کہ وہ انکار نہ کر سکی۔ مذبذب کے عالم میں خط کو الٹ پلٹ

کر دیکھنے لگی۔
 (باقیہ انشاء اللہ اگلے شمارے میں)

کوئی کھانا کھائے

ساون گئے پیچھے دنوں میں سے ایک ایسا ہی بھگدون تھا۔ ہلکی ہلکی پھواری چھایم۔ چٹوں، پھولوں پر بچتا جلتے رنگ۔ ماحول ایک دم ہی بہت گلابی ہو گیا۔ بہت خراب تاک اور سحر آئیں۔ اور ایسے میں ڈیپارٹمنٹ کی سیزھیوں پر بیٹھے ان چاروں کا

مود پر بیٹھنے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ شامین نے اپنی نازک سی گلابی ہتھیلی باہر پھیلا لی اور کتنی بہت سی لونڈی شبنم کی مانند اس کی ریشمی ہاتھ پر جم گئیں۔ وہ کتنی دیر ہی تماشا کرتی رہی۔
”یار یہاں بیٹھ کر کورسوں سے بہتر سے اتار لے



ہلتے ہیں بچاٹ کھائے، فاطمہ نے ایک دم پروگرام بنالیا۔
”کچھ کسے؟“
”میرے پاس گاڑی ہے۔“
”بھئی واہ پھر تو خوب مزار ہے گا۔ ایسا کرتے ہیں بچاٹ کے بعد عسٹری بہت خریداری بھی کر لیں گے۔ میں کل سے فراقان بھائی کو کہہ رہی ہوں کہ مارا گلی لے چلیں۔ پھر انہیں سر کھانے کی بھی فرمیت نہیں۔ فوج میں کیسی ہی کیا ہو گئے، ان کے تو مزاج ہی نہیں ملتے یا شامین بڑے دل سے بتا رہی تھی۔
”شاپنگ میں مزید دیر ہو جائے گی۔ اس کا مطلب ہے آج کا سارا دن بے کار گیا۔ یو یو سی آئے بھی اور

بالکل بھی نہیں پڑھا۔ کم از کم کلا میں تو لے لیتے یا کوئی نے تاسف بھرے بچے میں کہا۔
”تمہاری یہ رات بھی اب قیامت تک بند نہ ہوگی۔ ایسا کرتے ہیں تمہیں کلاس میں پھینک آتے ہیں۔ چھٹی کے وقت لے لیں گے“ فاطمہ نے آس سے کہا۔
”کچھ تم سب کے بغیر میری روٹی بھی تو بھگ جائیں ہوگی یا کبھی کے بچے میں بے چاری تھی یہ تو بس پھر چپ چاپ ہمارے ساتھ کھسکتی پھو۔ تمہیں لائف انجوائے کر لیتے ہیں اور تم بورڈنگ ر سدا بورڈ ہی رہو گی۔ مجھے تو لگتا ہے جس سے تمہاری شادی ہوگی اسے دال روٹی کے بجائے غالب، اقبال اور کیس سننے کو ملیں گے۔ سبے چارا اپنا سر میتا رہے گا ساری زندگی“



شامین کے گلابی گلابی چہرے پر بے زاری کے رنگ پھیلے تھے۔
 "اچھا اب اٹھو سب۔ یہ باتیں گاڑی میں بھی ہو سکتی ہیں۔ انارکلی یہاں سے خلاصہ دور ہے۔"
 فاطمہ کھڑی ہوئی۔
 اور پھر پارکنگ تک پہنچتے پہنچتے وہ ساری کی ساری تیز چھوڑا میں جھیک گئیں۔ فاطمہ نے جلدی سے پیٹے اگلا دروازہ کھولا پھر اندر لٹک کر پچھا۔ وہ سب اندر پہنچ گئیں۔
 "کہیں بارش تیز نہ ہو جائے۔" کبریٰ نے فکر مندگی ظاہر کی۔
 "پھر تو اور مر اسے گا۔ یہ طرف جل قتل۔ چھاجوں پانی۔ اور ساری دنیا جیسی جیسی ہی۔ اپنا تو یہ فیورٹ موسم ہے۔"
 شامین نے کھر کی کاشیہ نیچے گرالیا۔ کتنی بہت سی بوئیں اس کے رخسار پران بھرتیں۔
 "شیشہ بند کرو۔ جویریہ جلائی۔"
 "بدر فوج۔" اس نے چڑ کر شیشہ اوپر چڑھا دیا۔
 انارکلی میں تیز مرجوں والی چاٹ کھلنے لگی وہ مسلسل سوں سوں کیے تھی۔ ناگ سے بہتا پانی بار بار وہ دوپٹے سے خشک کرتی۔
 "اتنی مرغیں۔۔۔ چاٹ میں۔۔۔ فاطمہ نے سرزنش کی۔
 "تیز مرجوں سے ہی چاٹ کھانے کا مزہ ہے۔"
 آنکھوں میں آئے پانی کو شامین نے جھیلیوں کی پشت سے رگڑ ڈالا۔
 وہ چاٹ کھانے کے بعد چوڑیوں کی دکان میں جا گئیں۔ اتنی ڈھیر ساری سُرَن سُرَن جھیلیاں چوڑیاں دیوکر شامین نے دونوں بازوؤں میں چوڑیاں بھر لیں۔
 یہی ایک خوبصورت آواز اس کی سماعتوں میں سحر کھول گئی۔
 "ہیلو جویریہ۔"
 دلکش آواز۔ دلوازا۔ اور شامین نے ذرا سی گون ترجمی کر کے دیکھا۔ ایک نہایت ہی خوبصورت قسم کا شخص جویریہ کے قریب کھڑا تھا۔

تم یہاں؟ وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔
 "چاٹ کھانے آئے تھے۔"
 "مطلب یہ نور سٹی سے بھاگ کر آ رہی ہو تم؟"
 سمیت۔
 وہ مسکرایا تو اس کی بے تحاشا روشنیوں والی آنکھ کی جگہا ہٹ میں اضافہ ہو گیا۔
 "بس اپنے بھی یاد ہو چر ہیں۔"
 جویریہ نے ناویدہ کا لڑکھایا۔
 "اور ادھر کئی تھپی ہیں ان کی لاڈلی پڑھ پڑھ کر آدھی رہ گئی۔ آج جا کر سارے پول کھولوں گا۔"
 "خیر میرے پاس بھی تمہارے بہت سے پول ہیں اچھا۔ بتاؤ تم یہاں چوڑیوں کی دکان پر کیسے۔ کون سے نمبر والی محبوبہ کو چوڑیوں کا تختہ دینے کا لالہ ہے۔"
 "آہ۔۔۔ اپنی دوستوں کے سامنے میری پوندیشن خراب مت کرو۔ خاصا شریعت بندہ ہوں۔"
 "جی جویریہ کو تعارف کرنے کا ہوش آ گیا۔
 "یہ میری دوست فاطمہ کبریٰ اور یہ شامین ابراہیم۔"
 "ہیلو۔" وہ ایک ساتھ بولیں۔
 "اور ہم اسفند علی، جس کے پول کھول دینے کی دھمکی ابھی ابھی جویریہ نے دی ہے۔ جویریہ کی خوش قسمتی اور ہماری بد قسمتی ہے کہ مابعدیت اس پمپ پمپ لڑکی کے کزن کہلاتے ہیں۔"
 جویریہ چڑ گئی۔ "پمپ پمپ کر کے کہا۔ اور میری خوش قسمتی کس خوشی میں ہوئی؟"
 "بالکل کندھ زن ہو۔" بھئی مجھ جیسے بے حد آذیت اور ذلیت مندہ تمہارا پمپ پمپ زاد ہے۔ نہیں نہیں تو اپنی ساری دوستوں سے تعذیب کرو۔ سہمی جھپٹ متاثر ہو رہی ہیں۔
 وہ مسکرایا۔ اس کے سارے چہرے پر جیسے روشنی پھیل گئی۔
 "جی نہیں آپ سے قطعی کوئی متاثر نہیں۔"
 "جل گئیں وہ ہنسنا۔
 سب ان دونوں کی نوک جھونک پر خامی غفلت ہو رہی تھیں۔ اور اس بھگے موسم میں اسفند علی کا

سرخ و سفید چہرہ شامین کو ایک دم بنی بہت بھلا لگا۔
 اس کی جگہوں سے بھر پور آنکھیں جیسے اس کے اندر سب ہی تھیں۔
 یہ اندر ہی اندر اقل تھیل کیوں؟
 اس نے خود کو بڑے آرام سے ڈانٹ دیا۔
 "کچھ چوڑیاں آپ بھی پہن لیں عہم کزن صاحب۔"
 جویریہ نے جسے اپنی توین کا بدلہ چکا چاہا۔
 "مجھے تو یہ سُرَن سُرَن چوڑیاں تمہاری دوست لائیں۔"
 اس نے شامین کی کلائیوں میں سُرَن سُرَن چوڑیاں دے کر ایک دم ہی کہہ دیا اور شامین کا دل خواہ ہی جھونک گیا۔ اس نے ڈھیر ساری سُرَن چوڑیاں مزید لب کر لیں۔
 "گھر آ کر بھی وہ بے چین رہی۔ اس کا دل اسفند علی کے پاس رہ گیا تھا۔ وہ کتنی دیر سے کل سے کسی درخت کے کھڑی رہی۔ برستی بوئوں کی تیزی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ اس کے دل کے دھڑکنے لگے۔
 "جس میں اسفند علی اپنی شاندار پرستانی ریت آئی جماتا تھا۔
 وہ اونچا لمبا جوان۔
 "یہ کیا پاگل بن ہے شامین۔ تم نے ہمیشہ پہلی نظر کا ٹھکانے والوں کا مذاق اڑایا ہے۔"
 "مگر یہ پاگل دل جیسے آج بس میں نہیں تھا۔
 بل چل کر اپنی منوائے پر بیٹھا تھا۔
 وہ بے خیالی میں کتنی دیر اپنی چوڑیوں پر مانتا تھا۔
 میری رہی۔
 دو سرے دن وہ خواہ مخواہ ہی جویریہ سے اس بات کی توقع کرتی رہی کہ وہ اپنے کزن کا ذکر کرے گی۔ اسے بتائے گی۔ کل اس سے ملنے کے بعد وہ بہت بے چین رہے جس پھر۔ اس کی یاد میں آئیں پھر سنا۔
 "اس سے متعلق پوچھنا۔" گریڈ تیار رہا۔
 پھر اسے اپنی سوچ پر غور ہی نہیں آئی۔
 وہ بے زاری اور کس قسم سے سرخواد کا لیکر سنتی رہی۔ اور وہ انہیں سننے کے بجائے کہیں اور ہی گم تھی۔
 "یار! کہاں کھوئی ہو؟" کبریٰ نے بہت بار اسے ٹھوکا مارا۔
 "یہ نہیں ہوں۔"
 "مجھے تو حالات سازگار نظر نہیں آ رہے۔"
 "تمہاری نظر کمزور ہے۔" وہ خواہ مخواہ ہی چڑ گئی۔
 کلاس سے باہر نکلے شامین نے دیکھا۔ اوڑھے اوڑھے بادلوں نے آکاش کی وسعتوں کو اپنی پیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہی خوابناک سامان۔ لان میں گلاب کے بڑے بڑے پھولوں کی مہک نے فضا کو خاصا رومان پرور بنا رکھا تھا۔ بوئیں پھرے برس رہی تھیں۔
 "چلو کچھ چلتے ہیں۔ کافی کا ایک دور ہو جائے۔"
 جویریہ نے اس کا چڑچڑان دور کرنے کو کہا۔
 "اُک! رائٹ! ابھی تیار ہو گئیں۔"
 "ایک گڈ نور ہے۔" دھڑکنے کے گہرے جھنڈے تلے سے گزرتے ہوئے کبریٰ نے سپنس پھیلایا۔
 "کیا؟" ایک ساتھ آوازیں ابھریں۔
 "جویریہ کی منگنی ہو رہی ہے۔ اس خوشی میں آج کی کافی میرے ذمے۔ کیا یاد کرو گی کہ کس رئیس سے پالا پڑا ہے؟"
 "کبریٰ کی بات پر شامین نے آنکھیں کھولیں۔
 "کیوں میری منگنی نہیں ہو سکتی کیا؟ جویریہ ہنسی۔
 "بہت دو ٹوٹی ہو۔ بہت کتنی۔ دوستوں سے اتنی بڑی بات چھپائی؟ شامین خفا تھی۔
 "بالکل۔" سب ہی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔
 "یار! ابھی مجھے خود بھی یقین نہیں تھا۔ سو جا بات جکی ہو تو سب کو بتاؤں گی۔ مگر یہ کبریٰ کی بیٹی! اس کے بہت میں بھی کوئی بات نہیں رہتی۔ اسی لیے ہی اس سے مذکرہ کر تھیں اور اس نے سارے شہر میں بدنام کر دیا۔ اسی لیے کہ گھر آتی تھیں۔ سن گئی۔ لیکن۔" جاسوس کہیں کی؟
 جویریہ تیز تیز بولتی رہی۔ لبوں پر خشکی اور آنکھوں میں شرارت اور مسرت۔ کہیں اسفند ہی تو نہیں۔
 اس سوچ رہے شامین کا دل بند ہونے لگا۔
 اسے لگا جیسے دل کی بستی۔ پراک دم ہی دیرانی پھیل گئی ہو۔ اندر باہر سناٹا چھا گیا ہو۔ اس کے اندر

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجئے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی بے پناہ عظمت میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو باوجود صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں

گھڑیں۔ اب دیکھ جیسے۔ اتنا حسین موسم اور یہ غیر شاعر ازنی صورت

خود کہاں کے پرس آف دیلزم ہو۔

جو یہ چوڑی گئی۔

بس چوڑی گئی۔ وہ ہنس دیا۔

تو تم مت چڑا کر دو۔

کیا کروں جناب کی صورت ہی ایسی ہے۔

شرٹ اپ۔ وہ دیکھ سے چلائی تھی۔

جو حکم۔

اور پھر اس نے خاموش کھڑی شامین کے لیے فنرٹ

ٹوڑ کھول دیا۔

آپ تو بیٹھے شامین ہی۔ یہ تو بارش میں بوہی لڑتی

جھگڑتی رہے گی۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر

آپ بیمار ہو جائیں گی۔ جبکہ آپ پہلے ہی خاصی نازک سی

ہیں۔

اس نے بہت گہری نگاہوں سے شامین کو دیکھا

اور شامین نے اس کی طرف نگاہ کی اور اس کی نگاہوں کی

پیش سے جیسے اس کا سارا وجود دکھ اٹھا۔

اس نے بچے دروازے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

آپ میرے برابر بیٹھے۔ کم از کم میں گھاس لڑائی کو اپنے

برابر برداشت نہیں کر سکتا۔

اس نے پھر جو یہ کہہ دیا۔

تم چپ ہیں رہ سکتے۔

جو یہ یہ خود سے پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

اور پھر دھبائی کی آواز سے دروازہ بند کر دیا۔

آپ آئے نہ۔

بت بنی شامین کو ملاعت بھرے بیچ میں سفند علی

نے بکا را۔ اور اس کے دل کے تاریک جھنڈا اٹھنے۔ وہ

چپ چاپ اندر بیٹھ گئی۔ خاصی سہمٹ کر۔

گی۔ اب مجھے کیا پتا تھا موسم کے تصور خطرناک ہو جائے

گئے۔

ڈونٹ وری یار۔ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گی

جو یہ بولی۔

اور کیا۔ تم تو چھوٹی چھوٹی باتوں پریشان ہو

جاتی ہو یا میری نہ کہا۔

اور پھر شامین کا دل ایک دم ہی دھڑک دھڑک

گیا۔ اسے لگا اس کی نگاہوں میں متاعیل کے وجود

کی ساری روشنیوں آرائی ہیں۔ پارکنگ لائٹ میں

گاڑی لیے وہی دھن جال موجود تھا۔ جس نے اس کے

روح روم میں بے چینیوں بھری تھیں۔ اور تو اس کی

بے چینیوں کے کیر لا رہا تھا۔

تم ہر جگہ شیطان کی طرح موجود ہوتے ہو ڈیر کرنا

جو یہ کہتی۔

بس جہاں تم وہاں ہم لا وہ اور پتا تھا لگا کر

ہنس دیا۔

اپنی معرفت سے وقت کیے نکال لیا تم نے

حسین چروں کے لیے ہمیشہ میرے پاس وقت

ہوتا ہے۔

شامین کا دل بے قابو ہو گیا۔ کیا یہ فقرہ اس کے

لیے ہے ہ

ہیلو شامین جی

جو یہ یہ کہے برابر کھڑی شامین کو دیکھ کر وہ بڑے

دلنوازا انداز میں مسکرایا۔

ہیلو

وہ مسکرائی اور اسے دیکھ کر گئی۔ بلوچینز اور سفید

کرتے میں وہ بے تحاشا خوبصورت لگ رہا تھا۔ یہ ہم

سجیلانہ، تپائیں اس کے دل کا قرار کیوں بن گیا۔

وہ اس کو کھینچ کر کھینچا جاتی تھی۔

ایک بات بتائیے شامین

جی پوچھیے۔

یہ عجیب سی غلوں آپ کی دوست کیسے قسم سے ہیں

دن اس کی صورت دیکھی جائے وہ سارا دن بورگزنا

ہے۔ نیلی ہی لڑکی کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتی۔ جہاں

پس ذرا سا خوش ہوا۔ موصوفہ اپنی صورت دکھانے

جتنے والے دیپ ایک ایک کر کے بجھ سگئے۔ اور

ان کے سروں سے ڈھواں اٹھنے لگا۔

یہ آج تم پر بار بار ادا سی کے دوسرے کیوں

پڑ رہے ہیں شامی۔ جو یہ یہ اسے بچو دیکھ رہی تھی۔

کچھ نہیں۔ تم بناؤ تمہاری منگنی کب ہو رہی ہے

اور کس سے

اس نے خود کو سجال کر پوچھا۔ ساتھ میں سرزنش

بھی کی۔

عنقریب ہی منگنی ہے۔ امی کی کزن کے صاحبزادے

ہیں حضرت

جو یہ نے اس کی منگنی بھڑی بتانا شروع کر دی۔

اور شامین کے لبوں سے گہرا سانس نکل گیا۔

دیکھنے میں جیسے ہیں موصوف۔ فاطمہ نے پوچھا۔

خود ہی دیکھ لینا۔ منگنی پر تمہیں بھی بھلاؤ گی تو

اور وہ تہہ لایے حد آفت پھونچی نادر۔ جس سے

کل ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا تمہاری بسٹ میں نام

نہیں تھا کیا

ان حضرت کی ناک بہت اوجھل ہے۔ اور پھر وہ

خاصا مہر و ف بند ہے۔ اس کے پاس تو بقول اس

کے زہر کھلنے کو بھی وقت نہیں۔ وہ ان دنوں لڑی

اتج میں ہاؤں جاب کر رہا ہے۔ بڑے اونچے خواب

ہیں اس کے۔ پتا نہیں کون سی پری پسند آئے گی

اسے۔ اور پھر اس کے نزدیک شادی فارغ لوگوں کا

شعبد ہے۔ اس جیسے مہر و ف بندے کا نہیں

بڑا خشک مزاج ہے پھر تو کبریٰ نے منہ بنایا۔

جس اچھا خاصا دروازہ تک بھی ہے۔ کتنی لڑکیاں

اس کے آگے چمچے پھرتی ہیں۔ کئی ایک سے اس کی

دوستی بھی ہے

صرف دوستی ناں۔ کسی کے لیے سمجھ تو نہیں ہوا

کبریٰ جس سے پوچھ رہی تھی۔

یارا بڑا گنہگار ہے وہ۔ ہوا ہی نہیں لگنے دیتا

کیسے میں کاٹی پینے کے بعد شامین نے دیکھا۔ پھول

خاصی تیز ہو گئی تھی۔ اور ماحول مزید خرابانگ ہو گیا۔

بھی شامین نے پریشانی سے کہا۔

اودہ کا ڈا میں گھر کیسے جاؤ گی۔ فرقان بھائی کو

مزوری کام تھا۔ اس لیے میں نے کہہ دیا خود آ جاؤں

اس کی اس حرکت یہ وہ خاصا محفوظ ہوا۔

خطر جمع رکھیے۔ میں اتنا خطرناک نہیں

وہ چپ رہی۔ محزونہ سی۔ وہ اس کے بالکل قریب

نہا۔ اتنا کہ وہ اسے ہاتھ بڑھا کر کھینچ سکتی تھی۔ اسے عجیب

کر سکتی تھی۔ اس کے کپڑوں سے اٹھتی۔ خوشبو

جیسے اس کے جسموں پر چھاری تھی۔

یہ خوبانگ موسم۔ اور اس کا حسین سامعہ

دل نے اس ساتھ کہ لہر جو جانے کی شدت سے

دعا مانگی۔

اسفند علی نے ٹیپ آن کر دیا۔

او میرے شاہ خواں، او میری جان ماناں

تم میرے پاس ہوتے ہو کوئی دوسرا نہیں ہوتا

بول شامین کے اندر اتر گئے۔

کیا یہ اسفند علی کے دل کی آواز ہے؟

اس نے گہر کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دند اکرن

پر نگاہیں جاتے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

یہ کیا ہے مگر انا گنا گویا۔

جو یہ یہ منہ بنایا۔

وہاں۔ یہ بے سراسر ہے

وہ اپنی خوبصورت آنکھوں کو دایکے بولا۔

ایک دم سے بند کی۔

تو ذرا امداد دلت بھی سنیں۔ بازو کی لڑکی کو پسند

کیا ہے۔

کوئی انگشت کیٹ لگا دو۔

مجھے پہلے ہی پتا تھا تمہیں ہا، ہو کرنے والے گیت

پسند ہیں۔ جیسے افریقہ کے جنگلوں میں بہت سے جنگلی

سل کر ڈانس کر رہے ہوں۔ تم ہی بالکل اسی طرح جنگلی

ہی جادو جادو جادو۔ مجھے دہے کہیں تم اسی طرح

کا علیہ اختیار کر کے افریقہ میں لڑکی پڑو۔ پھر تمہیں ڈھول

بجا کر واپس بلانا پڑے گا اور۔

طرت خوشبوؤں اور خوشبوؤں کا بال بیل گیا ہو۔ تبھی وہ جلاری سے تیار ہونے کو بھاگی۔ اس نے جھٹ پٹ کپٹے دے دیے بالی سوار سے اور ہلکا سا ایک اپ بھی کر لیا۔ بھڑا تھی کسے کمرے میں آگئی۔

”کہاں کی تیار ہی ہے؟ ابھی تو آئی ہو، اور پھر کسے کھانا بھی نہیں کھا یا۔“

”اُمی! کھانے کے لیے جویر یہ نے مجھے گھر پر بلایا ہے۔“

اس کی اتنی بھلی اور کھنسنے بنائے ہیں۔“ اور اُمی ہنس دی۔

”اچھا جلدی آ جانا۔“

تبھی گاڑی کا بارن بجا، اور وہ باہر آگئی۔

”بعض دُعائیں کتنی جلاری مشق قبولیت پالیتی ہیں۔“

آپ سے ملنے کا دوبارہ سوچا اور دیکھ لیں آپ کو کیسے اچھی لگتا۔“

وہ بڑے آرام سے کہہ رہا تھا۔

اور برستی نوڑوں میں شاہین کو اس کا اظہار بہت بھلا، بہت اپنا اپنا لگا۔ وہ بڑے اعتماد سے فزٹ ڈوڑ کھول کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

”آپ میری باتوں کا کبڑا تو نہیں مانتیں؟“

وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

”کن باتوں کا۔“

”میں مذاق کر جاتا ہوں نا۔“ دراصل جویر یہ سے چھپ خانی چلتی رہتی ہے۔ اسی بنا پر زبان ہر مرتبہ پھسل جاتی۔ آپ مایند تو نہیں کرتی۔“

اس کی آنکھوں میں بھی بچوں جیسی معصومیت تھی۔

”بالکل نہیں۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”شکر ہے۔ ورنہ میں ڈر رہا تھا کہ آپ خفا ہو گئیں تو۔“

دراصل میں آپ کو خفا نہیں کر سکتا۔“

وہ پوچھنا چاہتی تھی، ”کیوں؟“ مگر پوچھ نہ سکی البتہ اس کی خوبصورت آنکھوں میں خوبصورت جذبے تھے اور ان جذلوں سے وہ اپنی تربیت کی داستان کو دیکھنا چاہتی تھی۔ ساری عمر کے لیے اس کی جو جانا چاہتی تھی۔

جویر یہ گٹ پر ہوا اس کی منتظر تھی۔

”شکر ہے صبح سلامت آ گئیں تم۔ ورنہ میں تو ڈر رہی تھی۔ یہ حضرت گاڑی اتنی تیز ڈرائیو کرتے ہیں جیسے کوئی

طیارہ آڑا رہے ہوں۔“

”نہیں، انہوں نے گاڑی بہت آرام سے ڈرائیو کی۔“

شاہین بولی اور وہ ایک دم خوش ہو گیا۔

”شکر ہے شاہین جی۔ ورنہ یہ لوگی میری بڑائی کا کوئی موقع یا حق سے جانے نہیں دیتی۔“

”اچھا! آؤ۔ کھانا کھاؤ جو مانگے گا۔“

جویر یہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈانٹنگ روم کی طرف چل دی۔

”ہائے کبھی مجھ غریب کا ہاتھ پکڑ کر کھانے کے لیے کہا جوتا۔ مگر نہیں تو میرے کھانے پینے سے سیر ہے، اور دوسرے تیار ہی شکل دیکھتے ہی میری جھونک اڑ جاتی ہے۔“

وہ پھر اسے چڑا رہا تھا۔

”شٹ آپ؟“ جویر یہ لگ کر بولی۔

”اسفند صاحب آپ بھی ایسے ناں۔“

وہ کرسی پر بیٹھنے پر تے بولی۔

”آپ کتنی مہمان نوازیں اور ملنسار بھی۔ اور یہ چڑیل بنانے کی سیر کرتی ہے۔“

”کم از کم تم پر بالکل نہیں لگتی۔“

”تم مجھ پر جاتی نہیں سکتیں کہ میں اتنا آفت اور ڈانٹ بندہ اور کیا تم۔“

”بھئی جی۔ بالکل بدل اٹھا۔“

”پتا نہیں ارسلان کو تم میں کیا پسند تھا کہ منگی کروانے چلائے۔“

”خیر کبھی فرصت میں، میں اس کے کان کھینچوں گا۔ آخر اپنی برادری کا کبڑا تو نہیں چاہ سکتا ناں میں۔“

”اُمی! اسے سمجھا لیں۔“ جویر یہ رو ہانسی جویر یہ تھی۔

”اوہ گاڈ اسفند بھائی! آپ بہت بولتے ہیں، اور ہر وقت جویر یہ کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ پتا نہیں کون سے جیم کی دھنپی ہے اس سے۔“

جویر یہ کی چھٹی ہنس مار دینے اندر داخل ہوتے ہوئے کہتا۔

”اور کیا پوچھو اس سے؟“

اس کا بھہر ہنوز گلو گئے تھا۔

”اچھا اب آرام سے کھانا کھاؤ کھانا کھانا کھاؤ۔“

”اُمی! نے مسک کر کہا۔ مگر کھانے کے دوران بھی ان سب کی نوک جھونک چلتی رہی۔ اور شاہین محظوظ ہو رہی رہی۔

”اُمی! شکر ہے آپ نے اتنا لذیذ کھانا کھلایا۔“

”مجھے معلوم تھا کہ میں کبھی بہت پسند ہے۔“

”بھلی تو مجھے بھی پسند ہے، وہ مزے سے تیار رہا تھا۔“

”تم اپنی ٹانگ مزور ڈانا اور میان میں؟“ جویر یہ نے جمل کر کہا۔

”یہ تمہرے وقت جلتی بھنتی گول رہتی ہو۔ ایک تو رنگ پتلے ہی کالی ہے، اور پھر مزید کمال ہو گیا۔“

”بھئی شاہی آپ ہی اسے کچھ بھانپا کریں۔ اب بھی جلنے کی کتنی زبردست بو پھیلی ہے۔“

”چلو یہ پھر شروع ہو گئے، مار سینے نہ بنا کر کہا۔“

”اچھا شاہین! آپ یہ بتائیں آپ کے گھر میں کون کون جوتا ہے۔“

”سب ہی میرا مطلب پایا اپنا بنس چلاتے ہیں۔“

”فرقان بھائی آرمی میں ہیں۔ اور ان کی مسز بہت اچھی خاتون ہیں۔“

”میرا مطلب قرین بھائی سے ہے۔ اور باقی ایک بھائی بی۔ اے میں ہے۔“

”گویا آپ اکوٹی بہن ہیں، اپنے بھائیوں کی؟“

”جی اور آپ؟“

”میری داستان حیات کچھ اتنی دلچسپ نہیں بھڑاسا گھر۔ اور ساری ذمہ دار کچھ غریب پر۔ ایک بھتیجی سی موٹر بائیک میری ذاتی ملکیت ہے۔ یہ تو اُمی کا احسان ہے جو ان کی گاڑی اڑاتا پھرتا رہا۔ اور۔“

”اچھا یہ بتائیں آپ کو بارش کا موسم پسند ہے۔“

”وہ ایک دم ہی بات بدل گیا۔“

”بہت زیادہ۔“ بارش تو میری گرونی ہے، اب بھی دیکھو یہ بڑا باندی جویر یہ ہے۔ کتنا حسین موسم ہے۔“

”یوں کہیے حسین موسم تھا۔“ اسفند نے سر دھبھی۔

”تھا۔ کیا مطلب؟“ ماریہ بھتی۔

”بھئی، یہ جو سائے موجود ہیں۔“

”اسفند نے خاموشی سے کھانا کھانی جویر یہ کی طرف اشارہ کیا۔“

”بکے جاؤ میری محنت پر کیا اثر پڑے گا۔“

”جی میں بخوبی جانتا ہوں آپ کا کٹھن، پھر میں۔“

”محنت تو مجھ جیسے غریب کی تباہ ہوئی ہے۔ جسے نظر نہ لگا کر تم نے اوجھا کر چھوڑا۔“

”بکے جاؤ میری محنت پر کیا اثر پڑے گا۔“

”جی میں بخوبی جانتا ہوں آپ کا کٹھن، پھر میں۔“

”محنت تو مجھ جیسے غریب کی تباہ ہوئی ہے۔ جسے نظر نہ لگا کر تم نے اوجھا کر چھوڑا۔“

”چلو اسفند شاہی، تم میرے کمرے میں چلو۔“

”وہ ایک دم جی اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”بھئی، انہیں ڈھنگ سے کھانا تو کھالینے دو۔“ اسفند نے کہا۔

”میں نے کافی سیر ہو کر کھانا کھا لیا ہے۔“ وہ بولی اور جویر یہ کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف چل دی۔

”میں بھی آؤں گا۔“ اس نے پیچھے سے ہانک لگا کر پوچھا۔

”جی بھی، کوئی ضرورت نہیں۔“

”میں تو آؤں گا۔“

”خدا کا واسطہ۔ ہمارا بیچھا چھوڑو۔“ جویر یہ رو ہانسی ہو گئی۔

”تمہارے پیچھے کب پڑا ہوں میں۔“

”آئے دونوں جویر یہ۔“

”شاہین نے سفارش کی۔ ٹی وی لائونج سے گزر کر وہ جویر یہ کے کمرے میں آگئی۔ ماریہ بھی ساتھ تھی۔“

”میوزک سنوٹی، جویر یہ نے کیشیں اکٹ پلٹ کرتے پوچھا۔“

”میں سنائوں اپنی پسند گیت۔“

”اسفند کرسی پر براجمان ٹانگیں مار رہا تھا۔“

”رہتے دو۔ تمہاری طرح کے بوز لگانے میں نہیں ہستے۔“

”جویر یہ نے بھی اوجھا کر کھانا نہیں سیکھا تھا۔“

”بھئی، میں اپنی آواز میں گانا سنائے کی بات کر رہا ہوں۔“

”بالکل مت سننا شاہی! ان کی آواز پر دنیا جہان کے کونے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔“

”جیسے تم ان بیٹھیں۔“

”بھئی وہی بحث۔ آپ لوگ آرام سے، صلح سے نہیں رہ سکتے کیا۔“

”شاہین ہنسی۔“

”اچھا پلیس اسفند بھائی! آپ اپنی آواز میں گانا سنائیں۔“

”مگر خدا کے لیے یہ جھگڑانا بند کریں۔“ ماریہ بھی اس کا آؤ تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“

”وہ راضی ہو گیا۔ اس نے کھانا کھانا۔“

”اچھا پلیس اسفند بھائی! آپ اپنی آواز میں گانا سنائیں۔“

”مگر خدا کے لیے یہ جھگڑانا بند کریں۔“ ماریہ بھی اس کا آؤ تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“

”وہ راضی ہو گیا۔ اس نے کھانا کھانا۔“

آواز کی خوبصورتی کا اندازہ تھا، اسی لیے آسانا اعتماد تھا۔
اور شاہین اس کے اعتماد پر جان بھرتی رہی۔ وہ نہ لے سچ شخص
اس کی شخصیت کے اور کون کون سے اسرار اس کی عقلیں
گئے۔

وہ تو پہلے ہی اس سے حدودِ مہمپر پس ہو چکی۔ اسے
اپنے دل کے انوائوں میں جگہ دے بیٹھی۔ یہ شخص اور کتنا
اس کا قہر لے گا۔ اور کتنی بے چینیوں کو اس کا مقتدر
بنائے گا۔

وہ گارہ تھا۔
چاندی جو یہ جو میری کب الیا میں نے سوچا تھا
ماں تم بالکل ویسی ہو جیسا میں نے سوچا تھا!
دل نشین اندازِ نگاہ کے خوبصورت بول اسے یوں
لگا جیسے وہ اس کے کالوں میں مدھمکا رہا ہو۔

وہ یقیناً اپنے خوبصورت جذلوں کو الفاظ کا روپ
دے رہا ہے۔

یقیناً وہ بھی اس کے لیے آسانا بے تاب، آناہی
بے چین ہے، جتنی پچھلے دنوں وہ رہی۔ خواب آگیاں گول
میں اس کی وارفتہ نگاہیں شاہین پر جمی تھیں۔
وہ جیسے معذور ہو گئی، وہ اسی کے لیے کارہا ہے۔

چاندی جو یہ۔
اور پھر گیت ختم ہو گیا۔ مگر وہ سحر زدہ سی بیٹھی رہی۔
بہت کی طرح ساکت۔ اپنے منہ کے حوالوں کے جلوں۔
کیسا ہار۔؟ وہ بے نیاز واد لینے کو بے تاب تھا۔
ایک دم بول لگا۔ جویر نے نہ جانی لینے والے انداز
میں کہا۔

”تم تو سدا کی بددوق ہو۔“ وہ منہ نہ کر بولا۔
”نہیں اچھا تھا۔“ ماریہ بولی۔
”بہت خوبصورت۔“ شاہین نے بھی دل کھول کر داد
دی۔

”شکر یہ۔“ آپ نے تعریف کی تو ساری قیمت وصول ہو
گئی۔ اور ایک یہ مہر مہر ہے، جو کسی کی تعریف پر حل
نہیں جاتی ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے یہ اپنے ہونے والے
منگیتر کی تصویر دکھا کر مجھ سے اس کی تعریف کرنا چاہ رہی
تھی، تب میں نے تو بھل کے اس کا نہیں لیا۔ تیر میں اب بھی
اس موبیوت میں سوکھنے کے کال سکتا ہوں۔“

”متلا۔؟“ جویر نے فتنے میں کشن اس پر دے مارا
”کبھی فرصت میں تفصیل سے بتاؤں گا۔“
اس نے بڑے آرام سے کشن کیچ کر لیا، اور کہنی کے
نیچے دبایا۔

”مدتیز۔“
”تعریف کا شکر یہ۔“
”اوہ گاؤ۔“ پھر جنگ و جدل شروع ہو گیا بھی جویر
تہارے اس بھگڑنے میں مجھے دیر ہو جائے گی۔ شاہین
نے ٹھہر ڈی دیکھی۔

”پھر وہ بار۔ اتنی جلدی کیا ہے۔“
”اچی سے میں نے جلد آنے کا کہا تھا۔“
”میں انہیں فون کر دیتی ہوں کہ تم دیر سے آؤ گی۔“
”نہیں بابر! ویسے بھی نقلی ہوئی ہوں، گھر جا کر آرام
کروں گی۔“

”اسفند۔ شامی کو بھوڑ آؤ گے ناں۔“
وہ اسفند سے پوچھ رہی تھی۔
”اپنے مطلب کے لیے لہجہ دیکھو کتنا نرم کر لیا مطلبی،
خود غرض۔“

اس نے جویر یہ کہنا دارا القابات سے نوازا۔
”اچھا، اب زیادہ ملتیں مرنے کا ڈر۔ گھر میں کوئی بھی
نہیں، ورنہ تم سے سرگز شامی کو بھوڑنے کو نہ کہتی۔“ وہ
ایک دم رنگ بدل گئی۔
”ایمان سے جویر یہ! تم بالکل گرگٹ ہو، اتنی تیزی
سے رنگ بدلتی ہو کہ عقل و نگ رہ جاتی ہے کیوں شاہین
جی۔“

”آپ تو مستقل مزاج ہیں ناں۔“ آپ نے اس کے رنگ
تو نہیں اپنالیے۔ دراصل مجھے متلون مزاج لوگ کیا بالکل
ابھی نہیں لگتیں۔
وہ شاہین سے کہہ رہا تھا۔

”تم سے بھلا کس نے تمہاری پسند و ناپسند کے بارے
میں پوچھا۔“ جویر یہ ہنسا کر بولی۔
”میں نے سوچا خود سے شاہین کو بتا دوں۔ ہو سکتا ہے
مستقبل میں اس کے کام آئے۔“ وہ بولا۔

اور شاہین نے اپنے اندر ہانکھ دل کے ساحل پر اودھم
مچا تھا۔ بڑا شور مچا۔

”اچھا، اب خیر نہ دکھاؤ۔“ میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔
شامی کو دیر ہو رہی ہے۔“
”ایک شرط پر۔“

”کیا۔؟“
”نہیں آؤں کریم کھانا ہو گی۔“
”اچھا کھلا دوں گی۔“ جانے جویر یہ کس موڈ میں تھی۔
”گھاڑی چلائے ہوئے وہ شاہین سے مخاطب ہوا۔
”میں کسی دن آپ کو اپنی بائیک کی سیر کرواؤں گا۔ ریشی
راکٹ بنا کر بائیک اڑاتا ہوں۔“

”پھر تو آپ مجھے گرا دیں گے۔“
”کوئی بات نہیں، سب کچھ بھی می بی یوں گا جب سب کچھ
والے موجود ہوں تو گھر سے نہ کھڑا نا نہیں چاہیے۔“
”اچھا! وہ مسکرائی۔

مقابل کے انکھوں کی ساری روشنیاں اس کے اندر
جگمگ کر رہی تھیں، اور شاہین نے حیرت سے ان روشنیوں
کو دیکھا۔
”پھر تاہیں۔“ سیر کر ہی کی ناں بائیک کی۔
”ٹھیک۔“ وہ مان گئی۔

”ماری گاؤ کی مفت میں، اس کے چکر میں نہ آنا۔“
”تم ہمیشہ رنگ میں جنگ ڈالو گی۔“
”یہ میری عادت ہے۔“ جویر یہ نے جمل کر کہا۔
”برستی لونڈوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی آؤں کریم انداز تے
وہ اپنی دھواؤں کو شمار کرتی رہی۔ جو مسلسل اتنی شخص
کا نام پکار رہی تھیں۔ اور وہ یقیناً سرتا پاسی کا تھا۔

شاید وہ کہنا چاہتا تھا۔
مجھے جس کی شدید تلاش تھی، وہ ہمسفر تم ہو میرے
حصین خیالوں کی غم لہر نہ ہو۔ دل نشین منزل ہو۔ اور۔
”اتنی جلدی گھر آ گیا۔“ اس کے گھر کے سامنے گاڑی
روک کر وہ بولا۔

”جی۔“ شاہین ہنسی۔
”اب تو انداز میں۔“
”جویر یہ سیکم سے اجازت لینا ضروری ہے، اوہ بولے جارہی
سے بولا۔

”یہ بیگ لفظ مجھے زہر مگتا ہے مجھے۔“
جویر یہ تنگ کر بولی۔

”اچھا، اب کب پکڑتا ہوں۔“
مخلاف توقع اس نے جلد ہی مارن مان لی۔
”جویر یہ آؤ ناں۔“ چائے کی لور۔

”شاہین بولی۔ اس کا دل چیل چیل کر اس حسین منہ پر کچھ
دیر اور اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔
”پھر بھی یہی بار۔“ جویر یہ بولی۔
”خاتم۔“ اسفند نے کہا۔ غائب شاہین کو سنایا۔
”انداز فاق بھائی، شمرین بھائی، علی اور محسن کی ڈی
پر کوئی پروگرام۔“ دیکھ رہے تھے۔

”آج شامی۔“ بڑا دلچسپ پروگرام ہے۔“
”محسن نے آواز دی۔ اور اسٹیکس سے بھری پلیٹ
علی کی جانب بڑھائی۔ علی نے بڑی سہولت سے پوری
پلیٹ ختم کر لی۔

اور محسن اٹھا کر دانٹوں سے کترے شامی کی طرف
دیکھا۔ کھلتی رنگت والی لڑکی اس کے دل کا قرار بن کر لاپرواہ
تھی۔ اس کا دل چاہتا ہے جھجھوڑے جھجھوڑے اپنے جذلوں سے
آشنا کرے اور سب۔

”آؤ شامی۔“
اس نے ایک سر۔ آہ کھینچنے سے پکارا۔
”نوشہ کس۔“ اس نے نوحہ بھرے انداز سے کہا۔
وہ انداز چلی گئی، اور محسن نے پوچھا۔
”یہ آپ بار بار سردا ہیں کیوں گھر رہے ہیں پہلے ہی
موسم میں خلی ہے۔“

”نہیں، ابھی نہیں گھر گئے بار۔“
وہ آٹھ کر شاہین کے کمرے میں آ گیا۔ وہ غالباً کورس
کی کتابیں الٹ پلٹ رہی تھی، کل اس اسٹنٹ تیار کرنا تھا
اور اسے اس مسئلے میں ابھی کتابوں سے مغز ماری بھی کرنا
تھی۔

”تم۔“ وہ لالچتی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
”میں یہ دینے آیا تھا۔“
اس نے گلاب کے پھولوں کی ٹوکری اس کے سامنے
کر دی۔ مگر مگر خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔ ساتھ میں

ایک گفٹ پیک اور کارڈ، جس پر درج تھا۔
”سنتے میں مل جاتی ہے ہر چیز دنیا سے
اک روز مجھے مانگ کے باہیں گے خدا

”یکس لیے؟“ اس نے کارڈ پر نظر ڈالتے پوچھا
 ”تمہارا برقعہ ڈسے ہے ناں۔“
 ”ابھی تو ہفتہ باقی ہے ذوہ لا پر دوائی سے بولی۔“
 ”میکٹ کھول کر دیکھو شامی۔“
 ”سوری، میں یہ تحفہ قبول نہیں کر سکتی۔ اس نے کورا
 جواب دے دیا۔
 وہ غائب اس سے ایسے روکھے جواب کی توقع نہیں
 کر رہا تھا۔ لمحہ بھر میں ہی اس کی نے غائبانہ صورت اٹھیں
 دھواں دھواں ہو گئیں۔ غمزدگی رنگت والے چہرے پر ایک
 سایہ سالہ لگایا۔
 ”مگر کیوں؟“ اس کا لہجہ ڈول رہا تھا۔
 ”کیوں سے لڑائی ہوئی ہے؟“
 اس بے حس لڑکی نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر
 نہیں دیکھا، جہاں کہتے روپے خالوں کی کرچیاں ٹوٹ کر
 بکھری تھیں۔ وہ اپنی فذوں سے واپس لوٹ گیا۔
 شامین نے دیکھا۔ وہ پکٹ دہیں جھونکا تھا۔ اور
 جڈوں سے گڑھا کارڈ فریش پر پڑا۔ سبک رہا تھا۔
 البتہ نکال کر لیں کی سحر انگیز خوشبو سے سانس ماحول لاپرواہی گرفت
 میں سے لیا تھا۔
 وہ عجیب سے احاسات میں گھر کر رہی تھی۔
 یہ شخص اس سے کسی توقعات والے نہ کر چکا، اس
 کے دامن میں اسے دینے کو کچھ بھی نہیں بکنی عجیب بات
 ہے کہ کبھی کبھی اس پاس رہنے کے ماحول کی جھونکن
 سنائی نہیں دیتے۔ اور کبھی دوریوں کے فاصلے بھی کئی حقیقت
 بنیں رکھتے۔ وہ شخص بھی اس کے اس پاس تھا، مگر کیفیت
 برقرار رہی اور اسفند ٹھوں میں دھڑکنوں کا کھین بن گیا
 اور۔
 اس ساری رات وہ بے چینی سے کمرٹیں بدلتی رہی۔
 صبح ڈیڑھ گھنٹہ میں کبھی اس کے سر ہو گئی۔
 ”کیا بات ہے آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہیں۔ رات بھر
 تارے گنتی رہی ہو کیا۔“
 ”ہیں تو۔“
 اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔
 ”پھر یہ اوائسی؟“
 ”ایک عجیب بات ہوئی ہے جویری۔ وہ جو بھائی کا

بھائی ہے ناں علی۔“
 ”وہی گندمی رنگت والا، خوبصورت باوامی آنکھوں
 والا اور نیلا لٹکا۔“ فاطمہ جھٹک لولی۔
 ”جڑی جھٹی ہے تو فاطمہ۔ شامین کے سرن کا اتنی تفصیل
 سے جائزہ لے ڈالا۔ اور ہم تہیں ایوں ہی جھٹکتے تھے۔
 میکین میں۔ معصوم چڑیا۔ مگر تو تارٹے میں خوب ماہر
 ہے۔“
 ”جویریہ دبیرنگ ہنسیتی رہی۔
 ”بکومت۔“ فاطمہ جھینک گئی۔
 ”ہاں جھٹی تو کیا ہوا علی صاحب کو۔“ کبیری التجس
 ہضم نہیں کر سکتی تھی۔
 ”وہ مجھ پر مہمے ہیں۔ پہلے پہل میں اس کی نگاہوں
 کو نظر انداز کرتی رہی مگر کل شام وہ میرے لیے ڈھیر
 گلاب لے آیا۔ اور میں نے اسے نامزد کر دیا۔ تم ہی بناؤ
 جویریہ میں کیا کرتی۔ میں نے کبھی اس کے بارے میں اس
 انداز میں نہیں سوچا۔ مگر کل سے میں خود کو مجرم تصور کر رہی
 ہوں۔ لیکن میں نے تو اس سے نہیں کہا تھا کہ وہ میرے لیے
 سیریس ہو جائے۔“
 شامین بہت سنجیدہ تھی، اور ساتھ میں رنجیدہ بھی،
 ”ہائے تو نے اس کا دل توڑ دیا۔ فاطمہ۔“ سچ سچ۔ وہ اتنا
 پیارا شخص۔“ فاطمہ انہوں کو کہنے لگی۔
 ”شٹ اپ بند کرو یہ کون اس۔“ نے ان فرخانات سے
 کوئی دلچسپی نہیں۔ شامین نے اسے ڈانٹ دیا۔
 ”بات کیا ہے شامی۔“
 ”جویریہ نے غور سے دیکھا۔ وہ واقعی بہت مشکل
 لگ رہی تھی۔
 ”اس کو انکار کر کے میں خود کو مجرم تصور کر رہی ہوں۔“
 ”اس میں تیرا کیا قصور۔ تو نے خود ہی کہا ہے کہ تو نے
 اسے کبھی کوئی امید نہیں دلائی۔ پھر گنتی کیوں چل کر رہی
 ہو۔ ساری زندگی میں کہتے بہت سے لوگ آئے ہیں مگر
 زندگی کسی ایک شخص کے ساتھ گزار دی جاتی ہے، اس
 شخص کے ساتھ جسے دل و دماغ ایک وقت قبول کرے۔
 اور تم نے علی کو کبھی اس نگاہ سے دیکھا ہی نہیں۔ اس لیے
 مٹی ڈالو اس قہقہے پر۔“
 ”جویریہ اسے بھجاتی رہی۔
 اور اس نے واقعی اس قہقہے پر مٹی ڈال دی۔ مگر

ان لوگوں کا قیدی رہا۔ جن میں اسفند علی اس کے دل کی
 ان بن گیا تھا کبھی نہ بھولنے والے وہ لمبے جواس کے ہم
 اپنے جیناں سوچ گئے۔ جن میں ایک مسیحی ہی سک
 بن کر گئے۔
 وہ شخص جس سے کوئی خلیق نہیں۔ کوئی واسطہ نہیں۔ وہ
 ساری دنیا سے لیاہ عزیز ہو گیا۔ سارے خوبصورت
 اور خود اس کے نام ہو گئے۔ چاہت، محبت کے سارے
 اور اس ندرے کو سوچ دینے کو جی چاہتا تھا۔
 ”کیا خبر وہ بھی تمہارے لیے اتنا ہی بے چین اور غور
 کیا پھر وہ اسے شخص لکائی کھیل بنائے، انجوائے کرنا
 وہ خود سے بہت مرتعہ سوال کرتی۔
 مگر سر بار دل دھڑک دھڑک کر اس شخص کے خدوں
 ہاتھوں کا اعتبار دلا دیتا۔ کہ جس نے منہ سے ابھی تک
 لفظ کا بھی اظہار نہیں کیا تھا۔ اور ہمیشہ
 کو ارباب۔
 رات کیٹ روم میں کھیش کی خوبصورت آواز گونجتی
 تھی۔
 ”یہ میرا دلوانہ بن ہے یا محبت کا تصور
 تو نہ پہچانے تو ہے پتیری لفظوں کا قصور
 کیٹ روم میں طبعی تھی اور کھیش کی کھیش علی کو دیکھ
 شامین نے عین ہرگز ویرے سے بہت گئی۔ وہ صرف
 خندے ہائے میں سوچنا چاہتی تھی۔ جس کے بغیر اب
 جہیز میں دل نہیں گتا تھا۔ کسی پل قرار نہیں تھا۔ لڑ
 بر۔ اور نہ اچھے بیٹھے چین۔ وہ شخص اسے نہ ملتا
 اس کی ساری زندگی دھکی پھکی گزرتی۔ بہت بے کراں اور
 مقرر۔ اس کا ہر خواب، ہر دوپہلا پسنا، ہر رنگ اسی
 دم سے تھا اور۔
 ”ایسے ویرانے میں اک دن
 گھٹ کے مر جائیں گے ہم
 جتنا جی چاہے پکارو
 پھر نہیں آئیں گے ہم“
 بھیگی ہوا کے دوش پر اوس آواز پھر اس کے کانوں
 آتی۔
 ”یہ شخص مجھ میں کیوں احاس برم پیدا کرنا چاہتا ہے۔
 اس نے جھجکا کہ کانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

ہم سب اپنی اپنی ذات کے حصار میں قید ہیں علی۔
 اپنے خالوں کے جزیروں میں مقید۔ جس طرح بچی
 کو قفس سے پیار ہو جاتا ہے، ہم سب اپنی قید میں راحت
 محسوس کرتے ہیں، اور جس دن یہ پھٹا پھٹی اس قفس
 سے چھٹکارا پائے گا، اس کا سانس ٹک جائے گا۔
 وہ بہت پریشان تھی۔ یہ کیسے محاسات اس کی زندگی
 میں آگئے تھے۔ یہ زندگی اس کے لیے پہلے تو کبھی اتنی
 نا آسودہ نہیں تھی۔ اتنی نفکا دینے والی۔ پڑھو۔
 کرے میں کا پیوں اور کتابوں کا ڈھیر تھی، اس
 نے بے دلی سے سوچا۔
 استمان میں صرف ایک ماہرہ گیا تھا وہ ابھی سے
 دلچسپی سے پڑھ رہی تھی، اچھے نمبروں میں کا پیاب ہو
 سکے گی۔ مگر یہ نا آسودہ سوچیں بھی نہیں دے رہی تھیں۔
 ایک طرف وہ شوخ خوشگ اسفند۔
 اور دوسری طرف وہ اداس اداس آنکھوں والا
 علی۔
 وہ آنکھیں موند کر لیٹر پر لیٹ گئی۔ تبھی اس کی
 بند آنکھوں میں اسفند اتر آیا۔ جھلکاتی روشنیات اتر
 آئیں۔ اور اس کی تنہائی سکڑا گئی۔
 ایک ماہ اس نے سجدگی سے کتابیں میں سر دے
 کر گزار دیا۔ نہ دھوا دھوا جھانکا۔ نہ کسی سوچ کو ذہن
 میں آئے دیا۔ جب بھی الفاظ اسفند کا نام بن جاتے
 پھر پھڑپھڑانے کا فذوں میں اس کی شبیہ اتر آتی تو وہ
 سنتی سے سر جھٹک دیتی لیٹا۔ وہ اس کا باہر لان میں
 ٹھنڈی گھاس پر آ بیٹھتی۔ یہاں بھی چلن کہاں تھا۔ وہ
 ایک بار اسفند سے ملنا چاہتی تھی۔ یہی سی آنکھوں کو
 سیراب کرنا چاہتی تھی۔
 ساون کی اداس شاموں میں جیسے کوئی دھیرے
 سے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر گیا۔
 ”میں تمہارا ہاتھ تھام کر وہاں تک جانا چاہتا ہوں
 جہاں سے تارے سکڑا کر مارا استقبال کریں اور جہاں
 بہا رہیں لیسر کرتی ہیں، میرے ساتھ چلو گی ناں“
 اور وہ کتاب بند کر کے بے بسی سے چلیں موند
 لیتی۔
 ”ہیلو شامی!“ علی نے آکر چونکا دیا۔

کتنی خوبصورت یادیں اور دھڑکنے لگیں۔
اسفند کی جین بادوں سے لوٹنا شامین کو بہت بڑا لگا۔
اور اس نے بھی زیادہ وہ روشن باوای آنکھوں والا علی۔
بڑا لگا جس نے اس سے ملاقات کی تھی۔ حالانکہ وہ۔
کل بیٹھے ہیں نصویر جانال کیے ہوئے۔
کے مصداق حرف اور صرف اسفند کو سوچنا چاہتی تھی۔
اور۔

”آج کل خوب پڑھائی ہو رہی ہے۔“
وہ اوسری سے مسکرایا تھا۔
”ہاں بس۔“
”اتنا مت پڑھو۔ بیمار ہو جاؤ گی۔“
”مجھے کچھ نہیں پڑنا دیکھیں۔“ پھر وہ پھر کر بولی۔
”شری سخت جان ہوں۔ اور تم ساؤتھم ڈیوٹی پر کلب
جار ہے ہو۔“
”بس ایک دو دنوں میں۔“
وہ اس کی طرف دیکھ کر بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ
کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی کی طرف دیکھنے پر
مخرومیاں ٹوٹنے لگی تھیں۔ نادہائی کا کرب بڑھ جاتا
تھا۔

”تجربہ یہ لڑکی اس کے جذبوں سے فکر کیوں
ہے، آخر کیا وجہ ہے؟“
”شامی! ایک بات بڑھوں؟“
”مجھے ابھی بہت پڑھنا ہے علی صاحب؟“
”سوری، میں نے تمہارا اتنا وقت لیا۔“
وہ ایک دم ہی لمبے لمبے دگ بھرتا اندر چلا گیا۔
اس کے اتنے بڑھتے قدم اس کے اندر وہی غلط اشارے
غماز تھے، اس نے سر ہٹا دیا۔ تیس خیریں بھائی نے آواز
دی۔

”شامی تمہارا فون ہے۔“
”کس کا؟“ وہ وہیں سے چینی۔
”جویریہ کا۔“ وہ کتابیں چھوڑ کر اندر بھاگ آئی۔
”کیا کہہ رہی ہو؟“
”کتابیں چاٹ رہی تھی۔ یہ امتحانوں کا خوف کسی
پل چہن نہیں لینے دے رہا۔ ابھی اتنی تیاری کرنی ہے
اور ذہن میں کچھ بیٹھنا ہی نہیں۔ میں اتنی کندہ ہوں تو
پہلے کبھی نہیں ہوتی۔“

”چلو، تم نے اعتراف تو کیا کہ تم کندہ ہیں۔“
جویریہ مٹی۔
”مکومت۔“
”اچھا جھٹ پٹ تیار ہو کر میری طرف آ جاؤ۔
تمہارے لیے ایک سر پرانہ ہے۔“
”میرے لیے سر پرانہ؟“
”شامین کا دل دھڑک اٹھا۔ دھان اسفند کی طرف
چلا گیا۔ کہیں اس نے اپنی تباہیوں کا حال جویریہ
سے تو نہیں کہہ دیا، تو کیا وہ لکھ کر آن پہنچا جب وہ اس
سے اپنی چاہتیوں کا اعتراف کرے گا۔ اور۔

”ہیلو سوکھیں کیا؟“
جویریہ کی آواز کان میں گونجی۔
”آہستہ پو پو لڑکان میں سوراخ کر دیا۔“
”اچھا پھر آرہی ہوں؟“
”مگر سر پرانہ کیا ہے؟“
”یہاں آنے پر معلوم ہوگا۔ بس تم فوراً آ جاؤ اور
ہاں اچھی طرح تیار ہو کر آنا۔“
فون بند ہو گیا۔ اور اسے جویریہ پر غصہ آ گیا کہ
لڑکی سپنس پھیلانے میں ماہر ہے۔

اس نے ارفوانی رنگ کاسوٹ نکالا جس کے دو
کے کندے کندے اس کی ہر رنگ بیل جی کا لون میں
ڈانڈ کے ٹاپس پہن کر اس نے خود کو ہر قسم میں ڈال
لیا اور اپنے میں اپنے سراپے پر نگاہ ڈالی۔ وہ شامی
اچھی۔ لگ رہی تھی بلکہ ارفوانی آئی شید نے اس
کی آنکھوں کو ہر دھڑکنے پر انداز کیا تھا۔
وہ آج کل کا سارا سامان کرنا چاہتی تھی۔ وہ
مطہن ہو کر فراق بھائی کے پاس آگئی۔
”بھائی! مجھے جویریہ کی طرف چھوڑ آئیں۔“

”یہ ایک دم تیاری کیسی۔ تم تو دن رات کتابوں
سے چٹی چٹاتی تمہارے امتحان کہاں گئے؟“ وہ شامی
سے پوچھ رہے تھے۔
”اند پرے آرام فرما رہے ہیں۔“ اس نے بڑا
سے کہا۔
”فرقان بھائی ہنس دیے۔“
”اچھا چلو، چھوڑ آتا ہوں، مگر واپسی۔“

”واپسی پر مجھے جویریہ چھوڑ دے گی۔“
اور وہاں جویریہ کے ساتھ ساتھ کبری اور فاطمہ
بھی تھیں۔
”یہ جیڈل چوکڑی یہاں کیوں؟“
”آج میری برتھ ڈے ہے ناں۔“
”پہلے کیوں نہیں بنایا۔ کوئی گفٹ لے آئی؟“
شامین نے منہ بنایا۔

”تمہاری برتھ ڈے بہت پہلے گزری ہے اور تم نے
اسے بلڈرٹ نہیں کیا۔ اس لیے میں نے دو کیک
منگوائے ہیں۔ ایک اپنے نام کا۔ ایک تمہارے نام کا۔
دونوں ساتھ ساتھ کیک کاٹیں گے۔“ جویریہ بتا رہی
تھی۔
”یہ تمہیں امتحانوں میں کیا سوجھی۔ ان کی دہشت
سے میری روح فنا ہے اور تمہیں یہ مستیاں سوجھ رہی
ہیں؟“
”ماں! بڑھ کر میرا دماغ تنگ کیا تھا اس لیے
یہ گید رنگ کر لی؟“
جویریہ نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ ڈاننگ ٹیل۔
بے شمار لوازمات سے بھری تھی۔ تبھی اسفند نے ڈھیر

پھول اور سرخ چوڑیاں شامین کی نذر کر دیں۔ اور شامین
کو نگاہ سے دیکھ کر جیسے اس کے اندر بے غار جھکا گئیں
آز آئی ہوں۔
”یہ آپ کی سالگرہ کا تھا۔ آج آپ بہت حسین
لگ رہی ہیں۔“ وہ جیسی آنکھوں سمیت کہہ رہا تھا۔
”اچھا۔“ وہ کھکھلائی۔
”اور آپ کی تہی جیسے انسان کو تفکرات سے
نجات دلاتی ہے؟“ مدھم سرگوشی میں اس نے کہا۔
وہ گڑ بڑائی۔

وہ جتنا خود خوبصورت تھا، اتنی ہی خوبصورت
باتیں کرتا تھا۔ وہ اسے کہنا چاہتی تھی، اے ہسٹلر۔
زندگی بھر یونہی اپنی خوبصورت باتوں کا مدھ کا لون
میں ٹپکاتے رہنا اور۔
”تمہارے پسند آیا؟“
”بے حد۔“
”تو پھر یہ چوڑیاں پہن کر دکھاؤ۔“

اور شامین نے دونوں کلاسیاں جھللاتی سرخ چوڑیاں
سے بھر لیں۔
”یہ جھل میں سرگوشی کیوں؟“
کبری نے ان دونوں کی چوری پکڑ لی۔
”میں شامین کو دیکھ کر کم لگتا۔“
وہ ذرا بھی نہیں گھبرا یا۔ اعتماد سے بولا۔
”اور میں تمہیں نظر نہیں آتی، سالگرہ میری بھی
ہے۔“

جویریہ نے منہ بنا کر کہا۔
”کیا کروں، مجھے ایک حسین چہرے کے سوا کچھ
دکھائی ہی نہیں دیتا۔“ اسفند کی گہری نگاہیں اس پر تھیں۔
اور شامین سب کے سامنے پوئل کھل جانے کے
خیال سے چورسی بن گئی۔
”اچھا جی کیک کاٹو ناں؟“ فاطمہ بولی۔
”پھر وہ جویریہ! میں تمہیں کلبھاری لا دوں۔“ اسفند
ایک دم جھنجھکی سے بولا۔
”کیوں؟“ جویریہ نے آنکھیں پھیلا دیں۔
”جی نہیں تم کلبھاری سے کیک کاٹنا۔“

جنہوں استعمال کیا وہ جلتے ہیں
سوہنی میسرائل کی خوبیاں
● گرتے بالوں کو روکتا ہے
● بال بے اور گتے کرتا ہے
● بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

سوہنی میسرائل

کیا آپ نے اسے استعمال کیا؟ نہیں
تو ایک دفعہ استعمال کر کے دیکھیں

کرہ روپ
ملنے کا پتہ
۳۷ اردو بازار کراچی

” حکومت : ” وہ چوگئی ۔

” آل راث : ”

” میرا خنق کہاں ہے ؟ ”

” میں کنگال ہوں ”

” میرے معاملے میں تم ہمیشہ سے کنگال ہو، کیوں غلط جویر یہ وضاحتی ۔

” اور پھر میری کھاتے شاہین کو استمان یاد آگئے ۔

” اس سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا ۔

” مجھے لگتی ہے جویر یہ اس مرتبہ بہت شاندار طریقے سے فیمل ہوں گے ۔

” میں پاس کروادوں گا ” اسفند بولا ۔

” ہاں جیسے خود پاس ہوتے رہے، جاؤ اور بدلتی دکھاؤ، مگر ہر بار یہ حربہ کامیاب نہیں ہوتا مجھے ” جویر نے ناگ مسکواتا ۔

” نہ سہی ۔ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا ”

” تم بھلائی نہ کرو، تمہاری یہ بھلائی ہمیشہ ہنگامی ہوتی ہے ”

” میں اب گھر جاؤں گی جویر یہ ”

” شاہین ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی ۔

” تمہیں کیا ہوا ؟ ”

” کبرئی نے پوچھا ۔

” امتحان ہمارا ”

” جس دن وہ آخری پرچہ دے کر آئی، اس نے شکے کا سانس لیا ۔

” شکر ہے کتابوں سے جان چھوٹی ۔ ”

” اس دن وہ اپنے وارڈروب کی خبر لے رہی تھی ۔

” سارے کپڑے بیڈ پر ڈھیر تھے ۔ وہ برائے کپڑوں کی چھٹی کر رہی تھی اس نے پہننے والے کپڑوں کو ہینگر کی زینت بنا کر وارڈروب میں لٹکا دیا ۔

” بہت صوف ہوشامی ! ”

” بھائی اندر آگئیں ۔

” کوئی کام بھائی ؟ ”

” ہاں بہت ضروری ”

” جی جیسے ”

” دراصل شامی : ” مجھے امتی نے ہی یہ بات تم سے

” معلوم کرنے بھیجا ہے ”

” انہوں نے قہید باندھی ۔

” کوئی بات بھائی ! ”

” وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی ۔

” شامی تمہیں علی کیسا لگتا ہے، میرا مطلب علی تمہیں پر پوز کر رہا ہے ۔ اور پھر میری جگہ ہی خواہش ہے ۔

” بھائی نے دھماکہ کیا ۔

” وہ کتنی دیر پتھر بنی بیٹھی رہی ۔

” بھائی : ” یہ سب ”

” شامی کچھ کہنے سے پہلے آسانسور علی بہت غصت کرنے والا لڑکا ہے ۔ اور وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا ۔ وہ تمہیں پسند کرتا ہے، نجانے کب سے نہیں اپنے دل میں محکوم دیے بیٹھا ہے ۔ شاید تم نے دیکھا نہیں تھی، اس کی آنکھوں میں مسکرائی ہو، وہ دونوں دوست کی طرح ہیں، تم مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کر سکتی ہو مگر مجھ کی تم سے درخواست ہے کہ تم اس رشتے سے انکار مت کرنا، کیونکہ علی تمہارے جانے کے قابل نہیں وہ بہت سچا ہوا، بہت بہترین لڑکا ہے ۔ اور ”

” بھائی : ” کیا ایک سب نے فیصلہ کر لیا، یا میرے پاس بھی جو اس کی تمنا ہے ”

” اس کا بوجھ دوا ہو رہا تھا ۔

” پسند و ناپسند کا اختیار تمہارے پاس ہے ”

” شامی : ” کہ تم جانتی ہو، امتی زبردستی قابل نہیں، مگر جاری خواہشات بھی تمہارے لیے قابل تکمیل ہوتی چاہئیں اور ۔

” یہ میری زندگی کا سوال ہے بھائی ! ”

” کیا کوئی اور ہے ؟ ” بھائی نے کر دیا ۔

” بھائی : ” دراصل میں ابھی ان جھجھکوں میں پڑنا نہیں چاہتی، ابھی تو کتابوں سے فارغ ہو گئی ہوں ۔

” ایک اور بوجھ کھنوں پر لاؤں، ابھی میں آرام کروں گی اور اس کے بعد جواب ” پھر کہیں جا کر اس سلسلے کے متعلق سوچوں گی ”

” اچھا ابھی شادی نہ کرو، مگر متنی تو ہو سکتی ہے ۔

” علی کو بھی نقل ہو جائے گی ”

” میرے خیال میں بھائی، علی مجھے اچھی طرح سمجھتا

” پھر یہ سلسلہ کیوں چلایا ۔

” یہ تم سب کی بھی خواہش ہے شامی، تم کوئی جذباتی سلسلہ نہ کرو، اچھی طرح سوچو، ایسا جیون ساتھی ہر

” کو نہیں ملتا۔ جو زندگی میں بہاؤ لے آئے ۔

” مشورہ ہے تم ٹھنڈے دل سے سوچو کہ بہر حال میں بادی خیر خواہ ہوں، اور پھر ”

” بھائی : ” جب یہ ارشاد دی کا موڈ ہوگا میں آپ سے ”

” وہ کہہ دوں گی ” وہ رکھائی سے بولی ۔

” اور بھائی اس کے کمرے سے باہر چلی گئیں ۔

” شاہین کو علی پر بے حد متاثر تھا ۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے اس کے دل میں اس کے لیے رتی برابر بھی

” دلش نہیں ۔ پھر بھی ڈھیٹ بن کر پوز کر دیا ۔

” اس آدمی ۔ وہ اس کے اور اسفند کے روپے

” انہوں کے درمیان دیوار بننا چاہتا ہے ۔

” بھلا ایسے شخص کے ساتھ کیا زندگی گزارنا ہے ”

” وہ دوسرے کے جذبات و احساسات کا رتی برابر

” سانس نہیں دے کر اسے کیا معلوم ۔ وہ اسفند کے لیے

” جلیں ہے اور ”

” علی آبا بیٹھا تھا ۔ باہر قدرے خشکی تھی جبکہ اندر

” موسم خاص گرم تھا ۔ درانی ڈھٹ کھاتے، منتر بن

” مانی سے دھیسے دھیسے باتیں کر رہا تھا ۔ جبکہ فرقان بھائی

” کے سے فون پر لگے تھے ۔ اور حسن کرٹ میگزین میں

” لکھ کر پڑھتا تھا ۔ ایسے میں پیرٹ گرین کپڑوں

” کی ملبوں ٹھیک ٹھیک شامین دروازے میں ہی ایک

” لڑکے سے توقع نہیں تھی کہ علی وہاں موجود ہوگا ۔

” آؤ شامی : ” بڑک کیوں گئیں ؟ ”

” بھائی نے اسے دیکھ لیا ۔ مجبوراً شامین کو اندر

” لڑکا اور نہ وہ اٹھتے قدموں والی کاسوٹ پہنی تھی ۔

” وہ دھیرے دھیرے چپے بٹانہ بند کر گئی ۔ اور کھٹکے سے

” رسی پر لٹک گئی ۔

” ” کو درانی ڈھٹ کھاؤ ” بھائی نے علی کے

” سامنے سے پلیٹ اٹھا کر اس کے سامنے کر دی ۔

” ” بوڈ نہیں ہے بھائی ! ” علی کو دیکھتے اس کا بوجھ زخمو

” مورا ہو گیا ۔

” ” تمہاری علی سے کوئی غفلت چل رہی ہے ” بھائی

” نے اٹیکم پوچھ لیا ۔

” نہیں تو ” وہ گرد بڑھائی ۔ وہ ان سے ایسے سوال

” کی توقع نہیں کر رہی تھی ۔

” ” میں بھلا ان سے کیوں غصا ہوں گی ” اس نے

” سپاٹ لہجہ میں کہا ۔

” علی نے بے تحاشا خوبصورت آنکھیں اٹھا کر اس طرح

” کو دیکھا جس کے چلنے نے اسے گہری تکلیف دی تھی ۔

” شامی شامی باوا دی آگئیں ۔ شامین نکلیں چرائیں ”

” ” اور کے آئی، میں چاہتا ہوں ”

” وہ بھائی سے کہتے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا ۔

” ” پھر وہ ناں ۔ کھانا کھا کر جانا ۔ ”

” ” پھر بھی سہی ! ”

” ” مگر سنو تو ”

” ” بھائی بیکار رہ گئیں اور وہ یہ جا وہ جا ۔

” ” شامین اسے کیا ہوتا جا رہا ہے ” بھائی نے

” حیرانی سے کہا ۔

” ” حالانکہ شامین جانی تھی ۔ وہ اچھی طرح جانتی

” ہیں اسے کیا ہو گیا ۔

” بالکل اچانک جویر یہ کی شادی کا ہنگامہ اٹھا۔ ان

” لوگوں کو بہت جلدی تھی اس لیے چند روزوں بعد شادی

” کی تاریخ ڈھکی ہوئی جویر یہ اپنے ساتھ شامین شاہین

” کو گھسیٹتی پھری ۔ وہ بازاروں کے چکر لگانا شروع کر

” گئیں ۔

” ” تو یہ ہے شادی کی شامین شیطانی کی آمنت

” ہوتی ہے ” شامین نے باقاعدہ کانوں کو ماتھ لگائے ۔

” ” لبرٹی میں جوں کی گانے سے نکلے اس نے جویر یہ سے

” پوچھا ۔

” ” یہ تمہارا کزن کہاں غائب ہے ابکل ”

” ” وہ لاہور آئی شخص ہے، بھی یہاں کبھی وہاں ”

” نہیں وہ غیر مجبورہ شخص ڈاکٹر کیسے بن گیا۔ ابکل موصوف

” بہت لمبی آؤٹان میں ہیں ”

” ” مطلب ” ” وہ چوگئی ”

” ” مطلب یہ کہ سعید کمال کا نام تو تم نے سنا ہوگا ”

” ” ہاں بہت بڑا صنعت کار ہے ”

” ” بس ابکل موصوف ان کی بیٹی کے زلف کے اسیر

” ہو رہے ہیں، ایمان سے شامی تم اگر اس لڑکے کو دیکھ لو تو

دوسری بار دیکھنے کی تمام عدم ہو جائے، مگر وہ حضرت دن رات اسے اپنی محبت کا یقین دلانے پر تلے ہیں۔
 ریشمی یہ شخص بہت سا دھڑ پست ہے ایک حسرت میں اسارت کی لذت پر پہنچنا چاہتا ہے، میری تو بھین نہیں آتا کہ اس کا کمر توڑنے سے دوسری کا کچھ لیتا ہے۔
 جاتے ہیں لیکن اس کی جانب کیوں پلٹتے ہیں۔ کون سا خیر نگاہ اس میں؟

اور شامین کو رنگا جسے جویر نے اس کے کانوں میں گھلتا ہوا سیسہ ڈال دیا ہے۔ اسے لگا جیسے اس کے سوجھنے بھنے کی صلاحیتیں جواب دے گئیں۔
 ”کیا یہ سچ ہے جویری؟“ اس کا سر جھک گیا۔
 ”لو تم نے اس کی لالابا طبیعت کا اندازہ نہیں لگایا اور۔“

جویری نے اس کا زرد پڑتا چہرہ دیکھا تو چونکی۔
 ”کیا بات ہے شامی، کہیں تم اس کے چکر میں تو نہیں۔“

”میں نہیں تو۔“ اس نے اندراشتی در دلی لہولہ پر قابو پاتے ہوئے جھوٹ بولا۔
 بعض باتیں خود سے بھی چھپا کر کہنے کی ہوتی ہیں۔

اور۔
 ”فکر ہے۔ میں تو ڈر رہی تھی۔“
 جویری نے ایک لمبا سانس بھرا۔ اس کے اندر بونے والی ٹوٹ پھوٹ سے کس نہ آشنائیا شامین کو لگا جیسے اس کے ارد گرد کی دنیا میں کس نہ ساٹھا گیا ہو۔ یہ چیخیں۔
 چنگھاٹوں کا ٹان یا کس نے آواز ہو گئی ہوں۔ اس باس چلے پھرتے انسان، ہر چیز پر گہری خاموشی کی زد میں ہوا اند۔
 اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں من مرنے کر وہ جی بھر کر روئی۔ انگلیوں کے چوڑے روشن کرتی رہی۔ اور ان اس اداس تالوں والے گیت سنتی رہی۔
 دل کی نازک رگیں تو جیتی ہیں
 کوئی اتنا بھی نہ یاد آئے

وہ خود کو یقین نہ دلا سکی۔
 وہ بے وفا ہے، وہ دھوکے باز ہے۔ وہ کالی کالی منڈلاتے والا جھوٹا ہے، جس کی کوئی منزل نہیں۔ جو کسی ایک ماہر کو رہتا نہیں جانتا۔ وہ اس کی خوش فطرت کو اس کی ذات کی اچھائی کو دانتی تھی۔ وہ اتنا بے رحمی کی وہ

انتہائی غیر سنجیدہ اور بے اعتبار شخص ہے اور۔
 یہ دن ایک دم بے کیف کیوں ہو گئے؟
 سے۔ یہ دنیا خالی خالی کیوں ہو گئی جیسے زندہ رہنے کو اب کوئی توجہ ہی نہ بچا ہو، دل کے سرو خانے میں اتنی برقت کہاں سے آئے گی کہ اسفندی کہ ہر یاد پر تکی لگی۔ اور جب راتوں میں اس کی تنہائی سوا ہو چالی تو کہیں سے بے اعتبار رسکیاں نکل جائیں۔

تم بھی عالم مردانے اسفندی، مادہ پرست۔
 وہ خود کو یقین دلانا چاہتی تھی، اس کی پسند آتی سلی اور گھٹائی نہیں۔ وہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ضرور جویر کو دھوکا دے گا یا پھر جویری نے اس سے جھوٹ بولا مگر کیوں؟

وہ ایک بار اسفندی سے خود ملنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے ضرور ملے گی۔ وہ اس کی آنکھوں میں اس داستان کو کھوجے گی جسے اس شخص نے خود اس کے دل پر رقم کیا تھا اور۔

وہ جویری کی شادی میں نہیں جانا چاہتی تھی، مگر ایک بار اس شخص سے ملنے کی تمنا میں وہ جلی آئی۔ اس کی تلاش نگاہیں اسفندی کو ڈھونڈتی رہیں۔ وہ سیاہ و نر سویر میں اپنی تمام تر وجہاں سمیت دہلیا سے غور گھبراہٹا تھا کہ اس خلیصورت تھا وہ۔ اور کس قدر دل میں آئے جاتے تھے شامین کا دل تو جیسے دھڑکنے لگا تھا۔ مگر یہ حقیقت کے اس ناگ نے دھمکے دیا کہ آنکھوں کو لہجائے والی بعض صورتیں اندر سے کس قدر مکروہ ہوتی ہیں۔

وہ اسے دھوکے باز تصور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ جس کی آواز خواب بن کر اس کے دل کے ایوانوں میں اترتی تھی۔

اسفندی اسے دیکھ کر قریب آ گیا۔
 ”ہیلو شامین کیسی ہو، بڑے دنوں بعد نظر کر رہی۔“
 ”اگر یہ نہیں آپ کے لیے کہوں تو۔“
 ”اوہ ہاں۔ آج کل میں کچھ زیادہ ہی مصروف ہوں۔“

”ہاسٹل کے علاوہ کوئی اور مصروفیت؟“
 ”نجانہ، ہر شے میں اس کا لہجہ دیکھا ہو گیا۔“
 ”اچھا چھوڑو، بڑی دلکش لگ رہی ہو۔“
 دیکھنے کا انداز والہانہ تھا۔ وہی انداز جو دلوں میں

غلط فہمیاں پیدا کر دیتا تھا۔

”یہ جملہ میرے سوا اور کس کس سے کہا؟“
 ”لگتا ہے آج احتیاب چاہتی ہو۔“ وہ ہنسا۔
 ”اچھا چھوڑو ناں۔ تم جیسی خوبصورت لڑکی کے منہ سے ایسی سنجیدہ اور خوفناک باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ وہ لایروائی سے کہہ کر ادھر ادھر مڑنے ہوئے بولا۔ غالباً کسی کو کھونٹ کر رہا تھا۔

”اسے ڈھونڈ رہے ہو؟“
 دل کو یقین تھا ابھی تک۔ وہ کہے گا مگر اسے بعد اچھے اور کس پرستی کی تلاش نہیں۔ میری تمام راہیں تم تک آکر ختم ہو جاتی ہیں شامین۔ تم میرے دل کا چین اور روح کا قرار ہو میں نے ہمیشہ تمہیں خدا سے مانا ہے۔ اور۔ مگر وہ کبہر رہا تھا۔

”ہے ایک جی۔ اگر اتنی تو تم سے ملاؤں گا۔“
 ”کون؟“ اس کے حلق میں کوئی چیز ٹنگ گئی جیسے دل پاتاں میں ڈھبلا جا رہا ہو۔

”تم اسے نہیں جانتیں۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ بالکل عام سی ہے مگر میرے دل کو اچھی لگتی ہے۔ پتا ہے شامین، محبت ظاہری خوبصورتی سے نہیں بلکہ انسان کی روح سے کرن چاہیے۔ اور اس سے مل کر ہر ماہ مجھے لازوال عشق اور راحت کا احساس ہوا۔

وہ اس کے جذبات و احساسات سے حادہ لہولہ چلا جا رہا تھا۔
 اور شامین کے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ سادی دنیا لگا ہوں گے سانسے ڈون ڈون۔ یہ شور مچا رہا ہے۔ ڈون ڈون اور رنگوں کا سیلاب اندھروں میں ڈوب گیا۔ ہوائیں خوشیوں کے گیت کی بجائے نوحہ سنانے لگیں۔ اور۔

”اسفندی تم۔“ اس نے کہنا چاہا۔
 ”لو دیکھو وہ اتنی۔“ ہلوا نکلیا جیسے ہو؟
 وہ آنے والی طرف بڑھ گیا۔

اور شامین نے دیکھا۔
 واقعی وہ عام سی تھی، مگر بے حد خوش قسمت تھی۔ واقعی دولت سب کچھ نہیں مگر بھی بہت کچھ ہے۔ اسفندی حد سے زیادہ مادہ پرست ہے، وہ نہ اس کا اسٹٹس بھی کم نہیں تھا، مگر وہ لمبی اڑان بھرنے لگا تھا۔ اور۔

شامین کا سر جھکا رہا تھا۔ ہر چیز بے کیف، بے مزہ اور بے رنگ ہو گئی تھی۔ جی چاہ رہا تھا، اس لڑکے کے چہرے سے یہی توجہ ڈالنے، اس مسکراتی دنیا کو آگ لگا دے۔ جب دل میں آگ لگتی ہے تو خود کو بھی فنا کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ سب ختم ہو جانا چاہیے یہ دنیا اپنی جگہ کیوں قائم ہے۔ یہ جگہ کتنے ستارے یہ مسکراتا چاند یہ درخت، پھول اور پتے، اس نے بظاہر آنسو اپنے آنچل میں جذب کر لیے۔
 وہ انیلا کو اس کی طرف آ گیا۔

”انیلا! یہ شامین ہیں، جویریہ کی دوست اس حوالے سے میری بھی دوست اور شامین یہ انیلا ہے میری سب کچھ۔“

شامین کے لبوں سے آہ نکل گئی کبھی یہ جملہ وہ خود کے لیے سننا چاہتی تھی، مگر وہ اس شخص کی بل بول کی لفاظی کو زندہ نہ سمجھ سکتی تھی، خود سے اسے منزل سے بغیر کر بیٹھی۔ اور۔

”ہیلو کیسی ہیں آپ؟“
 انیلا نے ہاتھ ملائے کو ہاتھ بڑھایا اور اس کی کلائی میں کچھ کی سرخ سرخ جوڑیاں جھڑنگ بجاتی جھنگائی جوڑیاں۔ یقیناً اس نے یہ جوڑیاں اسفندی کی پسند سے پہنچی ہیں۔ اور۔

”فاتح!“ وہ فحش ہونٹ ملا سکی۔
 ”اسفندی نے کئی بار آپ کا ذکر کیا ہے۔“
 ”مگر اسفندی نے مجھے آپ کا ذکر ایک بار بھی نہیں کیا۔“
 وہ ایک دم ہی پتھری پڑی۔ اور جویریہ کے قریب آ گئی۔

”تم کہاں سے آ رہی ہو؟“
 ”اسفندی محبت سے مل کر۔“ اس کے لبوں پر سلیقہ سے کراہٹ تھی۔

”ارے چھوڑو۔ وہ کہاں سنجیدہ ہوتا ہے۔“ جویریہ بولی۔

اور شامین نے بے دردی سے آنکھوں کو سلی ڈالا۔
 کاش وہ یہ پہلے جان جاتی۔ اس شخص کی فطرت سمجھ جاتی۔
 ”شامی! ایک بات کہوں۔“

”ہوں۔“

”اب تم بھی شادی کر لو۔“

”ہاں تہا ری شادی جو ہو رہی ہے۔“
”یہ میرا غلط فہم تصور ہے شادی، زندگی میں بعض لحاظ ایسے آتے ہیں جب ایک جیون ساتھی کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور۔“
”تہا ریہ فلسفہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس کی اس کی سمجھیں سرخ تھیں۔“

”یہ فلسفہ نہیں ہے جان۔ اس پر سنجیدگی سے سوچو۔ وہ تہا ری بھائی کا جانی ہے ناں۔ خوبصورت باوامی آنکھوں والا۔ تہا ری جوڑی اس کے ساتھ خوب جگے لگی اور۔“

”اب تم جوڑیاں ملانے بٹھ گئیں۔“
”اس نے اندر بڑھتی دھڑکیوں کو نظر انداز کر کے سر جھٹکا۔“

”علی کے متعلق سوچنا ضرور شادی۔“
”تھیں علی سے اتنی دلچسپی کیوں؟“ وہ جھنجھلائی۔
”مجھے اچھا لگا تھا شادی، تہا رے لیے۔“
”اچھا۔“ اس نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔
”شرم کرو۔ دلہن بنی ہو اور یوں پٹر پٹر گول رہی ہو۔“ اس نے سوزور بدل دیا۔

اور پھر جوہر کی رخصتی کے بعد اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا۔ ہر چیز سے جیسے دلچسپی ختم ہو گئی کسی چیز میں دل نہ لگتا۔ نہ چاندک چاندک بھائی۔ نہ چھوٹی کی خوشبو۔ ٹھنڈی ہوا میں بدن میں آگ لگا دیتی تھیں۔

وہ اندر کی پیش گوئی گھونٹ گھونٹ دل میں اتارتے کبھی کبھی بے حد و مشقت زدہ ہوا کرتی۔

”اسفند۔ تم کتنے ظالم نکلے، کتنے دغا باز اور کھٹور۔ مانا نام تم مجھ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا مگر بعض اوقات جذبے الفاظ کے محتاج نہیں ہوتے، تہا ری بے وفائی تم مجھ تباہ کر دیا اسفند اور میں تہا را گریبان میں نہ پڑ سکی۔ خدا کرے تم بھی کہیں جیون نہ پاؤ گے۔“

وہ اس کے بعد دغا نہیں دینا چاہتی تھی مگر دل دہائی دے رہا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ دن بیتیے کا نام ہی نہ لیتے۔ کبری کی بھی شادی ہو گئی۔ اور وہ تباہ کر کر کرانی چلی گئی۔ وہیں یونیورسٹی میں ملازمت بھی کر لی اور غلط فہمی اسخ دی میں مصروف ہو گئی۔
اب کے سادوں آتا تو اس کی دم ہم اس کے لیے عذاب اور آفتیں لے آتی۔ اس کی بے گلی اور سناٹوں میں اضافہ ہوتا گیا۔
اگر کہیں بااذا سے ملتا تو وہ دل کا جیون خرید لاتی۔ اور۔

مجھ سے مسلسل دم جم کا سامنا تھا۔ چھوٹے بچوں اور دوستوں پر برستی بوندوں نے ماحول کو دھلا دھلایا کر دیا۔ بہت نکھر نکھرا۔

اور بالائی میں جھی شامیں کو یاد آ گیا۔ اسفند سے اس کی ملاقات بھی ایسی ہی تھی رشت میں ہوتی تھی اور کمرے میں سلمان علوی کی خوبصورت آواز مزید اداسیاں بکھیر گئی۔

”اجنبی شہر کے، اجنبی راستے
میری تنہائی پر مسکراتے رہے
میں بہت دیر تک بیٹھی چلا کر
تم بہت دیر تک یاد آتے رہے۔“

”سلو شامیں۔“
”انگل اچانک علی اندر آ گیا۔
اور وہ بہت عرصے بعد اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔“

”ہائے کیٹین!“
”کیسی ہو؟“
”اس کی باوامی آنکھوں میں ہلا کی دلکشی تھی۔“
”فاش!“
”کیا فاش ہونا اسے ہی کہتے ہیں۔ یہ تنہائی۔ اور یہ چار دیواری۔ کو نسا رنگ بال رہی ہو؟“
”یہ میرا فاق معاملہ ہے کیٹین۔“

وہ ایک دم پریم ہو گئی۔
”تہا رے ذاتی معاملے میں مداخلت کی مجھ غریب کو جرات کہاں، مگر یہ تباہ و بیکار اتنی اداس کیوں رہتی ہو۔ اور یہ اداس اداس گیت۔“ وہ دستانے اُتار کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیوں ایسے گیت سننا بڑی بات ہے کیا؟“
”نہیں بڑی بات بھی نہیں، مگر ایسے گیت سننے کا کوئی مقصد بھی نہیں، دلچسپی بھی سب بد طور میں ملتی رہتی ہیں، تم نے دنیا سے جوگ لے لیا۔ بہت فنی فنی ہو رہی ہو کیوں آتا جانا بھی چھوڑ دیا۔ بھلا ایسے زندگی گزار پاتے کی؟“

”ہائیں اس سے مطلب، میری زندگی ہے۔ جیسے چلے گزروں۔ اس کی ہٹ دھرمی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔“

”ہاں تہا ری ہی زندگی ہے۔ باقی سب گھاس کھوٹتے ہیں۔“

”اس نے شیتے ہوئے بات اڑائی اور بالائی میں اس کے برابر آن ٹھہرا ہوا۔ اس نے تھیلی باہر پھیلانی۔“

”غصہ دھتھلی پر بوندیں آن گئیں۔“
”شامیں نے اس کے تھامے کو دلچسپی سے دیکھا۔“
”کیوں نہیں ایسی حرکتیں کرنے میں مزا آتا تھا میں پوچھا ہوں شامی۔ وہ ہنسی مسکرائی، شوخ شامیں کہاں گئیں اسے کہاں چھا دیا ہے تم نے۔ اور یہ سمجھ رہی لوکل کون ہے جو اس کی جگہ لے بیٹھی ہے اور۔“

”بوریت کر علی۔“
”اور جو تم سب کو بھڑکاتی تھی میری ہو۔“
”میری فاق سے کم از کم کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی۔“
”وہ باہر لان کو گھوڑنے لگی۔“

”یہ تم اس بند کمرے میں مقید رہ کر کیسے کہہ سکتی ہو ذرا باہر نکل کر اپنے والدین سے پوچھو کیا انہیں تہا ریلوں فکری میں جانا لطف دے رہا ہے، اپنے بھائی اور بھائی سے پوچھو کیا وہ تہا رے اس طرح جوگ لیتے پر غصہ نہیں جاباب دو شامیں، تم ایسا کیوں کر رہی ہو۔“

”علی نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔“
”مجھ سے اس لیے میں بات عدت کرو۔ اور تم کون ہو اس طرح میری توہین کرنے والے۔“

”کیا تم سوچ سکتی ہو کہ میں تہا ری توہین کروں گا؟“
”شامیں کے چلے نے اسے دکھ دیا۔“
”پلیز کیٹین مجھے تنہا چھوڑ دو۔“
”وہ ہلے سے چھوٹی تھی۔“

”سوچ لو کہیں یہ تنہائی کے ناگ تھیں ڈس ڈس کر نپلا کر دیں۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ ان تنہا ہوں سے گھر کر تم آؤ اور کوئی نہ سو۔ اپنے ارد گرد لوگوں کو تلاش کرو مگر کسی کو نہ پاسکو، تب وقت تہا ری گرفت سے نکل چکا ہوگا۔ اور ایک بات کہوں شامیں۔ اضافی زندگی اور حقیقی زندگی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جب تم خود اس تنہائی سے نکلنا نہیں چاہو گے تو کوئی نہیں اس تنہائی سے نہیں نکالے گا۔ جھلا کسی کو کیا مصیبت پڑی ہے، اس دنیا میں ہر کوئی اپنی دنیا میں مگن ہے۔ اور یہ چلے جاؤ پلین۔“

”اس نے کالوں پر ہاتھ رکھ دیے۔“
”اور وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔“
”وہ دیر تک روتی رہی۔ باواؤں کے ساتھ تھکا س

”کی سمجھیں بھی برستی رہیں۔“
”دل تسلیم کر رہا تھا۔ علی کی باتوں میں بھائی ہے۔“
”حقہ حق ہے۔ واقعی تنہا میں اس نے خود مول لی ہیں۔ ایک شخص کے پیچھے اس نے خود کو برباد کر لیا۔ جس سے اس کے کوئی وعدے وعید نہیں تھے، نہ ہی قول و قرار۔ وہ ایک سراب تھا۔ اور یہ جاننے کے باوجود وہ اس سراب کے پیچھے خود کو تباہ کر رہی ہے۔ اس رستے پر اس کے پاؤں کب کے ٹوہ لہان ہو چکے۔“

”اب یہ سب ختم ہونا چاہیے۔ اس نے خود سے اس شخص سے نفرت کی تھی۔ اپنی خاطر اس نے اسے دل میں جگہ دی تھی، پھر اس شخص کے لیے وہ خود کو کیوں تباہ کر رہی ہے۔ اپنی حماقت پر زندگی کے کیوں منہ موڑ رہی ہے۔“

”ان سناٹوں کو اس نے ناحی گلے لگا لیا۔“

”اس نے کہیں پرٹھا تھا۔“
”یا تو کسی کو اپنا نالو۔ یا کسی کے بن جاؤ۔“

”اور وہ بے شجاعت دلکش باوامی آنکھوں والا علی۔ وہ کب سے اس کا منتظر ہے۔ وہ بے ریا شخص، وہ بے حد غصہ اور کھرا بندہ۔ وہ بنا کسی صلے کے اسے چاہتا آ رہا ہے۔ کھری چاہتیں وہ ہوتی ہیں جو اپنا آپ متوالیں، جو دیرانوں میں کلیاں کھلا دیں، جس سے تنہا یاں مسکرا دیں

اور۔
نہ پائی۔

وہ اپنے کے سلتے اکٹری ہوں، وہ خود کو پہچان
یہ وہی ہے، اتنی زرد، اتنی ویران آنکھوں والی۔
"ان تنہائیوں سے گھر اگر تم آؤ اور ان کو ترسو گی۔"
اس کے کان کے قریب علی کی آواز بھری۔
اور وہ بال سمیٹ کر ایک دم ساری بیٹھیاں

چھلانگ آئی۔
وہ سامنے کین کی کرسی میں بیٹھا کسی سے فون پر
لگا تھا۔ پھر وہ فون رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"کچھ مدت کہو میں جا رہا ہوں، میرے سیانچلر
پر جانے کے آؤ، یہیں دو کوشش کروں گا۔ آئیو ہتھاری
ذاتیات میں مداخلت نہ کروں۔"
اس نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا حالانکہ
وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔
وہ تیز تر قدموں سے باہر نکل گیا۔
"تم کیوں پھرتی ہو؟" بھائی نے چونکا یا۔

"کیا بات ہے؟"
"میں بہت تنگ گئی ہوں بھائی؟"
وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر سرسک پڑی۔
"بھائی! مجھے لگتا ہے جیسے میں کسی گھر میں تنہا ہوں،
یاس ہے تنہائی ہے، اور تنہائی کے غمزدگی مجھے لنگل
رہے ہیں۔ کیا میں ساری عمر اس دشت میں ابلے رہا کرتی
رہوں گی۔ اور یہ ریت مجھے چاٹ جاتے گی؟"
"تم تنہا کہاں ہو چکی۔ ہم سب تمہارے ساتھ
ہیں۔" بھائی نے اس کے بال ملوڑے۔

"بھائی! میں علی سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر
اس نے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں اس سے
اپنی نادانی کی معافی مانگنا چاہتی ہوں، میں نے اسے
بہت اذیت دی، اس کا دل دکھایا اور وہ چلا گیا
بھائی اور۔"

گتے ہی ستارے اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر کھنکھن
گئے۔
"کہاں جانے گا وہ، لوٹ کر نہیں آئے گا تمہارے
پاس، پھر اس پر اپنی دلی کیفیت آشکار کر دینا۔ محبت

کے معاملے میں بھلا اس جیسا کوئی ثابت قدم ہو گا تمہارا
لیے وہ کیسا سر پھر ثابت ہوا ہے، تمہارے انکار کے
باوجود اپنی راہ سے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اور۔"
"بھائی! اس کو تیری سے رواں ہو گئے۔"
"وہ سیانچلر گفٹرز۔"

"مجھے بتا کر گیا ہے۔ اور تمہارا خیال رکھنے کو کہا
ہے۔ جلد نوٹ آئے گا وہ۔ بھائیوں نہیں لوٹے گا۔
ایک دیوانی شدت سے اس کی نظر ہے۔"
"بھائی! بے یار سس اس کی ناک دبا دی۔
پھر سادوں کی وہ رائیں طویل ہو گئیں، بہت بے یقین
بے رنگ۔ مات بھر بوندیں برسیں اور اس کی وحشتوں
اور تنہائیوں میں اضافہ کر جا رہی۔ وہ رہ کر تصور میں اس
شخص کی پیمائشیں باوادی اکٹریں لہا جا رہی۔
اب اس کے اندر کوئی دوسرا نہیں تھا۔

"کیسے ظالم ہو رہی تھی۔ نہ کوئی خطہ نہ فون، کیسے
غیب ہو رہی۔ کیا محبت کرنے والے لوگ تڑپتے ہیں؟"
اس نے بے دردی سے اکٹریں سل ڈالیں۔
وہ ٹیس پر بیٹھی گیٹ کو دیکھتی رہی۔ ڈلیکٹورا
گمان ہوتا تھا کہ اس کا خط ہو، مگر اس کا انتظار
ہی رہتا۔ بادلوں کے ساتھ اکٹریں برس برس پڑیں۔
"تم ان آنکھوں کے تسو کو جھٹکا چاہتے تھے علی!
مگر یہ آنسو اب تمہاری وجہ سے ہیں۔"

اس کی طرف نہیں بھی شریک تھے، یہ بے تحاشا
کھلے بھول، درختوں کے لہلہاتے پتے، برسی بوندیں
اور خوشبوؤں سے لدی ہوائیں۔
اور تب برسی دم جھم میں نیو نو کی آواز میں

پیش بڑھائی۔
"جو بچ پوچھو تو ہم تم زندگی بھر رہتے آئے
ہمیشہ بے یقینی کے خطرات کا شکار آئے
ہمیشہ خوف کے پیر ہوں گے اپنے ہی گھر پر۔
"یہ وہ راستہ ہے جس پر ہم پہنچ جاتے ہیں!
جہاں بے جا کہ پھر کوئی بھی واپس نہیں آتا
چلو اس کو۔"

اتنی شدت سے کیوں چلا بھی گئے کہ ابھی کے بعد پل
پل گزرا دو بھر ہے۔

وہ پتیلیوں میں چہرہ دیے۔ بیٹنی، بھلنے کب
اشک آنکھوں میں آگئے۔
تبی ڈالیا آگئی۔ خطیمیت۔ اردہ فون، جسے سننے
کے بعد بھائی پچھا "تس کھا رہی تھیں۔"
اور اس کی وحشتیں طویل ہو گئیں اس کی تنہائیاں
نہروں بن گئیں۔

"ان تنہائیوں سے گھر اگر تم آؤ اور ان کو ترسو گی۔"
بے حد چمکیل وکشل باوادی آنکھیں تسو میں اکٹریں۔
اب ان راہوں پر دھول اڑنے لگی، اب ان رستوں
پر چل کر کوئی اس تک نہیں پہنچے گا۔ وہ اس کے آنسو
پر چھنے کی مثال پر چشمہ کے لیے چلا گیا۔ وہ اس کے
لبوں سے اعتراف محبت سے بغیر نہ ہو گیا۔

نہیں وہ زندہ ہے۔
شہید بھی مرا نہیں کرتے۔ وہ اس سے ہے۔
دل وحشی ویران جنگلوں میں نکل جانا چاہتا تھا۔
"یہ وہ راستہ ہے جس پر ہم پہنچ جاتے ہیں!
جہاں بے جا کہ پھر کوئی بھی واپس نہیں آتا

وہ تیز بارش میں چمکتی رہی۔
اب اس نے زنگ میں نہ بڑھنے کو کہا۔ یہاں وہ جس
نے سننے کی اس دلائی وہی نہ رہا پھر۔ پوچھل سانس
کس لیے، کس کے لیے یہ زندگی، اور یہ زندہ رہنے کی
اسیہ کشا اچھا ہوتا۔ جب علی کی سائیں رکیں، تب
اس کی سائیں بھی بند ہو جاتیں یہاں وہاں ہر طرف
اندھیرا ہے، کہیں روشنی کی کوئی کرن باقی نہیں رہی اور۔
"یوں بادش میں چمکتے رہنے سے بیمار بڑھاؤ گی
نادان لڑکی۔ اور میں ابھی سے تمہارا خیال رکھنے کو کہہ
گیا تھا۔ یہ خیال رکھا انہوں نے؟" شامین کے کانوں
میں علی کی مائوس آواز بھری۔

وہ دلال آنکھوں سمیت اس نے چونک کر دیکھا۔
برسی بوندیں اس کی پیٹھ کا دھوکہ تھا۔
"کیوں سننے آجاتے ہو مجھے؟" اس نے مسکرائی۔
"اور جو تم نے سنا۔"
تیس اس کے بازوؤں پر مضبوط آنکھوں کی گرفت
نے اسے احساس دلا دیا۔ وہ زندہ و تاملہ باوادی
آنکھوں والا اس کے بے وقوف تیب ہے۔ انا کہ وہ

ہاتھ بڑھا کر اسے چوم سکتی ہے اور۔
"علی! تم، شامین نے بے اختیار اپنی انگلیوں سے
اس کے چہرے کو چھوا۔
"میں زندہ ہوں، تمہارے لیے بچ نکلا۔ دشمن
کی گولی لگی مگر مجھے جاٹ نہ لگی۔"

وہ اس کے ناکل قریب کھڑا تھا۔
"اس دن تم کچھ کہنے سے بغیر چلے گئے تھے اور۔"
وہ اس کا ہاتھ تمام کر سسک پڑی۔
"علی! اگر تم نہ آتے تو ان سانسوں کا بوجھ مجھ سے
مزیدا اٹھایا نہ جاتا۔ میں بے وقوف بھی جو میں نے؟"
"میں سب جانتا ہوں یاں پرانے قے جانے دو۔
تمہیں معلوم ہے میں محبت کے معاملے میں خاصا فزاعزل
واقع ہوا ہوں۔ اور تمہارے لیے اس دل کے دروازے
ہمیشہ کھلے ہیں۔"

"علی! تمہارے بغیر مجھے یوں لگا جیسے میں اس دنیا
میں بالکل اکیلی ہوں۔ تنہا ہوں جیسے سب ختم ہو گیا۔
اور جیسے میرے اندر گئے زخم بھی مندمل نہیں ہوں۔
گئے۔ مجھے ایک سیمائی ضرورت تھی۔ جو مجھے چھو لے
اور میں زندہ ہو جاؤں۔ وہ سیمائی ہو علی۔ اور اس کے
لب کا پتہ ہے۔"

"اے اتنی اچھی اچھی باتیں کرنے لگ گئیں اس
کا مطلب میری جدائی ہے نہیں عقل سکھا دی؟"
اس نے اس کی آنکھوں کے ستارے اپنی انگلیوں
کی پوروں میں چن لیے۔

"اب جلد نہ ہونا ورنہ میری جان نکل جائے گی؟"
"اب یہ جان آپ کی کہاں رہی بیٹا؟ بھاری سی گئی۔
بہت کٹھن مہم تھی جو مادیولت نے سر کی؟ اس کی
باوادی آنکھوں میں بے تحاشا دلکشی تھی۔
وہ ہنس دی۔ اور اس کی مضبوط پتیلی پرانا نانا کی
سا ہاتھ رکھنے اسے احساس ہو گیا۔ اس سیمائی کے چھو لینے
پر وہ سچ زندہ ہوئی ہے۔"



مرحومہ کا احیاء

داؤد تو نگہ کر کے بے وقت موت خاندان پر ایک بچی بن کر گریختی تھی۔ میں صبح کے جہان سے چلم میں شرکت کے لیے پہنچ گئی تھی، یہاں آکر دیکھا تو گھر کی رونق ایک رنگ کا تھی۔ پر موقوف تھی۔ دور کیا دیکھ کر قریب دیکھنے والوں کو بھی شادی کا گمان ہوتا تھا۔ باہر سے طرف شامیانے نکلے ہوئے تھے۔ اور شامیانے نکلنے والوں سے چھوٹے پھوپھیا کی لڑائی جھگڑائے کی آواز صبح سے پہلی خطرے کے سائرن کی طرح مسلسل وضائیں گونج رہی تھی، شامیانوں کے نیچے داؤد تو نگہ روم کے عقیدت مندوں اور خزانوں کو بچانے کے لیے لمبی لمبی قالینیں بچاتی جا رہی تھیں۔ قالینیں بچانے والوں کی کام چریوں اور گستاخیوں پر بڑے ماموں شعیب نے ایک وفد اتار دیا کہ اگر وہ پولیس کو بلائے کی دھمکی نہ دیتے تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے، اور ہرجلی والے بچلی کے گھمبول دیواروں اور درختوں پر صحرانی بندروں کی طرح اچھل کود میں لگے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچا مار بار بلب ٹوٹنے کی آواز پر چونک کر وقفہ وقفے سے انہیں بھی اس زور سے ڈانٹتے تھے کہ ایک وفد بچلی والے مارے غصے کے نشانہ بنا دیکھ کر ایک بلب ان کی طرف اس طرح مہینکا تھا کہ اگر چھوٹے بچا خود اتنے بڑے نشانہ باز نہ ہوتے اور بڑی بھڑکی سے سر تر چھا کر کے اپنے آپ کو بچانے لیتے تو ان کی ناک بڑ سے علیحدہ ہو جاتی۔ مزید برآں سر علیہ چلنا چور ہو جاتا۔ اور دماغ انک پاش پاش۔

جمہوریت میں یہی نوعمری ہوتی ہے، ہر آدمی کو اپنا حق مل جاتا ہے، آزادی ہوتی ہے، اور محمود و اباباذ ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ مغرض کام بڑی باقاعدگی اور تنظیم سے ہوتا تھا۔

اور ہر بڑے ماموں شعیب بڑے ہی در بادل واقع ہوئے تھے۔ ویسے وہ کفایت شعار بھی تھے مگر محض صرف اپنی جیب کی مدد، دوسروں کی دولت کو ہٹانے میں انہیں جو تلف آتا تھا اور کسی بات میں نہ آتا تھا۔ لہذا انہوں نے داؤد تو نگہ کی روح کو ڈاب بچانے کی کوشش میں انواع و اقسام کی ترکیب استعمال کی تھیں۔

سارے ملازمین اور شاگرد پیشے کے ایک ایک فرد کو ایسے اعلا باس سلوا کر دیے تھے کہ انہیں بہن کرنا بالکل بچانے ہی نہیں جاتے تھے کہ بندہ کو کون ہے اور شہر کون ہے؟ سارے کے سارے ہٹاش لٹاش اس تیزی سے چلت پھرتے، دور بھاگ میں مصروف تھے کہ ان کی اس بھڑکی کی وجہ سے کوئی کام ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے ہر چیز بڑے قریب سے ہوتی تھی، ایک طرف ریکارڈ پر داؤد تو نگہ کی یادیں مٹنے سے پہلے ہٹانے کے نیک اعمال کا پرچار کرنے والے متعین ہاتھوں میں کواکول کی اور لائی رنگ کی بوتلیں تھیں۔ بچلی کے تاروں کو صبح اور غلط سوراخوں میں لگانے اور نکلانے میں یوں مصروف تھے کہ جب میں نے اوپر کی منزل سے چمکی تیار کی دیکھنے کے لیے نیچے باغ میں جھانک کر دیکھا تو بعض حضرات کھڑے کھڑے زمین پر یوں قدم گر رہے تھے جیسے ٹوسٹ کر رہے ہوں۔ اور بعض بچے کو گم کر چکی کے تاروں اور سوراخوں کو یوں دیکھ رہے تھے کہ راک این رول کرنے کا شبہ ہوتا تھا۔ دراصل غم بڑی گہری چھڑے اور وہ بھی اپنے پیادوں کی دائمی جدائی کا سرسریکا ہوش نہیں رہتا کہ ہم کی کر رہے ہیں اور کس انداز میں کر رہے ہیں۔

داؤد تو نگہ کو کثیر قریب و بعید کے عزیز و اقارب کو ملا کر بہت بڑا کنبہ تھا۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہے، بڑے کنبوں میں مختلف مزاج اور جبلت کے لوگ



عزاداروں اور کام کرنے والوں کی چیخ و پکار، شور و غوغا سے کان پڑی آواز سانی نہ دیتی تھی۔

شدت رقت سے اکثر لوگ، شل چھوٹے پھوپھا اور بڑے ماموں ناک اس زور سے صاف کر رہے تھے جیسے بادل گرج رہا ہو، کئی کے ہاتھوں میں رومال تھے جس سے انہیں اور منہ صاف کر رہے تھے۔ کیونکہ گل خشک ہونے کی وجہ سے کشش و باوام منہ میں ڈال کر جلدی جلدی چہا رہے تھے۔ کئی غم خوار ایسے تھے جو سیون آپ کی

سے جاتے ہیں۔ امیر عزیز، شریف، کینے رہے و توف، نقل منہ، شیخی باز، چنل خور، فضول خراج، مکتی جوس، ہمارے مسکین، عزمن اس خاندانی گلدستے میں رنگ رنگ مہول تھے، اور سب کے سب آج یہاں موجود تھے، افراد ن لوگوں کی تھی جو غم سے ٹھنڈا شامیانوں کے نیچے بے تاشا کر رہے تھے۔ اور مصروف ماتم تھے، تو ریط اب وہ تھے جو باوجود غم کے اپنی توفیق کے مطابق اپنی پسپائی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ چنانچہ ان

تو نہیں ہاتھ میں پکڑے دریا سے غم میں غوطہ زن دیوار سے
چپ چاپ ایک لنگے بت کی طرح کھڑے تھے غم انسان
کو مفلوج کر دیتا ہے۔
بہر ایک ہنگامہ ہر باغ تھا تو اندر بھی ایک فائدہ جنگی
باغ تھی۔
چھوٹے پھوپھا بارہ بجے کے قریب کا اور غم سے بھرا
انداز آئے، شامیانہ والوں سے لڑائی کے بعد ان کی آواز
اور ہمت لست ہو گئی تھی، تکان کو دفع کرنے کے لیے
چلوڑوں سے بھری ہوئی ایک مقامی ان کے ہاتھ میں تھی،
اور وہ رہ رہ کر انہیں کھارہے تھے۔
ایک آہ صبر کے چھوٹے پھوپھا بولے: "آہ۔ دن کیسی
جلدی۔ چلوڑے کا خول سامنے کے دانتوں سے توڑتے
ہوئے (اڑاڑاتے ہیں۔ دچاتے ہوئے) چالیس دن
رچلوڑہ لنگل کر لگا کر اچھٹم زدن میں گزر گئے۔"
وہ مھمل ہو کر ایک تخت پر بیٹھ گئے اور چلوڑے
چیلنے میں مصروف ہو گئے۔
بڑے ماموں شعیب کو ہمیشہ دوسروں کا جیب خالی
کر کے فرحت حاصل ہوتی تھی، چنانچہ پوچھنے لگے۔
"میں نے دو شامیانے احتیاطاً اور نکلانے کو کہا تھا۔
وہ نکلانے تم نے؟ اور بجلی کا کام خاطر خواہ ہو گیا؟ میرا
خیال تھا کچھ محن میں بھی لال مروچیں جیسے بلب بلبوا
لیتے تو رون سوجائی شان ہدایات و سولات کے فورا بعد
انہوں نے کو کا کو لائی بول میں بچے ہوئے قطور، یاہوں
کیتے تلچھٹ کو ملتی ہیں، بڑھاپے کے لیے اسے منہ سے نکال
کر سر پیچھے زمین کی طرف کچھ منور سے زیادہ ہی کہ
دبا دتی ہی تو غصے سے گرتے بچے، مگر شکر ہے سب خال
لیا اپنے آپ کو۔
پھوپھی زیتون ازل کی کنوئیں اس وقت وہ ایک
پرانے جھاڑن کو دوسرے پرانے جھاڑن سے گروہ سے
کر بانڈے میں منہمک تھیں، کیونکہ انہیں تشویش تھی کہ
اگر دونوں جھاڑن باندھ نہ دیے جائیں تو ملازموں کی
بے پروائی سے ان میں کا ایک جھاڑن گم ہو جائے گا۔
بڑے ماموں کے سوال پر زرد متوش ہو کر بولیں: "کون
سے شامیانے اور بجلی کا کام کیا ہے؟"
بڑے ماموں شعیب کو کا کو لائی بول زور سے ایک
میز پر رکھتے ہوئے: "تمہ دانا گوارا سے بولے۔"

عزاد اردن کو بچانے کے لیے جگہ جاپیے یا نہیں؟
"ہے۔ بولتی تم نے اس بید روی سے پتی ہے؟
اس کے دو ٹکڑے ہو جاتے تو کم بخت و کا نذر دور رہا
ہو لیتا پھوپھی زیتون نے فوراً بولن ہاتھ میں تھا آلی
پوچھا: کیا کہہ رہے تھے؟"
"عزاد ارکون؟"
چھوٹے پھوپھا چلوڑوں کے خالی خول ہوا میں
ہوئے تلخی سے بولے: "آخر کھانا کہاں جھاکر کھلاؤ گا؟
"میں نے انتظام کر لیا تھا۔ پھوپھی زیتون نے فوراً
کہا: پیل کے پٹیکے نیچے گیارہ سکینوں کو آرام سے
کر جیکے سے کھانا کھلاؤ گے، تاکہ سر جو کم روح کو
پہنچے، یہ کہتے ہوئے وہ انور و مال سے خشک کر لے
لگین۔ دادا تو نگرے انہیں بڑی محنت تھی۔
بڑے ماموں طیش میں آگئے: "بچہ شرم کر و پیل
کا پیر اور گیارہ سکین؟ (حقارت سے) ہوں۔ اارے
اتنا تو سوچو زیتون۔ دادا تو نگر کس عظیم شخصیت کے
ان ان تھے۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے ہلم
میں بھی ایک عظمت ہونی چاہیے؟
"مجھے چچا ہمیشہ ڈنک مارا کرتے تھے۔ بولے "فرد
ہونی چاہیے عظمت۔"
پھوپھی زیتون غصے کو دما کر بولیں: "یہ تم لوگوں نے
عظمت، عظمت کی کارٹا رنگا دی ہے، میں پوچھی ہوں
عظمت فلاہر کرنے کے کیا کیا طریقے سوچ رکھے ہیں تم
لوگوں نے؟"
بڑے ماموں انگلی کے ذریعہ زور زور سے کان
صاف کرتے ہوئے کہنے لگے: "خیر خیرات یتیموں میں
کو زکوٰۃ، فقہوں کو کپڑے۔ (کان کی کھجلی بڑھاتی
تھی، اس لیے وہ زور زور سے جھٹکے دے رہے تھے)۔
بس ایسی ہی باتوں سے عظمت (زور سے کان پر دھکا
ظاہر ہوتی ہے) اور روح کو خواب پہنچتا ہے۔"
"مجھے چچا بولے "مزید برآں مرثیہ خوانی زور کر
کرائی جاتے اور بڑے ماموں بولے: "اور رات کو
کھانے کے بعد ایک مھل میلاد منعقد ہو۔"
"مجھے چچا بولے "دکھیری چائے سب سے آخر میں
رکھی جاتے۔"
بھول بھالی بارہ سالہ نازی نے رائے دی: "کیوں"

آتش بازی چھوڑی جاتے تھے چچا؟"
پھوپھی زیتون پیسے ہی آگ بولہ ہودی تھیں یہ
سننا تھا کہ بے قابو ہو گئیں، ہاں ہاں بڑے شوق سے
تم لوگ اس موقع پر بے جا بڑوں کا نمنا بھی کر ڈو رکھنا
کھی بچاؤ اور دل کی حسرتیں نکالو، میں پوچھتی ہوں روح
کو خواب پہنچانے کے یہ جوتے ہیں دھندلے؟"
چھوٹے پھوپھا ازل کے چوڑے انہیں ان باتوں سے
دلچسپی نہ تھی۔ ان کا حسن و الفہم چھ اور چاہتا تھا چلوڑے
چیلنے سے بولے۔
"اچی اٹھا رکھو ان ساری باتوں کو۔ اصل چیز کا تم لوگ
ذکر ہی نہیں کر رہے۔"
"ہاں ہاں تم بتاؤ۔ اصل چیز سے کیا مراد ہے؟
بڑے ماموں کان میں انگلی دیکھ پوچھنے لگے: "شاید کان
کی کھجلی کم ہو گئی تھی، تاہم احتیاطاً انہوں نے انگلی سے
کان مبارک کھتا۔
"اصل چیز کیا؟ مجھے چچانے سوال کیا۔
"دیکھیں، چھوٹے پھوپھا چلوڑے کے خول ہوا میں
بکھرتے ہوئے بولے: "عظمت تو وعدہ کھانے سے ظاہر
ہوتی ہے، اس لیے رنگیں چڑھتی چاہیں ونگیں۔"
پھوپھی زیتون کے ماموں کے طرے ٹوٹنے جھلا کر
بولیں: "یہ رنگیں کیا دیک کر؟"
اس بحثا بحث میں اچانک میری نظر پھوپھی زیتون
کے عجیب و غریب لباس پر پڑ گئی۔ مجھے ڈر تھا اب وہ تازہ
ہو کر نہ بھر جائے، ایسے عار تا وہ ہمیشہ بوسیدہ لباس پہنا
کرتی تھیں۔ مگر انہوں نے حد ہی کر دی تھی۔ چنانچہ
میں ناراض ہو کر بولے۔
"پھوپھی زیتون! یہ آپ نے کیا کات بنا رکھی ہے
اپنی؟ کوئی دیکھے تو کیا کہے؟"
"میری ملا سے کچھ گئے۔ وہ غصے سے بولیں: "تمہارا
مطلب ہے جو بھی کاجوڑا پہن کر کروں انتظار کھائی تو نگر
کے چلم کا؟ تمہیں کیا ہے تلخی باتیں کرتی ہو میٹھی روی سکھا
عجیب نظر آیا تم کو میرے کپڑوں میں؟"
"مجھے چچا ہمیشہ ڈنک مارنے سے عادی تھے، منس
کر بولے۔
"کہہ طے کیوں کہتی ہو، جھار میں کہو کوئی دیکھے تو
تقریبی کا شبہ کرے؟"
میں برآمدان کر بولی: "خیر مجھے کیا مت بدلے کیسے
دیکھنے والوں کو بول لگتا ہے آپ نے جھاڑوں کی ساری
بنا کر پہن رکھی ہے۔"
"وہ بھی پرانے جھاڑنوں کی آپاروچی۔ نازی کھلیکھا
کر مٹتے ہوئے بولی۔
بڑے ماموں ہمیشہ دوسروں کا خرچ کر دیا کر خوش
ہوتے تھے بولے۔
"کہو تو چلم ہی کے خرچ میں تم کو ایک دو چوڑے
بنوادوں، زیتون مجھے اپنے لیے سفید ریشم کی شروانی
تو بنوائی ہی ہے۔ بنوائی کیلے، بنوا چکا ہوں، کیونکہ ناکھ
پڑھنے قبرستان بھی تو جاتوں گا۔ آخر۔"
"توسہ بارانڈھ کر کیوں نہیں جاتے قبرستان فاتحہ
پڑھنے کے لیے؟"
پھوپھی زیتون کھانے والی نظروں سے بڑے
ماموں کو دیکھ کر بولیں، پھر چلا کر کہا: "اور حلوم بھی ہے؟"
"ریشم سرو کے لیے حرام ہے۔"
"حرام و حلال کی بات کرتی ہو تو سن لو کہ روح کو خواب
پہنچانا حراما فرض ہے، اس میں کوئی حرام کی بات نہیں ہے۔
میرے ماموں کان دما کر غصے سے بولے۔
"مجھے چچانے ڈنک مارا، روح کو خواب ہی پہنچانا
ہے تو پھر مسجد میں چراغاں کر ڈو۔"
"یہ چلم ہے۔ تو نگر بھائی کی شادی نہیں ہے، کہ
چراغاں کر ڈو! پھوپھی زیتون نے جلا کر کہا۔
"آپ نے آتش بازی بھی رکوا دی تھی، نازی نے
شکا یتا کہا۔
"تو مت۔ پھوپھی زیتون نے کہا۔ کان کھول کر
سن تو تم لوگ، میں مسلمان ہوں، شریعت کی پابند ہوں۔
حکم یہ آپ کے ہر چیز میں سادگی کو مد نظر رکھا جائے۔
چنانچہ میں جاہتی ہوں کہ ریشم چلم نہایت سادگی سے ادا
کر دی جائے۔ اسلام میں اتنی تانید کسی چیز کی نہیں جتنی
سادگی کی ہے۔"
"نماز کی بھی نہیں زیتون پھوپھی؟ نازی نے سوال
کیا۔
"میں نے تم سے کہہ دیا ہے نازی۔ بڑوں کی باتوں
میں مت دخل دیا کرو خبردار۔ زیتون پھوپھی نے ڈانٹا۔
"مجھے چچا ہنس کر بولے: "ڈانٹتی کیوں ہواں بچاری

نے صرف اتنا پوچھا ہے نا کہ بھی اتنی تاکید نہیں کی، جتنی سادگی کی۔“

”اے تم مشرکوں! کہو“

اتنی دیر چھوڑے پھر پھر اطمینان سے بیٹے چلوڑوں کا پشت خالی کرتے رہے۔ اب انہوں نے طشت پر سے ہاتھ بٹایا۔ خلال کرتے ہوئے ہاتھ ہاتھ بھائی تو نگر، تم تو چلے گئے اور ہم؟

”آئے بہت مایہ چلوڑے ختم کر دیے۔ چھوٹے چھوٹے آپ کے؟“ نازی نے شکایت کیا۔

”بڑوں کے معاملات میں دخل نہ دیا کرو نازی، بڑوں بڑے ماموں کے بغیر کچھ سوچے بچھے آرام سے اپنے کان کر دیتے ہوئے کہا۔

چھوٹے چھوٹا خلال کرتے ہوئے بولے خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ہاں اصل بات تو تم نے پس پشت ڈال دی زیتون۔“

”میں نے پس پشت ڈال دی تو تم سے دوبرہنہیں کرو۔ کوئی بات؟“ زیتون پھر بھی نے نفرت سے پوچھا۔

”میرا اچھا چھوڑو گئے بھی؟“ پھر بھی نے زیتون سے بے زار ہو کر کہا۔

”نہارا اچھا چھوڑو بھی دیں تو دیکھوں گا چھپا نہیں چھوڑیں گے وہ بیٹھ چائے جواب دیا۔

”تو سن لو کہ جو شریعت کہتی ہے میں وہی کروں گی۔“ زیتون پھر بھی اپنی بات پر اڑ گئیں۔

بڑے ماموں بولے تم شریعت شریعت سلوکی سادگی کی دھڑلہ ہی تو نگر یہ خاندان کی عزت کا سوال ہے۔“

”تو میرا جواب یہ ہے۔“ اچانک چھوٹے چھوٹے پھر بھی سے ایک چھلا چھلا چلوڑہ مل گیا۔ اسے بڑے متوق سے منہ میں ڈال کر جملہ مکمل کیا۔ خاندان کی عزت کا معاملہ ہے کمی دیکھیں چھوٹا بیٹا کی چھوٹے چھوٹے ہمیشہ کے چھوڑے تھے، ان کا ارادہ بچائے کن کن۔ اشیاء کی دیکھیں چھوٹے کا تھا۔ غالباً ان کی زبان پر ان وقت مرخ کی ٹانگ کا ذائقہ تھا۔

زیتون پھر بھی نے صندھی ہو گئیں۔ بلکہ بے قابو شاید تصور میں ان کی آنکھیں گھٹی سے بے شکا کھنکھارے اور

چادری کی لوریاں لٹتی ہوئی دیکھ رہی تھیں۔ چنانچہ چھلا کر بولیں۔ ”دیکھیں کیا۔“ دیگ کہو۔ کتنی دفعہ کہوں؟ اور ہاتھ پیچ پوچھو تو اب یہ ایک دیگ بھی پکائی نہ جاتے تب بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ جانے والا چکا ہاتھ ہاتھ۔

”دعا ہو، مرثیہ ہو، فاتحہ ہو، آہ و زاری ہو کوئی آواز ان کے کان تک تو جاہیں سکتی۔ یہ کہہ کر ایک پھٹا پرانا رومال آنکھوں پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

سب متاثر ہو گئے م سوائے میرے۔ کیونکہ میری نظر پھر بھی زیتون کے بوسیدہ لباس کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ میں اس مامی ماحول کو نظر انداز کرتے ہوئے ذرا تکی سے بولی۔

”خمس کے یہ معنی تو نہیں۔ کہ انسان گریبان چاک کر کے جھٹول بن جائے۔ ذرا دیکھیے تو اپنے لباس کو۔“

”تھوڑی دیر میں وادی زبیدہ آئے والی ہیں، وہ کیا کہیں گی۔“

”مخبط چھا بولے۔“ رومی بیٹی، تم لباس کی بات کر دی ہو۔ یہاں تو ناز و فغاخ کے لالے پڑے ہوئے ہیں کہتی ہیں کہ دیگ کا کیا فائدہ۔ جبکہ دعا اور فاتحہ بھی ان کے کان تک نہیں پہنچتی۔“

میں جل کر بولی۔ ”آپ کا بس چلے تو زیتون پھر بھی آپ سا گودانہ آباں کر تو نگر دادا کا چہلم اسی پر سرفا دیں گی۔ مجھے بے حد غصہ آگیا تھا۔

پھر بھی زیتون کو اپنی تکی کھٹکی نظر آئی تو بڑا مان لگیں۔ ”تو بہ رومی بیٹی تھاری زبان ہے کہ قینچی؟“

”قینچی؟ نازی نے ہنس کر کہا۔

چھوٹے چھوٹا خلال کرتے ہوئے بولے۔ ”پھر دیکھوں گی بات پس پشت جا بیٹی۔“

بڑے ماموں لال پیسے ہو رہے تھے بولے۔ ”رومی نے ٹھیک کہا تھا، کہ سا گودانہ آبا لیں گی۔ اور اسے پس کے درخت کے نیچے دو مسکینوں کو پیادگی۔“

”اسے ہے۔ بہتان ہے مجھ پر۔“ وہ چلا ہیں۔

”میں نے دو مسکین کب کہا تھا؟ گیارہ مسکین میرے حساب میں تھے۔ کیا رہے۔“

نازی زور سے ہنس رہی۔ ”رومی آپا پیل کا درخت اور سا گودانہ وہ اس کے چہرہ پر۔“

کیونکہ پھر بھی نہ تین برس پڑیں؟ حصار جو اسے کچھ کہا۔ میں نے کہا نہیں کہ بڑوں کے معاملات میں دخل نہ دیا کرو۔“ پھر ہم سب کی طرف ایک زہر خند نظر ڈال کر بولیں۔ ”تم لوگ جو جی چاہ کر دو۔ میں مسلمان ہوں۔ وہی کروں گی جو شریعت کہتی ہے۔“

”شریعت نے سا گودانے کے متعلق کچھ کہا ہے۔“ زیتون پھر بھی؟ نازی نے عرض اپنی مذہبی معلومات میں اضافہ کرنے کو پوچھا۔

”مجھے ہو گیا گیا۔ نازی بے جا رہی ہے۔ بیکے جا رہی ہے۔“ پھر بھی زیتون آگ بگولا ہو رہی تھیں۔

بڑے ماموں کے کان میں شاید میری جھلی ہو رہی تھی۔ وہ ہاتھ سے کان کو جھٹکے دیتے ہوئے بولے۔ ”تو کہو (کان دبا کر)۔

”کیوں مجھے جھٹکا کر اس کے پیچھے پڑ گئیں؟ کیا کہا بے جا رہی ہے؟“

بڑے ماموں کان مہلاتے ہوئے برآمدے کی طرف نکلی گئے۔

”یہ تھوڑی گستاخی ہے؟ پھر بھی نے پوچھا۔

”کوئی سی پھر بھی؟ یعنی پیل کے درخت کا ذکر؟“ نازی نے زرا سامنے بنا کر کہا۔ پھر بولی۔ ”یہاں تو ہرات پر ڈانٹ پڑتی ہے۔ میں باہر شامیالوں کے نیچے جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ رنگ رنگے ہیں نازی آٹھ کھڑی ہوئی زیتون پھر بھی چونک پڑیں۔ کیا چیز رنگ رنگ ہے؟“

”شامیالے؟ نازی نے جاتے جاتے چیخ کر کہا۔

پھر بھی زیتون متعجب ہو کر بولیں۔ ”شامیالے؟“

”وہ کہاں لگے ہیں؟“

”میں نے جل کر کہا۔“ صبح سے نہیں گھڑا ہے تھے چھوٹے چھوٹے۔“

”آخر کس غرض میں رومی بیٹی؟ مجھے تو کانوں کان خبر نہیں۔ چھوٹے چھوٹا کی شادی ہو رہی ہے کیا؟ کھڑکی سے باہر جھانک کر۔

”ہائے غصہ! یہ شامیالے کیوں کھڑے کر دیے؟“

”ارے میں کہتی ہوں ابھی مجھ سے بھی لے لیا کرو رائے۔“

”تمہاری رائے؟ خدا کی پناہ۔“ بڑے ماموں چڑھ کر بولے۔

”ارے تو معلوم ہو چکی۔“ چھلے چھلے طنز اسکر کر کہا۔ ”سا گودانہ پیل کا پیڑ اور دو مسکین۔“

”دو۔ دو۔ دو۔“ وہ غصہ سے دانت پیس کر بولیں۔

”یہ دو کا کچھ پر غواغواہ کا الزام ہے۔ میں نے کیا؟“

”مسکین مجھے تھے؟“

”پھر میری بات التوا میں جا بیٹی۔“ چھوٹے چھوٹے چلوڑوں کے خالی خولوں میں شاید کوئی بھرا ہوا چلوڑہ ڈھونڈ رہے تھے۔

پھر بھی زیتون دوبارہ کھڑکی تک گئیں۔ ”اور باہر شامیالوں کو جھانک کر دیکھنے لگیں، کچھ کھڑکی نڈر دی۔

”لوگو۔“ ایضاً کرو۔ مائے تم سے موقعوں پر شامیالے لگوانے جانتے ہیں کہیں؟“ لٹا دو ساری دولت مرحوم کی۔ بڑے شوق سے لٹاؤ۔ میں منع کرنے والی کون؟ چہلم ہے۔ تو نگر بھائی کی شادی نہیں ہو رہی۔“

چھوٹے چھوٹے چھوٹے خالی چلوڑوں کا طشت بڑے زور سے پیچھے کو بٹایا۔ تاؤ کھا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”بہت اچھا۔“ ابھی جاتا ہوں، سارے شامیالے اکھاڑ پھینکتا ہوں۔“

اچانک پھر بھی زیتون کی طبیعت میں ایک ٹھٹھاڑ سا پیدا ہو گیا۔ ”دیکھ لے میں بولیں۔“ ہاں۔ ہاں۔ اگر کرا یہ نہ دیا ہو تو کھاؤ دو یہ شامیالے تم لوگ فکر نہ کرو۔ سارا انتظام میں کروں گی۔“ زور دینا کچھ یاد آ گیا۔

”شامیالے اکھاڑنے کی کوئی اجرت تو نہیں لیں گے۔ کم قیمت ضرور؟“

”تو پھر تم خود ہی آکر کھاؤ پھینکو۔“ چھوٹے چھوٹے نے باہر جاتے جاتے بڑے غصے میں چیخ کر کہا۔

”اتنے میں بڑے ماموں شہادت کی انگلی سے زور زور سے کان جھلاتے ہوئے اندر داخل ہوئے، ارے یہ کس بات پر اتنا داد دیا جارہی تھی تم؟“

”بھلی والے حیران ہو کر سن رہے تھے۔“

”بھلی والے؟“ وہ حیران ہو کر پوچھنے لگیں۔ ”انہاں کمر اسے ہو؟ شامیالے تم لوگوں کو۔“

”احکام کا خیال نہ شریعت کی پابندی۔ (شہید غصہ) تم لوگوں کا بس چلے تو بیٹھا باجہ بجواؤ گے۔“ یہ کہہ کر

وہ مارے غصے کے اندر چلی گئیں۔ اور دروازہ پھٹ سے بند کر دیا۔

اسی وقت نوگز لمبی ایک پستی رنگ کی چمک دار سکاربرساتی میں آکر کھڑی ہوئی سب کے سب دریچے سے جھانک کر باہر دیکھنے لگے۔ معلوم ہوا داوی زبیدہ چہلم کے لیے پہنچ گئی ہے۔ اگرچہ کہ داوی زبیدہ سے پچھلے پچھوچا بڑے ماموں اور بھٹے چچا کا کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا بلکہ بہت دور کی رشتہ داری تھی مگر چونکہ دوا تو کمر اور پچھوچے زیتون سے ان کا قریبی رشتہ تھا، اس لیے چہلم میں ان کی شرکت لازمی تھی کئی تھی۔

کار دیکھ کر بڑے ماموں، بھٹے چچا، چھوٹے چھوچا باہر بھاگے۔ جیسے ہی دوا بیرونے کار کا دروازہ کھولا۔ سب سے پہلے داوی زبیدہ کی خاص الخاص کینز صنوبر ان کے لوازمات ہاتھ میں پکڑے کار سے باہر نکلی۔ پھر داوی زبیدہ سیاہ ریشم کے نقیب لباس میں بوڑھی کلون سو گھنٹی ہوئی کار سے اتر پڑیں۔ انہیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی کہ یہی کی تعبیل حکم میں، میں یہاں پہنچی تھی اور یہاں کی فضا سے آگاہی ہوئی تھی۔ چنانچہ دوڑتی ہوئی باہر آئی، تسلیم داوی جان پیاری۔ میں گورنش کے لیے جھکی اور ان سے چہلے کا رازادہ کیا۔

”تسلیم۔ مگر دوا پر سے ہٹ کر جان من۔ دامن کچل نہ جائیں میرے“ پھر اپنے دامنوں کو سمیٹ کر انہوں نے گردن ذرا ترچھی کر کے میری پیشانی چومی۔ پھر لہیں۔ ”خیریت سے پہنچ گئیں روحی پیاری؟ مجھے صحت فکر تھی۔ آج کل ہوائی جہازوں کے حادثات بھی اتنے ہوتے دہشتے ہیں آگے دن، مگر خدا کی پناہ“

پھر انہوں نے ہلٹ کر چھوٹے چھوچا، بڑے ماموں اور بھٹے چچا پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ تاہم بڑے اخلاقی سے پوچھتے لگیں۔ ”آپ سب لوگ اچھے تو رہے؟“

آداب و سلام کی رسومات کے بعد ہمارا جلوس کمرہ ملاقات کی طرف روانہ ہوا۔ بڑے ماموں نہایت موڈبانہ طریقے سے رستہ بتاتے ہوئے آگے آگے چھوٹے چھوچا۔ سر جھکائے چھپے چھپے۔ بھٹے چچا جی کہتے ہوئے ساتھ ساتھ صنوبر داوی زبیدہ کے دامنوں کو کھانچا ہوتی خراماں۔ خراماں۔ عرض ایک جلوس کی شکل میں

ہم کمرہ ملاقات کی طرف چلے۔

بارے کمرے میں پہنچ کر داوی زبیدہ ایک صوفے پر تنہا بیٹھ گئیں۔ پھر چھوٹے چھوچا کے مخالف ہو کر لہیں۔ ”جب کبھی میں ایسے غم کے موقعوں پر کہیں جاتی ہوں۔ ویسے تو کہیں جاتی ہی نہیں مامی نگہوں پر، لیکن اگر کہیں گئی تو میرے اعصاب تنہا والا ہو جاتے ہیں۔“

”جی۔“ چھوٹے چھوچا نے موڈبانہ جواب دیا۔

”اور علیٰ شک“ داوی زبیدہ نے بوڑھی کلون سونگتے ہوئے کہا۔

”جی۔“ بڑے ماموں نے جوابا کہا۔

”چنانچہ“ داوی زبیدہ نے کہا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے موقعوں پر میں ہمیشہ گھنٹے کی شیشی دستی بوتلے میں رکھ لیتی ہوں۔ حقن امتیازاً۔“

”جی۔“ بھٹے چچا نے جوابا کہا۔

”صنوبر! داوی زبیدہ نے ذرا ستر چھڑا کر کے کہا۔

”جی بیکہ۔“ صنوبر بھٹے چچا کی اور جلدی جلدی بڑھ کھول کر گھنٹے کی شیشی پیش کی۔

”داوی جان پیاری۔ آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“

میں نے بیٹھتے بیٹھتے یوں جی کہہ دیا۔

”ہاں۔“ وہ گھنٹے کی شیشی میں ہلکے ہلکے سانس لیتے ہوئے لہلہیں۔

”چہلم کے موقع پر ساوگی کو مد نظر رکھ کر میں نے یہ سیاہ ریشمی لباس پہن لیا۔ چینی ریشم ہے اور سرائیپ کے موتیوں کی ایک تیل سی مالا پر اکٹھا کیا۔“

صنوبر کہنے لگی۔ ”میں نے تو روحی بی بی۔“ بیکہ کی قد میں نیلم کا گلہ بند پیش کیا تھا مگر۔“

داوی زبیدہ ہنس پڑیں۔ ”دوایاں ہوئی ہر صنوبر! چہلم پر نیلم کون پہنتا ہے؟ البتہ سیاہ لباس پر سفید موتی محبوب نہیں سمجھے جاتے۔“

اچانک نازی دورٹی ہوئی آئی، اور داوی زبیدہ کے چہلم گئی۔

”تسلیم۔ تسلیم۔ داوی زبیدہ۔“

”نازی پیاری۔“ داوی زبیدہ نے سڑیلی آواز میں کہا

پھر اس کی پیشانی چومی۔ ”تم کہاں تھیں؟ اچھا یہ تو پیاری“

یہ کہہ کر انہوں نے بڑھ کھولا اور دو ٹافیاں نکال کر اس کے منہ میں ڈال دیں۔

”ہائے ہائے ٹافیاں۔“ نازی پچھی۔ ایک زمانے کے بعد نقیب ہوئی ہیں ٹافیاں داوی جان! کتنی دفعہ میں نے زیتون پچھوچے سے پوچھا آپ کو ٹافیاں سے نفرت کیوں ہے کیوں نہیں منگوادیتیں مجھے مگر وہ جھک کر کہیں ادا کرتی ہیں، تم بڑوں کے معاملات میں دخل نہ دیا کرو۔“

داوی زبیدہ نے کہا۔ ”تعب ہے۔ مگر خیر یہ تو زیتون اور عادت بگڑی۔ مگر وہ ہیں کہاں؟“

”میں جاؤں؟ بلالائیں انہیں؟“ وہ اندر کی طرف مامی۔ دروازے تک جا کر مڑ کر کہنے لگی۔ ”ٹافیاں کے متعلق ان سے ضرور پوچھیں گا۔“

نازی کے جانے کے بعد داوی زبیدہ بڑے ماموں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”ٹافیاں فائدہ دیتی ہیں چہلم بھاری ہوتی ہے، بھائی تو کمرہ قسمت میں آخر ٹافیاں فائدہ سے مرنا کھاتا تھا آہ۔“

”جی نہیں۔ دل کا دورہ پڑا تھا انہیں۔“ بڑے ماموں نے کہا۔

”اسے دل کا؟“ داوی زبیدہ نے کہا۔ ”کچھ یاد نہیں۔“

”ٹافیاں فائدہ دیتا کہ دل۔“

”ہم نے آپ کو فوراً اطلاع دے دی تھی۔“ بھٹے چچا نے کہا۔

”ہاں، ہاں آپ کا تاریخ پتہ تھا میں نے خود پڑھا تھا۔“

”جی نہیں۔“ ٹمک کال کیا تھا۔ چھوٹے چھوچا بولے۔

”ہاں، ہاں ٹمک کال، آپ یاد آیا ان کی پیاری کا۔“

داوی نے کہا۔

”جی نہیں۔ ان کی موت کا۔“ بڑے ماموں بولے۔

”شاید موت کا ہو۔ کچھ یاد نہیں رہا۔“ داوی زبیدہ نے بے پروائی سے کہا، کچھ دیر بوڑھی کلون سونگتے رہیں پھر ایک آہ بھری۔ ”آہ کتنی جلدی ایک سال گزر گیا۔“

”جی نہیں چالیس دن۔“ چھوٹے چھوچا نے کہا۔

”اچھا؟ صرف چالیس دن؟ حیرت سے داوی زبیدہ نے پوچھا۔“

اسی وقت دروازہ کھلا۔ پچھوچے زیتون اپنے بوسیدہ اور رنگ اڑے لباس میں دھڑلے مار کر روٹی ہوئی یوں باہر آ پڑیں، جیسے چھپے کسی نے دھکا دیا ہو۔

نازی بھی ان کے پیچھے آئی۔ اب پوچھنے ان سے

داوی زبیدہ بھوپھی زیتون کی ہدایت اور ادب آگے
پر جو اس باختہ سی ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ بدحواس ہو کر بولیں۔
"خدا کی پناہ"

"کیا بات ہے زیتون؟ گر بڑی بھینس کیا ہے۔ ہے ہے
کیڑے لقمہ تیار تار تار ہو رہے ہیں۔ کہیں اچھے تو ہیں
گئی بھینس کاٹوں میں؟ چوٹ تو نہیں لگی زیادہ؟"
"چوٹ تو دل پر لگی ہے زبیدہ۔ ہائے بھائی تو نگہ
انہوں نے ایک دلدور پہنچ ساری۔ اور داوی زبیدہ سے
پرست گئیں۔"

داوی زبیدہ اب تنگ وحشت زدہ سی نظر آ رہی
تھیں۔ بھوپھی زیتون اپنے سودا دار رومال سے
آنسو پونچھتی ہوئے ایک کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔
بقوڑی دیر خاموشی چاتی رہی۔ البتہ بڑے ماموں
کا اننگل کے زریعے رہ رہ کر مچلاتے رہے پھر داوی
زبیدہ نے سوال کیا۔

"یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر بھائی
تو نگہ مرے کیوں؟"
"اے ہے۔ آدمی کے مرنے کی کوئی وجہ ہوتی ہے
زبیدہ؟ انسان کو مرنے کے لیے بہانا چاہیے۔ بھوپھی زیتون
نے جواب دیا۔

"مجھے چچا بولے۔ بہا ناکیا۔ ان کے گردے پھلے دن
سال سے خراب تھے۔"
"گردے کیا؟ گردہ کہو۔ اے ایک ہی وقتاً زیتون
بھوپھی نے کہا۔ چھوٹے پھوپھا بولے۔ "گردہ چھوڑو
دل کی بات کرو۔ دل میں سودا خ تھا۔"
"ایک بولے؟ بڑے ماموں بولے۔ بلڈ پریشر تین سو
تک جا پہنچا تھا۔"

"غیر بلڈ پریشر کا کیا ہے؟ بھوپھی زیتون کہنے لگیں۔
"گوئی کھائی، ترنگا۔ ہاں البتہ اتیں۔"
"تین تیں کیا۔ ان کے کال بلڈ میں نقص تھا۔ پتھری
ضقی پتے ہیں۔ بڑے ماموں نے کہا۔ پھر شہادت کی
انگلی سے کان میں جھٹکے دیئے گئے۔

"اس پتھری کی وجہ سے سرطان کا ڈر تھا۔ بھوپھی
زیتون آہ بھر کر بولیں۔
"ان کے جسم کی تقریباً ہر چیز خراب ہو چکی تھی۔"

نازی غور سے سن رہی تھی۔ زور سے لکھ لکھا کر
ہنس پڑی۔ بولی اونٹ رے اونٹ نری کون سی لا
سیدی؟ نازی کی عاودہ آدنی پر بھوپھی زیتون
اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔
داوی زبیدہ نے پہلے بوڑی کلون ٹوٹکھا، پھر ایک
ہلکی آہ بھر کر بولیں۔ "بھائی تو نگہ بے چارے کی عمر آ
کیا تھی؟"
"نوٹس کے تھے۔" بھوپھی چچا نے کہا۔
"آخر کہاں تک جیتے؟" نازی نے ساوگی سے

کہا۔
"بے وقت ہی مر گئے۔" داوی زبیدہ نے سلسلہ جاری کیا
"ایک اور محاورہ یاد آگیا، کتاب میں پڑھا تھا عاودہ
کے بورے سمیٹا اسی کو تو کہتے ہیں نا آ پا رومی۔
نے سوال کیا۔
"لوگ سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال تک جیتے ہیں
تو سے کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؟ کتنی دفعہ کہا بڑوں کے
معاملات میں دخل نہ دیا کرو۔ بھوپھی نے کہا۔
مجھے چچا بولے۔ "داو تو نگہ کی اچانک اور بے وقت
موت کی وجہ سے جا بجا بھوپھی وقتیم نہ کر پائے"
"نوٹس سال تک تقسیم نہ کر پائے؟" نازی نے پتھری
سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

بھوپھی زیتون کا بارہ لیکھت چڑھ گیا۔ کوئی
انتہا بھی بے بدقتیری کی؟ نکل جا کر سے سے باہر کتنی
دفعہ کہا ہے کہ بڑوں کے معاملات میں دخل نہ دیا کرو
مگر۔"
"آخر میں کس کی بات میں دخل دوں؟" بھوپھی
بڑے ہیں۔ اچھا جانتی ہوں۔ شامیازوں کے نیچے بیٹھوں
گی۔" یہ کہہ کر وہ غصے سے باہر چلی گئی۔
"ہاں شامیازوں پر یاد آئے۔" داوی زبیدہ نے بڑے
ماموں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ لوگوں نے پچھلے
میں شامیازے نہیں لگائے۔ میرا خیال ہے تین شامیازے
اور لگے چاہیں۔ آخر بھائی تو نگہ کا چلہ ہے۔"

"چلہ ہے، شادی نہیں ہے۔ تم کبھی غصہ کرتی ہو؟
زبیدہ۔ زیتون بھوپھی کی آواز پھر رقت کچھ غصے کی
سے بھاری ہو گئی تھی۔

"یقین خاں کو کیا بھویا ہو؟" داوی زبیدہ نے پوچھا۔
"گور عرب عرابہ کے لیے کتنی رقم مخصوص کی؟"
"مجھے چچا غور سے بولے۔ "عرب عرابہ کے لیے
دو سو کچھ انتظام کروا ہی دیا ہے زیتون سے۔"
بھوپھی زیتون کو یہ ذکر بہت ناگوار گزارا۔ اتنی ساری
دیکھیں بلاؤ غور کے کی جو بھائی ہیں، ان مسکینوں بلا
نوشوں کے لیے۔ اور کیا کروں ساری دولت ہی کسادوں
بھائی تو نگہ کی؟"
"روست اور ٹاٹا سوپ بھی بنوا لیا ہے زیتون؟"
داوی زبیدہ نے پوچھا۔

"اے ہے اور سنو۔ روست اور ٹاٹا کے سوپ پر
چہل کی نیا زولواؤ کی زبیدہ؟ زیتون بھوپھی نے جل کر
کچھ یوں ہو کر پوچھا۔
"نہیں نہیں۔ میں اپنے لیے پوچھ رہی ہوں۔" داوی
زبیدہ نے جواب دیا۔ غرض اسی تنگ دود میں چہل کی
رات آگئی۔ خدا خدا کر کے جب سارے کام انجام کو
پہنچے تو غور والے کھانا کھانے کے لیے میسر نہ جا بیٹھے۔
چھوٹے پھوپھا کا منہ زعفران میں دم دی ہوئی
برائی سے اس قدر بھرا ہوا تھا کہ وہ ہیشکل کہہ سکے
"اس غم کے موقع پر مجھے خیال آتا ہے کہ تو نگہ بھائی
کو مرنے والے کا اچار کس قدر مرغوب تھا۔"

"مجھے چچا نے آہ بھری۔" اور آج ان کے چہل پر وہ
اچار میز پر نہیں۔ ان کی آواز کو گہرے سوتھی غم کی وجہ
سے باکوٹھ کی۔ ٹھیک ٹھیک اس کا علم نہ ہو سکا۔
بھوپھی زیتون آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔ "ہائے
تو نگہ بھائی رہے نہ مرنے کا اچار۔"

"اچار تو موجود ہے بھوپھی۔ البتہ تو نگہ داوا موجود
نہیں۔ نازی نے اچانک کہا۔
"کیا کہتی ہو؟" بھوپھی زیتون نے ٹاٹا۔
"میں کیسے معلوم ہوا نازی؟ کہ اچار موجود ہے؟
داو تو نگہ کے کمرے میں دیکھا ہے تم نے؟ میں نے پوچھا۔
"اچار رکھنے کے لیے خواب گاہ تو نامناسب جگہ ہے۔"
داوی زبیدہ نے اپنا کاٹا لپیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔
"ارے نہیں۔ یوں ہی بیٹے چلی جا رہی ہے۔ بھوپھی
زیتون نے کہا۔ پھر بائیک اور موٹی آواز میں بولیں۔ "اب
تو زمانے ہی بدل گئے ہیں رومی۔ بھائی تو نگہ کے ساتھ ہی

ان کے اچار بھی ختم ہو گئے۔"
"اچار ختم نہیں ہوا۔ میں شرطیہ کہتی ہوں بھوپھی زیتون
آپ ہی کے سر کی قسم۔ نازی نے وثوق کے بھوپھی میں کہا۔
"اے ہے میرا سر کوئی خال تو ہے؟ دماغ تو نہیں چل
گیا نازی تیرا؟" بھوپھی نے غصے سے کہا۔
"سر کا اچار کیا؟" داوی زبیدہ نے بے دھبائی سے
پوچھا۔ وہ کھا ختم کر کے اعصابی گولی کھا رہی تھیں۔
"مجھے چچا ہنس پڑے۔ زیتون کے سر کا نہیں۔
مرچوں کے اچار کا ذکر ہے۔ بیگم زبیدہ۔"
نازی اپنی بات سننے پر پہلی ہوئی تھی، کہنے لگی۔
"آؤ ارکو مرے کی بونٹ گودام سے آپ نے نہیں منگوائی
تھی؟" اس وقت میں نے اچار کے چار مرتبہ ان دواں کھے
ہوئے دیکھے تھے۔

"خالی ہوں گے۔" بھوپھی زیتون انجان بن کر بولیں۔
"نہیں نہیں، اچار کی خوشبو آ رہی تھی۔"
داوی زبیدہ بولیں۔ "پر زیتون؟ جب تو نگہ ختم
ہو گئے تو اب اچار کے مرتبہ ان کا کیا کر دے؟ ان کا
اچار ڈالو گی؟"

"میں تو کہتا ہوں ان مرتبہ انوں
کو ٹری مسجد میں بھجا دو۔ پھر انہوں نے زور سے اپنا کان
کھینچنا تاکہ کھلی کم ہو جائے۔
چھوٹے پھوپھا بولی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے
بولے۔ "یا عزمیوں، مسکینوں میں تقسیم کر دو، کیونکہ
مرحوم کی مرغوب غذا تھی۔"

نازی کہنے لگی۔ "میں نے تاریخ کی ایک کتاب میں
پڑھا تھا فرقوں کے عہد میں۔ مرغوب اشیاء و مہروں
کے ساتھ وفاداری جاتی تھیں کیوں نہ تو نگہ داو۔"
بھوپھی زیتون طیش کھا کر اٹھیں۔ بقوڑی دیر میں
ایک نہایت چھوٹی سی کٹوری میں مرچوں کا اچار لاکر
میز پر ٹھا۔
ان کے ٹھٹھے ہی چھوٹے پھوپھا کٹوری کی طرف
لپکے۔ "دینا۔ ادھر دینا۔"
بقوڑی دیر بعد۔ غم تو تھا ہی۔ اس پر طرہ مرچوں
کا اچار۔ داو تو نگہ کے چہل پر بھی رو رہے تھے۔

تری انکھوں میں رنوں اور خوابوں کے
جزیرے جھمکتے ہیں
سرمزگان رو پہلی ساعتوں کے استعارے
مُسکراتے ہیں
ہنسی مہتاب بنتی ہے
پھر اس مہتاب کے چاروں طرف آواز
کا ہالا ابھرتا ہے
اور اس ہالے میں تیری انگلیاں
نادیدہ منظر کو طلسمِ خواب سے آزاد
کرتی ہیں
ترے ہاتھوں کی جنبش دھوپ چھاؤں
سے دھنک ترتیب دے کر
خالی تصویر کو خدوخال کو آباد کرتی
ہے
تری پلکیں چپکتی ہیں
ستارے ستارے آن ملتے ہیں
کہ جسے شام ہوتے ہی سبک آٹار
لہروں میں
کنارے سے کنارے آن ملتے ہیں۔

اب کے برس

کہیں دور
کوئی خوشی

شاید کسی روزن سے جھانک رہی ہے
میری اور تمہاری باتوں کے دھاگوں سے
کچھ سن رہی ہے منظر
کچھ کہہ رہی ہے ہم سے
خاموشی کی زباں میں
لیکن ہم اتنے مگن ہیں
کہ دھیان میں نہیں رکھتے
اک دوسرے سے اب کچھ نہیں کہتے
کہ کہنے سننے میں کیا رکھا ہے
وہ بیتا وقت ہم نے کہیں سنبھال رکھا ہے
زندگی کی حقیقتوں کو کتابوں میں لکھ رکھا ہے
اور کتابوں کو
اب کے برس
دیکھ لگ رہی ہے

ستارے رات بھر جاگتے رہے
خوشیوں کی نوید سناتے رہے
لیکن کوئی
کیا جانے کہ
یہ خوشیاں پل میں بکھر جائیں تو
روٹھے مل نہ پائیں تو
آنچل سر سے اُٹھ جائیں تو
ہاں اگر معلوم ہو جائے جاناں
تو ہم
خوشیوں اور غموں کے بیچ
سفر کرنا ہی چھوڑ دیں
ہنستے لوگوں کے بیچ جاناں
چلتے قدم روک دیں
فرزاد رانی



زندگی اُلجھ رہی ہے
ہم سے کچھ کہہ رہی ہے
مگر کس کو فرصت ہے کہ
اس کی صداؤں پر دھیان دے
اتنا وقت ان کو سمجھنے میں گزار دے
فرخہ فوز

کون سا ملک مسکندہ کیس

وادو تھیں

ایک عظیم الشان محل جب تعمیر ہو چکا تو اس کی افتتاحی تقریب میں ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ان میں ایک ایسا خوش پوش بھی موجود تھا جو محل کے ذرا دروازے سے حقے کو نہایت غور کے ساتھ دیکھتا پھر رہا تھا کہ لوگ اسے انجینئر سمجھ بیٹھے اور پھر کا گمان تھا کہ وہ کوئی افسر ہے اور بعض کا خیال تھا کہ یہ افسر نہیں تو کوئی تاجر ضرور ہے۔

افتتاحی تقریب کے موقع پر چائے کا دور چلا تو کسی نے ان صاحب کے موقع پر چائے کا دور چلا

”کیا آپ کو یہ محل پسند آیا؟“
اس شخص نے خوشی سے محل کے جواب دیا۔
”بہت زیادہ، میں دراصل اس محل کے انجینئر کے کمال کی داد دے بغیر نہیں رہ سکتا اگر انہوں نے محل کو دریا کی چوڑائی پر بنانے کے بجائے لمبائی پر بنایا ہوتا تو میرا خیال ہے کہ یہ کئی سو سال میں بھی مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔“

بوریت

ایک بے حد پریشان عورت نے ڈاکٹر سے کہا۔
”ڈاکٹر صاحب! مجھے بہت زیادہ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے یہاں تک کہ میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی ہوں۔“

ڈاکٹر بولا تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟“
عورت نے جواب دیا۔

”لیکن ڈاکٹر صاحب بہت زیادہ باتیں کر کے میں اپنے آپ کو کتنا بوجھ کر رہی ہوں، آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔“

ستم ظریفی

ٹرنفک سارجنٹ نے طویل اور طوفانی تعاقب کے بعد ایک صاحب کو روکا جو سگنل ٹور کر تیز رفتاری سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک خاتون بھی ان کے ساتھ تھیں۔

”آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ نے سگنل بھی ٹوڑا اور پھر اپنی رفتار سے گاڑی جگائی جتنی رفتار سے اس سڑک پر گاڑی چلانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔“

سارجنٹ غصے سے بولا۔
”میں نے تو ایسی کوئی حرکت نہیں کی میری بیگم سے پوچھ لیں۔ وہ صاحبہ مصومت سے بولے۔
”کیوں بیگم صاحبہ! کیا آپ گواہی دیں گی کہ آپ کے شوہر نے نہ تو سگنل ٹوڑا اور نہ ہی گاڑی تیز چلائی۔ میں آپ جیسی معزز خاتون سے جھوٹی گواہی کی توقع نہیں کر سکتا۔“

”میں تو ایک بات جانتی ہوں۔“ خاتون سر جھکاتے ہوئے بولیں۔

”جب میرے میاں نشے میں ہوں اور ڈرائیونگ لائسنس گھر بھول آئیں تو ان سے بحث نہیں کرنی چاہیے۔“

کرکٹ نامہ

میچ شروع ہو چکا تھا کہ کپتان کو پیغام ملا کہ ڈس آڈی بغیر ٹکٹ اندر داخل ہونا چاہتے ہیں

اور وہ خود کو امپائر کے دوست بتاتے ہیں۔
”مگر اندر نہ آنے دینا۔ وہ لوگ مگر، قریبی اور جھوٹے ہیں۔“ کپتان نے کہا۔
”جھلا امپائر کا بھی کبھی دوست ہوا ہے؟“

افسوس

ایک میسٹ میچ میں ملک کا مایہ ناز کھلاڑی پہلی ہی گیند پر آؤٹ ہو گیا تو کوٹ کپڑے کو بہت ہی افسوس ہوا اور وہ اندازہ ہمدردی بول اٹھا۔
”کوئی بات نہیں دوست! کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اب دیکھو ناں پچھلے میچ میں آپ نے باروں کی خوب ٹھکانا کر کے ڈبل سچری مکمل کی تھی۔“

”ہاں، ہاں، جی پچھلی دفعہ میں خوب جم کر کھیلا تھا اور جب میں آؤٹ ہو کر واپس پویلین پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ کھانے پینے کی تمام اشیاء اور مشروبات تمام طعم ختم کر چکی تھیں اور مجھے جو کھا رہا تھا اور پینا تھا مایہ ناز کھلاڑی نے جواب دیا۔

ڈھٹائی

بارش میں بھیگتے ہوئے ایک صاحب نے دودھ سے ٹیکسی آتی دیکھی تو بیک کریچ سڑک پر کھڑے ہو کر اسے روکا لیکن اس وقت ان کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقب سے ایک خاتون نے اس کے پیچھے کرکسی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کے برابر بیٹھ گئیں۔
”یہ تو بڑی ڈھٹائی ہے تو وہ صاحب بڑے غصے سے بولے۔

”ٹیکسی کو میں نے روکا تھا۔“
”مذہد روکا ہو گا۔“ خاتون مسکراتے ہوئے بولیں۔
”لیکن اس ڈرائیور سے شادی دو سال پہلے میں نے کی تھی۔“

رباب علی۔ کھلا بٹ

سہرا براہ کون

سوشل ویلفیئر آفیسر آئنہ سہرت سہرت ایک

بار اپنی ٹیم کے ساتھ سرفہرے گرنے چھٹیں کر گھر کا سہرا براہ کون ہوتا ہے۔ سو میں سے نانوے گھر لیتے تھے جن کی سہرا براہ خواتین تھیں صرف ایک گھر ایسا تھا جس کی رو نے سہرا براہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ آئنہ سہرت سہرت بہت خوش ہوئیں کہنے لگیں۔

”تمہاری اس خوبی سے متاثر ہو کر ہم تمہیں تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کہو تو سو پونے نقد پیش کیے جائیں اور کہو تو پارک فلم۔ بولو، دونوں میں سے کیا پسند کرو گے۔“

اس مرد نے جس نے گھر کا سہرا براہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اپنی بیوی کی طرف چہرہ گھمایا اور بولا۔ تم بولو ممتی کی اماں، کون سی چیز بہتر ہے گی؟
عاصمہ زہرا۔ فیصل آباد

میری بیوی

اپنی بیوی کے بارے میں مختلف شوہروں کی رائے۔
”جھوٹ بڑے کا قدرتی آلہ ہے۔“
”مجھ سے ہر وہ کام لے سکتی ہے جو میں نہیں کرنا چاہتا۔“

”اتنی بد صورت ہے کہ جب چڑیا گھر جاتی ہے تو اسے دو ٹکٹ لینے پڑتے ہیں۔ ایک اندر جانے کے لیے دوسرا باہر آنے کے لیے۔“

”مجھے اس کے قد کا ٹھیک سے اندازہ نہیں کیونکہ اسے کھڑے ہونے دیکھے زمانہ گزر گیا۔“

”اس قدر موٹی ہے کہ جب وہ شاور کے نیچے نہاتی ہے تو اس کے پاؤں گیلے نہیں ہوتے۔“

”میں کھانے سے پہلے دعا مانگتا ہوں، لیکن اس دن جب قیمت سے کھانا میری بیوی نہائے۔“

”اس قدر حسدیت ہے کہ وہ مٹی کے برتن استعمال کرتی ہے تاکہ وہ گر جائیں تو اٹھنے نہ پڑیں۔“

”پورا دن خوش گوار گزارنے کے لیے صبح کی سیر کرنے کا پرہیز جاتی ہے۔“

”شانہ کوثر مریم۔ پٹنوال

بدلہ

صبح کے چار بجے فون کی گھنٹی بجی۔ ولیم نے بڑی

شکل سے آنکھ کھول کر فون اٹھایا تو اسے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ رجب اب آپ کا کتارات سے اب تک مجھ تک رہا ہے میں ساری رات جاگتی رہی ہوں۔ وہ مجھ نے معافی مانگی اور عورت کا نام اور یہی فون نہ معلوم کیا۔
دوسرے روز چار بجے فون کی گھنٹی ٹکے شور سے عورت کی آنکھ کھل گئی۔
دوسری طرف سے ولیم بول رہا تھا۔ خاتون میرے گھر میں کوئی بھی کتا نہیں ہے۔

ذاتی مکان

کوئلے سے دلوں پر کھتے ہوئے بچے کو دیکھ کر باپ نے بچے کو ٹوکا۔ دیوار پر کچھ نہیں کھا کرتے۔ بچے نے سر اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا اور کہا۔ پاپا! پہلے تو آپ نے کبھی نہیں روکا تھا۔ ٹھیک سے بیٹا! باپ نے جواب دیا۔ وہ کرائے کا مکان تھا اور یہ ہمارا ذاتی مکان ہے۔
انٹی خنات۔ کمالیہ

فرمائش

جارج برنارڈشا ایک رستوران میں کھانا کھا رہے تھے۔ بینڈ کے غوریدہ مشروں سے عاجز آ کر انہوں نے ویٹر کو بلا دیا اور پوچھا۔ کیا یہ بینڈ والے کوئی فرمائشی چیزیں بھی بجا سکتے ہیں؟
اُس نے جواب دیا۔ جی ہاں، ضرور ضرور۔
برنارڈشا نے کہا۔
”اچھا تو میری طرف سے انہیں عرض کر دیں کہ اب وہ بغلیں بجاں۔“
ایم نریب۔ کوٹ ادو

خوشگوار خواب

ایک دفعہ ایک آدمی نے پورٹ ورج کو فانی کر ڈس کی بیوی تم ہو گئی ہے۔
اسے چمکڑے اُس سے کہا۔

”آپ کی بیوی کو تم ہوئے تھے دن ہو گئے ہیں۔ وہ شخص کہنے لگا۔ تقریباً تین ہفتے ہوئے ہیں۔“
ایک بڑا حیران ہوا۔
وہ شخص کہنے لگا۔
”راتے دن دراصل میں یہ سمجھا رہا کہ میں کوئی خوشگوار خواب دیکھ رہا ہوں۔“
قابل اعتبار
عقیدہ بدر۔ جگہ رات

تھانے دار نے ان دو جیب کتروں سے جنہیں ابھی اچھی گرفتار کیا گیا تھا۔ پوچھا۔
”تم دونوں ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہو؟“
ایک نے کہا۔
”ہم ایک دوسرے کو تین ماہ سے جانتے ہیں۔“
”بہت خوب۔ تم دونوں کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“
اُس نے کہا۔ ”ایک ہوٹل میں۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ سات بار جیل جا چکا ہے۔“
”اچھا تو پھر؟“
”پھر کیا تھا مجھے اس پر بھروسہ ہو گیا۔“

انتقام

ایک صاحب اپنے دوست کو اپنی خیریت کا راز فیضی ٹیلی گراف آفس گئے۔ تار وصول کرنے کے فرائض ایک خوبصورت لڑکی انجام دے رہی تھی۔ ان صاحب نے لڑکی سے پوچھا۔
”فلاں جگہ نیلی گرام تھی دیر میں پہنچ جائے گا؟“
لڑکی نے ناک سکود کر ممتنا سے جواب دیا۔
”مجھے ایسے فضول جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“
”وہ صاحب چپ ہو گئے اور ٹیلی گرام کے الفاظ لکھ کر لڑکی کے حوالے کر دیے۔
جبارت پڑھ کر لڑکی شرمندہ ہو گئی۔
ٹیلی گرام کے الفاظ تھے۔
”میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ بشر بہت اچھا ہے مگر لڑکیوں کی مثال یہ ہے کہ شکل پریوں کی سی اور مزاج پڑیلوں جیسے۔“



غدار کا انجام

ایک قلعہ کا شاہزادہ کے مضبوطی میں قلعوں میں رہتا تھا۔ اس کی وجہ ایک قواس کا قدرتی عمل وقوع تھا۔ یہ قلعہ دریا سے جدا اور فرات کے درمیان واقع تھا۔ اس کے علاوہ اس کی فیصل اتنی بلند تھی کہ گندس اور سی سے بڑی بیڑیاں اس کی نصف اونچائی تک بھی نہ پہنچ سکتی تھیں۔ قلعہ کا حاکم شاہ ساطرون جتنا بہادر تھا اتنا ہی سرکش بھی تھا۔ وہ ایرانی سلطنت کے درمیان گھر سے ہونے کے باوجود ایرانی شہنشاہ کی پروا نہ کرتا تھا۔ چھپا کر ایک سال سے ایرانی فوجوں نے اسے محاصرہ کر رکھا تھا لیکن اب وہ قلعہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ ایران کا شہنشاہ خود اپنے لشکر کی کمان لے رہا تھا اور شاہ ساطرون ان بہادری اور محنت پر حیران تھا۔
شاہ ساطرون کی ایک بی بی نظیر تھی۔ بادشاہ کو اس سے بہت محبت تھی اور اس نے بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش کی تھی۔ بے چھینک بھرتی تو عمل میں کمر لگا رہا۔ شہزادی نظیرہ خوبصورتی اور نزاکت میں اپنی مثال آپ تھی لیکن وہ اتنی ہی اقدار اور شہرت کی چمک بھی اُس نے فیصل پر سے شہنشاہ ایران شاہزادہ کو دیکھا تو سوچا۔ میں اگر اس کی مدد کروں اور قلعہ پر اس کا قبضہ کرادوں تو پورے ایران کی عکد بن سکتی ہوں۔
اُس نے شاہزادہ کو خط لکھا۔ شاہزادہ نے وعدہ کیا کہ اگر نظیرہ نے اس کا قلعہ پر قبضہ کر لیا تو وہ اسے اپنی مکہ دے گا۔ شہزادی یہ جان کر پھولے نہ سہائی۔
اُس نے پہلے تو اپنے باپ کی ضمانت کرنے کی کوشش کی کہ وہ شہنشاہ ایران کی اطاعت قبول کرے۔

اس کا بہادر باپ اس پر رونا مند نہ ہوا بچہ شہزادی کی پندرہویں سالگرہ کے موقع پر قلعہ میں شاندار جشن ہوا۔ سپاہی، سردار سب نے دل کھول کر نشہ کیا۔ شہزادی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اُس نے مغربی دروازے کے محافظ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور شراب میں بے ہوش کی دوا ملا کر قلعہ سے گرا دی۔ تمام محافظ مدہوش اور بے ہوش ہو گئے اور ایرانی لشکر اندر داخل ہو گیا۔
شاہ ساطرون الحظ کا بوڑھا شیر اپنے عمل کے محافظوں کے ساتھ مقابلے پر ڈٹ گیا اور لڑتے لڑتے اپنی جان قربان کر دی۔ عرب فوج قتل ہو گئی یا غلام بنائی گئی اور انہوں نے اپنے گھر کے پورے بچے اور عورتوں کو متبع کر ڈالا اور قلعہ کے برج کو لوہے سے یہ قلعہ اس طرح سمار ہوا کہ آج تک اس کے کھنڈرات بھی نہیں ملے۔
الحظ کی فتح کے بعد شاہزادہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور شہزادی سے شادی کر کے اپنے حرم میں داخل کر لیا لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ غدار ہمیشہ عبرت ناک انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔
شادی کے کچھ دنوں بعد ایک شب شہزادی کو بے ہوشی محسوس ہوئی۔ اُسے کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا بار بار اُس کے کمر بٹھ جاتی۔ اتفاق سے شہنشاہ کی آنکھ کھل گئی اس نے شہزادی سے پوچھا۔
”کیا ہوا نظیرہ؟ تم بے چین کیوں ہو؟“
”میرے شانے پر کوئی چیز چبھ رہی ہے“ نظیرہ اپنا شانہ مہلاتے ہوئے بولی۔
شاہزادہ پریشان ہو گیا۔ اُس نے شے اٹھا کر شہزادی کا شانہ دیکھا۔ شہزادی کے شانے پر گلاب کی ایک

پتی چکی ہوئی تھی۔ شاپور نے پتی شادی۔ شہزادی کو
 چھین لیا۔
 شاپور نے ہنس کر کہا: شہزادی! تم کس قدر نازک
 ہو کہ گلاب کی پتی بھی تم کو چھتی ہے؟
 ”اے شہنشاہ! نظیرہ غصے ہوئی۔“
 ”آپ کو علم نہیں میری نزاکت! غصے میں ہی نہیں
 پوری دنیا نے عرب میں مشہور ہے۔ میرے باپ نے
 مجھے بہت ناز و غم سے پالا ہے۔“
 شہنشاہ کی دیکھی برہمی۔ اس نے پوچھا:
 ”جب تم اتنی نازک ہو تو پھر کھانے کا فائدہ کس
 طرح ملتی ہوگی؟ وہ بھی تہکے حلق میں ٹسکا ہوگا؟“
 ”آپ کا خیال درست ہے شہنشاہ؟ شہزادی
 نے غور سے کہا۔
 ”مجھے کوئی سخت چیز کھانے کو نہیں دی گئی۔ میرا باپ
 مجھے کھانے کے لیے محض، انڈوں کی زردی اور شہد
 دیا کرتا تھا۔“
 شاپور کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک نکتہ تبدیل ہو گیا۔
 اس کی تیوریوں پر ہل پڑ گئے۔ اس نے کہا:
 ”او، زہریلی ناگ! اٹھنے اپنے اس باپ سے غذاری
 اور بے وفائی، جس نے تجھے اس محبت سے پالا تھا
 تو نے صرف مکہ ایران بننے کے لیے اس باپ سے
 غذاری کی تو میرے ساتھ کس طرح وفادار رہے گی
 کوئی مجھ سے زیادہ طاقت ور نہ ملے گا تو مجھ سے بے وفائی
 کرے گی اس کے پاس جلی جانے گی؟“
 پھر اس نے تالی بجا کر نیندوں کو بٹایا اور حکم دیا
 کہ نظیرہ کو جلاؤ کے خولے کر دیا جائے۔
 نظیرہ بہت چیخی چلائی، دہائیاں دیں لیکن شاپور
 نے اس پر رحم نہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔
 بعض روایتوں میں ہے کہ شاپور نے شاہی اسپتال
 سے گھوڑا منگوایا اور حکم دیا کہ نظیرہ کے بال گھوڑے
 کی دم سے باندھ دیے جائیں۔ اور گھوڑے کو تیز رفتاری
 زمین پر دوڑایا جائے۔
 فرود ہونے پر نظیرہ کے بال اس واقعہ کا ذکر
 تفصیل سے کیا ہے۔ اس کا بڑا تراب تک ضرب المثل ہے۔

”شاپور کو یہ پیام دو کہ وہ جنگ کے لیے آیا ہے
 اور میں اسے دوستی اور صلح کا پیغام دیتی ہوں۔“
 ڈریکولا
 خوفناک اور سنی خیز مناظر سے بھر پور ڈریکولا
 کی فلمیں یقیناً آپ نے بھی دیکھی ہوں گی اور ان میں
 ڈریکولا کو انسانوں کا خون پیتے بھی دیکھا ہوگا۔ دنیا
 میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں ڈریکولا کی فلمیں
 نہ چلتی ہوں۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے اس کی
 فلمیں دیکھتے ہیں لیکن یہ حقیقت شاید ہی کسی کو معلوم
 ہوگی۔ ڈریکولا کوئی انسانی کردار نہیں ہے بلکہ باقاعدہ
 ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ اس نام کا شخص پندرہویں
 صدی عیسوی میں رومانیہ میں بادشاہ تھا۔ وہ آج کے
 فلمی ڈریکولا کی طرح انسانوں کا خون تو نہیں پیتا تھا مگر
 اس نے اپنے عوام پر اتنے ظلم و ستم کیے۔ لوگوں کو ایسی
 ایسی اذیتیں دیاں کہ سزا میں سے کہلا کر کیا کہ تازہ
 میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے
 اپنے پھر سالہ دور حکومت میں ایک لاکھ سے زیادہ
 آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا
 کہ وہ کسی کو ایک دم ہلاک کرنے کا تالش نہیں تھا بلکہ
 وہ لوگوں کو تڑپا تڑپا کر مارا کرتا تھا۔
 اس زمانے میں تو ڈریکولا نے اپنے عوام پر بے پناہ
 ظلم و ستم ڈھائے مگر آج بھی ڈریکولا رومانیہ کے لیے
 آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ رومانیہ کے طول و
 عرض میں آج بھی بہت سے ایسے قلعے ہیں جہاں ڈریکولا
 مجرموں کو سزا میں دیا کرتا تھا۔ اب ہر سال لاکھوں سیاح
 ان قلعوں کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں اور ان سیاحوں
 سے رومانیہ کو سالانہ تقریباً پندرہ کروڑ روپے کی آمدنی
 ہوتی ہے۔
 ڈریکولا کا انسانی کردار ایتھ ڈریکولا کے مرنے
 نے بہت عرصے بعد تخلیق کیا گیا، ۸۹ء میں ایک برطانوی
 ناول نگار کریک اسٹوکر نے ایک ناول لکھا اور اس میں
 ڈریکولا کو مرکزی کردار بنایا۔ اس ناول نے اس قدر مقبولیت
 حاصل کی کہ بعد میں اسی کردار کو بنیاد بنا کر بہت سے

ناول لکھے گئے۔
 دنیا میں لوگ ڈریکولا سے خواہ کتنی ہی نفرت
 کیوں نہ کرتے ہوں مگر رومانیہ میں اسے قومی ہیرو و کا
 درجہ حاصل ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس نے
 رومانی عوام کے لیے بہت کام کیا تھا۔
 خوش نصیب
 یونان میں ایک شخص سوئین گزرا ہے۔ یہ ایک
 مانا ہوا مقصد فلسفی اور شاعر تھا۔ ایک بار قبرص کے
 بادشاہ کریکس نے سوئین کو اپنے ملک میں دیکھا۔ سوئین
 نے دعوت قبول کر لی۔ ملاقات کے دن بادشاہ اپنے پیش
 قیمت لباس اور ہرے جو اہر زیب تن کر کے سخت
 پر جلوه افروز ہوا اور بولے: شاہانہ طعراق سے سوئین
 کا انتظار کرنے لگا۔ سوئین آیا اور اطمینان دے کر نیابتی
 سے بادشاہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے بادشاہ کے
 جاہ و خرم اور سطوت و شوکت پر کوئی توجہ نہ دی۔ بادشاہ
 بے چین ہو گیا۔ اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ سوئین کو
 ہلاک کرنے والے دھکے جائیں۔ وزیر نے سوئین کے
 سامنے سوئے چاندی اور نعل و زنجیر دکھا دیے۔
 یہ چمک و دمک بھی سوئین کو متاثر نہ کر سکی۔ وہ بے پروا
 بیٹھا رہا۔ بادشاہ سے نہ لگا۔ اس نے بلند آواز
 سے سوئین کو مخاطب کیا:
 ”سوئین! تم یونان کے نامور فلسفی ہو۔ بتاؤ تہکے
 نزدیک دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی کون ہے؟“
 سوئین نے تردید کے بغیر جواب دیا:
 ”بادشاہ! میرے ملک میں نینس نامی ایک آدمی
 بہت خوش نصیب تھا۔ وہ بہادر، نیک، صاحب
 نصاب اور اچھے بچوں کا باپ تھا۔ اس نے اپنے وطن
 کی خاطر لڑتے لڑتے جان دے دی۔“
 اس کے بعد دوسرا خوش نصیب کون ہے؟“
 بادشاہ نے دریافت کیا۔
 سوئین نے جواب دیا:
 ”دو بھائی سب سے زیادہ خوش نصیب ہیں۔
 انہوں نے ماں کی خدمت کرتے کرتے جان دے دی۔“

بادشاہ آگ بگولا ہو گیا۔
 یہ کیا تم ہمیں خوش نصیب نہیں سمجھتے؟
 ”خوش نصیب وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ خوش
 نصیبی زندگی کے آخری لمحے تک ہے۔ سوئین نے
 وضاحت کی۔
 ”جس کی زندگی ابھی ختم نہ ہوئی ہو اس کے متعلق
 کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ انسان کی زندگی ہمیشہ ایک
 حالت پر برقرار نہیں رہتی۔“
 بادشاہ مشتعل ہو گیا۔ اس نے سوئین کے ساتھ
 انتہائی نفرت و حقارت کا سلوک کیا۔
 بعد میں شہنشاہ سائرس نے قبرص فتح کر لیا اور
 بادشاہ کریکس کو زندہ جلائے گا۔ حکم دیا کہ کریکس
 کو جلائے کے لیے کٹر یوں پر بٹھایا گیا۔ اس کے منہ سے
 ایک دروناسک چیخ بلند ہوئی۔
 ”ہائے سوئین!“
 فاتح بادشاہ نے ہاتھ اٹھا کر رروائی اچانک
 زکوا دی اور کریکس کے قریب جا کر سوال کیا۔
 ”ہائے سوئین سے تمہاری کیا مراد ہے؟“
 کریکس نے پورا واقعہ بتا دیا۔ فاتح بادشاہ
 یہ واقعہ سن کر مغلوب ہو گیا۔ اس نے کریکس کی
 جان بخش دی اور اس کے ساتھ عزت و کرم سے پیش آیا۔
 توڑک جہانگیری سے
 جہانگیر رقم طراز ہے۔
 سلطان نصیر الدین اپنے مزارع کی گرمی دور کرنے
 کے لیے بسا اوقات پانی میں بیٹھا رہتا۔ ایک دن وہ
 ایک گھر سے عرض میں ڈوبنے لگا۔ چند خادموں نے
 اسے بچا لیا۔
 جب وہ جوش میں آیا تو اس نے ایک خادم کے
 ہاتھ قطع کر دیے۔ اس خادم نے اسے سر کے بالوں سے
 پکڑ کے پانی سے باہر نکالا تھا۔ سلطان نے اسے ٹوٹے
 ادب سمجھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ ڈوبنے لگا تو کسی
 نے پانی سے باہر نہیں نکالا۔ وہ ڈوب کر مر گیا۔ اس
 کی موت کے ایک مہینے بعد ہم نے اس کی گلی شری

نفس جلا دینے کا حکم دیا پھر سوچا کہ اس کی ناپاک
نفس جلا کر اس کی لطافت کیوں کم کی جائے۔

دور کا شاگرد

افلاطون جس جگہ شہزادگان اور امراء کے لڑکوں
درس دیتا تھا وہ اکاڈمی کہلاتی تھی۔ اس اکاڈمی کے لیے
افلاطون کو ایک لڑکے کی ضرورت پیش آئی جو اس کے
شریک درس شہزادوں اور امراء کے لڑکوں کو پانی پلانے
کی خدمت انجام دے سکے۔ اس کام کے لیے ایک لڑکا
رکھ لیا گیا جو کچھ افلاطون کی درس گاہ میں کوئی معمولی
لڑکا جگہ نہ پا سکتا تھا اس لیے جب وہ درس دینے کے لیے
کھڑا ہوتا تو اس لڑکے کو اکاڈمی سے باہر چلا جانا پڑتا
اور دروازے اندر سے بند کر لیے جاتے پھر یہ لڑکا دروازے
سے باہر بیٹھ جاتا اور پانی لگا کر بیچتا اور پوری توجہ
سے افلاطون کا درس سنتا رہتا۔

درس کی تکمیل کے بعد ایک شاندار تقریب ہوتی
اس میں اس دور کے مشہور عالموں اور فاضلوں کو
شرکت کی دعوت دی جاتی اور یہیں ایک طرف طلباء
کے بچان اور سرپرست موجود ہوتے۔ لڑکوں کا
امتحان زبانی لیا جاتا۔ لڑکوں کو ایک موضوع دے
دیا جاتا جس پر انہیں گفتگوں زبانی تقریریں کرنا پڑتیں۔
ایک دفعہ ایسی ہی ایک تقریب منعقد ہوئی اور
افلاطون نے اپنے شاگردوں کو ”علم کی فضیلت“ پر بولنے
کی دعوت دی۔ شہزادے اور امراء نے باری باری آتے
اور کچھ دیر تقریر کر کے بیچوں سے محبوب ہو کر چپ ہو
جاتے۔ افلاطون بہت پریشان ہوا کیونکہ اس طرح
اس پر یہ الزام عائد ہوتا تھا کہ اس کی تدریس میں
شاہد محنت کی کمی رہی ہے۔ افلاطون کی پریشانی بھانپ
کر پانی پلانے والا لڑکا آگے بڑھا اور اس نے درخواست
کی ”مجھے اس موضوع پر تقریر کرنے کی اجازت دی جائے۔“
افلاطون نے حیرت اور لاپرواہی کی علیحدہ کیفیت
میں یہ کہہ کر اس کی درخواست مسترد کر دی ”تم نے
میں درس نہیں دیا اس لیے تمہیں تقریر کرنے کا موقع
نہیں دیا جائے۔“

لڑکے نے افلاطون کی پوری تقریریں سننے کی تفصیل

سنائی اور کہا۔
”میں نے آپ کی پوری تقریریں سنی ہیں یہ الگ
بات ہے کہ اس وقت میں اکاڈمی سے باہر دروازے
کی سیڑھیوں پر ہوا کرتا تھا۔“

جب افلاطون اپنے شاگردوں سے یوں ہو گیا
تو اس نے خدمت گزار لڑکے کو حاضرین کے سامنے کھڑا
دیا اور اس کا تعارف کرانے کے بعد کہا۔
”میں اس لڑکے کی تقریر کی ذمہ داری نہیں دے سکتا
لیکن یہ کتاب ہے کہ اس نے میری ساری تقریریں سنی
ہیں اس کی درخواست ہے کہ میں اسے تقریر کی اجازت
دوں شاید اسے یقین ہے کہ یہ اس موضوع پر تقریر
کر سکتا ہے۔“

اس کے بعد اس نے لڑکے کو تقریر کا اشارہ کیا۔ لڑکے
نے تقریر شروع کی اور کئی محنتوں علم کی فضیلت پر بولتا
رہا۔ افلاطون کا دل بڑھ گیا اور مجمع لڑکے کی قوت
گویائی اور علم کی فضیلت بیان کرنے پر حیران رہ گیا۔
جب وہ تقریر ختم کر چکا تو افلاطون نے حاضرین عقل
سے کہا۔

”حاضرین نے اس لڑکے کی تقریر سے اس بات کا بخوبی
اندازہ لگایا ہوگا کہ میری تدریس اور محنت میں کوئی
غامی نہ تھی بلکہ میرے شاگردوں میں جوہر قابل کی
کمی تھی۔ ان میں علم مضمر کرنے کی صلاحیت منفقہ تھی
لیکن جس میں یہ خوبیاں موجود تھیں اس نے وہ سب
کچھ حاصل کر لیا ہے جو میں اپنے شاگردوں کو دینا چاہتا
تھا۔“

تقریب کے خاتمے پر افلاطون نے اس خدمت گزار
لڑکے سے دریافت کیا۔
”کیا تم مجھ سے مزید درس لینا چاہتے ہو؟“

لڑکے نے جواب دیا۔
”میرے اشوق آپ پر ظاہر ہو چکا ہے۔ اب سوال کی
کوئی گنجائش نہیں۔“
اس کے بعد افلاطون نے اپنے خدمت گزار شاگرد
پر بہت زیادہ توجہ صرفہ کی۔ بعد میں یہ شاگرد تاریخ
عالم میں ”ارسطو“ کے نام سے عالمی شہرت کا مستحق
قرار پایا۔

کلیں سے خوشبو

تیغ باز

عمر بن معدی کرب بہادری اور تیغ زنی میں اپنا
قالب نہیں رکھتا تھا۔ اس کا قصار نامی تلوار اپنی
کاٹ میں بے مثال تھی۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے
اپنے دور خلافت میں اس سے صحابہ مستعارے کر
اپنی دوسرے شخص کو دے دی۔ یہ شخص کئی جگہوں سے
بزرگ جب والہ اس آیا تو حضرت عمرؓ نے شکایت کیا۔
”ایمیر المؤمنین! مجھے تو یہ تلوار عوامہ معلوم نہیں ہوتی
کیونکہ اس کی کاٹ ویسی نہیں ثابت ہوئی جس کا پورا
سننے میں آتا ہے۔“

حضرت عمرؓ نے عمر بن معدی کو بلا کر یہ شکایت
بہادری۔ عمر بن معدی نے صحابہ تلوار طلب کی اور
اپنے ہاتھ میں لے کر ایک اونٹ کی طرف بڑھا اور پھر
ایک ہی ضرب میں اس کے دو ٹکڑے کر دیے اور نہایت
اقتوس سے حضرت عمر بن خطابؓ کو مخاطب کیا۔
”ایمیر المؤمنین! میں نے آپ کو صرف تلوار بھیجی تھی
اپنا بازو نہیں بھیجا تھا۔“

آمنہ خان - خاتوا شریف

چھینکنے کے آداب

- ۱۔ منہ پر ہاتھ یا کچھ نہ رکھیں۔
- ۲۔ آواز کو پست رکھیں۔
- ۳۔ حاضرین سے منہ پھیر لیں۔
- ۴۔ الحمد للہ کہیں۔
- ۵۔ الحمد للہ کے جواب میں یہ جملہ اللہ کہیں۔
- ۶۔ اگر چھینکنے والا الحمد للہ نہ کہے تو حاضرین کو

چاہے کہ اسے یاد دلایں۔ یہ امر بالمعروف
کی ایک قسم ہے۔
۷۔ غیر محرم کو عورت جواب نہ دے۔
۸۔ طاہر عینا۔ کھاریاں۔

مضم

سکندر اعظم دنیا فتح کرنے کے لیے پھر رہا
تھا۔ اس نے ایک بہت بڑے ملک پر حملہ کیا
ارادہ کیا۔ وہاں کا بادشاہ سکندر کی فوج سے ڈرا
شکر رکھتا تھا مگر اس نے جنگ کے بجائے صلح
کے لیے پیش قدمی کی۔ سکندر نے اس کا نظیر قرار
دیکھ کر کہا۔
”اگر تیرے کے لیے آیا ہے تو اتنی بڑی فوج
لانے کی کیا ضرورت تھی معلوم ہوتا ہے تیرے
دل میں دغا ہے۔“
بادشاہ نے کہا ”سکندر! دغا کمزوروں کا شیوہ
ہے۔ مقدور وائے کبھی دغا نہیں کرتے۔ ایسی
فوج لانے کا مقصد یہ جتنا ہے کہ ہم کسی خوف
کی بنا پر اطاعت نہیں کرے ہیں بلکہ اس لیے کہ
ہم سے ہیں کہ فی زمانہ تیرا اقبال بلند ہے۔“ سکندر
نے صلح کا ہاتھ بڑھا دیا۔

بادشاہ نے سکندر کے اعزاز میں ایک بڑے تکلف
ضیافت کا اہتمام کیا۔ سکندر کو ایک وسیع مریض
خیمے میں لایا گیا اور بیش بہا لعل و جواہر زین خرواف
میں بھر کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ بادشاہ سے
کہا ”سکندر اعظم! کھائے۔“
سکندر نے حیرت سے کہا ”لعل و جواہر انسان

کی غذا نہیں ہیں؟
بادشاہ نے پوچھا: پھر آپ کیا کھاتے ہیں؟
» وہی اجناس جو انسان کی غذا ہیں۔
بادشاہ بولا: تعجب ہے۔ کیا وہ اجناس آپ
کے ملک میں نہیں ملتیں؟ آپ قدر رنج و مصیبت
برداشت کر کے دنیا بھر میں پھیر رہے ہیں اور اپنے
علاوہ بے شمار مخلوق کو غدا میں مبتلا کیے ہوئے
ہیں۔ آخر کیوں؟
سائراہ امین ملک - گلشن مثنوی

جواب

ایک مرتبہ عبداللہ بن زبیرؓ نے پہلیں میں دوسرے
بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ وہاں سے حضرت
عمرؓ ان خطاب کا گزر ہوا تو سب بچے بھاگ گئے
اور یہ کھڑے رہے تو حضرت عوفؓ نے دریافت کیا۔
» تو اپنے دوستوں کے ساتھ نہیں بھاگا؟
انہوں نے جواب دیا: اے امیر المؤمنین! میں
نے کوئی جرم نہیں کیا تھا کہ بھاگتا اور لڑتا رہتا
کوئی تنگی نہیں تھی کہ آپ کے لیے گنجائش نہ ملنے
کی ضرورت ہوئی؟

عذرا ناصر - کراچی

فیاضی

حضرت ابراہیمؑ اس وقت تک کھانا تناول
نہ فرماتے تھے جب تک کوئی مہمان دسترخوان
پر موجود نہ ہوتا۔ ایک دن کوئی بھی مہمان نہ آیا
تو آپ تلاش میں نسبت سے باہر گئے۔ وہاں ایک
لوٹھارا گھیر جا رہا تھا۔ آپ اس کو لے گئے اور
اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا۔ لیکن کھانا ترش
کرتے وقت اس نے اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا۔ حضرت
ابراہیمؑ نے دل میں ارادہ کر لیا کہ ایسے ناشکرے کو
آئندہ کبھی اپنے دسترخوان پر نہیں بلواؤں گا۔ اسی
وقت غیب سے آواز آئی۔
» اے ابراہیمؑ! اس بوڑھے نے ایک دفعہ شکر
ادانہ کیا تو تم نے آئندہ کے لیے اس کو نہ کھلانے کا

عزم کر لیا۔ خدا میری فیاضی کا اندازہ لگاؤ کہ پہلیں
نے کراب تک اس نے ایک دفعہ بھی میرا نام نہ لیا
لیکن آج تک میں نے اس کا رزق بند نہیں کیا۔
شمیتہ تبسم - علی

ناشکری

گر میوں کا موسم تھا۔ حضرت شیخ سعدیؒ دمشق میں
تھے۔ دوسرے کا وقت تھا۔ جس، پیاس اور تھکن سے
پریشان تھے۔ اس بڑے پر کہ جوتا سی ٹوٹ گیا اور اس
چھالے پڑ گئے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ سب
اکرام سے گھروں میں بیٹھے ہیں۔ ایک ہی ہوں کہ جوتا
نصیب نہیں۔

اپنی خیالات میں غرق جا رہے تھے کہ چلتے چلتے شہر
دروازے پر جا پہنچے۔ دیکھا کہ با در سے ایک اپنی فقیر
ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹٹی ہوئی تھیں اور وہ کہوں
بل کھشتا جا رہا تھا۔ اسے دیکھا تو فوراً دل کا حال بدل گیا
تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ کیا اور درجہ شکر الہی کے سہ
رے عرض کی: اے اللہ! میری غلطی تھی کہ میں تیری نعمتوں
غافل ہو گیا۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے پاؤں سلامت
اور اس اپنی فقیر کی طرح مجھے زمین پر گھسٹنا نہیں پڑنا
ارشاد ہوئی کہ: دیکھا کا خیال آئے تو اپنے سے کہہ دو
دیکھو تاکہ اطمینان حاصل ہو اور ناشکرے نہ ہو۔ نیک اعمال
خیال آئے تو اپنے سے اچھوں کو دیکھو تاکہ زیادہ اچھا
پیدا ہو۔

اقوال بزرگمہر

مجھے بطور شفقت و نصیحت اور ادب سکھانے کے
نصیحت دینے والوں نے نصیحت دی اور عقاب
واووں نے وعظ کیے لیکن میرے بڑھاپے میں
کسی نے نہیں کیا اور میری عقل جیسی کسی نے
نہیں کی۔
= میں انکاروں پر جلا اور گرم برکت کو میں نے ہاتھ
میں نے غصے سے جب کہ وہ مجھ پر قابو پالے کہ
زیادہ گرم نہیں دیکھی۔

استاد کی عزت

جب سکندر اعظم یونان کا فرماں روا بنا۔ اور بڑے
بڑے ملک فتح کیے۔ تو جشن فتح میں اس نے اپنے
استاد کی اس طرح تعظیم کی کہ ان کے استقبال کے لیے
پایا وہ نکل آیا۔ اس کا استاد کی سواری کے ساتھ چلا رہا۔
اور ان کو بڑے عزت و احترام سے اتارا اور اپنی
منبر پر جگہ دی۔ کسی نے سکندر سے کہا۔
» آپ نے اپنے استاد کی ایسی تعظیم کی کہ اپنے
والد کی بھی اس طرح بھی نہیں کی؟
سکندر نے جواب دیا۔
اس لیے کہ میرا باپ تیری فانی زندگی کا سبب
ہے اور میرا استاد تیری اس زندگی کا جو باقی رہے
گی اور فنا نہ ہوگی؟
فرزانہ نذر - گجرات

دلیل

انسان کا فصول شوق میں وقت کھو دینا اس امر
کی دلیل ہے کہ اللہ اس سے خفا ہے انسان اپنے
مقصد تخلیق کے خلاف ذرا سا وقت بھی
صرف کرے گا اسے اس پر پھٹنا پڑے گا۔ چالیس
سال عمر ہو جانے کے بعد بھی اگر بھلائیوں براہیوں پر
غالب نہ آجائیں تو پھر انسان دوزخ میں جانے کے لیے
تیار ہو جائے۔

فرحت اجل - بخاری - ساکھڑ

حاضر و ماضی

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ بہت
صغیر بزرگ اور امانت دار خاتون تھیں۔ اس لیے
اکثر لوگ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوا دیتے تھے۔
ایک دفعہ دو آدمیوں نے کپڑوں سے بھرا ہوا صندوق
آپ کے پاس بطور امانت رکھوا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد
ایک آدمی نے اگر صندوق طلب کیا تو آپ نے صندوق

میں نے ابھو اکھایا اور کڑوی چیزوں کو پیا کر مٹا دی
زیادہ کروا کسی چیز کو نہیں پایا۔
دنیا کی مصیبتوں کا سچا حصہ زبان کا پیدا کردہ ہے اس
کے ماضی کلام و طعام ہیں۔
رسماء اسحاق - گوجرانوالہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
» جب کوئی شخص کسی سے کوئی بات کہے (یعنی ایسی
بات جس کا اخفاہ پسند کرنا ہے) اور پھر وہ چلا جائے
تو وہ امانت ہے (یعنی سننے والے کے لیے امانت کی مانند
ہے اور اس بات کی حفاظت امانت کی طرح کرنا
چاہیے)۔

اقوال زریں

6 جب تجھے ہماری کر کے خوشی ہو اور برائی کر کے
پچھتاؤ تو قوموں سے۔
(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)
6 اپنا کام دوسروں کی کمکہ یعنی سے تنگ اگر
بند نہ کرو۔
(بابا فرید)
6 خاموشی نفرت کے اظہار کا سب سے اچھا طریقہ
ہے۔
(برنارڈ شا)
6 صبر کرو! آسو پوچھو اور اپنے چہرے سے علم کو
نمایاں نہ ہونے دو۔

6 میں خوش رہتا ہوں کیونکہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا
(خلیل جبران)
6 جس پر نصیحت اثر نہ کرے وہ جانے کے لیے ایمان
سے اس کا دل خالی ہے۔
(حضرت ابو محمد)
مریم معید - کراچی

اس کے حوالے کر دیا کہ عرصے بعد دوسرا آدمی آیا اور صندوق طلب کیا تو آپ نے کہا۔

"میں تمہارے ساتھی کو صندوق دے چکی ہوں۔"
اس شخص نے کہا: جب ہم دونوں نے ساتھ رکھو یا تھا تو پھر آپ تے میری موجودگی کے بغیر اس کو صندوق کیسے دے دیا؟

اس شخص سے امام شافعیؒ کی والدہ کو نہایت ہوتی اور دل میں سوچا۔ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ دراصل ان آدمیوں نے صندوق رکھوایا اور یہ شخص یہ

چاہتا تھا کہ وہ پہلے صندوق اٹھا لے اور دوسرا جانے۔ پہلا کامیاب ہو گیا اور دوسرا بھی آپ کی نہایت کو دیکھ کر دل میں خوش ہوا کہ خاتون مجھے اس صندوق کا معاوضہ دے گی۔

اسی وقت امام شافعیؒ گھر آگئے اور والدہ دریافت کرنے کے بعد اس شخص سے کہا۔

"تم تمہا کیوں آگئے اپنے ساتھی کو ہمراہ کیوں نہیں لائے۔ جاؤ اپنے ساتھی کو لے کر آؤ پھر تم دونوں کو وہ صندوق دے دیا جائے گا۔"

یہ سن کر وہ شخص خرمندہ ہو گیا۔

عاصمہ بخاری۔ دھرم پور

کرن کرن خوشبو

جو شخص انتقام کے طریقوں پر غور کرتا ہے اس کے زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔

(بلوعلی سینا)

علم دل کو اس طرح زندہ کرتا ہے جیسا کہ بارش زمین کو۔

(حکیم لقمان)

بڑی محبت سے تنہائی بہتر ہے۔

جو شخص لالچ و رشیدہ رکھتا ہے وہ گویا اپنی سلامتی کو اپنے جیفے میں رکھتا ہے۔

(حضرت عرفادوقؒ)

دنیا میں ہر چیز کے دورِ بھستے ہیں پھر کیوں نہ ہمارے رنج پر توجہ منڈول کریں۔

صائمہ سلیم۔ کورنگی لکڑی

منہری باتیں

۱ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ اس بات کو بار بار سننا چاہتا ہے جو اسے پسند آئے۔

۲ محبت خریدی نہیں جاسکتی۔ دینے والا یا اپنا دل مفت دے دیتا ہے یا پھر کسی قیمت پر نہیں دیتا۔

۳ طاقت کا گھمنڈ انسان کو شیطان بنا دیتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ جب چھوٹی تو کبرنگ

جائیں تو اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔

۴ آنکھیں بند کر لینے سے سورج کی روشنی کم نہیں ہوجاتی۔

۵ کبھی کبھی امیری کے حیر سے بزدل لوگ جہنم لیتے ہیں۔

۶ مکر و فریب پر چپکانی ہوئی مناس کا دوسرا نام چالوئی ہے۔

۷ جو شخص بات کرنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھتا ہے اس کی بات ملنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھ لینا چاہیے۔

۸ بے سلیقہ بات کرنے سے خاموشی بہتر ہے۔

۹ جو آدمی اپنی عظمت کا ڈھول بجاتا ہے وہ ڈھول کی طرح اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔

رہا ب علی۔ کھلا بیٹ ٹاؤن شپ

حاصل

امام اصمعیؒ بوزے ہو چکے تھے لیکن صحت و توانائی قابل رشک تھی۔ کسی نے پوچھا: حضرت آپ کی عمر کیلئے؟

اصمعیؒ نے جواب دیا: "ایک سو بیس سال"

اس شخص نے حیرت سے کہا: اول تو اتنی عمر ہر ایک کو نہیں ملتی اور دوم آپ کی قابل رشک صحت و توانائی آخر اس کا کیا راز ہے؟

اصمعیؒ نے جواب دیا: اس کا کوئی راز نہیں۔ زندگی کی قاتل ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے حسد۔

میں زندگی بھر حسد سے دور رہا ہوں۔

اجمر۔ لورے والا

☆

دکھائی جیل



یہاں خاتمہ ملتا کہنت سے رنگس خان کا ہے۔ کبھی ہیں۔ میں آپ کے ڈائجسٹ شعاع میں مستقل خلوت کثابت کرنا

چاہتی ہوں۔ آپ کا شعاع میرا پسندیدہ ترین رسالہ ہے۔ میں تقریباً چار سال سے اس کی مسلسل قاریہ ہوں۔ آپ قلم جانیں کہ

کنا نا گھائے بغیر تو رہ سکتی ہوں لیکن اگر شعاع کا تازہ شمار نہ ہوں تو ادھر سے بن کا احساس ہوتا ہے۔ میری تمام کٹرز

شعاع کے تازہ شمارے کا شدت سے انتظار کرتی ہیں۔ سب کا یہ ہے جیسا ہی حال ہے۔ کیونکہ شعاع میں ایسا جاوہ ہے جو

پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں ایسا لے لے کر پھر چھوڑتا ہی نہیں میں اس سے پہلے ہی بے شمار خطوط لکھ چکی ہوں بھر بھاری

رضیت جی مجھے بہت دکھ سے کہنا پڑا ہے کہ میرے تمام خطوط آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی شاید رڈ کی ڈکری کو سدھار

گئے۔ چار سال سے میرے کسی خط کا جواب نہیں ملا۔ میرے اس خط کو رڈ کی ڈکری کی نذر مرمت بھیجے گا۔

پیارے رئیس! یقین کرو کہ یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ آپ نے بے شمار خط لکھے اور ایک خط بھی ملکر نہ پاسکا۔ ایسا ہوتا

تو ہمیں ہے۔ غورنا ایک دو خطوں کے بعد باری آجاتی ہے پھر مل معذرت خواہ ہوں۔

شعاع کے متعلق آپ کی پسندیدگی جان کر دل کی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی یہ پسندیدگی بیش قائم رکھے۔ آمین۔

ثمینہ خان، پریٹ آباد سے لکھی ہیں۔

سب سے پہلے مرموق بہت اچھا تھا۔ ٹائٹل پر موجود شخصیت کا ایک آپ زبردستی تھا۔ دھبے کے شمارے میں

اشعار میں اپنا نام دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ سب سے پہلے مابا جی کا اک دیا جائے کہنا "بہت اچھا جارا ہے" جو

مابا جی بلڈ فیروز اور صبا کو ملوا دیجئے، اگر صبا کی شادی ہیں اور میری تو میرا دل اس ناول میں نہیں گئے گا۔

نہم کرنا، انار سے ڈوب جاتے ہیں۔ مجھے پسند نہیں ہے مرقول میں طویل کر رہی ہیں۔ پہلی قسط تو بالکل بور

مندی۔ اب نذا سٹوری ٹی وی علی صاحب مرگے۔ اور بھی دل آجات ہو گیا۔ ماہ پارہ باز سے بڑھاپے میں مکروری۔ ساڑو

کرنے کا طریقہ بتادیں۔ میں ہر صورت میں حیدر ناچا کرتی ہوں۔
 باقی، میں، شاعری کو لیتی ہے، میں اپنا بہت ہی خوبصورت
 انتخاب بھیجا جاتی ہوں۔
 نفرت ہیں، فائز کے امتحان میں شاندار کامیابی پر
 ہماری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ ہماری دیکھنے کے
 اللہ تعالیٰ آپ کو ہر میدان میں ایسی کامیابیوں سے نوازے۔ آج
 آپ کے حاضر شاگرد ہوئے کہ اس کا بھی دل شاعری
 ہے۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ آپ اپنے بھائی جان سے کہہ دیں
 کہ وہ آپ کو ہر ماہ باقاعدگی سے شعاع لادیا کریں۔

اک لڑکی یا لڑکی یا لڑکی، اس کے لیے آپ مکتبہ عمران ڈانٹ
 ۲۷ اردو بازار راجی کے نام خط لکھ دیں۔ وہ آپ کو ناول
 حاصل کرنے کا طریقہ بتادیں گے۔
 شاعری سچ لکھتی ہے، اس کے لیے انتخاب ضرور ہوجو
 لیکن شرط ہے کہ شاعری اچھے شعور کے مجموعہ کے انتخاب
 کی گئی ہو اور اس سے پہلے ہمارے اہل شاعر نہ ہوئی ہو۔

انعم منظور سیال، تھوڑا سا ہندو سے لکھتی ہیں۔
 اس مرتبہ مکتبہ عبدالغنی باری جیت میں پہلے نمبر
 سے میں نے انہیں فورٹ ۲ قرار دیا تھا لیکن اس مرتبہ
 وہ پھر فورٹ ۱ سے آرٹ فورٹ ہو گئی ہیں۔
 ناول میں سیر آئے، کنائے ڈوب جاتے ہیں، اس کے گرد
 وکڑی اسٹینڈر ریٹیں، کیا خیال ہے سیر آئے اس کے لیے
 کہ جاب میں کیونکہ وہ قسطوں میں ختم ہو جاتی جیسے غلے
 خط میں ماما ملک کا اک دیا جلائے رکھنا، کا ذکر کرتا
 گز ہوگا۔ اس مرتبہ بھی ناول بہت دل کو مچایا۔
 مستقل سلسلوں میں مجھے، شاعری سچ لکھتی ہے، اور کھلت
 کسی پر کیوں میرے دل کا معاملہ پسند ہے اور اس مرتبہ انداز
 بیان ایسا، دھڑے کر آپ نے بہت نظر کیا ہے ہم پر آئندہ
 شیاں رکھیں گے، غلوں غلوں میں صرف ایک غزل پسند
 آئی۔ اور وہ بھی اقتدار اسلام انجمن کی، کیونکہ عذرا بھول کی غزل
 پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ اور لکھیں گے وہ نہیں ہیں۔
 انعم ہیں، شاعر کے پسند کی پر مشورہ۔ انداز بیان اپنا
 اس ماہ شامل ہے۔ پڑھ کر جانے لگا کہ اس ماہ کے شاعر آپ
 کو کیسے لکھتے۔

شانی اینڈ فائز، بہاول پور سے لکھتی ہیں۔
 باقی ہم دونوں بہتیں شعاع کافی عرصے سے پڑھ رہی ہیں
 مگر غلط کھینکے کی جھارت، جہلی بار کی ہے۔ امید ہے مایہ س
 نہیں کریں گی۔
 ناولوں میں سب سے پہلے ماما ملک کا ناول اک دیا جلائے

لکھنا، پڑھا جو کہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ جن کہانیوں سے زیادہ
 متاثر کیا ان میں سے تم یاد آئے، اور کنائے ڈوب جاتے
 ہیں، بہت اچھے ناول تھے، شعاع کا ہر شاعر ہی تقریباً بہت
 اچھا ہوتا ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔
 شانی اور فائز، بہن، تعریف کا شکریہ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا
 اگر آپ نے انھیں سمجھ لیا ہوگا۔ اور تعریف کے ساتھ ساتھ ان
 تحریروں کا بھی ذکر کیا ہوگا جو آپ کو پسند نہیں آئیں۔

غزینہ نقر قریشی نے شاد سے لکھا ہے۔
 شعاع دیکھا کہ آخری شمارہ خوبصورت تحریروں سے
 تاج و جگر کوئی بات میں آیا تھا میں نے اعتبار سرورق کی
 جامعہ لکھیں، سرورق پر مادل گول اچھی لگ رہی تھی۔
 حمد و ثناء پڑھ کر روح سرشار ہوئی۔ جبکہ میرے نبی کی
 بیماری یا میں واقعی بہت چھاتیں جو انھوں نے رستہ دل
 میں لکھ رکھی۔

دستک کے سلسلے میں اطہر شاہ خان اور قمر خان سے
 بات چیت پسند آئی، پھر مکتبہ عبداللہ کا مکمل ناول لکھ
 محمد سیال سدا پڑھا۔ ویسے تو ناول بہت خوبصورت تھا۔
 مگر چند باتیں جیت میں مبتلا کر لیں، ۱۰ ناول کا کردار، احسن
 زار صاحب کے تقریباً تک کیے جاتے تھے۔ پھر وہ اسے جلتے
 تک نہ تھے۔ صرف اس کے سڑ کرنے سے کسی کے بارے میں
 اتنی معلومات حاصل نہیں ہو جاتی۔ ۲۔ جب وہ جان چکے
 تھے کہ زار صاحب شادی شدہ ہیں تو پھر ہر مرتبہ میرے انتقام پر ہندو
 دیکھنے کی وجہ سے نہیں آتی۔ ۳۔ ناول کے کردار حسن بزوافی
 صاحب نے میگزین تو ایسے سنبھال کر رکھا تھا جیسے انہیں نہیں
 ہو کر ان کی دوبارہ زار صاحب سے ملاقات ضرور ہوگی۔
 فاطمہ غزینہ کا مکمل ناول بس ٹھیک ہی لگا۔ جبکہ ساڑو یا میں
 راؤ کا ناول تم یاد آئے، وہ مڈل ٹریڈ ثابت ہوا۔

ماما ملک صاحب کا ناول اک دیا جلائے رکھنا، کامیابی
 کی جانب کا مزمن ہے۔ جبکہ نیم آئینہ کے ناول، کنائے
 ڈوب جاتے ہیں، کی دوسری قسط نے بھی خاصا متاثر کیا۔
 باتوں سے خوشبو لگے، مسکرائیں، کھل گئی کسی پر کیوں ہے
 دل کا معاملہ، خط آپ کے، تمام سلسلے خاص طور پر بہت اچھے
 لگے۔ کی جانی میری طرف سے آپ کو نیا سال بہت بہت
 مبارک ہو۔

غزینہ، بہن، شعاع آپ کو پسند آیا، اس کے لیے بہت دل
 سے مشکور ہوں۔ آپ نے اتنی بار ایک جہتی سے ناول پڑھا
 اس کے لیے شکریہ، یہی اعتراضات کی بات تو بھی جن کے
 بدلے صادق ہوں وہ منزل تک پہنچ ہی جاتے ہیں اور احسن
 نے میگزین بھی اسی جذبے کے تحت سنبھال کر رکھا تھا کہ زارا سے

میں دیکھیں ملے کی ضرور۔

اہلو، پورے والے لکھتی ہیں۔

رضعیہ، جھڑی، ہندو سے لکھ رہی ہے، ہندو مہاتما
 شعاع ہر لحاظ سے صحیح سبق آموز تقریباً کہانیوں اور بہت
 سے لوگوں سے ملاقات، اچھی باتوں کی خوشبو تیار۔ پیادری
 باری مسکرائیں، منے منے کے کیوں، پیارے نبی کی
 باتیں، بیوی کا بیڑ، باذوق لوگوں کی شاعری اور چٹ پٹی
 فرس فرا ہم کو تار، ساڑا سال شعاع کا شک بہت اچھا
 بارہا اب کے برس بھی دعا ہے کہ شعاع کے تمام خاتونین
 ہاں کنان شعاع اور تمام امت مسلمہ کے لیے یہ سال اپنے جلو
 میں نئی خوشیاں لے کر گئے۔

دوسرے شعاع کا ٹائٹل میں سو سو تھا۔ اس امینی صلیب
 کا نام تو تھا، ساڑو یا میں راؤ کا ناول، تم یاد آئے،
 حسب معمول بہترین تھا۔ ناول افسانے کے مزمار سارا سال
 ہی اپنی مثال آپ تھا۔ زہرہ، کہانی کو اچھے پڑھا میں۔
 اور دوسرے کنائے سے پڑھ کر اس میں پڑھ کر، عام سے
 کوئی نیا ناول لکھیں۔ ماما ملک صاحب بھی بہت سولو جہتی
 ہیں۔ سب کو نیا سال مبارک۔
 امیر، بہن، اُسے سال کے لیے آپ کی دعاؤں کا شکریہ۔
 افسانہ اللہ آئے والا سال ہم سب کے لیے خوشیاں لے کر
 آئے گا۔

متعلقہ معنی میں، نگ آپ کی دلے ان سطور کے ذریعے
 پہنچانی جا رہی ہے۔

ایف، جے عاصی، لکری سندھ سے لکھتی ہیں۔
 دیکھنا شمارہ کافی تازہ سے ملا، سرورق تو بالکل غزل
 تھا۔ اپنے پسندیدہ ناول کی طرف آتے ہیں۔ اک دیا جلائے
 رکھنا، اچھا جا رہا ہے، مکتبہ ناول میں دلوں کی روشنی بخشنے
 دینا، ناپ پر ہوا۔ اندر شمع جڑی تھا مگر ناول اچھا لکھا تھا
 فاطمہ غزینہ کو مبارک باد، ناول کنائے ڈوب جاتے
 ہیں، میں سارے بارہا پڑھ رہی ہوں بہت فضا آ رہا تھا۔ باقی افسانے
 بس ٹھیک تھے۔

پروین شاکر کی شاعری کی کتابوں کا مجموعہ یا کوئی بھی

کتاب پروین شاکر کی شاعری کی جو بہت اچھی ہو، اگر آپ
 کو نام معلوم ہے کتاب کا تو پھر جواب میں لکھ دیجیے گا۔
 بہت نوازش ہوگی۔

عاصی، بہن، پروین شاکر کے کئی مجموعہ شائع ہو چکے ہیں
 ان کے تمام مجموعوں کو ماہ تمام کے نام سے کیات کی شکل
 دی گئی ہے۔ اس سے استفادہ کر سکتی ہیں۔

میں انہوں سے کہ سرورق آپ کو پسند نہیں آیا، آئندہ
 اس کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

فائزہ کوئل شریف، ہندوستان سے لکھتی ہیں۔

دوسرے شمارے میں اپنا خط بنا کر بہت انہوں ہوا۔
 اور زیادہ انہوں اس لیے ہوا کہ وہ خط میں نے ایکڑ امرتی
 بیماری کے دوران بمشکل وقت نکال کر لکھا تھا اور یہ خط بھی
 میں ایکڑا مکتبے دوڑا، ان لکھ رہی ہوں۔

شعاع مجھے ہر مرتبہ سے پیار ہے نبی کی بیماری
 باتوں کے بعد خاص کر زہرہ، جی اور ماما جی کے ناول کی وجہ
 سے۔ دیگر سلسلے بھی بے حد شاندار ہیں۔ تار کے کچھ روکن
 سے، انداز بیان اپنا، شاعری سچ لکھتی ہے وغیرہ۔ بھی سید
 زہرہ دست ہیں۔ اور ان سب سے مجھے کافی حد تک متغف

پیارے فائزہ، آپ نے امتحان کی مصروفیت میں وقت
 نکال کر خط لکھا لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ امتحانوں سے
 فارغ ہونے کے بعد شعاع کا مطالعہ کریں اور پھر میں تھوہ
 سمجھیں۔ کیونکہ پڑھانی سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ ہم
 آپ کے لیے دعا گو ہیں کہ آپ اچھے نمبروں سے کامیابی
 حاصل کریں۔

سعدیہ سعید، گوجرانولہ سے لکھتی ہیں۔

سرورق فاضلہ زبیب لگا۔ پڑھنا دیکھ، پڑھ کر اندازہ
 ہوا کہ سعدیہ حسین اپنی طلاق کے دھڑکے پہلا دیکھ کر
 کے باوجود جھٹلانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ کہانیوں کا ذکر
 کرنے سے پہلے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں کہ اچھا ہوتا اگر
 اس شاعر کے مخصوص فیہ قرار دے دیا جاتا کیونکہ اس کی ہر تحریر
 ہی دل کو چھیوٹی ہوئی محسوس ہو رہی ہے اور یہ آپ کی غزلوں
 کا شہرہ بولتا ثبوت ہے۔

ساڑو یا میں راؤ نے اپنی کہانی میں موضوع سے مطابقت
 رکھتے اشعار کا بڑا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ ساڑو یا میری
 بہت اچھی دوست بھی ہیں۔ لکھتی تو ہیں ہی اچھا دیکھنے میں
 بھی چھوٹی سی ناگزیر ہیں۔ اور شعاع کے سارے سلسلے
 بھی مجھے بہت پسند ہیں۔

سعدیہ، بہن، ارسلان کے پسندیدہ گی کا حکم ہے۔ اور ہم آپ
 کو بتا دیں کہ ہمارا ہر شمارہ خاص مہر نبی ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم ہر
 شمارے میں — آپ کے لیے خاص تحریروں کا انتخاب
 کرتے ہیں۔

ساڑو یا میں راؤ سے ابھی تک نہ ملاقات ہوئی ہے نہ
 ہی انہوں نے کبھی تصویر بھیجی ہے۔ ویسے ہمارا بھی اندازہ یہی
 تھا کہ وہ زیادہ بڑی نہیں ہوں گی۔

ہرم رئیس، میر بلور خاص سے لکھتی ہیں۔
 شاعر کا دسمک کا شمار ملازم سروق میں ہو گیا تھا۔
 ما مالک کا ناول پڑھا جو کہ ہماری ہیرویت کا شکر ہے۔ انہوں
 نے نیک کو برے حالات میں اٹھایا دیا ہے۔ لیکن اس کا کتنا
 ڈوب جاتے ہیں وہ بھی لیا ہی ہو گیا ہے۔ تم کو کچھ رہے
 تھے کہ انتقام ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ ساڑھے پانچ سو
 کا رقم یاد آئے بھی پسند آیا۔ اور سلسلے تمام ہی جا رہے
 پسندیدہ ترین سلسلے ہیں۔
 ناشی: اگلے ماہ میری شادی ہو رہی ہے۔ اور آپ
 کے شہر کراچی میں ہی آ رہی ہوں۔ آپ میرے اس نئے
 سفر کے لیے دعا کیجئے گا۔
 ہرم رئیس: شاعر کی پسندیدگی کے لیے شکر ہے قبول
 کریں۔
 تمام مصنفین تک آپ کی بلے ان سطور کے ذریعے
 پہنچانی جا رہی ہے۔ ان کی جانب سے شکریہ قبول کریں۔
 آپ کی شادی ہو رہی ہے۔ تو ہماری دعا ہے کہ آپ
 کا یہ نیا سفر خوشیوں سے معمور ہو۔ اور آئے والا نیا سال
 تمام لوگوں کے لیے خوشیوں کا پیغام لائے۔ آمین۔
 صائمہ ناز زوی: مندی بہاؤ الدین سے لکھتی ہیں۔
 اس مرتبہ ٹائٹل اچھا نہیں ہے۔ ایسے لگا جیسے زیورات
 کی نمائش کی گئی ہو۔ اپنی فی فریش چہرے دکھایا کریں تاکہ
 ہمارا مود بھی خوشگوار ہو جائے۔
 اس مرتبہ ناول افسانے پڑھ کر بالکل مزا نہیں آیا۔
 ناولوں میں نگہت عبداللہ کا لکھنا بہترین سدا
 کیجئے اچھا لگا۔ باقی ناولوں پر ہے۔ ما مالک کا ناول بہت
 زبردست رہا۔ ما مالک کی واقعی الماس نے رخصتے شادی
 کر لی ہے۔ یہ تو بہت بڑا ہوا۔ الماس کے لیے عثمان ہی
 ہو گیا تھا۔ جو بہت محنت کرتے تھے۔ لیکن آگے، کتنا
 ڈوب جاتے ہیں۔ یہ والی قسط کا زیادہ جاندار رہی۔ میرا
 قبول یا نہ کیے ان سطور و مباحث۔ مال کو بہت ہی زیادہ خوش
 دکھایا گیا ہے۔
 صائمہ: بہن آفتید کا ہم بالکل بڑا نہیں مانتے۔ بلکہ سچ
 پوچھیں تو ہمیں تعریف سے زیادہ تنقید بھی لگتی ہے بشرطیکہ
 معقول ہو۔ آپ کو ناولوں میں پسند نہیں آئے۔ لکھ دیجیں
 تو اچھا تھا۔ بہر حال آئندہ خیال رکھیں گے۔
 ٹائٹل کے سلسلے میں آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی
 ہے۔
 شاپن رشید: میں اختر کا انٹرویو کر چکی ہیں۔ شاید
 آپ کی تقریر سے نہیں گزرا۔ میں معین اختر انٹرویو میں
 اس لیے آپ کی یہ فرمائش پوری کر کے قلمبندی۔

صدا لیلیٰ نے فعل آواز سے لکھا ہے۔
 ناولوں میں سب سے پہلے زہرہ ممتاز کا ذکر کریں۔
 عدنان بیگ کا کردار آج کل بہت کم لکھا جا رہا ہے۔ زہرہ
 صاحبہ جویر پر اور عدنان کے بارے میں سوچیں۔ طارق
 کا رویہ رباب سے تنگ تھا لیکن نہ جانے کیوں پہلی قسط
 پڑھ کر اداس ہو گئے تھے۔ جب طارق علی رباب کو چھوڑ
 آیا تھا لیکن اس دفتر ما مالک کے ناول ایک دیا جگہ
 رکھنا کی قسط اچھی کی۔ لکھانے فیروز صاحب نیکر سے
 سیدار ہو رہے ہیں لیکن ادھر الماس نے رخصتے شادی
 کر کے عثمان کے ساتھ بہت زیادہ دینی۔ اپنی جے تو راز
 ہی اس کو راہ راست سے لایا نہیں گی۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں (وہ)
 اتنا کہہ دیا ہے) ناول میں کتنا بے ڈوب جاتے ہیں
 کی دوسری قسط پر مٹی کی موت اور ماہ پارہ کا فکس کر لی
 جلال سے حلقاں تو رحمت اخوں ہوا۔ اس کے علاوہ
 نگہت عبداللہ کا لکھنا بہترین سدا رہا۔
 صبا بہن اچھے افسانوں کے کہ آپ کا پہلا خط انہیں
 ہو سکا۔ افسانہ بھی پڑھا نہیں۔ اطمینان رکھیں قابل اشاعت
 ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔
 متعلقہ مصنفین تک آپ کا تبصرہ ان سطور کے ذریعے
 پہنچایا جا رہا ہے۔
 سعیدہ زہیر: انجاء اے لکھتی ہیں۔
 آئی ہے میرا پہلا خط ہے۔ میں بچے سات سالوں سے
 شاعر اور خاتون کی قاعدہ قاری ہوں۔ اب آتے ہیں
 شاعر کی شاعری کی طرف اس کے تمام سلسلے انھوں کو
 چندھیا دیتے ہیں۔ خاص کر شاعری سچ لکھتی ہے۔ اس میں
 بہنوں کا انتخاب لاجواب ہوتا ہے۔ اس ماہ لائبریری
 نمبروں میں اور صابن دوسرے نمبر پڑھ لکھنا سچی بہن
 میرے دل کا معاملہ میں شہر کا انتخاب لاجواب تھا۔
 تمام ناول اور کہاں کیا اچھی تھیں۔ نگہت عبداللہ میں وہ
 بات نہیں رہی۔ بہر حال آپ کی فرمائش ہے کہ دوسرے
 میں اسد اور لغمان انجاء کو بلا لیں۔
 سعیدہ: بہن اشعار کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ
 نے صرف خط شاعر نے پڑھنے کے دوسرے سات سال تک
 خط نہیں لکھا۔ دوسرے کا تو کچھ زیادہ طویل نہیں ہو گیا۔
 شاعری اور دیگر سلسلے پسند کرنے کا شکریہ۔
 اسد کا فیصلہ انٹرویو شائع ہو چکا ہے۔ لغمان اعجاز
 انٹرویو کی فرمائش جلد پوری کریں گے۔
 وحیدہ جاوید خان: ہر ضلع ساہیوال سے لکھتی ہیں۔
 باجی! تم کو تصور کرتے ہیں کہ یہ شاعر ہمارے لیکن باجی

ب کہ ہم نے صندی ہو گئی ہے۔ نہ خط شامل کرتی ہیں
 شاعری کا احوال شائع کیا میں نے اپنی دوست فیروزہ
 رقی کی شادی کا احوال نامہ جون ۹۹ء میں پوسٹ کیا تھا
 میں آپ نے رقی کی تذکرہ کر دیا۔ باقی کیا اس لیے کہ ہم
 ہونے سے گاؤں میں رہتے ہیں۔ رسل کے کیا تعریف کروں
 سب سے پیارا نسب سے عزیز ہے ہیں۔ اس میں ناول
 بہت اچھے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ما مالک کے ناول کا
 انتخاب ہی نہیں۔ اور میرے ہی کی پیاری باتیں "تو
 بہت پیاری ہوتی ہیں۔ اور افسانے کو سب ہی غضب
 کے ہوتے ہیں۔ اور شاعری تو دوسری غذا ہے۔ شاعر جیسی
 شاعری کسی کے پاس نہیں۔
 پیاری وحیدہ معدرت خواہ ہوں کہ آپ کی دوست کی
 شادی کا احوال اب تک شائع نہ ہو سکا۔ انشاء اللہ آئندہ
 ماہ مزدور شائع ہوگا۔ آپ کی یہ بات اچھی نہیں لگی کہ آپ
 چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہیں اس لیے آپ کے خط شائع
 نہیں ہوتے۔ چھوٹے گاؤں ہوں یا بڑے شہر اس سے کیا فرق
 پڑتا ہے۔ ہماری بہت سی مصنفین بہت چھوٹے سے گاؤں
 میں رہتی ہیں۔ اور ان کی تحریریں باقاعدگی سے شائع کی
 جاتی ہیں۔ یہیں تو شاعر میں لکھنے والی اور شاعر پڑھنے والی
 تمام باتیں یکساں عزیز ہیں۔
 ما مالک اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف
 پہنچادی گئی ہے۔ ان کی جانب سے شکریہ قبول کریں۔
 عطی نقوی عیسیٰ سے لکھتی ہیں۔
 ٹائٹل دسمک کی طرح ہے بچہ اچھا تھا اور اداس سا لگا۔
 پیار سے مٹی کی پیاری باتیں میں دانت درد کی دعا جیسی میں
 کتنے فورا پڑھتے ہیں اسے دانت پر دم کیا ڈانٹ کا درد
 غائب ہو گیا۔ سعیدہ جیانی کی اس بات پر مرانی ہوئی کہ
 طلاق ملنے کا انہیں قطعاً دکھ نہیں۔ فاطمہ عین کے ناول
 "دلوں کی رقصی مجھے نہ دینا" محبت کی غفلت پر ایک نیا مثال
 تحریر بھی مگر نمبر کے ساتھ زیادہ پوری کی۔ آپ کی بہنوں کے
 سحر جو ہونے کے لیے برائے ہو چکے ہیں۔ بہر حال پھر بھی اولیٰ
 غزل لکھ کر محبت قطب ستارہ کی جانب کیا بہترین
 تحریر بھی مردوں کی طویل شام کے واسطے۔ وہ تو ویسے ہی ہٹ
 کر لکھتی ہیں۔ عکاس ناول میں محبت کو جس انداز اور جس
 جس لکھتے ہیں انہوں نے دھال کر بیان کیا کہ ان کی فکر رائے
 صلاحیت ہے۔ زہرہ ممتاز نے جہاں رباب کو حود و جد
 قابل رحم بنا دیا ہے وہیں ارم صاحبہ کو کسی کے کہنے میں
 جین حتیٰ کہ باجی ان کے کہنے میں بھی نہیں۔ زہرہ ممتاز نے
 اپنے ناول میں جذبات اور رشتوں پر ایک کی حد تک
 دی ہے۔ ایک بار پھر دسمک کی طویل اداس اور سرد شاپن
 منتظر ہیں۔ سال کا آخری مہینہ بھی جس طرح سے بے بس گذرتے
 وقت کو دیکھتے ہیں کہ کیا ہو گیا یا۔ یونہی غموں میں سال

بچہ کا اضافہ ہو چکا ہے۔ مگر معدرت کی طرح مختصر سے پانی
 کی جھل کی طرح سالت ہے۔ میں ایک پیغام دینا چاہوں
 گی ان پڑھنے والوں کو کہ پلے زاپ جس سے محبت کریں
 اگلا ہے وہ قید و بند سے۔ مگر آپ اپنی محبت کو ہمیشہ
 غفلت رکھیں کہ کبھی تو خیر و خیر ہو جائے گی۔
 ہے۔ آپ اطمینان رکھیں آپ کا انتخاب مزید شائع ہو گا لیکن
 جو انتخاب آپ نے بھجوا دیا ہے وہ نہیں ملے گا آپ محبت کر کے
 اچھے شاعروں کا کام بھجوائیں اور ایسی نئی غزلوں کا انتخاب
 کریں کہ جو ہمارے ہاں پہلے شائع نہ ہوئی ہیں۔ سعیدہ جیانی
 نے یہ بات بالکل درست کہی طاقی اگرچہ جائزہ کماؤں میں سب
 سے زیادہ ناپسندیدہ چیز ہے۔ لیکن پھر رشتے ہمارے لیے
 ایسا عذاب بن جاتے ہیں کہ ان سے بچنا کا ملنے پر انسان سکون
 محسوس کر لیتا ہے۔ غزل لکھنا اور دیگر مصنفین تک آپ کی
 تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔ غزل لکھنا
 بے مثال مصنفین ہیں لیکن ان سے جیس ایک ہی شکایت
 ہے کہ وہ بہت کم لکھتی ہیں۔
 ہرم رئیس: سعیدہ مبارک لائی سے لکھتی ہیں۔
 جی کتاب رضیہ ناخن کی حال چال ہیں آپ کے، ارے
 ارے حیران نہ چولہ یہ میں ہوں آپ کی خاموشی لاڈلی
 جیسی (زیریں جی کی کہیں، بس اس دفتر یونہی
 دل چاہا کہ خاموشی کا قتل کھولا جائے۔ اور آپ سے ذرا بات
 چلی جاتی ہے۔ حالانکہ کتنے کی کوئی تحریر نہیں پڑھی شاعر
 کے علاوہ لیکن جو آپ خطوط کے جوابات اتنے سوئٹ
 اسٹائل میں دیتی ہیں مجھے پسند ہیں۔ پلے زاپ میں نے بھی
 بھی شاپن رشید کو نہیں دیکھا وہ بھی بڑی اچھی لکھتی
 ہیں۔ آپ پلے زاپ کی تقریر اور ان کا انٹرویو دیکھیں۔ میں
 تنقید ڈاکٹر کی اسکوڈٹ ہوں دیر الگ بات ہے کہ کھولے
 میرے تین مشوروں کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ حالانکہ میں
 بڑے زبردست مشورے دیتی ہوں) مجھے نگہت عبداللہ
 کی کہاں بلے حد پسند ہیں۔ اس ماہ بھی ان کا مکمل ناول
 یونہی پڑھ رہی ہوں۔ اس لیے حد پسند آیا۔ اور اس کے
 علاوہ مجھے سعیدہ عزیز انٹرویو کی فرمائش بہت
 پسند ہے۔ وہ اگر اپنی تحریروں میں عام سے موزون لکھی
 خاص بنا دی ہیں۔
 پیاری عطی عیسیٰ: ہرم سعیدہ! تم نے ادا کیا محبت خوش ہوئی۔
 یہ جان کر محبت ہوئی کہ تم قلم ڈاس رہی تھیں۔ بڑے خط سے
 تو لکھتا ہے کہ کبھی کر رہی ہوں۔ میں ایسا تو نہیں کر رہی
 سب سے چھوٹی ہوں اس لیے کہ دوائے ہمارے سچے مشوروں
 کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ سعیدہ عزیز انٹرویو بہت پیور
 اور پختہ انداز میں لکھی ہیں۔ حالانکہ میں بہت کم لکھتی
 ان کی حداد و صلاحیت ہے۔ شاپن رشید کی تقریروں کی فرمائش
 پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنی تقریروں کی
 اشاعت پسند نہیں کرتیں۔



دستک دستک

شاہین رشید

روینہ اشرف

کیسی ہیں روینہ؟

بالکل ٹھیک!

”میں تو کہوں ہی کہ ۹۰ سال کا تھا۔ اس سال آپ نے بہت اچھا کام کیا اور بہت ساری کامیابیاں حاصل کیں“

”میں نے؟“ بھی کون سی کامیابیاں حاصل کی ہیں؟

”سب سے کامیاب تو آپ کا پیس آئینہ“ ہی

رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کامیاب ڈیلے کیے ہیں؟

”ہاں یہ بات تو ہے۔ واقعی پس آئینہ کو بہت پسند کیا گیا اور ابھی بھی کیا جا رہا ہے“

لیکن پرواز آپ کا نام سیریل ہے البتہ آپ

اس میں بہت ہی گریس فلنگ کر رہی ہیں۔ اور سارا جی

آپ پر بہت سوٹ کر رہی تھی۔ خاص طور پر تیلی اور

میرون؟

”اچھا۔ بہت شکریہ۔ اور انڈیا کا بھی شکریہ۔“

کیا مطلب؟

”مطلب یہ کہ سب انڈیا کی سازشیاں تھیں اور

میرے جینیٹک تھیں اور کبھی زندگی میں میں نے سارا جی

بہنی نہیں تھی۔ اب سوچا کہ جو ڈیلے میں ای بہن

لوٹ

یعنی جینیٹک چیزیں اب کام آ رہی ہیں؟

”ہاں۔ اتنے سالوں کے بعد۔ اب کام آ رہی ہیں؟“

گزشتہ دنوں آپ کو طارق عین زشتو میں دیکھا

اور آپ کی باتیں سن کر مرزا یا کیونکر اتنی بڑی فکرا

ہونے کے باوجود آپ کے لہجے میں عجز و انکساری

تھی اور غرور کہیں نہیں تھا؟

”کو شش تو بہت کی ہے کہ ابھی چیزیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔ میں نے کو شش کی ہے کہ خود ڈائریکٹ کروں۔ کسی کی مدد نہ لوں۔ میرا سیریل مکمل طور پر ون میں تھا“ ہوگا۔ میرے شو ہر طارق نے میری مدد کی ہے میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں کہ خود دوسروں کے جھرو سے پر کام چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے آف سے لے کر یہ تک سارا کام خود کیا ہے؟

”پھر تو آپ پر کام کا بہت بوجھ پڑا ہوگا؟“

”ہاں بوجھ تو بہت پڑا۔ سارا کام خود کیا کسی کی مدد نہیں لی سوائے طارق کے“

”فکاروں نے کس حد تک تعاون کیا؟“

”فکاروں نے تو بہت زیادہ کوآپرٹ کیا ہے۔ میری کاسٹ نے اور میرے دیگر ساتھیوں نے اتنا

زیادہ تعاون کیا ہے کہ میں ایکسپلین نہیں کر سکتی۔

میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت انسان سمجھتی

ہوں کہ سب نے میرے ساتھ تعاون کیا۔ اور اب

مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے؟

”ہم حاضر ہیں۔ آپ ہمیں اپنے قریب ہی پائیں

گی؟“

سحر افضل

”کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟“

”میں نہیں ہوں اور ابھی ہوں۔ آپ سنائیں؟“

”آپ تو ایک سیریل کے بعد غائب ہی ہو گئیں؟“

”آپ کو یاد ہوگا، میں نے کہا تھا کہ اس سیریل

کے بعد شاید میں کام نہ کروں۔ بس اسی لیے غائب

ہو گئی“

”مگر آپ کو یاد ہو تو آپ نے کہا تھا کہ اگر اچھا

دول آفر ہوا تو ضرور کام کروں گی۔ کیا اچھا دول آفر

نہیں ہوا؟“

”بات کچھ یہ بھی ٹھیک ہے۔ بہت اچھا دول

آفر ہوتا تو یقیناً انکار کی گنجائش نہ ہوتی“

”اور آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟“

”اور آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟“



”پڑھائی کی مصروفیات ہیں اور ابھی تو سی اے

کافرٹ سمسٹر مکمل ہو چکا ہے۔ ابھی تو سی اے کرنے

کے لیے لمبی دوڑ لگانی ہے؟“

”ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے

ڈرامے میں تو مصروفیت کی وجہ سے نہیں آ رہیں لیکن

ایک کمرشل کی وجہ سے اب ابھی بھی ان ہیں؟“

”ہاں۔ کمرشل کی ابھی آفر آگئی تو کر لیا“

”ویسے بھی کمرشل آسان ہے؟“

”جی ہاں۔ کم خرچ بالائنٹین۔ یعنی وقت بھی کم خرچ

ہوتا ہے اور کم بھی معقول ملتی ہے۔ اس لیے میں نے

کمرشل کر لیا۔ اور کاری کے لیے وقت بہت خرچ ہوتا

ہے اور ابھی پڑھائی کی وجہ سے میں اتنا وقت آفر

نہیں کر سکتی“

لیکن ناظرین ایک مرتبہ پھر آپ کو اسکرین

پر دیکھنا چاہتے ہیں؟“

”انشاء اللہ ضرور واپسی ہوگی اور بہت اچھے دول

کے ساتھ ہوگی۔ بس سی اے ہو جانے دیجیے“

عبدالحمید (اداکار پروڈیوسر سندھ دے درمیان)
"مبارک ہو کر این ٹی ایم کی نشریات بحال ہو
گئی ہیں۔"

"شکر ہے۔ میں تو خود بہت پریشان تھا کہ کیا
ہوگا۔ کیونکہ جب ہمارا سیریل عروج پر تھا این ٹی ایم
کی نشریات ختم ہو گئیں۔ مزید دیر ہو جاتی تو اور
زیادہ پریشانی ہوتی۔"

"کیونکہ اس محدود زندگی میں لوگوں کو غول
جلنے کی عادت بھی پڑی ہے۔"
"جی ہاں۔ لیکن اچھا یہ ہے کہ ناظرین اس سیریل
کو نہیں بھولے ہوں گے اور اس کی مزید فساد کے
منتظر ہوں گے۔"

"اس میں شک نہیں کہ آپ کا سیریل بہت
کامیاب جا رہا ہے مگر کیا تنقید کا سامنا بھی کرنا
پڑا۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ صحافیوں کی طرف سے اور عام
لوگوں کی طرف سے کوئی تنقید نہیں آئی ہے۔ بلکہ لوگ
انتظار کے ساتھ اسے دیکھتے ہیں اور مجھے فخر کرتے
ہیں اور مبارک باد دیتے ہیں۔"

"ڈرامے میں جاپان کا کچ آپ نے بہت عمدہ
دیا۔ یہیں یاد ہے کہ سیریل "آوازیں" کی ایک بڑی
ٹیم لندن گئی اور وہیں بہت خرچ ہوا۔"

"جی ہاں "آوازیں" میں کروڑوں روپے خرچ کر
دیے گئے تھے مگر "آوازیں" میں آواز ہی نہیں
تھی کیونکہ ساری ڈنگ بعد میں کی گئی۔ مگر ہم
نے کم وسائل میں لندن بھی دکھایا اور جاپان
بھی۔"

"کہانی میں ساس کا رویہ کچھ تکلیف دہ ہے۔
ایسی سائیں ہونی نہیں چاہئیں؟"

"ہم نے ہمارے معاشرے میں تو یہ طرح
کی ساس موجود ہے۔ ہماری ساس عشرت باشتی صاحبہ
کو ہی لے لیجیے۔ وہ بھی تو ایسے ہی رول کرتی ہیں۔"
"مگر اس میں تو ان کا کردار خدا مختلف ہے؟"

"اس لیے کہ جو اس ہم نے ان پر چھوڑی تھی۔
کیونکہ گھر کی پروڈکشن تھی۔ لہذا انہوں نے سافٹ
کردار پسند کیا اور کہا کہ سلطان کو آپ سخت ساس
کا کردار دے دیں کیونکہ انہوں نے ابھی تک ایسا
کردار نہیں کیا ہے۔ چنانچہ ہم نے انہیں وہ کردار
دیا۔"

"ہمارا خیال ہے کہ عشرت باشتی صاحبہ حقیقی زندگی
میں بہت لہجی ساس ہوں گی۔"

"ظاہر ہے جی "بے ساختہ" بنتے ہوئے "میں تو
ڈراموں کی بات کر رہا ہوں۔ دوسرے واقعی وہ بہت
اچھی ساس ہیں۔"

"آپ کا ارادہ امر یہ کہ جا کر سیریل بنانے کا ہے۔
کچھ بتائیے اس کے بارے میں؟"

"میری پوری فیملی امریکہ میں ہے اور اس مرتبہ
انشاء اللہ فرج کو بھی (بیگ) میں نے جانس دینا ہے۔
کہانی میں میں نے دکھا ناچا رہا ہوں کہ چار بچے ہیں

ایک لڑکا ایک لڑکی اور دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ حال
ظاہر ہے عشرت باشتی صاحبہ ہوں گی اور اب تو ارادہ
یہ ہے کہ عشرت باشتی صاحبہ کا شوہر بھی ہم اپنے سنز کی
کو ہی دکھائیں گے۔ فرج سے میں نے کہا کہ ناپا کو لے

لیں گے تو پوری فیملی آجائے گی۔ میں نے سوچا کہ یہاں
پاکستان سے کسی آرٹسٹ کو لے جانے کے بجائے
ناپا کو ہی لے لیں تو کیا خرچ ہے۔"

"اداکاری سکھانا تو آپ کا کام ہے۔ سسر
صاحب کو بھی سکھا دیجئے گا۔"

"جی ہاں۔ انہیں بھی اداکاری سکھا دیں گے۔"
"اچھا یہ بتانے کے سیریل سے پہلے اور سیریل کے

درمیان جو ڈھیر سارے کمرشلز دکھانے جاتے ہیں
تو کیا آپ کو بھی اسپانسرز کرتے والے پیسہ دیتے
ہیں؟"

"اسپانسرز کی سہولت ہمیں حاصل نہیں ہے۔
یہ سہولت قوانین ٹی ایم والوں کو حاصل ہے۔ اسپانسرز

کا سارا پیسہ این ٹی ایم کے کھاتے میں جاتا ہے۔ حالانکہ
آپ دیکھیں تو ایک قسط میں تقریباً پچاس یا ساٹھ
اشتہار چلتے ہیں اور اس طرح انہیں ساٹھ لاکھ روپے

ایک قسط منافع دیتی ہے اور پورا سیریل تقریباً چھ
کروڑ روپے کا ہے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ این ٹی
ایم ہوا پی ٹی وی کتنا کماتا ہے؟"

"آپ سیریل خود ڈائریکٹ کرتے ہیں خود کام
بھی کرتے ہیں اس لیے کسی کی ہدایات کی ضرورت
تو نہیں پڑتی ہوگی؟"

"ایسی بات نہیں۔ ابھی بھی میں اپنے سیزنر کی
رہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور ہمارے سیریل

میں جو سیزنر کام کر رہے ہوتے ہیں ان کے تجربے
سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس اگر میں نہیں رہتے
کہ ہم ڈائریکٹر ہیں اس لیے ہم ٹھیک ہیں۔ ہم تو

فیملی کی طرح کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پروڈکشن
کے وقت مجھے کوئی ٹینشن نہیں ہوتی۔ اور آپ یقین
کریں کہ جنہوں نے میرے ساتھ کام کیا ہے وہ خواتین

کہتی ہیں کہ حامد صاحب ہم نے زندگی میں آپ جیسا
پروڈیوسر نہیں دیکھا۔ ہماری بہن اور آخری خواہش
یہ ہوگی کہ ہم آپ کے سیریل میں کام کریں۔ اس میں

سعدہ حسین انہوں ہیں۔ منشی خان نے کہا ہے کہ میں
آپ کو اسٹار کروں گی اور آپ کو اسٹار
کرنایا میری خوش نصیبی ہوگی۔ اس طرح کوئل رضوی نے

کہا کہ ہمیں انتظار ہے گا اس بات کا کہ آپ ہمیں
کب اپنے دوسرے سیریل میں جانس دیتے ہیں۔
اور یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔"

"کیا ڈراموں کا انسان کی زندگی پر اثر ہوتا ہے؟
"بالکل ہوتا ہے۔ اور اس کی ایک مثال میں

آپ کو دوں کہ میری خالہ ساس کے شوہر لندن گئے
ہوئے ہیں۔ تو ہمارے ڈرامے میں ایک سین تھا
جب سلطانہ ظفر معمر سے کہتی ہیں کہ جب شوہر گھر

سے باہر ہو تو آپ اسٹاک لگانے کا کیا جواز ہے۔
تو میری خالہ ساس نے اس جملے کو محسوس کیا اور۔

لب اسٹاک لگانا بند کر دی کہ جب میاں ملک
ہمیں باہر ہے تو میں کس کے لیے لب اسٹاک لگاؤں

تو اس حد تک لوگ ڈراموں کا خریدتے ہیں؟
"فرج کیسی خاتون خانہ ہیں؟"

"ماشاء اللہ بہت اچھی ہیں۔ شادی سے پہلے وہ بچن



میں نہیں گئی تھیں مگر ہم بھڑے دہلی والے لوگ
اچھا لکھا نا پینا ہماری عادت ہے چنانچہ میری والدہ
نے فرج کو کھانا پکانا سکھایا۔ اور اب فرج بہت
اچھا پکاتی ہیں۔ اور امریکہ جانے سے پہلے وہ ایک
مہینے کا کھانا پکا کر فریڈز کے گئی ہیں کہ میاں صاحب
کو کوئی تکلیف نہ ہو۔"

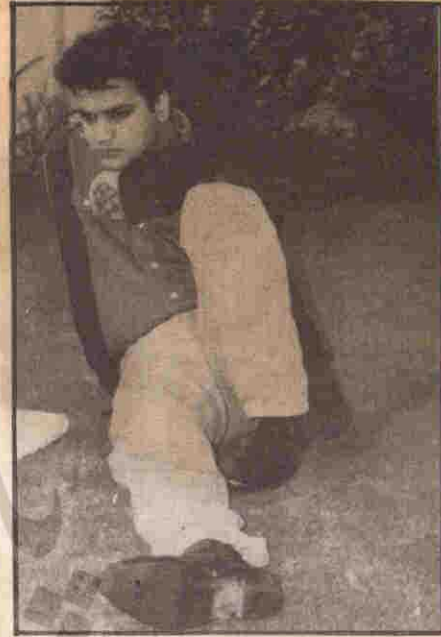
"فرج پروڈکشن میں کتنا تعاون کرتی ہیں؟"
"سارا کا فونش ان کے پاس ہوتا ہے۔"

"کام کی چیز تو ان کے پاس ہے۔"
"بے ساختہ" بنتے ہوئے "کام کی چیز ہے شک

ان کے پاس ہے مگر چیک تک میرے پاس ہے
بلینک چیک پر سائن کرا کے رکھ لیتا ہوں۔"

"فرج مزاح کی کیسی ہیں؟"
"نرم بھی ہیں گرم بھی ہیں۔ پروڈکشن میں وارڈروب

کا سارا کام فرج کے سپرد کیا ہوا ہے۔ جہازوں کی آؤٹ فٹنگ
کرنا، کھانا پکانا، دیگر انتظام کرنا فرج کے ہی ہاتھ



”میں ہے“
”فرخ کو بارصداں کھلاڑی کہہ سکتے ہیں؟“
”بالکل کہہ سکتے ہیں۔ اسکرپٹ بھی وہ ہی تھیک کرتی ہیں۔ کافی مدد کرتی ہیں۔ فرخ میری۔ اور ایک دوسرے کے تعاون سے ہی پروڈکشن ہو سکتی ہے۔“

یاسر اختر

”اے شاہن کیسی ہیں آپ۔ بڑے عرصے کے بعد بات ہو رہی ہے؟“
”ہم تو فون کرتے ہیں آپ ہی نہیں ملتے۔ کبھی کہیں ہوتے ہیں، کبھی کہیں۔ رنگ۔ بیگ بھی آپ نہیں کرتے؟“
”اوائی ایم سوئی۔ کچھ آتی زیادہ مصروفیت رہی کہ آپ سے بات نہیں ہو سکی۔ ویسے مجھے آپ کے فون کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔ بہر حال آپ سنائیں کیسی ہیں؟“

”اللہ اکرم ہے۔ آپ بتائیں کہ پٹال سینما پر شروع کر رہے ہیں یا نہیں؟“
”بالکل شروع کر رہے ہیں اور جب آپ ملک

سے باہر تھیں ہم نے پریس شو بھی کیا تھا اور صحافیوں کو اپنی کاوش دکھائی تھی۔ تو بس انشاء اللہ آپ جلدی ہی اسکرین پر ہمارے ڈرامے دیکھیں گی۔“
”اس مرتبہ اسکرین کس کی ہوگی۔ پی ٹی وی کی یا این ٹی ایم کی؟“

”اس مرتبہ انشاء اللہ آپ ہماری کاوش پی ٹی وی کی اسکرین دیکھیں گی اور اس مرتبہ ہم پی ٹی وی سے اس لیے پیش کریں گے کیونکہ پی ٹی وی کا سرکل بڑا ہے اور کئی ممالک میں دیکھا جاتا ہے اور ہم چاہتے بھی ہیں کہ اچھے ڈرامے زیادہ سے زیادہ لوگ دیکھیں۔“

”پہلا ڈراما کون سا ہوگا۔ اور کل کتنے ڈرامے ہوں گے؟“

”نوٹل چھوٹا دل دورانیے کے ڈرامے ہم تیار کریں گے۔ پہلا ڈراما تیار ہو چکا ہے جسے آپ سننے سال میں دیکھ سکیں گے اور پہلے ڈرامے کا نام کشش ہے اور باقی دیگر ڈراموں کی ریلیز ڈنک منقریب شروع ہو جائے گی۔“

”کشش کو لکھا کس نے ہے؟“
”کشش کو اسد محمد خان نے لکھا ہے اور مزید ڈراموں کے لیے مجھ نے رائٹر زکی ضرورت ہے۔ اگر نئے لوگوں کو ہم میں گے تو یقیناً نئی سوچ سامنے آئے گی اور ہمارے ڈرامے زیادہ مقبولیت حاصل کریں گے۔“

”یہ تو آپ بہت اچھا کریں گے کیونکہ ہمارے رائٹر ز نے اتنا لکھا ہے کہ آپ ان کے پاس کوئی نئی بات نہیں رہی ہے؟“

”اسی لیے تو میری کشش ہے کہ میں نئے رائٹر زوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ زمیر عباسی کو ہم نے متعارف کرایا تھا اپنے ڈرامے ”زہر“ سے۔

”اب آپ دیکھیں کہ سب سے زیادہ ڈرامے ان کے پاس ہیں۔ یوں سمجھئے کہ زہر کے بعد اسے تھیں ہے کسی اور کام کی۔ آئی ڈی اے

”اگر یہ کہیں کہ آج کل ہر دوسرا ڈراما زمیر عباسی کا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کا خالی ہاتھ بھی بہت

”جی ہاں۔ زمیر عباسی تو چاہ رہے ہیں کہ میرے مزید ڈرامے لکھیں مگر میں نے کہا کہ لوگ نہیں گے ایک ہی رائٹر مل گیا ہے اس لیے کہ اور لوگوں کو دے دے۔ وہ میں نے کہا کہ یار اب تو آپ اپنے ہروں پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اس میدان میں اب نئے کھلاڑی آئے جاتے ہیں۔“

”گزشتہ سال آپ نے پٹال سینما میں جو ڈرامے پیش کیے تھے، وہ کافی مقبول ہوئے تھے۔ اور اب بھی ناظرین آپ سے امیدیں وابستہ ہیں۔“

”انشاء اللہ ہم ناظرین کی امیدوں پر پورے اتریں گے۔“

”اور سنائیں۔ بیٹا کس سے کیا نام رکھا ہے؟“
”بیٹا اناشاء اللہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور نام ہم نے زریاب علی اختر رکھا ہے۔“

”اب تو اناشاء اللہ مقصود بڑا ہو گیا ہوگا؟“
”جی ہاں۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ مقصود مقصود چلنے بھی لگا ہے۔ اور جناب شادی بہت ہو گیا ہے۔ بہت پریشان کر رہا ہے۔ مگر اس کے آجائے سے گھر میں رونق بہت ہو گئی ہے۔“

”واقعی بچے بہت بڑی نعمت ہیں۔“



شاعری سچ بولتی ہے

فیصل ندیم (اشرف)

زندگی کے طویل سفر میں کبھی کبھی ایسے حالات بھی آتے ہیں کہ آنکھیں جو دیکھتی ہیں، دل جو چاہتا ہے وماغ جو کچھ سوچتا ہے زبان وہ سب کہہ نہیں پاتی۔ ایسے جذبات کی ترجمانی جو چیز کرتی ہے اسے شاعری کہا جاتا ہے۔ شاعری براہ راست وماغ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بے شک شاعری سمندر کو کوزے میں بند کر دیتی ہے۔

سہیل کے معاملے سے لے کر تاجناک کا شغز ایک ہول مسلم حرم کی پائنتانی کے لیے

(اقبال)

تعارف سے آغاز کرتا ہوں۔ میرا نام فیصل ندیم اشرف ہے۔ میں کوئٹہ کے ایک چھوٹے سے علاقے مریاب مل میں رہتا ہوں۔ حال ہی میں ایف اے آرٹس کا امتحان دیہے سے شاعری سے بچپن سے قدرتی طور پر پر لگاؤ ہے۔ مگر کچھ میں شاعری کے جراثیم دور دور تک نہیں تھے۔ پھر دسویں کلاس میں ڈائری شروع کی جس میں صرف ہم قافیہ شعر لکھے۔ اپریل ۹۷ء سے دوستی کے حوالے سے نظم سے شاعری کا آغاز کیا۔

مجھے سب سے پہلے جس شاعر نے خوب گہرا جھوڑا وہ احمد فراز ہیں۔ فراد وہ شاعر ہیں جن کا بچپن میں کوئی شعر مستعار نہ تھا کہ شاید ان کی کتابیں بہت ہنگامی ہیں مگر الحمد للہ میں اب تک فراز صاحب کی کچھ کتابیں خرید چکا ہوں۔ درد، آشوب، جاناں جاناں اور خواب گل پریشان ہے پسندیدہ ہیں۔

سہ جب تک دوپہے تو تیری پرستش کریں ہم جسے چھو نہ سکیں اس کو خدا کہتے ہیں

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں بکلی کیا
دور میں تیرا نہ تھا اور تو میرا نہ تھا

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سواں کے شہر میں کچھ دن مہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے لڑے تو باتوں سے بھول جاتے ہیں
یہ بات ہے تو طو بات کر کے دیکھتے ہیں

احمد فراز کے بعد محسن نقوی بہت بھلے، خصوصاً
قطعات میں ان کا اپنا ایک اسلوب ہے۔

اب اس کی یاد سے اس کا بدن ترلے ہیں
وہ خواب بھی تو نہیں تھا کہ ہم بھلا دیتے
اسی کے واسطے محسن کبھی ہے تازہ غزل
اب اس کی سالگرہ پر ہم اور کیا دیتے

روٹھا تو شہر خواب کو غارت بھی کر گیا
پھر مسکرائے تازہ شرارت بھی کر گیا
حسن یہ دل کہ اس سے پھر تازہ تھا کبھی
آج اس کو بھونے کی جرات بھی کر گیا

آنکھوں میں کوئی خواب اترنے نہیں دیتا
یہ دل کہ مجھے چین سے مرنے نہیں دیتا
پھر مرنے تو عجب پیار جتنا ہے خلون میں
مل جائے تو پھر حد سے گزرنے نہیں دیتا

قیس شنائی ایسے شاعر ہیں جن کی غزلوں میں ایسا
سُر ہے جسے انسان محسوس کر لیتا ہے۔ وہ ڈائریکٹ نہیں

لے رہے ہیں۔
ابھی تو بات کرو، ہم سے دوستوں کی طرح
پھر اختلاف کے پھول نکالتے رہنا
تفیل ایک ہی شغل پسند ہے ہمیں
خیال یا رکشعروں میں ڈھلے رہنا

اور اس قطعے میں انہوں نے بالی نگر کو کس طرح تیر
لے لیا کہ۔

مرے دل کو ذرا سا پیار دے دے
یہ پتھر ہے کھلونا چاہتا ہے
تو ہی لے کر مجھے ساحل تنگ آیا
تو ہی مجھے ڈبو نا چاہتا ہے!

عورتوں میں ادا جعفری، پروین شاکر اور نوشی گیلانی
نے متاثر کیا۔ پروین شاکر نے کم عمری میں ہی شاعری کے
کاغذی حور کے سر کر لیے۔

اپنے انجام تک آگئی زندگی
یہ کہانی مگر اختلافی رہی
ہے زمانہ خفا تو بجا ہے کہ میں
اس کی مرضی کے بالکل منافی رہی

نوشی گیلانی نے قدیم انداز کو خوب اپنایا۔
سرفراز امید سے خوشبو نکل گئے

تنہائی کے صحرا میں اگر تو نکل آئے
پھر دن تیری یادوں کی منڈیوں پر گزرا
پھر شام ہوئی آنکھ سے آنسو نکل گئے

ادا جعفری کے الفاظ گہری معنویت سے لبریز ہوتے
ہیں۔

رہ جانے کتنے چراغوں کا خون ہوا ہوگا
ہمیں ہے مہل کسی دل کو بے وفا کہنا
یہ میری اپنی اس عہدی کہانی ہے
جو دسترس سے ہو باہر اسے خدا کہنا

اس کے علاوہ عورتوں میں شبنم شکیل کا یہ قطع بہت

اجالہ لگا۔
دل کی باتوں کو بہت پیار سے ٹالا ہوگا
خود کو جب ایک نئی راہ پر ڈالا ہوگا
اس سے منسوب ہوں تھے بھی منسلک نہ تھا
ان میں شاید کہیں میرا بھی حوالہ ہوگا

عمر حجاز کے شعراء میں اگر کسی کی سنجیدہ شاعری پر کسی
جائے تو احمد ندیم قاسمی ان میں سرفہرست ہوں گے۔ مجھے
قاسمی صاحب کو بہت کچھ یاد ہے کہ بہت کم کوئی ملا کر وہ بہت
گہرے شاعر ہیں۔

میں محبت کا بجاری ہوں عقیدوں کا نہیں
ان تلوں کو مرے رستے سے ہٹا یا جائے
حکمران سچ بھی قریب سے کہا جائے ندیم
زخم تو زخم نہیں پھول بتایا جائے

اس کے علاوہ نوجوان شاعر دل میں جدید دور کے

سورنگن شاعر عباس تابش جن کے شعر شاعری کے اعلا
ذوق کے حامل ہیں۔

پس غبارِ مدو مانگتے ہیں پانی سے
یہ لوگ تنگ ہیں مٹی کی عمرانی سے

اہم وہاں بھی تھے آنکھوں میں بے ہمتی ہیں
چینٹک دیتے ہیں جہاں غم کو پرانا کر کے

ایک شاعر جنہوں نے مجھے بہت جلد اپنا گرویدہ بنا
لیا وہ ہیں حبیب جالب۔ میں اپنے کانٹا کی لائبریری
سے اتفاقاً ان کی کتاب اٹھالایا مگر وہ آئی گہری محی کی
میں نے بار بار اسے پڑھا۔

سہ نہ ڈنگ لگے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلانے ہوا کے رستے میں
خدا کا نام کوئی لے تو چونک آتے ہیں
ملے ہیں ہم کو وہ رہبر خدا کے رستے میں

سہ جو کہتے تھے کہ کوئی نہیں جاں سے گزرتا
لو جاں سے گزر کر انہیں بھٹکا تو گئے ہم

اب سوچ رہے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے
پھر ان سے منسلک کی قسم کھا کر گئے ہم

اس کے علاوہ ان کے انقلابی قطعات بہت اچھے
لگتے ہیں۔

ہم گوہر دیس کے قلعے نہ سننا و جانال
ہم نے پردیس میں انار بھی دیکھے تھے بڑے

جہاں سے ربط ملایا بخار زندگی سے ندیم
وہاں یہ موت کے آثار بھی دیکھے تھے بڑے

آپ حیران ہوں گے کہ ابھی تک نظم کیوں نہ آئی
تو نیچے نظر اچھی غزل سے وزن دار ہوتی ہے۔ اگر اچھی
ہو تو نظم نیلی اعجاز اسلام اعجاز خاقان غادر، ان م راشد
اور پروین شاکر سے متاثر کیا۔ خود بھی نظمیں کہیں
چونکہ دی لگاؤ غزل و غزلیہ سے زیادہ رہا اس لیے نظم کم
پڑھی مگر اب نظم پر بھی محنت کر رہا ہوں۔ خاقان غادر
کی ایک مختصر نظم۔

بغاوت

جبر کا زہر جب آخر تلے
بار کا باغ جب بکھر تا ہے
ظلم جب انتہا پر ہوتا ہے
جب ہوا بولنے سے ڈرتی ہے
اسی رحم ساعتوں میں آگئے
رہت بدلنے کی بات کرتی ہے۔

اپنی ایک مختصر نظم۔

مد ہوش چاند

آج پھر مے چاند کو
بادلوں کی چاہت نے
آنے نہیں دیا۔
ہر انسان کی زندگی حادثوں سے دوچار ہوتی ہے مگر
میری زندگی کے چند حادثے تمام عمر نہیں بھولیں گے۔
والد صاحب کی وفات اور میرے گردے کا کبیریشن جس
میں گردہ نکال دیا گیا۔

ستاراں جنوری سے آسمانوں سے باری ہے
کہ بنا باپ بھی زندگی ہماری ہے

ہم گر گردے کے اخراج پر مجبور ہو گئے
ہم دیکھتے ہی دیکھتے معذور ہو گئے

شاعری سے بولتی ہے

نفاذ اسلام اعوان

سے کہتی ہیں۔

”جلدی جلدی سننا نہیں نے ابھی سمری بھی یاد کرنی
ہے“

اور پھر سنا کے جب میں خوشی خوشی اُس سے پوچھتی
ہوں کہ اب بتاؤ کیسی ہے۔ پہلے تو وہ حیرت سے میری
طرف دیکھتی ہے۔ پھر کہتی ہے۔

”مجھے تو یہ نظر اچھی نہیں لگی اور نہ ہی میرا
ارادہ ہے۔ اپنی فرینڈز کو اس قسم کی نظمیں سنا کے خستہ
ہونے کا“

اور بے اختیار دل چاہتا ہے کہ سر پور دوں اُس کا
ابھی کل ہی کی بات ہے فرحت عباس شاہ کا اتنا
اچھا شعر پڑھنے کو ملا اور غار ہری بات ہے میرا دل
چاہ رہا تھا کہ کسی کو سنناؤں (دل جو ہوا اس پر ہمارا کیا
دوش) ایسے میں اپنی پیاری سی بیٹی ماری سے کہا کہ شعر
سنو۔ بہت اچھا ہے۔ جب اُسے شعر سنائے لگی تو
اُس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔ ”نہیں پھوپھو شعر
نہیں سننا وہ والا کا ناسنا میں ناں“ دیدی تیرا دلور
دلواز۔ وہ مجھے بہت پسند ہے۔ بھارت میں جاٹے یہ
دید کی دلور تیا نہیں اُن لوگوں نے ہماری نسل پر کیا
بادو کر دیا ہے کہ بڑے تو بڑے چھوٹے بھی ہر وقت انہی
کے گیت الایتے نظر آتے ہیں۔

میرے خیال میں باتیں پھر زیادہ ہی طویل ہو گئی ہیں۔
اب آتے ہیں شاعری کی طرف۔ میرے فورٹ شعر اولیں
فرحت عباس شاہ، احمد فراز، اور پروین شاکر ہیں۔ ان
کے علاوہ بھی کئی شعرا کے کلام کو پڑھا۔ ہر اچھا شعر۔
اثری کٹ کتابت خواہ کسی بھی شاعر کا ہو۔ بچپن میں کچھ اس
قسم کے شعروں کو بھاتے تھے۔

سمن الدین کی سادی پر سیسے کے گلاسوں میں
سکر کا سہرہ بت جیس کیا گیا !

شاعری کیلئے ایمان سے بالکل نہیں
جانتی۔ رہا باب علی نے اسے خوشنور اور عصمت نہ ہونے
سے بچول کہا ہے۔ اب میں کیا کہوں۔ کاشا کہنے سے تو
رہی۔ ہاں یہ مزہد کہوں گی کہ شاعری مجھے اچھی لگتی ہے۔
چار پانچ ماہ تو بھی سوچتے گزر گئے کہ شاعری مجھوں کو
ناں اور۔ ناں، ہاں میں بدلی تو پھر سوچنے لگی کہ کیا
کرنا نہیں شائع بھی ہوگی یا پھر ایسے ہی بھاری اپنی
باری کا انتظار کرتے کرتے: فرحت ہو جائے گی۔ لیکن پھر
دماغ نے سرزنش کی کہ ادن، ہونہ۔ ایسے نہیں کہتے بھلا
شاعری بھی نہیں مری ہے اور یہی سب کچھ سوچتے سوچتے
ساری باتوں کو جمع کرنے کے بعد ہم بھی اپنا انتخاب
لے کر قاری بہنوں کے سامنے حاضر ہیں۔

اب اپنا حقوڑا تعارف

تو حجاب! نام ہے نفاذ اسلام اعوان اور بی اے
فائنل کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ شعر و شاعری سے جنون کی
مد تک لگاؤ ہے۔ اسے آپ میری بدقسمتی کہیں کہ گھر
میں کسی کو بھی شاعری سے لگاؤ نہیں ہے (میرے علاوہ)
گھر کے سبھی افراد شاعری سے تو ایسے دور بھاگتے ہیں
جیسے جحر سے بلی، میرا مطلب ہے بلی سے بڑا۔ میر
جی ہم بھی پروا نہیں کرتے نہیں پسند تو نہ سہی ہیں تو
سے ناں۔ لیکن اس بے چارے دل کا کیا کر سں۔ جس کی
بھی کوئی تمنا، کوئی آرزو، کوئی خواہش ہے (یہ ڈائلاک
میری خالجان کے ہیں)

جب کبھی موڈ ہو شعر و شاعری کا تو ایسے میں واحد
نا بید ہی نظر آتی ہے جسے سنائے کے لیے بڑی مشکل سے
آسادہ کرتی ہوں کہ منوگی تو تو نگ رہ جاؤ گی کا آئی اچھی
نظم کس شاعر کی ہے۔ اور اگر کہ اپنی فرینڈز (فرخ زینبا
و شبنم) کو سنناؤ گی ناں تو وہ فوراً اپنی دائری میں تید کر
لیں گی پھر کہیں جا کر مادام لاضی ہوتی ہیں اور کل بے نیازی

ان کی یہ نظیں۔ لیجئے آپ بھی پڑھیے۔
میں جسم و جان کے تمام رشتوں سے اسے چاہتا ہوں
نہیں سمجھتا کہ ایسا کیوں ہے
رخسار و خد کا جمال اس میں نہ زندگی کا کمال کوئی
جو کوئی اس میں ہنس بھی ہوگا
تو مجھ کو اس کی خبر نہیں ہے
نہ جانے پھر کیوں

کام میں فریفتہ اکثر مجھ ہی سے شعر یا کوئی غزل
دینا دیتی ہیں۔ کیونکہ ہر اچھے سے اچھا شعر اور غزل میری
فائز میں محفوظ ہے۔ اور اب اپنے پسندیدہ شاعروں
کے خوبصورت اشعار

وہ جس قدر بھی منافق تھا پر یہ کہتا تھا
پھر نہ اہم سے مگر پھر بھی سسلے رکھنا

اور اسی طرح ان کی ایک اور نظم میں خود ہی اپنی بہار سے رونے لگوں گے
تو مجھے رونے سے روکنا
جو واسطے کا ہو سہنا
یہ سوچ لینا
یہ ایک لمحہ گریز کا
کیسے

میں لفظ لفظ ڈھونڈ کے تھک بھی گیا عدم
وہ پھول دے کے بات کا اظہار کر گیا

اور یہ نظم جس کے شاعر کا نام مجھے معلوم نہیں، بہت
بہت زیادہ پسند ہے۔ یقیناً تمام قاری بہنوں کو بھی
اچھی لگے گی۔ نظم کے لوگوں نے کہ
تم اپنی خودی گئے پہرے میں
اور دام عزو میں جڑے ہوئے
ہم اپنے زعم کے نزع میں
انا ہاتھ ہمارے پکڑے ہوئے

اک مدت سے غلطان پیمان
تم ربط و گرہ کے دھاروں میں
ہم اپنے آپ سے اچھے ہوئے
پچھتاوے کے انگاروں میں

خاموش سے تم، ہم مہر لب
جگ بیت گئے، ملک بات کیے
سنو کھیل ادھورا بھرتے ہیں
بنا چال چلے بنامات کیے

آج پھر ٹوٹیں گی تیرے گھر کی نازک کھوپکیاں
آج پھر دیکھا گیا ہے دیوار تیرے شہر میں

عشق آغوشِ لہر، عشق جذلوں کا تار
عشق شعلوں کی غلش، عشق پتھر کا گداز
عشق اک نغمہ جہان، عشق اک موت کا ساز
عشق یازید جفا، عشق زنجیرِ ستم
عشق شیشے کی چاب، عشق کبساں الم
عشق شیر میں تے نکلے، بھٹکے خواب
عشق فریاد کا خون، افس کا رقص جنوں
عشق جھینے کی ادا، عشق ہر دل کی صدا
عشق کے کپے میں فرعون کدا

پھر جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتی گئی شاعری میری
ذات کا حصہ بنی گئی اور اب جب بچپن کے وہ سالے
اسی طرح کے اشعار یاد آتے ہیں تو بے اختیار یہ شعر یاد
آ جاتا ہے۔

سہ گلاب لہلوں کے محفل پہ کھلتے بچپن
پلٹ کے آئیں جیسے شرابی سناٹوں
مجھے یاد ہے۔ ایف اے میں اردو کی لیکچرار نے ہمیں
خاص طور پر ناظر کاظمی کا یہ شعر دکھوا دیا۔
سہ دل تو میرا آداس ہے ناظر
شہر کیوں سائیں سائیں کر رہے
جو اس وقت تو نہیں البتہ بعد میں اچھا لگا۔

یوں تو اتحاد اسلام اتحاد کی ہر غزل میری دونوں ہے لیکن
ان کی یہ نظم "سلسلہ خالوں کے" اتنی اچھی ہے کہ کیا بتاؤں۔
ہواؤ! اس کی گلی سے گزر تو میرا اس سے سلام کہنا
مجھے خبر ہے کہ میرے گھر سے گزرنے والی ہوا کا راستہ
تمہارے
گھر تک نہیں گیا ہے
سلام میرا تمہارے کانوں سے نارسا ہے
میں جانتا ہوں، یہ بچپن ہے
مگر حقیقت کو جان کر بھی نہ جاننے میں عجب مزاح ہے
ہوا سے میں نے یہ پھر کہا ہے
گزر رہے ہیں تمہاری یادوں کے دم سے صبح و شام کہنا
ہواؤ! اس کی گلی سے گزر تو میرا سلام کہنا
تمہارے گھر کا کسے چتا ہے
ہوا کے رُخ کی کسے خبر ہے

سب سے پہلے آتے ہیں پروین شاکر کے کلام کی
طرف۔ پروین شاکر میری پسندیدہ شاعرہ ہیں۔ ان کی ہر
نظم انہی کی طرح خوبصورت ہے اسی لیے ان کی شاعری
کے ہر لفظ پر داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ خاص طور پر
ان کی نظم شرط
تیرا کہنا مجھے تسلیم ہے
میں مانتی ہوں
اُس نے میری ذات کو بے حد نوازا ہے۔
خدا نے بزرگ و برتر کے سامنے
میں بھی دعا میں ہوں، میرا یا شکر ہوں
اُس نے مجھے اتنا بہت کچھ دے دیا لیکن
مجھے "اے دے دے تو میں جانوں

اسی طرح یہ بھی
عشق دلائے تنہا کا فصول
عشق میداری و حشت کا صحرا
عشق شہروں کا ڈھول، عشق صحرا کا غبار
عبید اللہ علی کی شاعری بھی خوبصورت ہے

سے کیا جانے کس خیال میں اُٹھی تھی وہ نظر
اور ہم نے اس سے شہر معافی بنا لیا

سے جلیط کر نابہ تو مجھ حد سے گزرتا ہو گا
خون ہو جائے یہ دل آٹھ نہ بھرنے پائے

سے اتنی مضبوطی سے دیر لے کے در بند ہوئے
دل میں اُتری نہ کوئی ذات تیری ذات کے بعد

سے ہم سے اک بار بھی جیتا ہے نہ جیتے گا کوئی
وہ تو ہم جان کے کھائیے ہیں مائیں اکثر

سے سوال کر کے تاویر وہ، کچھ غلی سار ہا
جواب دے کر میں اُسے لا جواب کیا کرتا

سے عجیب طرح کا گھنڈ تھا اس کے بچے میں
وہ بات کرتا ہر لمحہ سے خدا کے بچے میں
نجانے کیا دیکھا اس نے میری آنکھوں میں
عجب بے چینی سی اگئی پھر اس کے بچے میں

سے آسان راستے کو بھی مشکل سمجھ لیا
تم نے یہ کس پڑاؤ کو منزل سمجھ لیا
میری رگوں میں مشرقی تہذیب تھی رواں
اُس نے نجانے کیوں مجھے بزدل سمجھ لیا

سے اک طرف میری کہانی جس میں تیرا نام ہے
اک طرف سارا زمانہ کس قدر اچھا لگتا
اس کی ساری گفتگو تھی اک تہذیب کی طرح
اس کا ایسے گڑ بڑانا کس قدر اچھا لگتا

سے ہم نے روتی ہوئی آنکھوں کو ہنایا ہے سدا
اس سے بہتر تو عبادت نہیں ہوئی ہم سے

سے ابھی کہاں تجھے پہچاننے کی ضرورت تھی
ابھی تو خود سے بھی ٹھہری ہیں بے خبر آنکھیں

سے جل جاؤ تھوڑی سی کڑی دھوپ میں لیکن
اپنوں سے بھی سایہ دیوار نہ مانگو

سے وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ جو نہیں ملا اُسے بھول گیا
کہ جو مل گیا وہی اب ہے جو نہیں ملا وہ سب تھا

سے ہم سے، تو تھے جب کوئی گناہ
اس کو قسمت کی بھول کہتے ہیں
کتنے با اعتماد ہیں ہم لوگ
لغزشوں کو اصول کہتے ہیں

سے میرے خیال میں اشعار کچھ زیادہ ہی ہو گئے ہیں۔
اگر سب ہی شائع ہو گئے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی
اور آخر میں سلیم کوثر کی غزل۔
اس کلام کو انہوں نے کچھ اس طرح ننگ جنریشن
تک پہنچایا۔

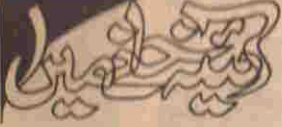
سے جو دل میں ہے آنکھوں کے حوالے نہیں کرنا
خود کو بھی خوابوں کے حوالے نہیں کرنا

سے اس عمر میں خوش پنہیاں اچھی نہیں ہوتیں
اس عمر کو عددوں کے حوالے نہیں کرنا

سے اب اپنے ٹھکانے ہی پر رہتا نہیں کوئی
پیغام پر ندوں کے حوالے نہیں کرنا

سے دُنیا بھی تو پاتاں سے باہر کا سفر ہے
منزل کبھی رستوں کے حوالے نہیں کرنا

سے تو جناب یہ تھی میری مختصر سی شاعری (میرے خیال
میں مختصر ہی ہے) اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ اسے شائع
کرتی ہیں یا یہ واقعی بے چاری اپنی باری کا انتظار کرتے
کرتے۔ خیر امید یہ دُنیا قائم ہے۔ جو ہمیں یہ انتخاب
دیکھ کر شدید لذت محسوس کرے اُن سے خلوص دل
سے معذرت خواہ ہوں اور جن کو میرا انتخاب اچھا لگے
ان کی تہ دل سے مشکور ہوں۔



نور کی سے نکال دیا کہ تم جیسے غلاب ملازم کی مجھے
کوئی ضرورت نہیں؟
(اور سناور میلا! انڈسٹری والے بھی تہیہ
غلاب کہہ کر نکال دیں تو؟)

ہم بھول گئے ہر بات

فلم "دیوانے تیرے پیار کے" کی ہیروئن جیا علی
آج کل بہت عروج پر جا رہی ہے۔ جیا علی کے سر
پر سجاد گل کا ہاتھ ہے اور وہ جیا علی کو بغیر کسی
صلامتیوں کے اوپر سے اوپر پوزیشن دلانے کی
کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہی جیا گل تک
مسترت مصباح کے بیوٹی کلیک میں ایک بھولی
سی درک تھی اور مسترت مصباح کو باجی کہا کرتی

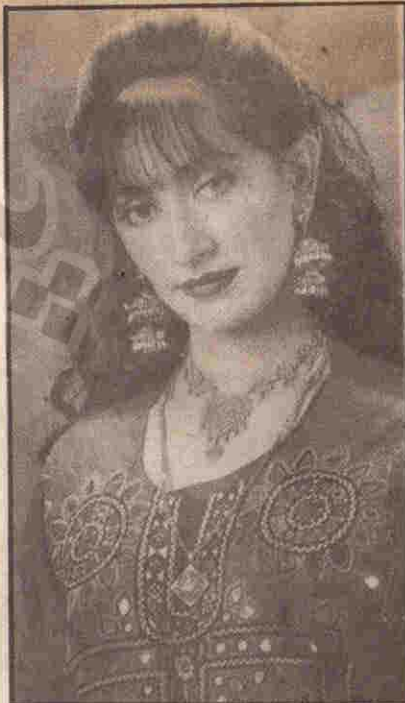


چڑچڑی

جب "ووڈ اور" میرے سینوں کی رانی ایک
ساتھ غلاب ہوئیں تو ارمیلانے حد چڑچڑی ہو
گئی اس چڑچڑے پن کے بلنے میں اس کے سابقہ
ملازم کو پاؤں نے رو رو کر بتایا۔
"بات صرف اتنی سی تھی کہ اس روز ارمیلانے
اپنے بھائی اور بھائی کو کھانے پر بلایا تھا اور عین
اسی روز میڈم کو رپورٹ ملی تھی کہ "ووڈ" غلاب
ہو گئی ہے۔ پس پھر کیا تھا انہیں کچھ اور تو ملا نہیں
میں سے کیا مئے کمالوں پر اعتراض کرنے لگیں۔ کسی
دشمن میں تیر نمک اور کسی میں تیر مرق کا بہانہ بنا کر
مجھے ہمانوں کے سامنے بے عزت کیا اور یہ کہہ کر



مٹی اور آج سجاد گل کی آشیر باد کے بعد اسے سوتیلی باجی ماننے کو بھی تیار نہیں۔ کل تک کہا کرتی تھی کہ۔
 "مسترت باجی کے بچے پر بہت احسانات ہیں میں جہاں بھی جاؤں، کسی نقصان پر پہنچ جاؤں انہیں نہیں بھول سکتی۔"
 اور آج وہ کہتی ہے۔
 "سہرچی! پلیز مسترت کا نام میرے سامنے نہ لیں اس نے میری زندگی سیاہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی" (یہ ہوتی ہے صبح کی ابن الوقتی)



ہمیر وغیرہ زید و
 فلم "عشق زندہ رہے گا" کی عکس بندی ایک میرین آل میں ہو رہی تھی کہ اچانک تین گول جوازن ہاتھوں میں کلاسٹکوف لیے سیٹ پر گھس آئے

انہوں نے سنے ہی اداکارہ رادوی کی ٹانگوں پر فائرنگ کر دی۔ اس موقع پر شبلی اویہ وجود بھی عکس بندی میں حصہ لے رہے تھے جبکہ شبلی کا باڈی گارڈ اصل اسٹوڈیو کے لیے موجود تھا۔ مگر وہ اسٹوڈیو استعمال کرنے کے بجائے نیلی کوٹے کے باہر روم میں جا چھا جبکہ چھ فٹ کا قد رکھنے والا ٹریل جوان سود جو یوں تو فلموں میں کششوں کے پیشے لگا دیتا ہے وہ دبے پاؤں گھر کی سے فرار ہو گیا۔

شان کی غیر سنجیدگی

شان کا ستارہ ایک بائیسگر گوش میں ہے۔ پچھلے دنوں اس کی منگنی ٹوٹنے کی خبریں آتی رہیں اس کے علاوہ شان نے شان بے نیازی دکھانا پھر سے شروع کر دی ہے۔ دیر سے شوٹنگ پر آنا یا غائب ہو جانا معمول بن گیا ہے۔ ساتھ ہی فلم میکرز سے باقاعدہ جھگڑا بھی شروع کر دیا ہے زیادہ دن نہیں ہونے دیے تیار محمد جاوید فاضل سے اس نے جھگڑا کیا تھا۔ اس کے بعد ٹیگتا سے بھی ان بن ہو گئی اور نتیجے میں ان کی فلم "کراچ" کے سیٹ پر شان کا انتظار ہوتا رہا جبکہ شان کراچی کے اسپتال میں (اپنی ہونے والی ساس) ملکہ ترم نور جہاں کی تیمارداری میں مگن رہا۔ اب شان کے بارے میں پتا چلا ہے کہ اس نے منشیات کا استعمال بھی شروع کر دیا ہے جس سے اس کی صحت بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔ شان کے لاابالی پن اور اس کی گرتی ہوئی صحت کے باعث فلم میکرز سے اپنی فلم سے کٹ کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔

کیسی شرم

سبحاش گھنٹی نے اپنی فلم "سوداگر" کے لیے چند راپور کا۔ اسکرین ٹیسٹ کے کرستور کر دیا ان دنوں ان کے بھائی شوخ گھنٹی کی فلم "شام گشتیا" میں وہ کام کر رہا ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ دو بھائیوں میں سے ایک کے ہاتھوں مسترد ہو کر غصہ

تو آیا ہو گا تو جواب میں اس نے کہا۔
 "یہ آپ بہت پرانی بات کر رہے ہیں سوداگر" کے لیے مجھ سمیت نئی ٹوکوں نے سبحاش جی سے رابطہ کیا تھا لیکن سلیکٹ تو کسی ایک کو ہی ہونا تھا چنانچہ ولوک مشران سلیکٹ ہوا اور مجھ سمیت تمام لوگ کے ریکٹ ہو گئے۔ اس میں ناراضی یا غصہ کی بات کہاں سے آگئی۔ سبحاش جی کے ساتھ میں اب بھی کام کرنا چاہتا ہوں اور اگر انہوں نے مجھے بلایا تو میں سر کے بل جاؤں گا۔ اس میں کیسی شرم؟

بیتا بھتا بلکہ کرشمہ

سلمان نے ایک دن کرشمہ کی ممابیتا کو ڈانٹ کر رکھ دیا۔ واقعہ یوں ہے کہ سنی دلوں کی فلم لندن کی شوٹنگ کے لیے کرشمہ نے بے شمار ڈش ڈے رکھی تھیں مگر ڈائریکٹر کرشمہ پر جھڑپا اور سنی کے بیچ کوئی معاملہ ہوا اور شوٹنگ روک دی گئی۔ اس بات سے ناخوش ہو کر مسز اینڈ بے بی کیور نے سنی سے بحث کر ڈالی اور یوں سنی کرشمہ ریٹیشن کھٹائی میں پڑ گئے۔ اس تمام قصے کے بعد کیور بھی کوشش سے ایک مددگار اور دل جوئی کرنے والے دوست کی ضرورت تھی اور بد قسمتی سے قرعہ فال سلمان کے نام نکل آیا کیونکہ وہ بھی ان دنوں فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھا۔ اس معاملے کو سننے کے بعد اس نے کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا جس سے تجربے کار می یہ جان گئیں کہ کچھ گڑبڑ ہے ریٹیشن شپ کو سنبھالتے سنبھالتے وہ باتوں باتوں میں سلمان سے پوچھ بیٹھیں۔
 "کیا تم بھی تک صوفی علی سے شادی کے فیصلے پر قائم ہو؟"

یہ سوال غیصے خان کو بھیجے گا کہ کے لیے کافی تھا اس نے مزہ کھو کر جیسے کٹے انداز میں جواب دیا۔
 "آپ کو کس نے یہ حق دیا ہے کہ میری گرل فرینڈ یا کسی بھی لڑکی کے لیے ایسے الفاظ استعمال کریں یا کسی کو اپنا نشانہ بنائیں؟"
 ایسے ہی کئی کرائے جھلوں نے کرشمہ کو بھیج دیا



ادھیڑ عمر شخص

بالی ووڈ کے نامور فنکار ہمیشہ نوری سے پوچھا "کیا وہ خود کو بینڈ کم سمجھتا ہے؟"
 اس نے جواب دیا۔
 "یہ بات تو یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ میں اپنے چہرے کے نقوش کی بدولت اشار نہیں بناؤ۔ میرا چہرہ دلکش نہیں ہے اس لیے کہ میں جب بھی آئینہ دیکھتا ہوں تو وہاں مجھے ایک ایسا ادھیڑ عمر شخص دکھائی دیتا ہے جسے شیوہ کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے پگلے ہونٹ کے نیچے جو زخم کا نشان ہے وہ کار کے ایک حادثے کی نشانی ہے۔ رڈ ایکٹروں نے اس زخم کو اس وقت اس انداز سے بھرا تھا کہ یہ ایک بھرا نشان چھوڑ گیا۔ اس وقت سے مجھے شیوہ کرنے میں واقعی دشواری پیش آتی ہے۔"

قسمت کا چکر

اسد نے فلموں میں کام کیا لیکن ناکام رہا۔ گو

کہ اسد فی ٹوی ڈراموں میں کام کر رہا ہے اور پروڈیوکر اسے ایک بھی کر رہے ہیں لیکن پھر بھی اسد نے خود ہی ایک ڈرامہ پروڈیوس کرنے کا پروگرام بنایا اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ اس پروجیکٹ میں اسد کے ساتھ لاہور میں مقیم کراچی کی ایک مشہور جرنلسٹ خاتون بھی تھیں یہ مشہور زمانہ خاتون اسد کی نہایت ہی قریبی دوستوں میں شمار ہوتی ہیں اور اپنی پبلک ریلیٹنگ کی بدولت ہر طبقہ فکر میں پہچانی جاتی ہیں اپنی۔ اس جان پہچان کا فائدہ اٹھا کر انہوں نے اسد کی سیریل کا بڑے اچھے داموں سودا کر دیا تھا۔

سوئے کا انڈا

آج کل عبدالحمید پروڈیوسری کر رہے ہیں۔ اب یہ بات ہنوز جواب طلب ہے کہ عبدالحمید کو ہدایت کاری کے میدان میں دھکا دینے کی ذمہ دار



ان کی بیگم ہیں یا۔ ساس عشرت ہاتھی۔ عبدالحمید بنیادی طور پر بیو لڑ ہیں۔ اور ساس نے انہیں سوئے کا انڈا دینے والی مرغی ہی جانا تھا۔ "سمندر سے درمیاں" فی وی کے ایک پروڈیوسر نے پروڈیوس کیا ہے اور نام عبدالحمید کا دیا جا رہا تھا۔ یوں داؤ بھی سمیٹ رہے تھے۔ اب ان کی اہم بندش کا شکار ہوا تو ساس اور داماد ایک دوسرے کو نقصان کا فتنے دار قرار دے رہے ہیں۔

احساس برتری

ایمی جیا اور محرم کو فلموں میں آئے جمعد جمعد آٹھ دن گزے ہیں اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے شکایتیں بھی ہوئی ہیں۔ جب جیاسے پوچھا گیا کہ محرم کو تم سے کیا شکایتیں ہیں تو اس نے کہا۔ "مومی احساس برتری کا شکا ہے۔ وہ اپنے



آپ کو ہلی وڈ کا پروڈیوسر کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو لیا رابرٹ، ڈینی مور اور شیرون اسٹون اس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش مند ہیں۔ سید لو سمیٹ بہت سے لوگوں نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ (دماغ اس کا ظاہر ہوا ہے یا تمہارا۔)

جان، جان

جان ریسمول تک انڈسٹری کی جان بنا ہوا تھا۔ مگر آج کل فرصت سے ہے اس کی فرصت کو دیکھتے ہوئے صاحبہ بھی اس سے الگ ہو گئی ہے۔ اب یہ عالم ہے کہ جان ریسمول بھی نشوونما کر رہا ہے۔ تو کبھی صاحبہ کو "پینی" جو بھی مل تک اس کی اپنی تھی۔ ان تمام حالات سے تنگ آکر جان ریسمول نے اب پھر فی وی پروڈیو ہاؤس جاری لگا دی ہے۔ (اس کو کہتے ہیں لوٹ کے دھوکہ کھراؤٹے)

رنگین کہانی

آج کل زینا بختیار اپنے بیٹے اذان کے لیے جگہ لڑتی پھر رہی ہیں۔ اور زنی خبر یہ ہے کہ اس کی ایک ذاتی ڈائری اس کے دشمنوں کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ جس میں اس نے اپنی۔ رنگین کہانی لکھ

رکھی ہے۔ اس ڈائری کے چند اوراق شائع ہونے کے بعد زینا کی ڈیمانڈ بہت بڑھ گئی ہے۔ اس ڈائری کے چھپنے کے بعد زینا کو تریویڈی بیان دینا ضرور چاہیے تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور ایسا کیوں نہیں کیا۔ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کی تریویڈی کیسے کی جاسکتی ہے۔

چٹکیچ ادھال کی خانہ داری

چٹکیچ ادھال غریب تو خوب گاتے ہیں۔ لیکن آپ کو بتا ہے وہ کھانا پکانے میں بھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں کہتے ہیں۔ "میں گجراتی کھانوں سے لے کر باری کو تک کافی کچھ جانتا ہوں میری تو پسندیدہ غذا اپنی باری کیو در اپنی ہے۔ میں سردیوں میں اپنی مینل کے ساتھ لونا والا اپنے مکان پر جاتا ہوں۔ اور وہاں ہم خوب بارلی کیو بناتے ہیں۔ میں نے بریانی بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اور اب میں یہ بھی بہت اچھی جانتا ہوں۔"



ان کی بیٹی، بہن یا دوست ہوں۔ مجھے گھر پر ایک اشارہ بھی نہیں سمجھا جاتا۔ آج بھی اگر میں اپنا کمرہ صاف نہ رکھوں تو جی بجے ڈانٹ دیتی ہیں یا

سفر

فریال گوہر کو جمال شاہ سے علیحدگی کے بعد کی زندگی کافی پرسکون اور آزاد مکی ہے۔ اور وہ خوش بھی ہے۔ فریال کا کہنا ہے کہ شادی کے بندھن کے ٹوٹنے کے بعد اب میں کافی حیرت انگیز تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔ اب میں خود کو کچھ زیادہ طاقتور محسوس کر رہی ہوں۔ ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ میں نے جو پلاننگ اپنی زندگی کے بارے میں کر رکھی ہے اس میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اس سلسلے میں شادی اور بچوں کے بندھن میرے سفر کو متاثر کر سکتے تھے۔ دیکھ رہی تھی کہ معاشرے کی عورت، بیس سال بعد اس سفر میں کون سہارا دے گا؟

خبر

خالد انعم ان دنوں بچوں کا پروگرام آلف سے لے کر رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ اشتہارات میں بھی مصروف ہیں۔ انہوں نے اشتہار سازی میں ایک انوکھی جدت تلاش کی ہے، بہت سے نئے تصورات و تجربات والے اشتہارات خالد انعم کے اپنے ذہن کی تخلیق ہوتے ہیں۔ خالد انعم میں اب وہ پہلے والا لالائی پن نہیں رہا۔ وہ سنجیدگی سے مصروف کاموں میں مصروف ہیں۔ بلکہ مستقبل کی اہمیت کا بھی انہیں اندازہ ہو گیا ہے۔ خوشی کی خبر یہ بھی ہے کہ خیر سے خالد انعم اب والدین بن گئے ہیں۔



عام سی لڑکی

گلیمس ہونا ایک علیحدہ بات ہوتی ہے اور جو گلیمس ہوتے ہیں۔ وہ کہیں عام سی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں مادھوری کہتی ہے۔ "بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں بہت آدم بن کر رہی ہوں، مگر حقیقت یہ ہے کہ میں گرم خوش ترین لوگوں میں سے ایک ہوں، بے شک میں ہر ایک سے دوستی نہیں کرتی، لیکن میرا مزاج دوستانہ ہے۔ میں اپنے دوستوں کے حلقے میں اپنی ملوثی ہوں کہ مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں کہ ہر ایک مجھے جانے پیرے چربی دوست جب چاہیں مجھ سے مل سکیں۔ میں نے انہیں پوری آزادی دے رکھی ہے۔ کہ وہ مجھے کال کریں۔ مجھے پر تشدد کریں۔ اور میرے متعلق جو بھی کہنا چاہتے ہیں کہیں۔ ان کے لیے اشارے کے بجائے عام سی دوست رہوں۔ اس سلسلے میں میری فیملی نے توازن برقرار رکھنے میں میری بہت مدد کی ہے۔ ان کے لیے چاہیے میں کوئی کامیاب اشارہ ہوں یا ناکام، ایسی طرح سے

خالد انعم

گلیمس کی زندگی میں بدلے کی علامت

شکیلہ راؤ، صفیراؤ سال تو تو بھی آیا اب زخم یاد دینے کو! کس سے مانگوں باری بیک زخموں کی چلو سنو! سندر دھون نے آگ آگ لگائی خیرن میں کیسے پھر اپنا دل چاہے خوشیوں کی بستی میں بیٹھ کر عزیزین نھر کر بیٹھی بشارت دے رہی ہے سنا ہے لوگ اُسے آٹھ بھر کے دیکھتے ہیں سو کچھ دن اُس کے شہر میں ٹھہر کر دیکھتے ہیں سنا ہے لوگ تو باتوں سے پھول جھرتے ہیں چلو یہ بات ہے تو بات کر کے دیکھتے ہیں آریاب علی کیا سال آیا ہے، نئے علم میں گئے شہر بہت، مہربان کم ملیں گے بیٹس فاطمہ بزرگوں خواتین دل کے نہاں خانوں میں ہوتی ہیں یہ بے آباد قصبے بھی کہناں ویران ہوتے ہیں بلا کی اخراجی ہے ہماری فاسٹ میں لیکن ہمیں بے دھیانی میں بھی ترسے دھیان ہوتے ہیں درخشا شاہ دو سون کو دل میں رکھتے ہیں انگلیوں پر گنا نہیں کرتے بادیاں بھی ہوا کے ساتھی ہیں پائینوں پہ چلا نہیں کرتے فوزیہ ثمر تیرا فراق، دل کی تباہی، زلزل کا خوف میرے لیے یہ سال قیامت کا سال تھا روزِ یلیم لب تہ و نو میہ ہیں ہم اب کے برسی بھی اسے منہ سے ہونے لبر کرم اب کے برسی بھی

ہو جانے کا ہر زخم کہیں پھر سے نمایاں رونے کا دیدہ نم اب کے برسی بھی ارم زیب مری عمر سے نہ سمٹ سکے، مرے دل میں آئے سول تھے ترے پاس جتنے جواب تھے تری اک نگاہ میں آگے فرحت اجمل بخاری سنا گھر گستاخوں پہ آئیں جب بھی ہوا میں غم کی خود کو بیٹھ رہنا شائستگی یہی ہے زخموں کی فصل بونارت دھون سنا اس شہر دہراں میں چارہ گری یہی ہے شانی، فزی بہا پور یہ بھی آداب ہمارے ہیں تمہیں کیا معلوم ہم حیرت کے نہیں ہارے ہیں تمہیں کیا معلوم اک تم ہو کہ ہم کو مجھے نہیں اپنا اک ہم ہیں کہ تمہارے ہیں تمہیں کیا معلوم تہمینہ ناز علی پور چھٹے چھٹے ہوئے وہ لفظ وہ جلتے ہوئے حروف شہرگ میں آج بھی ہیں وہ کانٹے اڑے ہوئے اک بار چہ کہا تھا مگر اس کی آگ سے اب شک میری زبان پر ہیں چلے نہ ہوئے انشال صابر تمہارا نام لکھنے کی اجازت چھین گئی جب سے کوئی بھی لفظ لکھتا ہوں تو انھیں ہینک جاتی ہیں میں ہنس کے جھیل لیتا ہوں جلدی کی سبب نہیں گلے جب اُس کے گناہ ہوں تو انھیں ہینک جاتی ہیں غلامز بول میرا نصاب بھی تو اور میرا خدا بھی تو ہر ایک سال تیرے نام سے شروع ہوا

317



شاہانہ بلوچ خان پور
 یادوں کی آگ میں میری کھیں سنگ آئیں
 راتوں کو سوچنے کی تو عادت نہ تھی مجھے
 شاید وہ میرے عشق کی اک انتہا ہی تھی
 کہ تیرے ہمسفر سے رقابت نہ تھی مجھے
 عروج بخت شاہ میاں زوال
 یہ سال بھی آداس رہا روئے کر گیا
 تجھ سے ملے بغیر دوسرے گزر گیا
 خوبات معتبر تھی وہ سر سے گزرتی
 جو حرف سرسری تھا وہ دل میں آگیا
 ٹیپہ عظمت شاہ میاں زوال
 آج پھر ساون ٹوٹ کے برسا ہے
 آج پھر کسی کے بلے میں نمی ہے
 پھر سے دھتوں کے ہالے میں ہوں ٹیپہ
 آج پھر یادوں کی محفل جچی ہے
 شہرت زری شاہ میاں زوال
 رنگ کتنے ہیں نئے سال تیرے ہفتوں میں
 پھیکا لگتا ہے مجھے اپنی رفاہیات کا رنگ
 عطیہ بدر گجرات
 تمام شب جہاں جلتا ہے اک اداس دیا
 ہوا کی راہ میں اک ایسا گھر بھی آتا ہے
 وہ مجھے ٹوٹ کے چاہے گا پھر چھوڑ جائے گا
 مجھے خبر تھی اسے یہ ہنر بھی آتا ہے
 مسز نشہ العاف بٹ سیالکوٹ کینٹ
 کم زمانے کی راہ سے آئے !
 درنہ سیدھا تھا راستہ دل کا
 لغت نہ تھی گجرات
 اسے کاش یہ نیا سال خوشیوں کی فیر لائے
 اس ملک کے ہر شہری کو یہ سال راس آئے
 نہ ہو ساخ کوئی اب نہ آجڑے کوئی گھر
 نئے سال کا ہر لمحہ پیغام امن لائے
 مریم رئیس نواب شاہ
 خدا کرے کہ زمانے کو راس آجائیں
 نیا برس نئے لیل و نہار ملے ہیں

عاصم بخاری دھریہ
 جس پیٹریک جھاڑوں بھی لگے دھریہ
 اس پیٹریک پہنچی بھی بسرا نہیں کرتے
 آنکھوں ہی سے چڑھ لے دھریہ کوئی دل کی اداسی
 اس دھریہ کو وہ ذکر بھی میرا نہیں کرتے
 فرزانہ نذر گجرات
 وقت ادجباب و دعا کا تھا کوئی نعمت مانگتے
 سلسلے جابر کے سچ کہنے کی جرات مانگتے
 جن کی آنکھیں تھیں انہیں بھی کچھ نظر آتا نہ تھا
 ایسے اندرے شہر میں ہم کیا بصارت مانگتے
 امیر پورے والا
 مشے تو بچھلے سال کے اپنی جگہ ہے
 سب سوچتے رہے کہ نیا سال آگیا
 خورشیاں جو بانٹا تو کوئی نئی بات تھی
 گزرا ہوا یہ سال بھی عمر میں بڑھا گیا
 زید آئی گول لہ
 بڑے درختوں کی شاخوں کا کیا بگڑ سکتا
 ہوا کا زور تو چڑوں کے آشیان تک تھا
 مجھے زمیں کے سناڑ کیا شکست دیتے
 میرا ضمیر بلندی میں آساں تک تھا
 شگفتہ کرن لاہور
 ٹوٹ کر ملنے جلنے سے اب ڈر سا لگتا ہے
 تو بھی ہم سے چھ جانے گا ایسا لگتا ہے
 جانے کیوں اک تیرا چہرا اچھا لگتا ہے
 کہنے کو تو عزیز ہے لیکن مجھے تو اپنا لگتا ہے
 روٹی گول میاں چنوں
 فکر معاش، عشق بے تابی، یاد و ننگاں !
 اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے
 ٹیپہ خان پریٹ آباد
 اب کے بچھڑ کے اس کو نہایت تھی اس قدر
 جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا !

موسیٰ کے پکوان

ساتویں خدام نبی

سحری کے پکوان

سحری میں عموماً مسئلہ درپیش رہتا ہے کہ کیا
 کھایا جائے۔ عام طور پر لوگ اندرے وغیرہ کھانا زیادہ
 پسند کرتے ہیں تاکہ پورے دن کے لیے بھر پور
 غذا ایت مل سکے۔ ایک طرح کا ذائقہ کھاتے کھاتے
 بھی دل بھر جاتا ہے۔ سو اس لیے ہم نے اس دفعہ
 اندرے کو مختلف طریقوں سے پکانے کی ترکیب دی
 ہیں۔ جو یقیناً آپ کو پسند آئیں گی۔

سادہ آمیلیٹ

اجزاء۔

اندرے دو عدد
 گھی دو بڑے چمچے
 نمک (سرف مرچ ایسی ہوگی) حسب ذائقہ
 ترکیب۔

اندرے کو سب سے پہلے اس چھوٹے نہیں بلکہ
 کاسٹے سے اس میں نمک اور سرف مرچ ملا لیں
 فراپی پین میں ڈال کر ڈرائیں۔ آج کل کی کاسٹیں
 چھوٹے سے اندرے کے تیار شدہ اندرے ڈال دیں۔
 پھر ہلکی آگ پر پڑ لیں۔ آپ کی مرضی سے کہ اسے
 الٹ پلٹ کر پھینکی کی شکل کا بنالیں۔ یا گول گھیر کی طرح
 تل کر سرخ کریں اور اتار لیں۔

مسالے دار آمیلیٹ

اجزاء۔

اندرے دو عدد
 پیاز ایک عدد چھوٹی
 ہری مرچ چار پانچ
 ادھرک ذرا سا

نماز۔ ایک عدد بہت چھوٹا سا
 برادھنیا۔ چند بٹے
 نمک۔ حسب ذائقہ
 گھی۔ تین بڑے چمچ (کھانے کے)
 ترکیب۔
 پیاز کو باریک کاٹ لیں۔ ہری مرچ اور ادھرک
 کو بھی باریک کاٹ کر رکھیں۔ اندرے ایک گہری
 پلیٹ میں ڈالیں اور کاسٹے سے خوب پھینٹیں۔ پھینٹنے
 کے بعد اس میں نمک اور سب کچھ ہوا سالادال دیں
 اور خوب اچھی طرح ملا لیں۔
 پھر فراپی پین میں گھی کو گرم کریں اور اندرے ڈال کر ہلکی
 آگ پر پڑ لیں۔ آج کل کی کاسٹیں پانچھلکی کی شکل بنائیں یا
 تھوٹے چھوٹے تین چار ٹکڑے کر لیں۔ بہت مزے دار
 ہوگا۔ یہ آمیلیٹ پرائیوٹ کے ساتھ کھانے میں بہت
 مزا آتا ہے اور آپ اسے کھانے پر بھی استعمال کر سکتے
 ہیں۔

آمیلیٹ

اجزاء۔

اندرے دو عدد
 سوڈا ایک چمچ
 نمک، کالی مرچ حسب ذائقہ
 گھی حسب ضرورت
 ترکیب۔

اندرے تو ڈر سفیدی گہری پلیٹ میں ڈال لیں
 اور زردی اندرے کے اندر ہی رہنے دیں۔ سفیدی
 کو کاسٹے سے اتنا پھینٹیں کہ وہ سب جھاگ ہو جائے
 سفیدی زردی اور جھاگ ایسے نہیں کر سکتے ہر
 بلٹہ نہ جلے کہ اس میں سوڈا کھانے والا یا کیننگ

باؤڈر ایک چھٹی برابر ڈال دیں۔ اس کے ساتھ ہی نمک اور کالی مرچ لپی ہوئی ذرا سی ڈال کر خوب پھینٹیں۔ پھر زردی بھی ملا دیں۔ اور ذرائی بین میں بہت سا گھی ڈال کر کڑا لیں اور پھر چھوٹے سے آواز کر گھی کو نیم گرم رہنے دیں۔ اب ہلکی آگ پر رکھ کر اس میں پورے کے پورے اندھے ڈال دیں۔ اور پلٹے سے اس کو گول گول کینڈی طرح بنانے کی کوشش کریں۔ جیسے جیسے سینک لگتا جائے گا۔ اس کی شکل ٹھیک گول ہوتی چلے گی۔ اگر آپ چاہیں تو دو مرتبہ میں علیحدہ علیحدہ دو گول گول آئینٹ تیار کر سکتے ہیں جو کہ دیکھنے میں بہت خوبصورت لگیں گے۔

اندھے کو کاکامیلٹ

اندھے چار عدد
آلو ایک باؤڈر
نمک، سرخ مرچ حسب ذائقہ
نمٹاؤ ایک عدد
اورک، ہرا دھنیا۔ ڈرا سا

گرم مسالا پیا ہوا۔ آدھا چھو
پیاز ایک عدد بڑی
گھی آدھا پاؤڈر

ترکیب ہے۔
آلو پھین کی طرح کاٹ لیں۔ لیکن ذرا موٹا۔
دیکھیں۔ سب مسالا کاٹ لیں اور اندھے خوب پھینٹ لیں۔ اب ذرائی بین میں گھی کو کڑا لیں اور ہلکی آگ کر کے اس میں آلو اور لپی لپی گئی ہوئی پیاز ڈال دیں۔ پلٹے سے الٹ پلٹ کرتے جائیں۔ یہاں تک کہ آلو گول جائیں۔ لیکن سرخ نہیں ہونے دیں۔ اب آلوؤں کو کانٹے سے خوب پھینٹیں پھینٹتے ہوئے آلو تیار کر کے رکھ لیں۔

چادر اور اندھے تو ڈر کر گھر کی پلٹ میں ڈال کر پھینٹیں اس میں سب کچھ ہوا مسالا نمک مرچ گرم مسالا ڈال لیں۔ اندھے خوب ایک جان کریں اور اس میں آلو ملا لیں۔

اب ذرائی بین میں گھی گرم کریں۔ پھر تھوڑا سا زیادہ نہیں۔ اور یہ اندھے ملے ہوئے آلو سب اس میں الٹ دیں۔ بالکل ہلکی آگ پر رکھ کر ذرائی بین کو ہلاتے جائیں کوئی ایک منٹ تک ہلانے کے بعد اس کو واپس میرا پلٹ میں الٹ لیں اور اگلے حصے کو ذرائی بین میں اسی پلٹ کی مدد سے ڈال دیں۔ یہ آئینٹ بالکل سرخ ہر حصے کی طرح اور ذرائی بین سے باہر کا ہو گا۔

اندھے کی بھیجیا

اندھے۔
پیاز درمیان دو بین
نمٹاؤ آدھا پاؤڈر
ہری مرچ پانچ چھ
اورک ذرا سی
گھی چار بڑے پیچھے
نمک حسب ذائقہ

ترکیب ہے۔
پیاز کو چھٹے وار کاٹ لیں۔ اورک، نمٹاؤ، ہرا دھنیا سب باریک کاٹ کر رکھ لیں۔ ایک دیگی یا تھالی میں گھی کو کڑا لیں اور اس میں کئی ہوئی پیاز ڈال دیں۔ سنہری رنگ ہونے پر اس میں ڈرا سا پانی ڈالیں۔ اور ساتھ ہی نمک، سرخ مرچ، نمٹاؤ اور اورک ڈال دیں۔ دو چار پیچھ چلا کر تھوڑا سا پانی اور ڈال دیں۔ تاکہ پیاز مکھن جائے۔ دس منٹ کے بعد اس کو کھولیں۔ ڈرا سا پھینٹیں اور پھینٹتے ہوئے اندھے ڈال کر آہستہ آہستہ پیچھے کو چلا دیں۔ جب اندھے جھن جائیں تو آواز لیں۔ اوپر سے ہرا دھنیا ڈال دیں۔ اندھے اور آلو تیار ہیں۔



ہونٹ اسی وقت اچھے لگتے ہیں جب یہ متاثر کن اور بھر پور نظر آئیں اور انہیں پھر پور بنانے کے لیے لب اسٹک لگائی جاتی ہے۔ لب اسٹک ہونٹوں کو نرم روشن، چمکدار اور گلابی بناتی ہے۔ آپ آسانی سے کسی لب اسٹک لب پینل یا برش سے لپٹے ہونٹوں کو ایک نئی آؤٹ لائن دے سکتی ہیں اس کے بعد لب اسٹک منتخب کرنا آپ کا کام ہو گا کہ جسے ہی بناؤٹ کے لحاظ سے لب اسٹک کا انتخاب کریں۔

لب اسٹک لگانے کا بہترین طریقہ لب برش کا استعمال ہے۔ آپ کو تھوڑی مشق کی ضرورت ہوگی اس کے بعد برش سے ذریعہ لب اسٹک لگانا آسان ہو جائے گا۔ اور آپ آسانی سے ایک مخصوص متاثرہ پیرا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ یاد رہے یہ عمل کم خرچ بھی ہے۔

لب اسٹک بیشتر باؤڈر لگانے کے بعد لگائی جاتی ہے۔ ہونٹوں کے آس پاس اگر موثر انداز میں باؤڈر لگایا جائے تو اس سے لب اسٹک ہونٹوں کے ساتھ جلی باریک باریک لائنوں میں پھینے سے محفوظ رہتی ہے۔ پینل یا برش کی مدد سے آؤٹ لائن بنائیں یہ آؤٹ لائن اس شیشہ سے ہلی ہوئی چاہیے جس سے آپ اسے پر کریں گی آؤٹ لائن بنانے کے بعد اسے منتخب شدہ شیشہ سے بھر دیں اور اس عمل کے لیے لب برش استعمال کریں۔ برش سے فٹنگ دینے میں سہولت رہتی ہے۔ ایک بار پھر کرنے کے بعد لٹرو چیم سے اس کو خشک کریں مگر احتیاط سے پھر دو مٹر آؤٹ لگائیں۔

جب لب اسٹک برش کی مدد سے لگائی جاتی ہے تو یہ پروفیشنل ورک لگتا ہے۔ سب سے پہلے آؤٹ

لائن بنائیں اس کے بعد اسے پر کریں۔ یہ سیدھا سا طریقہ ہے لب اسٹک لگانے کا۔ اگر لب اسٹک پینل سے بنائی جائے والی آؤٹ لائن کے بغیر ہی لگائی جا رہی ہے تو مجموعی متوجہ آپ کے لیے مایوس کن ہو سکتا ہے۔ اس لیے لب اسٹک پینل کا استعمال ضرور کریں۔ جس وقت لب اسٹک لگائیں ہونٹوں کو اچھی طرح خشک کریں۔

- ۱۔ سب سے پہلے مونسو انر لگائیں۔
 - ۲۔ اب آؤٹ لائن بنائیں۔ اسٹروک زیادہ تیزی سے مکمل نہ کریں اور پہلے اوپری ہونٹ کی آؤٹ لائن بنائیں۔
 - ۳۔ آؤٹ لائن بناتے وقت ہونٹوں کو کھینچاؤ سے محفوظ رکھیں۔ ہونٹ بالکل قدرتی انداز میں ہونے چاہئیں۔ ہونٹوں پر آؤٹ لائن بنانے کے بعد اسے پر کریں اور ایسا آپ برش کی مدد سے کریں۔
 - ۴۔ برش کو ہونٹوں کے درمیان سے استعمال کرنا شروع کریں اور پھر دونوں جانب بتدریج بڑھیں۔ یہی عمل نیچے ہونٹ پر کریں۔
 - ۵۔ اگر مزید روشن بنانا ہے تو ہونٹوں کو تو اس پر لب اسٹک لگانے کے بعد گلوٹنگ کر سکتی ہیں۔
- ہونٹوں کی شیب کی تبدیلی۔
آپ کے ہونٹ پتلے ہیں اور آپ قدرتی شیب میں موجود ہونٹوں پر ہی لب اسٹک لگاتی ہیں تو آپ کے ہونٹ تخت اور عظیم نظر آئیں گے۔ آپ کو آؤٹ لائن تبدیل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہونٹ بھرے محسوس نظر آئیں۔ سب سے پہلے قدرے گہرے رنگ کی لب پینل اور اوپر لب مٹکا

انتخاب کریں۔ اپنے اوپری ہونٹ کی بناوٹ کو
پنسل سے گہرا کریں۔ بناوٹ سے مراد ہونٹوں کی
قدرتی آؤٹ لائن ہے۔ درمیان سے یہ عمل کرتے
ہوئے دونوں کناروں کی طرف آئیں۔ اب منہ
بند کر لیں اور حقوڑا سارک جائیں۔ اب یہ کریں کہ
اپنی کہنی ڈریسنگ ٹیبل پر جمائیں تاکہ ہاتھ میں
لرزش باقی نہ رہے۔ جب آؤٹ لائن مکمل ہو جائے
تو پچھلے ہونٹ پر بھی یہی عمل کریں۔ اب برش
سے نکالیں اور آؤٹ لائن کو پھرنا شروع کریں۔
اسٹروک بہت آہستہ آہستہ لگائیں۔ برش کو بھی
درمیان سے لگانا شروع کریں اور ہولے ہولے
دونوں کناروں کی طرف آئیں۔ اس کے بعد منہ کھولیں
اور اندرونی حصے پر بھی برش سے لکھیں۔ جو مزید
ہونٹ کی صورت میں لکھنے سے روکے گئے تھے۔

ہونٹ موٹے ہوں تو ہونٹوں کی قدرتی لائن سے
ذرا اندر کی طرف آؤٹ لائن بنائیں تاکہ ان کی موٹائی
کم ہو جائے۔ ہونٹوں کے درمیان سے اشارت لیں
اور کنارے کی طرف آئیں۔ پہلے اوپری ہونٹ پر
آؤٹ لائن بنائیں۔ یہی عمل پچھلے ہونٹ کے ساتھ
کریں۔ اب پنسل کی رنگت سے قدرے ہلکا شید
برش کے ذریعے ہونٹوں پر لگائیں۔ درمیان سے
شروع ہو کر کنارے کی طرف آئیں۔ ہونٹوں کو پتلا
بنانے کے لیے بہترین شید کافی ہے۔

اگر آپ کا اوپر والا ہونٹ پتلا ہے اور نیچلا ہونٹ
موٹا اور آپ چاہتی ہیں کہ اوپر والے ہونٹ کو پتلا
ہونٹ کے تناسب میں لائیں تو آپ کو اوپری ہونٹ
کی آؤٹ لائن، قدرتی آؤٹ لائن سے باہر نکل کر
بنانا ہوگی۔ درمیان سے شروع کریں اور دونوں
کناروں کی طرف بتدریج آئیں۔ پچھلے ہونٹ کی
قدرتی آؤٹ لائن میں بالکل تبدیلی نہ کریں۔ شید
لپ اسٹک برش سے لگائیں۔

اگر ہونٹ چوڑے ہوں تو آؤٹ لائن ڈارک
پنسل کی مدد سے بنائیں اور کناروں کی طرف آتے
ہوئے اسے قدرے ہلکا کریں۔

